اصلاح المسلمین
ارشاداتِ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ
از افادات
حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ
مؤلف : جناب پروفیسر مسعود حسن علوی مرحوم
مرتب و مدون : جناب محمد کلیم صاحب و جناب علی حماد رضا صاحب
زیرِ نگرانی
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب دامت برکاتہم
ادارہ اسلامیات
لاہور، کراچی (پاکستان)

اِصلاحُ المُسلِمین

ارشاداتِ حکیم الاُمّت رحمۃ اللہ علیہ

جلد ۱

قرآن و سُنّت کی روشنی میں زندگی کے
تمام شعبوں سے متعلّق جامع ہدایات

از افادات

حکیم الاُمّت مجدد الملّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

تألیف : جناب پروفیسر مسعود حسن علوی مرحوم

ترتیب و تدوین
جناب الحاج محمّد کلیم صاحب
جناب علی حمّاد رضا صاحب

زیرِ نگرانی
عارف باللہ حضرت اقدس
ڈاکٹر محمّد عبدالحی صاحب
قدس سرہٗ

اِدارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۲۴۳۳۱۲، ۷۲۳۴۴۸۵، فیکس ۷۳۲۴۴۸۵-۴۲-۹۲

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۴۳۹۹۱ - ۷۳۵۲۲۵۵

★ موہن روڈ
چوک اُردو بازار، کراچی فون ۷۷۲۲۴۰۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

عرضِ ناشر

"ارشاداتِ حکیم الامّتؒ" کے نام سے اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ اس سے قبل "اصلاح المسلمین" کے نام سے کئی بار طبع ہوچکی ہے اور بحمد اللہ دینی حلقوں میں مقبول خواص و عام ہوئی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے حکیمانہ ملفوظات، درحقیقت قرآن و سُنّت کے جامع احکام کی وہ آسان تعبیرات ہیں جو تجربہ کے مطابق دورِ حاضر کے عقل پسند مسلمان کے ایمان کی حفاظت کے لئے اکسیر ثابت ہوتی ہیں اور اُنہیں پڑھ کر سینکڑوں نہیں بلکہ ہزارہا مُسلمانوں کے ایمان و عمل میں قوت و تازگی پیدا ہوتی ہے۔

"اصلاح المسلمین" بلاشبہ ان مؤثر ملفوظات کا بہت خوب صورت اور مفید انتخاب ثابت ہُوا ہے۔

"اصلاح المسلمین"، چُونکہ حضرت اقدس ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس سرہٗ کے فیضِ نظر، روحانی توجہ اور اُن کی جُنبشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس لئے حضرتؒ کی خواہش تھی کہ اُن کی باقی دیگر مؤلفات "مآثر حکیم الاُمّت، بصائر حکیم الامت، معارف حکیم الامت" کی مناسبت سے اصلاح المسلمین کا نام "ارشاداتِ حکیم الامت" سے بدل دیا جائے تاکہ اس موضوع پر ان کی جملہ تالیفات کے نام ایک جیسے ہوں۔ اس مقصد کے لئے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہٗ نے خود احقر کو تحریراً "ارشاداتِ حکیم الامتؒ" کا نام لکھ کر دیا تھا۔

حضرتؒ کی خواہش کے پیشِ نظر اب یہ کتاب اسی نام سے شائع کی جارہی ہے اور آئندہ بھی اسی نام سے انشاء اللہ شائع ہوتی رہے گی۔ اطلاعِ حال کے لئے یہ سطور تحریر ہیں۔ فقط

احقر

محمود اشرف عفی عنہ

فہرست

باب اوّل

عقائد و اعمال

فصل (۱)

اسلام و ایمان

اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے، مگر ہر عمل کے دو درجے ہوتے ہیں ایک ظاہری ایک باطنی۔ اسی طرح اسلام زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے اور اس کا دل سے ماننا یہ ایمان ہے۔ تو اسلام اقرار ہوا اور ایمان تصدیق قلبی۔ یہ تو سب سے مقدم شرط ہے کہ اقرارِ توحید و رسالت زبان سے کرے اور دل میں اس کی تصدیق ہو کیونکہ یہ اصول میں سے ہے۔ (شعب الایمان ص۱۳)

چونکہ فعل لسانی اور فعل قلب بہت سہل ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اسلام کا مدار احکام دنیا میں تو صرف زبان کے اقرار پر رکھا۔ اور احکام آخرت میں تصدیقِ قلب بھی ضروری ہے۔ اور جو افعال اس کے علاوہ ہیں نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ وہ مکمل اسلام ہیں اجزائے اسلام نہیں ہیں۔ یعنی تارک صلوٰۃ کافر نہیں اور یہ نکتہ اہل سنّت نے سمجھا ہے کہ جب اسلام اتنی سہل چیز ہے جو زبان ہلانے سے متعلق ہے تو اس کے اجزاء یہ امور شاقہ نہیں ہو سکتے۔ پس مومن تارک صلوٰۃ اگرچہ معذّب ہوگا۔ مگر پٹ کٹ کر کسی وقت جنّت میں ضرور پہنچ جائے گا۔ پس خدا تعالیٰ کی یہ بہت بڑی رحمت ہے کہ اسلام کو پھولوں جیسا ہلکا کر دیا۔ حالانکہ یہ ایسی قیمتی شے ہے کہ کوئی چیز اس کے برابر قیمتی نہیں کیونکہ عذاب دائمی سے نجات کا مدار اسی پر ہے اور جنّت کی دائمی نعمت کا استحقاق اسی سے ہوتا ہے۔ اگر یہ سب سے زیادہ دشوار ہوتا تو بجا تھا۔ مگر قربان جائیے رحمت حق کے کہ سب سے زیادہ ضروری چیز کو سب سے زیادہ آسان کر دیا۔ مگر صاحبو! اس رحمت کے اندر خدا کا ایک بڑا قہر بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ اتنا آسان کام کافر کو بہت ہی مشکل ہے اس کو

گردن دے دینا آسان مگر اسلام لے آنا آسان نہیں۔ آپ سمجھے کہ یہ کس چیز کا حجاب ہے؟ یہ حجاب قہرِ الٰہی کا ہے۔ اسی وجہ سے اہل اللہ خدا کے قہر سے ہر وقت لرزاں ترساں رہے ہیں۔ اسی لیے کام کرنے والوں کو چاہیے کہ اپنے اعمال کو اپنا کمال نہ سمجھیں بلکہ خدا تعالیٰ کا احسان سمجھ کر شکر کریں کہ انہوں نے ہم سے کام لے لیا ورنہ ہماری کیا طاقت تھی۔

منّت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

رسالت کے بغیر ایمان معتبر نہیں

ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مان لے کیونکہ وجود کا انکار تو مشرکین بھی نہیں کرتے بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفاتِ کمال سے متصف اور صفاتِ نقص سے منزہ سمجھے۔ اب میں کہتا ہوں کہ صفاتِ کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے جس کے ساتھ خدا تعالیٰ کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے اور صفاتِ نقص میں سے ایک صفت کذب بھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو منزّہ سمجھنا لازم ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہُوا اور دوسرا مقدمہ یہ کہ حق تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں محمد رسول اللّٰہ" اور قرآن شریف کا کلامِ الٰہی ہونا دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے تو اس خبر کو بھی سچا سمجھنا واجب ہے۔ پس جو آپؐ کو رسول نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب کہتا ہے تو پھر اللہ پر کہاں ایمان لایا۔ پس ثابت ہُوا کہ حق تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیق رسالت کے ممکن نہیں۔ (الرفع والوضع)

ایمانِ کامل کا اقتضاء

ایمان کامل کے لیے لازم ہے کہ طبیعت اور خُو بُو سب مسلمانوں کی سی ہو۔ رغبت اسی چیز سے ہو جو قرآن و حدیث سے ثابت ہو۔ اور ایسے لوگوں کو اسی چیز سے نفع ہوتا ہے جو حدیث و قرآن میں ہے۔ وہ مستحبات پر ویسا ہی عمل کرتا ہے جیسے واجبات پر۔ وجہ یہ ہے کہ کمال ہر

کام کا ایسے ہی انہماک سے ہوتا ہے۔ مستحب اور واجب کی تنقیح سے نہیں ہوتا۔
(کمالات اشرف ص۴۲)

اپنی خواہشوں کو شریعت کا تابع بنانا ہی کمال ایمان ہے

کیا نقصان ایمان ڈر نیکی چیز نہیں اور کیا ایمان ایسی چیز نہیں جس کو حاصل کیا جائے۔ جب آپ کھانا پکاتے ہیں تو اتنی سی بات بھی گوارا نہیں ہوتی کہ ذرا نمک پھیکا ہو۔ حالانکہ اگر نمک بالکل بھی نہ ہو تو کھانے میں مقصود کا بطلان نہیں ہوتا۔ کمال ایمان بڑی چیز ہے۔ ہمت کیجئے اور حاصل کیجئے اور ہمہ تن اپنی خواہشوں کو شریعت کا تابع بنائیے۔ عقائد ہوں تو شریعت کے مطابق۔ اخلاق ہوں تو شریعت کے مطابق اور معاملات کی بالخصوص اصلاح کیجئے اس میں ابتری بہت ہی زیادہ ہے۔
(منازعۃ الھویٰ)

خوف و رجا سے ایمان کامل ہوتا ہے

ترغیب کی تکمیل ترہیب سے ہوتی ہے جیساکہ ترہیب کی تکمیل ترغیب سے ہوتی ہے۔ بدون ایک دوسرے کے ہر ایک ناقص ہے۔ کیونکہ رجاء احتمال نفع ہے اور احتمال کا مفہوم خود مستلزم ہو رہا ہے دوسرے احتمال کو۔ پس کسی کا تحقق بدون دوسرے کے نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ترغیب و ترہیب دوش بدوش چلتے ہیں۔ پس خوف و رجا ہی سے مل کر ایمان کامل ہوتا ہے۔ اس لیے مومن کو خوف کے ساتھ رجاء اور رجا کے ساتھ خوف کا ملانا ضروری ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر حشر میں یہ ندا ہو کہ جنت میں ایک ہی آدمی جائے گا لیر جوت انی اکون ھو۔ تو میں یہ سمجھوں گا کہ وہ ایک میں ہی ہوں اور اگر یہ ندا ہو کہ جہنم میں ایک ہی جائے گا لخفت انی اکون ھو۔ تو میں ڈرون گا کہ شاید وہ ایک میں ہی نہ ہوں۔ گویا رجا و خوف دونوں کامل درجہ کے تھے۔ (اجمال الجلیل ص۴۲)

جان اپنی ملک نہیں کہ اس میں جو چاہو تصرف کرو۔ اگر جان اپنی ہوتی تو خودکشی کیوں حرام ہوتی۔ ہاں جہاں یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں جان دینا طاعت ہے

نورِ ایمان

تو وہاں کمزور مسلمان بھی قوتِ ایمان سے بہادر ہو جائے گا۔ کیونکہ شجاعت میں کمی تردد سے ہوتی ہے اور بے موقع بے محل بدون اذنِ شرعی کے جان دینا کوئی بہادری نہیں بلکہ بزدلی ہے جیسے خودکشی بہادری نہیں اور اگر یہ بہادری ہے تو ویسی ہی ہے جیسے عورتیں کنوئیں میں گر کر مرجاتی ہیں۔ کیا کوئی عاقل اُن کو بہادر کہے گا۔

اور شجاعت ہی کی کیا تخصیص ہے۔ تمام کمالات کی یہی حالت ہے کہ دنیا کی غیر مسلم اقوام مسلمانوں سے کسی چیز میں نہیں بڑھ سکتیں، خواہ علم ہو یا عمل ہو۔ شجاعت ہو یا عقل ہو۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے اندر ایک چیز ہے جس کو ایمان کہتے ہیں اور نورِ ایمان کے اندر جو چیز نظر آئے گی وہ ظلمت اور اندھیرے میں کہاں نظر آ سکتی ہے۔ اس کے موازنہ کی سہل صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان اور غیر مسلم کو لیں۔ وہ دونوں ایک ملک ایک تعلیم ایک سے قویٰ، ایک سی وسعت میں شریک ہوں۔ پھر موازنہ کیجئے معلوم ہو جائے گا کہ کون قابل اور کون نا قابل ہے۔ (الافاضات ج۵ ص۳ ملفوظ ۴۸۷)

مصائب میں ایمان کی آزمائش ہے

پس، لیبتلی اللّٰہ ما فی صدورکم کا حاصل تو یہ تھا کہ نفسِ ایمان کی حفاظت کی جاتی ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے یا نہیں اور تمحیص کا حاصل یہ ہے کہ مصیبت کے ذریعہ سے ایمان کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے..... بعض لوگوں کا ایمان وساوس و معاصی سے مشوب ہوتا ہے۔ مصیبت کے ذریعہ سے وساوس و معاصی کا میل دھویا جاتا ہے۔ کیونکہ مصیبت کی خاصیت یہ ہے کہ دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور وہ غفلت جو وساوس و معاصی سے قلب میں پیدا ہو گئی تھی مصیبت کے وقت دور ہو جاتی ہے۔ یہی تمحیص ہے اور یہ تفسیر اہلِ سنت کے مذہب پر سب سے زیادہ منطبق ہے

کیونکہ وہ ایمان خالص اور ایمان غیر خالص کے قائل ہیں۔ بخلاف معتزلہ خوارج کے۔

غرض مصائب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے اور ایمان کے اندر معاصی و وساوس سے جو میل کچیل آجاتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے اور اس تحیص سے بندہ پر عبدیت غالب ہو جاتی ہے اور دعویٰ تکبر و غرور کا میل کچیل کم ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقت منکشف ہو کر سمجھ میں آجاتا ہے کہ آدمی کبھی دعویٰ نہ کرے۔

وعظ: البر بالبر ۱۲ المحرم الحرام ۱۳۴۶ھ

حکمِ شریعت بلا دلیل ماننا چاہیے

میں بقسم کہتا ہوں کہ اطمینان اور تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ میں اللہ و رسول کے حکم کو بلا دلیل مانتا ہوں۔ اسرار و حکم کے درپے ہونے سے پوری تسلی نہیں ہوتی۔

الدوام علی الاسلام صـ۱۵

تجدید ایمان

اگر کوئی شخص ہزار دفعہ بھی کافر ہوا اور پھر صدق دل سے اسلام لانا چاہے تو حق تعالیٰ ایسے کریم ہیں کہ پھر قبول کرنے کو تیار رہیں۔ اللہ اللہ ایسا رحیم ان کے سوا کون ہے۔ پس اگر کسی سے کوئی کفر کا کلمہ صادر ہوا ہو یا ایسا ارادہ ہوا ہو تو وہ پھر سچے دل سے ایمان لے آئے تو حق تعالیٰ کے یہاں قبول ہے۔

(اصلاح ذات البین صـ۳۹)

طبعی کمزوری کمال ایمان کے منافی نہیں

ایک خط کے جواب کے سلسلہ میں فرمایا کہ ایک بزرگ کا الہام ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں" اے بندے! رزق کی وجہ سے کیوں پریشان ہے۔ یہ تو وہ چیز ہے کہ اگر تو یہ بھی دعا کرے کہ اے اللہ مجھ کو رزق نہ دے تب بھی ہم دیں گے۔ نہ کہ تو مانگے اور ہم نہ دیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ واقعی اگر کوئی شخص تمام دن تسبیح لے کر یہ رٹا کرے کہ اے اللہ مجھ کو کھانے کو نہ دیجیو تب بھی ملے گا۔ مگر رزق کی اسی پریشانی سے کسی پر ضعیف الایمان کا حکم

نہیں لگا سکتے۔ امور طبعیہ میں انسان معذور ہے اور ان امور طبعیہ کے مناشی بھی کثر ت ہے غیر اختیاریہ ہوتے ہیں۔ بعض واعظین بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ سطحی نظر سے مسلمانوں پر غلط فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ وعظوں میں اکثر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خدا پر اتنا بھی بھروسہ نہیں جس قدر ایک دعوت کر دینے والے پر ہوتا ہے۔ کہ کوئی دعوت کر دے تو کھانا نہیں پکواتے پورا یقین ہوتا ہے کہ کھانا آئے گا اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر یقین نہیں۔ مگر ان واعظ صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ جس وعدہ میں وقت اور سبب مبہم ہو وہاں طبعی پریشانی ہوتی ہے۔ مثلاً اگر دعوت کرنے والا ہی یہ کہہ دے کہ کسی دن کسی جگہ سے کھانا آئے گا تو ایسی دعوت پر کسی کو بھی سکون نہ ہوگا بس اسی طرح وعدۂ الٰہیہ میں وقت اور سبب مبہم ہے تو اس میں پریشانی ہونا منافی توکل نہیں۔ اعتقاد تو یقیناً یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ سچّا ہے۔ مگر وقت اور سبب نہ معلوم ہونے کی وجہ سے طبعی پریشانی ہوتی ہے۔ تو اس میں دو درجے ہیں۔ ایک اعتقادی اور ایک طبعی جس طرح ہر مسلمان کے قلب میں حق تعالیٰ کی خشیت ضرور ہے مگر اس میں بھی وہی تقسیم ہے یعنی ایک خشیتِ اعتقادیہ ایک خشیت طبعیہ۔ اسی طرح کوئی شخص مومن نماز پڑھتا ہے اور اس میں کسل ہوتا ہے تو یہ کسل اعتقادی نہیں، کسل طبعی ہے۔ اگر کسلِ اعتقادی ہوتا تو پڑھتا ہی کیوں۔ تو امور طبعیہ سے اپنی بدحالی کا گمان کر کے پریشان نہ ہونا چاہیے۔ اور ان اصولوں کے استحضار کے بعد بھی اگر پریشانی ہو تو جہل ہے یا کید نفس ہے۔ اس کو علم صحیح میں قید کرنا چاہیے — اور حضرت اگر یہ موانع طبعیہ مانع نہ ہوں تو پھر عبادت میں اجر ہی کس بات کا ہو۔ ناواقف ان موانع کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ موانع حکمت کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ازالہ کے واسطے پیدا نہیں کیے گئے۔ ہاں امالہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً انسان کے اندر طاعات سے ایک بڑا مانع شہوت ہے مگر اس کی حکمت کو مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوتِ دنیا مثالِ گلخن است　　　　که ازو حمامِ تقویٰ روشن است

یعنی اسی شہوت سے تقویٰ کا حمام گرم ہوتا ہے۔ اس طرح دنیا کی شہوت اور رغبت سے داعیہ معصیت کا پیدا ہوا۔ ادھر عقل اور دین کی قوت سے اس کی مقاومت کی، بس مل کر درویشی ہو گئی۔ ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا تھا کہ فوج کسے کہتے ہیں۔ اس نے کہا تیرا میاں میرا میاں سب مل کر فوج ہو گئی مگر لوگوں نے درویشی کو کم فہمی کے سبب معیبت بنا دیا۔ مقاصد یعنی اعمال کو غیر مقاصد اور غیر مقاصد یعنی کیفیات طبعیہ مثلاً زوال داعیہ شہوت و غضب کو مقاصد سمجھ لیا۔ شریعت کی حقیقت اصلیہ یعنی رسوخ اعمال اگر حاصل ہو جائے بس یہی درویشی ہے اسی کی تدابیر کو طریقت کہتے ہیں۔

(الافاضات ج۳ ص۲۶۱ ملفوظ ۴۵۳)

حقیقتِ اسلام اسلام کا لفظ زبانوں پر اس درجہ شائع ہو گیا ہے کہ اب اس سے اس کا مصداق تو متبادر ہوتا ہے، مگر مفہوم کی طرف کسی کو التفات نہیں ہوتا۔ اگر لوگ اسلام کے لغوی معنی پر بھی نظر کر لیا کرتے تو اس حقیقت سے قریب ہو جاتے (جس کو میں اس وقت بیان کروں گا) اسلام کے معنی لغت میں سپرد کرنے کے ہیں جس کو تسلیم بھی کہتے ہیں جس کو صوفیہ نے تفویض سے تعبیر کیا ہے۔ یہی اسلام کی حقیقت ہے۔ قرآن میں کہیں اسلام کا ذکر مجملاً ہے کہیں مفصل ہے اور مفصل بمعنی تفویض ہی ہے۔

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

بلیٰ من اسلم وجہہ للّٰہ وھو محسن فلہٗ اجرہٗ عند ربہ۔	ضرور جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے

دوسری جگہ ہے:

ومن احسن دینا ممن اسلم وجہہ للّٰہ وھو محسن واتبع ملۃ ابراھیم حنیفا۔	اور ایسے شخص سے زیادہ اچھا دین کس کا ہوگا جو اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو اور ملتِ ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں۔

اور ایک جگہ ہے:

ومن یسلم وجهه الی اللہ و هو محسن فقد استمسك بالعروة الوثقی۔	اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکادے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا۔

یہاں اسلام وجہ کے ساتھ اتباع ملت ابراہیم کا بھی ذکر ہے اور اس کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

ومن یرغب عن ملة ابراهیم الا من سفه نفسه ولقد اصطفینٰه فی الدنیا وانه فی الآخرة لمن الصلحین اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العلمین	اور ملتِ ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں جبکہ ان سے انکے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی۔

جس سے معلوم ہوا کہ ملت ابراہیم بھی اسلام وجہ لرب العلمین ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کردے جس کو ایک مقام پر حضرت ابراہیم نے

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا۔	میں نے یکسو ہوکر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔

سے بیان فرمایا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اسلام کی تفسیر اسلامِ وجہ ہے جس کے پورے معنی نماز، روزہ کے نہیں ہیں بلکہ اسلام وجہ بمعنی تفویض ہے۔ یعنی اپنی ذات کو خدا کے سپرد کردینا اور اپنے کو ہر تصرفِ الٰہی کے لیے آمادہ کردینا کہ وہ جو چاہیں کریں، جو چاہیں حکم دیں سب منظور ہے۔ نماز روزہ بھی اس تفویض کا ایک فرد ہے لیکن عین نہیں۔

اگر قرآن میں اسلام کا استعمال اطلاق ہی کے ساتھ ہوتا اور اس کے ساتھ وجہ اللہ

یا وجہ الی اللہ مذکور نہ ہوتا تو یہ بھی احتمال تھا کہ اسلام بمعنی اطاعت ہے مگر ان قیود کے ساتھ اطاعت کے معنی نہیں بنتے بلکہ تفویض ہی کے معنی مستقیم ہوتے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ آیت بعض بعض کی مفسر ہوتی ہیں تو اب جہاں اسلام بلا قید مذکور ہے وہاں بھی مقید ہی مراد ہے بنصوص میں اسلام سے اسلام وجہ مراد ہے یعنی تفویض۔ یہی وہ چیز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات وفضائل ہیں۔ پس ان آیات میں:

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ	اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو ڈرنے کا حق ہو بجز
حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم	اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوط
مسلمون۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً	پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب
ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللہ	متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو
علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین	اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس اللہ
قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً	تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم آپس میں بھائی
وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار	بھائی ہوگئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔
فانقذکم منہا کذالک یبین اللہ	سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ
لکم ایٰتہ لعلکم تہتدون۔	تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کرکے بتلاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

اصل مقصود لا تموتن الا وانتم مسلمون (تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دینا) ہے اور اتقوا اللہ، واذکروا نعمۃ اللہ واعتصموا بحبل اللہ۔ یہ سب اسی کے لقب ہیں۔

(اب میں مقصود عرض کرتا ہوں) حق تعالیٰ فرماتے ہیں "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دینا"۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں اصل مقصود ایک ہی ہے۔ باقی سب اس کے عنوانات ہیں۔ یہاں حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اسلام یعنی تفویض پر مداومت

رکھو، کسی وقت اس کو ہاتھ سے مت دو۔ یہ وہ چیز ہے جو پریشانی کو لذیذ کر دیتی ہے۔
یہ مت سمجھنا کہ تفویض کے بعد پریشانیاں یا پریشان کن واقعات پیش نہ آئیں گے۔ ضرور
آئیں گے۔ مگر پہلے وہ ناگوار تھے۔ اب خوشگوار ہو جائیں گے۔ جیسے مرچ کھانے والے
کو مرچوں بھرا کباب خوشگوار و لذیذ ہوتا ہے کہ روتا بھی جاتا ہے اور کھاتا بھی جاتا ہے)۔
حق تعالیٰ کا یہ کلام محاورہ کے موافق ہے۔ محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ بے وفا بن کر
جان مت دینا اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر وفادار رہنا اور اسی پر جان نکل جانے۔ مگر اس
کو "لا تموتن الا وانتم مسلمون" کے عنوان سے اس لیئے ظاہر کیا گیا کہ تفویض پر
مداومت کوشش کرعشاق پر مصیبت آجاتی کہ حکم تو ہمہ وقت تفویض کا ہے اور ہم سے
اس میں کوتاہی ہوتی ہے۔ تو اس عنوان میں ان کی تسلی کر دی گئی کہ اگر موت کے وقت
بھی تفویض کامل ہو جائے تو کافی ہے۔

(عوام تو اس کو سن کر بے فکر ہو گئے ہوں گے کہ بس مرتے وقت تفویض کلی حاصل
کر لیں گے۔ ارے اس کے ساتھ یہ مقدمہ بھی تو ملاؤ) مرتے وقت تفویض کلی عادۃً اسی کو
حاصل ہوتی ہے جو زندگی بھر اس میں مشغول رہا ہو۔ ورنہ موت کا وقت تو سخت نازک ہے۔
وہ تحصیلِ نسبت اور طےّ مقامات و تکمیلِ تفویض کا وقت تھوڑا ہی ہے کہ اُسی وقت کام
شروع کرو اور اسی وقت حاصل بھی کر لو اور یُوں خلافِ عادت حق تعالیٰ جو چاہیں کریں۔
پس بے فکری بے معنی ہے۔ اور یہ شیطان نے راہ مار رکھی ہے کہ عمر بھر یہی پٹی پڑھاتا رہتا
ہے کہ ابھی زندگی بہت ہے۔ ذرا دنیا کے لطف اُٹھا لو۔ پھر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کر
لیں گے۔

غرض تفویض وہ چیز ہے کہ ہر کام میں اس کی ضرورت ہے خواہ دنیا کا ہو یا دین کا۔
صاحب تفویض تو ابتدا ہی سے تفویض کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے محض سنت و اطاعت
سمجھ کر کرتا ہے۔ اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور کامیاب ہی ہو بلکہ وہ کامیابی

کو اور ناکامی کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیابی ہوگئی تو اور ناکامی ہوگی تو وہ ہر حال میں خوش ہے اور جو شخص اس ارادہ سے تدبیر کرتا ہے کہ مجھے کامیابی ہی ہو اور جس طرح میں چاہتا ہوں۔ کام اسی طرح چلے۔ اس کی پریشانیوں کی کوئی حد نہیں رہتی۔ کیونکہ جہاں کوئی بات ناگوار طبع پیش آئے گی۔ اس کو اپنی ناکامی کا رنج ہوگا۔ تو بتاؤ تفویض سے زیادہ راحت کا آلہ دُنیا میں کیا ہوگا۔ حضرت تلاش کرتے کرتے تھک جائیے گا اس سے بڑھ کر راحت کا آلہ کوئی نہ ملے گا۔

مگر راحت کی نیّت سے تفویض کرنا دین نہیں بلکہ دنیا ہے۔ حقیقی تفویض وہ ہے، جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا بلکہ محض رضائے حق کا قصد ہو۔ اگرچہ تفویض بقصد راحت سے بھی راحت حاصل ہوگی مگر یہ نفع قابلِ اعتبار نہیں۔ تفویضِ معتبر یہی ہے جس سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور کچھ مقصود نہ ہو چنانچہ شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری نے کسی کی حکایت لکھی ہے کہ میں ایک بزرگ سے ملنے گیا تو وہ یہ دُعا کر رہے تھے کہ اے اللہ میں لذّتِ تفویض سے پناہ مانگتا ہوں۔

واقعی تفویض میں بڑی لذّت ہے مگر اہل اللہ اس سے پناہ مانگتے ہیں کہ مبادا ہم لذّت کی وجہ سے تفویض کر رہے ہوں۔ لیکن یہ ان بزرگ کا حال تھا۔ تم یہ دُعا بھی نہ کرو۔ کیونکہ لوگ بدون لذّت کے تفویض نہیں کر سکتے۔ بس تم نہ لذّت کا قصد کرو نہ اس کی نفی کی دُعا کرو بلکہ یہ مذاق رکھو۔ ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

اب اگر لذّت عطا ہو جائے تو یہ نعمتِ حق ہے اس سے گھبراتے کیوں ہو۔ اس سے پناہ نہ مانگو، نہ اس کے دفع کی دُعا کرو اور لذّت حاصل نہ ہو جب بھی راضی رہو، اصحابِ مقام یوں فرماتے ہیں کہ اگر وہ چپت ماریں کھا لو اور پیار کریں تو پیار کرا لو۔ اس کی لذّت حاصل ہو تو اس کو نعمت سمجھو۔

لیکن یاد رکھو تفویض کے معنی ترک تدبیر نہیں بلکہ تفویض کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے۔ تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کرے۔ تدبیر بھی اسی کا حکم ہے جس کے لیے تم تفویض کر رہے ہو۔ اپنی طرف سے نہ بلا تجویز کرو نہ راحت بلکہ جو وہ تجویز کر دیں اس پر راضی رہو۔ حضرت یہ نسخہ اکسیر ہیں نے ایسا تبلا دیا جس سے نہ اہلِ دُنیا کو استغنا ہے نہ اہلِ دین کو، نہ علماء کو استغنا ہے نہ عرفا کو بلکہ تمام عالم اس کا محتاج ہے۔

بس تفویض کر کے دیکھئے انشاء اللہ سب شدائد کا تحمل آسان ہو جائے گا اور نہ بھی آسان ہو تو تفویض کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اسی کو حافظ فرماتے ہیں ؎

باغباں گر چند روزے صحبتِ گُل بایدش
بر جفائے خارِ ہجراں صبر بلبل بایدش

اگر کبھی وصال کے بعد فراق ہو جائے تو صبر سے کام لو، تفویض کرو۔ اگر تجلی جمال کے بعد تجلی قہر و جلال ہو تو اس وقت بھی تفویض سے ہی کام لو؛

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ مجھے چین کیونکر ہو۔ اسرافیل صور منہ میں لیے ہے اور کان جھکائے حکم کا منتظر ہے کہ ذرا حکم ہو تو عالم کو درہم برہم کر دوں۔ صحابہ اس کو سُن کر لرز گئے، گھبرا گئے۔ حضورؐ نے فرمایا قولوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل یعنی گھبراؤ نہیں بلکہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہو۔ یعنی تفویض کرو، خدا پر نظر رکھو۔ ارے جب سارے راستے ان کے ہی قبضے میں ہیں اور تم کہیں سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے تو اب بجز تفویض کے چارہ ہی کیا ہے ؎

اے حریفاں راہ ہا را بست یار
آہوئے لنگیم و اُو شیر شکار

واللہ سارے راستے بند ہیں کہیں ان کے قبضہ سے باہر نہیں جا سکتے بس ہماری ایسی مثال ہے جیسا لنگڑا ہرن۔

غیر تسلیم و رضا کو چارہ   در کف شیر نر خونخوارہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہی علاج تبلایا ہے۔ قولوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل جس پر مدہ ہے ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکلِّ شیئٍ قدراً

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال   مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

تمہاری مثال ایسی ہے جیسے مرغ جال میں پھنسا ہوا ہو۔ اس کو تحمل بھی چاہیے کہ صبر وسکون کے ساتھ پابزنجیر ہو جاوے ورنہ جتنا پھڑ پھڑائے گا اور زیادہ پھنسے گا۔

پس ہمیشہ کے لیے یہی دستور العمل بنالو کہ شریعت نے جس تدبیر کی اجازت دی ہے خواہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے وہ اختیار کر کے نتیجہ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ بس اس سے نجات ہوگی۔

اب میں تمام دُنیا سے کہتا ہوں کہ کوئی اس سے بہتر نسخہ لائے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں انشاء اللہ قیامت آجائے گی اور اس سے بہتر نسخہ کوئی نہ لا سکے گا۔ اسی کو حق تعالیٰ دس جگہ بیان فرماتے ہیں: ولا تموتنّ الا وانتم مسلمون۔

(الدوام علی الاسلام ص ۴۲ تا ۴۷)

اسلام کامل اسلام کامل یہ ہے کہ ہر حال میں آدمی حق تعالیٰ کا منقاد و مطیع رہے۔ اغراض سے قطع نظر کر کے اتباع اختیار کرے۔ نہ مال کی پروا کرے نہ جاہ کی نہ حکومت کی۔ حق تعالیٰ یہ حالت نصیب کریں کہ حقیقت سمجھ میں آجائے اور ہر وقت یہ امر منکشف ہوتا رہے کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہ رب العلمین ہیں۔ ہمارے بدخواہ نہیں ہیں۔ جو کچھ امر تکوینی کرتے ہیں یا تشریعی، وہ سب ہمارے لیے خیر ہی خیر ہے۔ (الاسلام الحقیقی ص ۱۰۱-۳)

جو شخص کسی صفت سے متصف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تین حال سے خالی نہیں ایک

تو یہ کہ وہ صفت اس میں بالکل نہ ہو، اس صورت میں تو یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ صفت اس میں ہو تو سہی لیکن کامل نہ ہو، اس صورت میں وہ دعوے تو صحیح ہو گیا مگر صرف لغت کے اعتبار سے صحیح ہو گا، عرفاً صحیح نہ ہو گا۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ صفت اس میں علیٰ وجہ الکمال موجود ہو تو اس صورت میں اس کا دعویٰ لغۃً اور عرفاً دونوں طرح صحیح ہو گا۔

اسلام صفت مطلوب ہے اور کوئی صفت درجۂ نقصان میں مقصود نہیں ہوتی چنانچہ کوئی شخص جو متموّل بننا چاہے وہ ایک پیسہ حاصل کر کے بیٹھ نہیں سکتا اور اس طرح منطقی مقدمات سے اپنے دل کو نہیں سمجھا سکتا کہ متموّل کہتے ہیں مال دار کو اور مال دار کے معنی ہیں مال رکھنے والا، اور پیسہ مال ہے تو ہم مال دار اور متموّل ہو گئے۔ نہیں۔ بلکہ متموّل بننے کے معنی ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس صفت کو علیٰ وجہ الکمال حاصل کیا جائے اور درجۂ نقصان میں کوئی اس صفت کو مقصود نہیں سمجھتا۔ بنابریں جب صفتِ اسلام مطلوب ہے تو اس کے ساتھ اس کا کمال بھی مطلوب ہو گا۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: یٰایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ یعنی اسلام میں پورے پورے داخل ہوں۔ صاف حکم موجود ہے کہ صفت اسلام کو علیٰ وجہ الکمال حاصل کرنا چاہئے۔ حالانکہ اگر یہ امر صریح بھی موجود نہ ہوتا تو اس قاعدہ کے موافق — کہ کسی صفت کا اطلاق جب ہوتا ہے تو درجۂ کمال ہی میں ہوتا ہے۔ اسلامِ کامل ہی مطلوب ہوتا ہے چہ جائیکہ امر صریح بھی موجود ہے تو اب کیا کلام ہو سکتا ہے اس بات میں کہ اسلام کامل ہی مطلوب و مقصود ہے۔

دعویٰ اسلام کے صحیح ہونے کے لیے ضرورت ہے۔ کمالِ اسلام کی اور اس کے لیے ضرورت ہے اس علم کی کہ اسلام کامل کیا چیز ہے تاکہ اس کو سمجھ کر حاصل کیا جائے۔ اسی کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے: قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای و

مماتی للہ رب العلمین۔ لاشریک لہ وبذالک أمرت وانا اوّل المسلمین

یعنی آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہُوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں پہلا ہوں۔

یہ لفظ مسلمین کا دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اسلام ہی کی شرح کی گئی ہے کیونکہ اس کے اجزا کو بیان کرنے کے بعد اس کی تعمیل کرنے والوں کا لقب مسلمین فرمایا گیا ہے۔

یہاں اسلام کامل کی حقیقت چار چیزوں میں بتلائی گئی ہے کہ نماز اور عبادت اور موت وحیات" کو اللہ ہی کے لیے خالص کر دو۔ اس کے معنی صرف یہ نہیں کہ ان چاروں کو صرف عقیدہ کے مرتبہ میں اللہ کی سمجھتے رہو کیونکہ اس سے تو کوئی ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی خالی نہیں۔ ہر مسلمان ہر چیز اعتقاداً اللہ ہی کی سمجھتا ہے تو پھر کامل اور ناقص میں فرق ہی کیا ہُوا۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان چار چیزوں کو اعتقاداً اللہ کی سمجھ کر حالاً بھی ان کو ان کے ہی سپرد اور تابع کر دو۔ جب اپنے کو اللہ ہی کی ملک سمجھا تو اُن کو اعتقاداً بھی تصرف کا مستحق سمجھو اور حالاً بھی منقاد ہو جاؤ۔ یعنی دل سے عقیدہ یہ رکھو کہ یہ سب چیزیں خدا کی ہیں اور حالاً بھی ان کے تصرّف کو تسلیم کر کے بالکل منقاد و مطیع اور فرمانبردار بن جاؤ کہ ان چاروں میں جس طرف چلائیں اسی طرف کو چلو۔

حاصل یہ ہُوا کہ حق تعالیٰ جو تصرّف بندہ کی نماز میں، عبادت میں، حیات میں موت میں کریں اس کا اعتقاداً و حالاً منقاد و فرمانبردار ہونا اسلام کامل ہے جس میں نماز و عبادت "حالات اختیاریہ" ہیں اور "حیات و موت" "حالات غیر اختیاریہ"۔ بالفاظ دیگر ہمارے تمام حالات خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری سب حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اور ان کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے "تصرّف" حق تعالیٰ کا فعل ہے اور اس کو ماننے کا حق ادا کرنا جس کا نام "انقیاد" ہے۔ یہ فعل بندہ کا ہے۔ یہ انقیاد دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک اضطراری اور ایک اختیاری۔

اضطراری تو یہ کہ جتنے کام دنیا میں ہو رہے ہیں ان سب میں ہم مجبور ہیں۔ جیسا حق تعالیٰ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے۔ موت و حیات، صحت و مرض کوئی چیز ہمارے اختیار میں نہیں اور نہ وہ اسباب جو ان میں مؤثر ہیں ہمارے اختیار میں ہیں۔ ان سب میں ہم کو انقیاد زبردستی کرنا پڑتا ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے، ہمارے ارادہ کے موافق کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کوئی واقعہ تکوینی انسان کے قبضہ میں نہیں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم حالتِ تشریعی میں آزادی چاہتے ہو تو تکوینی میں بھی کر کے دکھاؤ لیکن وہاں آزادی نہیں چلتی تو امور شرعیہ میں کیوں آزادی کا دم بھرتے ہو؟ ہمارے اختیار دینے پر مست بھولو۔ ہم نے تم کو فی الجملہ اختیار امتحان کے لیے دیا ہے کہ دیکھیں کون ہمارا حکم اپنے قصد سے بے چون وچرا مانتا ہے اور کون اس میں تاویلیں کرتا ہے۔ اختیار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم کو ہمارا حکم بدل دینے کا بھی اختیار ہے، تم اس درجہ کے فاعل مختار نہیں ہو۔ اس کے ثبوت کے لیے اپنے اختیار کو اس حالت میں دیکھو جس میں ہم بالجبر حکومت کرتے ہیں۔ اس میں غور کر کے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم بالکل بے بس ہو۔ ذرہ برابر تم کو اپنے اُمور میں اختیار نہیں۔

مسلمانوں کی دو قسمیں

مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دنیادار، دوسرے دیندار۔ اور دنیادار سے میری مراد وہ ہیں جو عقائد کے اعتبار سے دنیادار ہیں اور دیندار سے مراد بھی وہ ہیں جو عقائد کے اعتبار سے دیندار ہیں گو عمل سے دنیادار ہوں۔ پہلے زمانہ میں جب تک نیچریت کا ظہور نہ ہوا تھا ہندوستان میں عقائد کے اعتبار سے مسلمانوں کی یہ دو قسمیں نہ تھیں بلکہ اس وقت عقائد کے اعتبار سے سب دیندار تھے، صرف اعمال کے اعتبار سے دینداری اور دنیاداری کا فرق ہوتا تھا۔ ہماری قسمت کہ ہم ایسے زمانہ میں ہیں جس میں عقائد کے اعتبار سے مسلمانوں کی دو جماعتیں ہو گئیں۔

۱۔ ایک وہ جن کو عقائد اسلامیہ میں شبہہ ہے۔

۲ - ایک وہ جن کو عقائد میں کچھ کلام نہیں۔

اس لیے آج بعضے وہ فاسق غنیمت معلوم ہوتے ہیں جن کو عقائد میں کلام نہ ہو بلکہ عقائدِ اسلامیہ پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور بحمد للہ ابھی تک کثرت اسی جماعت کی ہے جس کے عقائد درست ہیں اور اس میں کچھ شبہہ نہیں کرتے۔

وعظ: الفاظ القرآن

۲۳ شعبان المعظم ۱۳۴۴ھ

مسلمان کے لیے خوشی کی بات

مسلمانوں کے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ دنیا کے کسی نقصان سے بھی ان کا حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ حقیقی نقصان صرف کافر کو ہوتا ہے مسلمان کے لیے ہر وقت خوشی اور مسرت ہی ہے۔ راحت میں بھی (کہ شکر ادا کر کے ثواب بھی حاصل کرے) اور مصیبت میں بھی (کہ صبر کرے اور ثواب لے) مسلمان کی مراد حاصل ہو جائے تب تو خوشی ہی ہے اگر نامراد رہے تب بھی خوشی ہے ؎

گر مرادت را مذاق شکر است

بے مرادی بے مراد دلبر است

اگر مراد میں مزا ہے تو بے مرادی میں ثواب ہے کیونکہ وہ حضرتِ حق کی مراد کے موافق ہے عشاق کے لیے تو یہی بات خوش ہونے کو کافی ہے کہ محبوب کی رضا اسی میں ہے۔ بس یہ سوچ کر بڑی سے بڑی مصیبت بھی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اب کوئی مصیبت ایسی نہیں جس سے خدا کے ہوتے ہوئے مسلمان پریشان ہو۔ ہاں دین میں کمی ہو تو قلق ہونا چاہیے کیونکہ اس کا عوض کچھ نہیں۔ (مظاہر الآمال ص ۲۹-۳۰)

اسلامی قوت کا مدار

اسلام کی قوت کا مدار حق پر ہے نہ کہ کسی مخلوق پر۔ اسلام کی قوت خارج سے نہیں داخل سے ہے۔ حق میں وہ قوت ہے کہ اگر ایک شخص حق پر ہو اور سارا عالم اس کا مخالف ہو تو وہ شخص ضعیف نہیں اور اگر یہ شخص

حق پر نہیں اور سارا عالم اس کا معتقد ہو وہ شخص ضعیف ہے۔ اس میں کچھ بھی قوت نہیں
(الافاضات ع۳ ص۱۲) تعجب ہے کہ لوگ سب چیزوں کی خاصیتوں کے قائل ہیں مگر
حق کی خاصیت کے قائل نہیں عجیب عقلیں ہیں۔ (الافاضات ع۶ ص۱۵)
دین میں دُنیوی مصالح سے متاثر ہونا سب کمزوری کی باتیں ہیں۔ بڑی چیز دین ہے
یہ محفوظ رہے خواہ تمام مصالح بلکہ سارا عالم فنا ہو جائے کچھ پروا نہیں۔
(الافاضات ع۷ ص۱۹۳ ملفوظ ع۵۲۹)

طریقِ حق پر رہ کر موت آجانا بڑی نعمت ہے۔ (دنیا و آخرت ص۲۹۵)

دُوسرا مذہب اختیار کرنے کی وجہ

فرمایا کہ جو لوگ مذہب اسلام کو چھوڑ کر دوسرے مذاہب اختیار کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو مذہب اسلام میں شبہات پیدا ہوتے ہوں بلکہ زیادہ تر دنیا کے لالچ سے ہوتے ہیں اور واقع میں کسی کو کوئی شبہہ ہُوا اور اس لیے اس نے اسلام کو ترک کیا تو نہایت ہی حماقت کی کیونکہ مذہب اسلام میں اگر ایک شبہہ ہے کہ جو یقیناً غیر ناشی عن دلیل ہے تو دوسرے مذاہب میں تو پچاس شبہے ہیں جو ناشی عن دلیل موجود ہیں پس ایک وہمی شبہہ کی بدولت اسلام جیسے پاک مذہب کو چھوڑ کر دُوسرے یقینی شبہات میں پڑنا کون سی عقل کی بات ہے۔
(ملفوظ ع۳۔ دعوات عبدیت حصۂ چہارم پنجم)

اسلام اخلاق سے پھیلا ہے تلوار سے نہیں

اس اعتراض کا ذکر تھا کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے خوب لطیف جواب دیا تھا کہ اگر مان بھی لیا جاوے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا تو ہم یہ پوچھتے ہیں کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک دو شمشیر زن تو بزورِ شمشیر اسلام کو عالم بھر میں پھیلا نہیں سکتے تھے۔ تو پس معلوم ہُوا کہ شمشیر زنی اصل علت اسلام کی نہیں بلکہ اصل علت اور ہی ہے جس سے شمشیر زن پیدا

ہوئے۔ وہ حقیقت میں تو تائید حق ہے اور ظاہری سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں۔ اسلام پھیلا ہے اخلاق سے تلوار سے نہیں پھیلا۔

(حسن العزیز ج۱ ص۲۸۲ ۔ ملفوظ ۴۶۲)

عقائد کا عملی پہلو

عقیدوں کی عملی غایت

عقیدۂ تقدیر کو اصلاحِ اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن وبطر رفع ہوجاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر وبطر جڑ ہے تعطل باطن کی یعنی غمگین اور پریشان آدمی ظاہر میں تمام دین ودنیا کے کاموں سے معطل ہوجاتا ہے اور متکبر آدمی کا دل خدا کے تعلق سے معطل ہوجاتا ہے جب تک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کا لگاؤ نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح عقیدۂ توحید سے مخلوق کا خوف وطمع زائل ہوجاتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخل ہے۔ پس عقائد جس طرح مقصود بالذات ہیں اسی طرح مقصود للاعمال بھی ہیں۔

(انفاسِ عیسیٰ ص۳۴۹)

توحید کی عملی غایت

علوم وہی مقصود ہیں جن کی کوئی غایت عملی بھی ہو۔ چنانچہ توحید کی غایت میں خداوند تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے قل ھواللہ احد اللہ الصمد۔ اس سورۃ میں خدا کی ذات وصفات بیان کی گئی ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ جس وقت خدا کو ایسا سمجھو گے غیرِ خدا پر طمعاً وخوفاً نظر نہ ہوگی جس طرح حاکم کا مقرب رعایا سے نہیں ڈرتا اسی طرح توحید پرست غیرِ خدا سے نہیں ڈرے گا۔ اگر غور کیا جائے تو تمام مسائلِ اعتقادیہ میں علاوہ غایتِ نجات کے اور بھی بہت سی عملی غایات نکلیں گی۔

(تذکیر الآخرہ ص۱۵)

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان لو کہ اگر سب کے سب متفق ہوجائیں

اس پر کہ تم کو کچھ نفع پہنچائیں ہرگز نفع نہ پہنچائیں گے مگر اسی چیز کا جو اللہ نے لکھ دی ہے اور اگر سب کے سب متفق ہو جائیں کہ تم کو ضرر پہنچائیں گے۔ ہرگز ضرر نہ پہنچائیں گے مگر اسی چیز کا جو اللہ نے لکھ دی ہے۔ (تعلیم الدین ص ۶۷)

مولانا گنگوہیؒ کی ایک نصیحت

مولانا گنگوہیؒ نے ایک بار فرمایا کہ بھائی کسی سے توقع مت رکھو۔ پھر خدام سے فرمایا کہ بتلاؤ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مربی ہیں محسن ہیں، حضرت کا ہم پر وہ احسان ہے جس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ میں تم کو دل سے کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی کوئی توقع نہ رکھو۔ بس خدا سے اُمید رکھو اور کسی سے مت رکھو۔ تو ایسا شخص جس کی رگ رگ میں توحید بسی ہوئی ہو اس کو کسی سے کیا رنج ہو سکتا ہے۔ (المراقبہ)

عمل میں کوتاہی کا سبب

ہم لوگوں نے عقائد کو محض علم و دانستن کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اعمال میں ان سے کام نہیں لیتے۔ اسی لئے کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ ان سے عمل میں کام لو تو کیفیت حاصل ہو۔ پھر اس کیفیت میں رسوخ پیدا ہو کر ایسا ذوق میسر ہو کہ پھر کبھی عمل نہ چھوٹے اور نہ کبھی سیری ہو۔ (دنیا و آخرت ص ـــ)

اعتقاد کی حقیقت

ایک سلسلہ گفتگو میں کسی خاص معاملہ کی نسبت فرمایا کہ اس کو اعتقاد ہی نہیں کہتے۔ اعتقاد تو اس کو کہتے ہیں جو جازم ہوتا ہے ٹل نہیں سکتا ہٹ نہیں سکتا جیسے کوئی کسی پر عاشق ہو جائے تو اس کو کوئی بات بھی نہیں ہٹا سکتی۔ یہ ہے حقیقت اعتقاد کی۔ (ملفوظات ج ۲ ص ۱۴۸)

خواص اعمال کا عقیدہ

اگر آپ کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ یہ اعمالِ صالحہ یقیناً کار آمد ہیں تو پھر ان سے یقیناً غفلت نہ ہو گی۔ اور اسی طرح اعمالِ معصیت میں اس کا یقین ہو جائے کہ وہ یقیناً مضر ہیں تو ان سے ضرور بچو گے۔ پس اعمال کے نافع و ضار ہونے کا اعتقاد دل میں جما لو۔ (دواء الغفلۃ ص ـــ)

حدیث میں ہے کہ اے عائشہ کسی نیک عمل کو حقیر نہ سمجھنا۔ ہر نیک عمل میں خاصیت مغفرت کی ہے۔ اسی طرح ہر گناہ میں خاصیت عذاب کی ہے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔

(حسن العزیز م۱ ص۶۴۲)

عقائد علم و عمل دونوں کے لیے ہیں

عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہیں اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں۔ مثلاً مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کر لینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے۔ ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر پریشان نہ ہو، اسی طرح نعمتوں پر بطر و تکبر نہ ہو۔ ان کو اپنا کمال نہ سمجھے۔

(کمالات اشرفیہ ص۱۸)

عمل کے بغیر یقین کامل حاصل نہیں ہوتا

یقین مطلوب اور یقین کامل بدون عمل کے حاصل نہیں ہوتا اور نہ اس کے ثمرات مطلوبہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ یقین و اعتقاد کا ثمرۂ مطلوبہ، نجات مطلقہ بدون تعذیب ہے۔ اور یہ اعتقاد بلا عمل کے حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی غالب الوقوع یہی ہے کہ بدون عمل نجات کامل نہیں ہوتی۔ گو کسی فرد میں تخلف ہو جائے۔

(دواء الغفلۃ)

حضرت حاجی صاحبؒ کا ایک قول

حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا۔ کہ اگر میں عند اللہ مومن ہوں اور ساری دنیا مجھ کو مردود سمجھے میرا کچھ ضرر نہیں۔ اور اگر عند اللہ مردود ہوں اور ساری دنیا قطب غوث اور ابدال سمجھے تو کچھ نفع نہیں۔

(الافاضات ج۲ ص۱۳)

موحد کا اطمینان

موحد کو ایسا اطمینان ہوتا ہے جیسا کہ بچہ کو ماں کی گود میں اطمینان ہوتا ہے۔ بچہ ماں کی گود میں جا کر بالکل بے فکر ہو جاتا ہے کہ بس اب کسی کا خوف نہیں۔

(انفاس عیسیٰ ص۲۹)

عظمتِ الٰہی کا اخلاق پر اثر

حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آ جائے تو کسی کی زبان سے اپنی نسبت تعظیمی الفاظ سننے سے شرم آنے لگے جیسا کہ سررشتہ دار کو کلکٹر کے سامنے اپنی تعظیم ہونے سے شرم آتی ہے۔ ہمارے اندر تکبر اسی وقت تک ہے جب تک کہ خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں نہیں آتی اور اگر عظمت حق دل میں آ جائے تو پھر یہ حال ہو گا ۔

چو سلطانِ عزت علم برکشد   جہاں سر بجیب عدم درکشد

پھر یہ سارے دعوے نیست و نابود ہو جائیں گے۔ (العبد الربانی ص۲۳)

زبردست قوت کی چیز

فرمایا کہ یہ اعتقاد میری زندگی ہے کہ جہاں کوئی تکلیف پہنچی فوراً بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں ثواب ہے۔ اس سے وہ کلفت جاتی رہتی ہے۔ یہ امید ثواب ایسی قوت کی چیز ہے کہ بڑی سے بڑی کلفت اور رنج کو سہل کر دیتی ہے ــ اور افسوس ہے کہ اس کو آجکل معمولی خیال کر رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں۔ نعوذ باللہ، استغفر اللہ۔ میں کہتا ہوں کہ جس قدر مسلمانوں کے پاس سامان قوت کا ہے ان سب میں یہ ایک نہایت زبردست چیز ہے۔ نئے تعلیم یافتہ اس پر ہنستے ہیں کہ ثواب کو لئے بیٹھے ہیں، پرانے خیال کے ہیں بلکہ علما تک نے بھی اس کی ترغیب چھوڑ دی۔ وعظوں میں ثواب و عذاب کا ذکر ہی جاتا رہا۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں زیادہ یہی بھرا ہوا ہے کہ اگر یہ کرو گے ثواب ملے گا، نہ کرو گے عذاب ہو گا۔ مسلمان کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ یہ خیال پھیلایا ہے آجکل کے نیچریوں نے۔ نہایت ہی بدعقیدہ لوگ ہیں۔

(۳۰ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ)

عقائد سے کام نہ لینے پر ایک مثال اور اعمال کے خواص،

جس اعتقاد سے کام نہ لیا جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک زنانہ شہزادہ کی حکایت ہے کہ وہ بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً سانپ نکل آیا تو وہ کہنے لگا ارے بلا نا

کسی مردوئے کو۔ کسی نے کہا حضور بھی تو ماشاء اللہ مرد ہیں۔ کہا ارے ہاں! خوب یاد دلایا، بچا لاٹھی لاؤ۔ پھر یہ معلوم سانپ مارا یا نہیں۔ تو ظاہر ہے اس کو اپنے مرد ہونے کا اعتقاد ضرور تھا مگر ایسے اعتقاد سے کیا نفع جو وقت پر یاد نہ آئے حتیٰ کہ دوسروں کو یاد دلانے کی ضرورت پڑے۔ گو اعتقاد کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ذہول کے بعد بالکل بے کار ہے۔ کیونکہ اہلِ سنت کا عقیدہ ہے کہ ایسا اعتقاد بھی اخیر میں کام آجائے گا۔ پٹ کٹ کر اس عقیدہ ہی کی بدولت کسی وقت جنت میں پہنچ جائیں گے۔ جس کی دلیل یہ آیت ہے:

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔

جب ذرہ بھر نیکی بھی ضائع نہیں تو ضعیف اعتقاد اور ضعیف ایمان کی جزا بھی ضرور ملنا چاہئے اور اس کی یہی صورت ہے کہ کسی وقت یہ لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں۔ تو ہرچند کہ یہ اعتقاد بھی ایک درجہ میں نافع ہے مگر جب وقت پر پوری طرح کام نہ آیا اور مرتے ہی جنت میں جانا نصیب نہ ہوا تو یہ اعتقاد نافع کامل نہ ہوا۔

(دنیا و آخرت ص۲۵۸)

خاصیت عمل حدیث میں ہے کہ اے عائشہؓ کسی نیک عمل کو حقیر نہ سمجھنا۔ ہر نیک عمل میں خاصیت مغفرت کی ہے۔ اسی طرح ہر گناہ میں خاصیت عذاب کی ہے۔ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ (حسن العزیز ج۱ ملفوظ ۶۴۲)

زہد کے مدارج زہد فی الدنیا کا ایک تو علم کا درجہ ہے کہ اعتقاد درست ہو جائے اور یہ جان لے کہ ہم کو ایک دن مرنا ہے اور قیامت بھی آنے والی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو دنیا کا فانی ہونا معلوم ہے مگر عمل اور برتاؤ ایسا ہے جیسا باقی رہنے والی شئے کے ساتھ ہوا کرتا ہے تو ان کا یہ اعتقاد کافی نہیں بلکہ کالعدم ہے۔

دوسرا درجہ عمل کا ہے کہ دنیا کے متعلق اعتقادِ فنا رکھ کر عمل بھی اس کے ساتھ وہی ہے جو فانی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

ایک حال کا درجہ ہے کہ فنائے دُنیا کا قلب سے مشاہدہ ہو جائے اور دل میں تعلقاتِ دُنیا سے نفرت پیدا ہو جائے۔

پھر یہ حال راسخ ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے تعلقاتِ دنیا سے قلب کو الجھن ہونے لگے۔ یہ مقام کا درجہ ہے۔ یہ ہے مطلوب اور منتہیٰ۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دُنیا سے ایسا برتاؤ کرو جیسا مسافر کیا کرتا ہے۔ وہ سفر میں محض ضروریات پر اکتفا کیا کرتا ہے۔ فضول اسباب ساتھ نہیں لیا کرتا۔ ایسے ہی تم دُنیا کے ساتھ عمل کرو کہ قدرِ ضرورت پر اکتفا کرو۔ زائد از ضرورت سامان کی فکر میں نہ پڑو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک تعلقاتِ دنیا کی تعلیم نہیں فرمائی بلکہ ان میں اختصار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ پس نہ ترک تعلقات کی تعلیم ہے نہ انہماک فی الدنیا کی۔

اپنی تجویز ختم کر کے راضی بقضا رہنا

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا:

ان ربکم اللہ الذی ..... الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العٰلمین ...... المحسنین

حق تعالیٰ کے تصرف و اختیار کا اقرار و استحضار رکھنا چاہیے اور ہر تصرفِ حق کے ساتھ راضی رہنا چاہیے۔ الا لہ الخلق والامر میں اسی کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خالق و حاکم با اختیار ہونے کا اعتقاد رکھنا چاہیے جس کا مقتضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو تصرف بھی ہو اس کے ساتھ رضا متعلق رہے۔ اگر یہ مقتضا ظاہر نہ ہوگا تو عدمِ اعتقاد یا ضعفِ اعتقاد کی علامت ہے۔

تجویز تمام پریشانیوں کی جڑ ہے۔ یہ تجویز کرنے والا گویا اس ذاتِ مقدس پر حکومت کرنا چاہتا ہے جو اس کے قبضہ میں نہیں بلکہ یہ تجویز کنندہ خود اس کے قبضہ میں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے اپنے تصرف و اختیار کو قرآن میں صاف صاف بیان کر کے انسان کے

اختیار کی صاف صاف نفی کر دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی۔ فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ الخ

میں صراحۃً اختیارِ عبد کی نفی ہے۔ مگر یہاں اس اختیار کی نفی نہیں جو جبر کے مقابل ہے کیونکہ اس کے تو اختیار کا امر ہے بلکہ اس اختیار کی نفی ہے جس کے استعمال کی اجازت نہیں۔ جس کا عنوانِ ثانی تجویز و رائے ہے۔ مثلاً بیمار کے متعلق یہ تجویز کرنا کہ جلد اچھا ہی ہو جائے پھر اس کے ظہور و وقوع کا انتظار کرنا کہ کب اچھا ہو گا۔ پھر تاخیر صحت سے پریشانی کلفت کا بڑھنا اس کی تو ممانعت ہے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی میں اسی تجویز کی جڑ کاٹی گئی ہے کہ دنیا و آخرت کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ تم کو اس میں تجویز کا کوئی حق نہیں اور تجویز کی علامت یہ ہے کہ اس کے وقوع کا تقاضہ کے ساتھ انتظار کیا جائے یعنی ایسا انتظار جس کی جانبِ مخالف کا تصور ناگوار ہو اور اس سے رجا کی نفی نہیں ہوتی۔ مثلاً بچہ کی عدم صحت سے ناراض ہو اس پر اعتراض کرے یہ مذموم ہے۔ اور اگر صحت اور عدم صحت دونوں پر راضی ہو اور یہ سمجھے کہ جو کچھ حق تعالیٰ کریں گے وہ عین حکمت ہے مگر دل یہ چاہتا ہے کہ اس کو صحت ہو جائے اور عدم صحت کے تصور یا وقوع سے رنج ہوتا ہے تو یہ حزن ہے اور حزن مذموم نہیں حزن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا ہے مگر اس کے ساتھ رضا بھی ہوتی ہے حزن میں پریشانی اور ناراضی نہیں ہوتی بلکہ رضا موجود ہوتی ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ ڈاکٹر نے کسی شخص کا آپریشن بدون کلوروفارم سنگھائے کیا ہو تو یہ شخص نشتر لگنے سے روئے گا بھی چلائے گا بھی، ناک منہ بھی چڑھائے گا۔ مگر دل میں اندر سے نہایت خوش ہو گا چنانچہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے لہٰذا کراہت ظاہر کے ساتھ رضا مجتمع ہو سکتی ہے۔ میں کراہت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کراہت کی نفی کرتا ہوں جس کے ساتھ رضا مجتمع نہ ہو کہ دل میں بھی ناگواری ہو اور ظاہر میں بھی ناگواری ہو۔ یہاں تک

کہ اگر اس پر نسبت فعل الی اللہ منکشف ہو جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے بھی شکایت و عداوت ہونے لگے۔ اسی لیے ہمارے حاجی صاحب نے اس زمانہ میں مراقبہ توحید اصطلاحی سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کے لیے محبت کاملہ کی ضرورت ہے جس سے محبوب کا ہر تصرف محبوب ہو جائے خواہ وہ تصرف ملائم طبع ہو یا ناملائم طبع۔ کیونکہ محبت کی یہ شان ہے کہ

از محبت تلخ ہا شیریں شود

تشریعی و تکوینی دونوں احکام کی طرف توجہ کرنی ہے

جس طرح احکام شرعیہ احکام حق تعالیٰ ہیں اسی طرح احکام تکوینی بھی ہیں۔ مگر ان کی طرف لوگوں کو توجہ کم ہے۔ حکم تشریعی حکم تکوینی دونوں بامر الٰہی ہیں۔ پھر ایک کی طرف توجہ کرنا، دوسرے کی طرف التفات نہ کرنا کس قدر غفلت کی بات ہے مصیبت کا پہنچنا، راحت کا ہونا یہ سب بھی تو بامر الٰہی ہے۔ ان کا مراقبہ کرنا چاہیے۔ البتہ احکام کے اسرار و حکم معلوم ہونا مشکل ہے ان میں فکر نہ کرے کہ

ع کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

ایک مجمل حکمت واقعات عالم میں یہ ہے کہ باغ میں ہر قسم کی چیز ہونی چاہیے جہاں پھل اور پھول ہے وہاں گھاس اور کانٹے ہیں، کوئی درخت خشک ہے، کوئی تر۔ اس عالم میں یہ ساری باتیں موجود ہیں۔ سبحان اللہ۔ (دعوات ج۲ ص۲۴۲)

نحوست کا عقیدہ اختراع فی الدین ہے

بعض عورتیں اُلّو کو منحوس سمجھتی ہیں۔ جہاں اُلّو بولتا ہے تو عورتوں کے دل میں خوف بیٹھ جاتا ہے اور اسی وقت اس کو مارتی ہیں کہ یہ کہاں ویران کرنے آیا۔ یہ خیال فاسد کچھ ایسا عام ہوا ہے کہ مردوں تک پر اثر کر گیا۔ اگرچہ مردوں میں ایسا راسخ نہ ہو جیسا عورتوں میں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر اس کے بولنے کے بعد اس جگہ کوئی موت ہو جائے یا اور کوئی آفت آجائے تو مردوں کے دل میں بھی یہ خیال گزر جاتا ہے کہ شاید اسی کا اثر ہوا اور جب عورتیں

ان کو اڑاتی ہیں تو اس خیال کو عملی صورت تک میں لے آتے ہیں اور اس جگہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ صاحبو! یہ مسلّم ہے کہ الّو ویرانہ کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں کہ ویرانہ اس کے آنے سے پیدا ہوا بلکہ ویرانہ دیکھ کر وہ آیا۔ اور خود ویرانہ آپ کے عمل بد سے ہوا تو منحوس ہم ہوئے نہ کہ وہ۔ ہم کو اپنی نحوست اس کے اندر نظر آتی ہے۔

(پس ہماری مثال اس حبشی کی سی ہے کہ راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا پایا۔ اس نے جو اپنی صورت دیکھی تو بہت خفا ہوئے اور آئینہ کو زمین پر پٹک دیا کہ لاحول ولا قوۃ، ایسا بدصورت تھا جب ہی تو کوئی پھینک گیا۔ سو اس نے اپنی زشتی کو اس کی زشتی سمجھا) الّو بیچارہ ایک صوفی منش جانور ہے کہ خلوت کو پسند کرتا ہے۔ اگر نظر کو عمیق کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کے لیے واعظ ہے کہ آپ کو آپ کے گناہوں پر آگاہ کرتا ہے جن سے ویرانہ پیدا ہوا اور اصل سبب ویرانہ کا معاصی ہیں۔ جب آپ کو کسی طرح تنبہ نہیں ہوتا تو الّو آن کر بولتا ہے جس سے آپ کے کان میں پڑ جائے کہ ہم نے ویرانہ بنا دیا ہے۔ لیکن آپ نے اس کو غلط سمجھا کہ الّو کے بولنے کو اس کا سبب جانا۔ اس کا سبب معاصی ہیں۔ ان کا علاج استغفار ہے اس کو اڑانے اور مارنے سے کیا ہوگا۔ (اگر حبشی نے آئینہ کو پٹک کر توڑ دیا تو کیا صورت درست ہو گئی۔ اس کو چاہئے کہ اگر کسی تدبیر سے کر سکے تو صورت درست کرے۔ پھر اسی آئینہ کو دیکھے جس نے بُری صورت دکھائی تھی۔ اب وہی آئینہ اس کو اچھی صورت دکھائے گا)

الّو کو اڑانے سے گناہ معاف نہیں ہوتے بلکہ اور دوسری جہالت زیادہ ہو جاتی ہے۔ پہلے تو صرف عملی خرابی تھی اب عقیدہ کی خرابی ہو جاتی ہے جو عملی خرابی سے بدرجہا زیادہ ہے اور وہ نحوست کا عقیدہ رکھنا ہے۔ جس کا حاصل اختراع فی الدین ہے۔ بجائے اس کو منحوس سمجھنے کے استغفار کی کثرت کرو اور فکر کرو کہ ہم سے کیا گناہ ہوا جو ویرانہ ہو گیا۔ اس سے نہ عقیدہ کی خرابی ہو گی نہ گناہ رہیں گے۔ الّو کو اپنا دشمن نہ سمجھو۔ اس سے بھی ایک نصیحت حاصل کرو اور حبِ خلوت بھی سیکھو۔ (وعظ: تعلیل الذکر)

فصل (۳)

مسئلہ تقدیر کی وضاحت

عقیدۂ تقدیر سے راحت تقدیر تجویز حق کا نام ہے جس کا تعلق ذات وصفات حق سے ہے اس میں کاوش کرنے سے بجز حسرت و پریشانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

(التفحات ص۶)

مسئلہ تقدیر کو سمجھنا ممکن نہیں تقدیر کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے کہ اس کا انکشاف تام جنّت میں بھی نہ ہوگا۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ یہاں وساوس اور تردّد ہوتا ہے۔ جنّت میں تردّد اور وساوس نہ ہوں گے، بوجہ غلبۂ محبّت کے۔ اور اس مسئلہ میں شفا جبھی ہو سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق صحیح ہو جائے۔ اور قیل وقال سے اور زیادہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی واسطے سلف نے علمِ کلام میں انہماک کو منع کیا ہے۔ سوان دلائل اور چھان بین سے تو بہتر ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ کی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ ہمارے نوکر ہمارے اسرار نہیں جانتے اور اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا نوکر ہمارے اسرار معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ مستوجب سزا ہوگا۔ بس ایسے ہی یہاں سمجھ لیا جائے۔

اس معاملہ میں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عجیب شان تھی۔ ان کی طبیعتیں اس قدر سلیم تھیں کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اسی طرح ان کو یقین ہو گیا۔ اور ہماری تحقیق ہی کیا کہ جس کی بنا پر حقیقت کا انکشاف ہو اور اسرار پر مطلع ہوں۔

حقائق کے سامنے ہماری یہ مثال ہے کہ پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں کیڑے

ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک کیڑا سر ابھار کر آئے اور کہے کہ اس ریل سے کیا فائدہ! اور اس تھرمامیٹر سے کیا نفع! اور ٹیلیفون کیا چیز ہے؟ اور ٹیلیگراف کس کو کہتے ہیں؟ تو کیا اس کی یہ کوشش معقول ہو سکتی ہے؟ سو جیسے اس کیڑے کی کیا حقیقت ہے انسان کے سامنے ایسے ہی انسان کی حقیقت ہے حق تعالیٰ کے سامنے۔ بلکہ اس کیڑے کو تو انسان سے کچھ نسبت ہے بھی کیونکہ دونوں محدود ہیں۔ اور انسان کو حق تعالیٰ کی ذات کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں کیونکہ محدود کو غیر محدود سے کیا نسبت؟ (الافاضات ج۲ ص۲۳ ملفوظ ۴۲)

تقدیر کی تفصیل سے فطرت گھبراتی ہے

یہ بات نہیں کہ شریعت نے مسئلہ قدر میں گفتگو کرنے سے روکنے میں ہم پر جبر کیا ہے کہ دل مانے یا نہ مانے اس کو بلا گفتگو مانا جائے۔ بلکہ حق تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ جس مقدار پر مسئلہ تقدیر کی ہم کو تعلیم دی گئی ہے اس کو فطری بنا دیا ہے اور اس کو طبیعت میں داخل فرما دیا ہے۔ اور جتنی تفصیل سے منع کیا ہے وہ فطری نہیں بلکہ فطرت اس سے گھبراتی ہے۔ چنانچہ جو طبائع سادہ ہیں وہ اتنا کہہ دینے سے مطمئن ہو جاتی ہیں کہ میاں خدا کی مصلحت اسی کو مقتضی تھی۔ اور اگر اسباب بیان کرنے لگو تو طبیعت کو قرار نہیں ہوتا۔ اور وجہ یہ ہے کہ سب اسباب حادث ہیں، ہر ایک سبب کے لئے کوئی مسبّب ہوگا۔ آخر میں قرار اسی کو ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی اسی کو مقتضی تھی۔

مثلاً کسی کو ایک مہلک مرض ہوا اور وہ مر جائے۔ اب اگر اسباب بیان کرنے بیٹھو تو اس سے ہر ایک کو کچھ خیالات پیدا ہوں گے مگر اس سے سوائے کلفت زیادہ ہونے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جو سادہ طبیعتیں ہیں وہ یہی کہیں گی کہ میاں کہاں کا جھگڑا باندھا، خدا کو یہی منظور تھا۔ اس کی اس میں مصلحت تھی۔ تو چونکہ مسئلہ تقدیر کی تفصیل فطرت کے خلاف ہے اس لیے اجمال پر اکتفا کیا۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ کی حکمتیں لاانتہا ہیں انہیں حکمتوں کا یہ مقتضاء ہے کہ ہر شے میں ایک خاصیت رکھ دی ہے جس کا اثر ضرور ظاہر

ہوتا ہے۔ زنا میں جو ظلمت اور وحشت ہے وہ ضرور ظاہر ہو گی۔ ظلم کا جو وبال ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ زمین دبانے کا جو قہر ہے وہ ضرور پڑے گا۔ (التنبیہ)

توفیقِ الٰہی اور مسئلہ تقدیر میں شفاء کا طریقہ

قرآن شریف میں ارشاد ہے: ولو ارادوا الخروج۔(الآیۃ) کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ تبوک میں منافقین کا جانا نہ چاہا تو اس کا سامان بھی نہ کر سکے بلکہ ارادہ بھی نہ کر سکے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وہ ارادہ کر لیتے اور سامان بھی کر لیتے۔ پس تم اپنی سعی پر ناز نہ کرو بلکہ تفویض سے کام لو مگر تقدیر کے مسئلہ میں زیادہ غور و خوض بھی نہ کرو۔ اور میں نے جتنا بھی اس کے متعلق بیان کیا ہے محض اس ضرورت سے بیان کیا ہے کہ اپنے علم و عمل پر ناز نہ ہو نہ کہ بندہ کے کسب و اختیار کے نفی کرنے کے لیے۔ حضرات صحابہؓ جب ایسے واقعات سے گھبرائے تو حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم کیا کریں؟ حضورؐ نے فرمایا: قولوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ بس خدا پر نظر رکھو اور تفویض سے کام لو ؎

بحر یست بحرِ عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آنجا جزایں کہ جاں بسپارند چارہ نیست

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور اللہ تعالیٰ تیر چلانے والے ہوں تو ان سے کیونکر بچا جائے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر چلانے والے کے پاس کھڑا ہو جائے بچا رہے گا۔ کیونکہ تیر دور والے پر چلتا ہے نہ کہ پاس والے پر۔ پس اس میں غور و خوض نہ کرو۔ غور کرنے سے یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو گا ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضلِ شاہ

اگر اس مسئلہ میں شفاء چاہتے ہو تو عبدیت اور تفویض اختیار کرو۔ اسی سے

انشاء اللہ تسلی ہوجائے گی عقل کو تو بہت آزمالیا اب خدا کے حوالے کرکے دیکھو ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(اکمال العدۃ واسلاح رمضان)

عقیدۂ تقدیر میں بعض نادانوں کے خیال کی اصلاح

بعض نادانوں کا خیال ہے کہ تقدیر کے اعتقاد نے مسلمانوں کو کاہل بنادیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ تقدیر نے مسلمانوں کو بہادر و شیر دل بنادیا ہے۔ جو شخص تقدیر کا معتقد ہے وہ ادنیٰ درجہ کی تدبیر سے بھی کام شروع کردیتا ہے اور کہتا ہے: کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

چنانچہ حضرات صحابہؓ کے واقعات میں اس کی کافی دلیل موجود ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی جماعت کے مقابلہ میں اس کے منتظر نہ رہتے تھے کہ اُن کے برابر ساز و سامان اور جمعیت ہو تو جب ہی مقابلہ کیا جائے بلکہ ادنیٰ سے سامان و جمعیت کے ساتھ ان کا مقابلہ شروع کردیتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔ بخلاف صاحبِ تدبیر کے کہ وہ جب تک مکمل تدبیر نہ کرے گا اس وقت تک ہرگز کام شروع نہ کرے گا۔

(التیسیر للتیسیر ص۳)

عقیدۂ تقدیر سرچشمۂ راحت ہے

ہم لوگوں نے شرح عقائد تو پڑھی ہے اس میں سب سچے عقائد ہیں اور دلائل سے ہم لوگ ان کو ثابت بھی کرتے ہیں، مگر عمل کے وقت سب ذہن سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ جب تک سایہ میں ہیں، عیش و عشرت میں ہیں تو اللہ اللہ کرتے ہیں اور جب کوئی مصیبت آئی سب حذف تو یہ ہماری خامی ہے۔ باقی عقیدۂ تقدیر کے نور برکت اور حکمت سے تو (اُوپر دکھلا چکا ہوں کہ اس سے) دل قوی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ جس کے دل میں جما ہوا

ہو وہ بادشاہ ہے۔ کیونکہ سلطنت سے اصل غرض تو راحت ہی ہے اور اس شخص کو وہ
راحت حاصل ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں۔ اس کی وہ حالت ہے

؎ خوشا وقتے وخرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

اور یہ حالت ہے کہ

؎ بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ از آنکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

غرض یہ ہے کہ دریا ہو یا پہاڑ، ندی ہو یا نالہ، مومن کا سب جگہ وہی عقیدہ مشعل راہ
ہے۔ وہ حالت ہے کہ اَفَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ
بِہٖ فِی النَّاسِ کہ پہلے تو ایک مُردہ تھا۔ اب اس کو ایک نور عطا ہو گیا جہاں جاتا ہے
یہی نور رہبری کرتا ہے۔ یہ نور کیا ہے۔ یہی عقیدۂ توحید و تقدیر حضرت شیرازی فرماتے ہیں

؎ گر گزندت رسد ز خلق مرنج — کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
از خدا داں خلاف دشمن و دوست — کہ دل ہر دو در تصرف اوست

اور تصرف اس طرح ہوتا ہے ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

...... ان واقعات والوں پر اس عقیدہ ہی کا تو غلبہ تھا جس کے یہ آثار
تھے۔ خدا کی قسم ان عقیدوں نے سارے عالم سے بےفکر کر دیا ہے ان کی بدولت جہان
کو کتنی راحت پہنچی۔ سبحان اللہ۔

صدمہ کے وقت غم اور پریشانی میں فرق جو دیندار ہیں ان کو اولاد کے مرجانے کا غم
تو ہوتا ہے مگر پریشان نہیں ہوتے۔ جو
شخص خدا تعالیٰ کو حکیم سمجھے گا وہ کسی واقعہ سے کبھی پریشان نہ ہوگا۔ ہاں جس کی نظر اس پر

نہیں اس پر اگر کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس کو بڑا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے کہ اگر زندہ رہتا تو ایسا ہوتا۔ دل کے اندر شعلے اٹھتے ہیں۔ ارمان آتے ہیں۔ حسرتیں ہوتی ہیں کہ ہائے ایسی لیاقت کا تھا۔ (دنیا و آخرت "الدنیا" صفحہ ۹۳)

دین و دنیا کی راحت کا طریقہ جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے اس کو دنیا میں بھی غم ہے اور آخرت میں بھی۔ اور جس کا اعتقاد ضعیف ہے وہ آخرت میں تو پٹ چھٹ کر جنت میں پہنچ جائے گا، مگر دنیا میں عمر بھر ضرور بے چین رہے گا۔ تو کیا اچھا ہو کہ یہاں بھی راحت ہی ہو۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل و اعتقاد کو کامل کر لو۔ پھر تمہارے لیے دنیا میں بھی چین ہو گی لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ۔ (خیر الحیات و خیر الممات صفحہ ۱۲)

مسئلہ تقدیر میں قلبی قوت قلب کو جتنی قوت اعتقاد تقدیر سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہو سکتی۔ کفار چاہے لاکھ یا قوتیاں کھائیں مگر اس اکسیر کے سامنے سب گرد ہیں۔ یہ قائل تقدیر کسی حالت میں متزلزل نہیں ہو سکتا۔ جو مصیبت سامنے آئے گی یوں کہے گا کہ یہ تو مقدر تھی، ٹلنے والی نہ تھی۔ خواہ میں راضی ہوں یا ناراض۔ پھر خدا کی تقدیر سے ناراض ہو کر عاقبت بھی کیوں خراب کی۔ پھر اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ آتا ہے کہ اس میں ضرور کوئی حکمت ہے۔ (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۲)

جبر و اختیار ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ مسئلہ قضا و قدر محل خوض نہیں۔ بس مختصراً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ انسان افعال میں مختار ہے۔ اختیار میں مجبور ہے۔ ایک معترض نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا تھا کہ یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اختیار بھی ہے اور جبر بھی ہے۔ فرمایا کہ زمین سے ایک پیر اٹھاؤ۔ اٹھا لیا۔ فرمایا کہ دوسرا بھی اٹھاؤ۔ نہیں اٹھا سکا۔ فرمایا کہ بس یہ اختیار ہے اور یہ جبر۔ (الافاضات صفحہ ۳۲۵ جلد ۶)

جبری عقیدہ رکھنے والوں کا عملی علاج

فرمایا کہ بہت سے لوگ اس کے منتظر ہیں کہ اول دلچسپی پیدا ہو تو کام شروع کریں اور کام اس کا منتظر ہے کہ مجھ کو شروع کریں تو میں دلچسپی کے آثار پیدا کروں۔ غرض اول دلچسپی پیدا ہو تو کام شروع ہو، اور اول کام شروع ہو تو دلچسپی پیدا ہو۔ یہ اس کا منتظر وہ اس کا منتظر۔ یہ تو ایک اچھا خاصا دَور ہو گیا جو کبھی ختم ہونے والا نظر نہیں آتا۔ اس غلطی میں ایک عالم مبتلا ہے۔ یوں چاہتے ہیں کہ خود داعی ہی کی جانب سے فعل کو اضطراری ترجیح ہو جائے ۔۔ سو اگر یہ عقیدہ ہے کہ داعیہ پیدا کرنے والا چونکہ خدا تعالیٰ ہی ہے۔ وہ اگر چاہیں گے داعیہ پیدا کر دیں گے، نہ چاہیں گے نہیں پیدا کریں گے۔ اس لیے خود کچھ ارادہ ہی نہیں کرتے۔ سو یہ عقیدہ جبر ہی ہو گا۔ اس کا علاج وہ ہی ہے جو ایک حکایت میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے جبری عقیدہ کے مقابلہ میں نقل فرمایا ہے کہ ایک شخص کسی باغ میں پہنچ گیا اور وہاں پر پہنچ کر اس باغ سے پھل کھانے شروع کر دیے۔ اتفاق سے مالکِ باغ بھی آ پہنچا۔ اس نے دریافت کیا کہ کیوں صاحب اس باغ کا کوئی مالک بھی ہے اور آپ نے اس سے اجازت بھی لی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ باوا باغ کا مالک کون ہوتا؟ خدا مالک ہے زمین خدا کی، درخت خدا کے، پانی خدا کا، ہوا خدا کی، پھل خدا کے، میں خدا کا، منہ خدا کا، بھوک خدا کی، پیٹ خدا کا۔ لا فاعل الا اللہ اور لا موجود الا اللہ۔ مالک نے کسی کو حکم دیا کہ ہمارا ڈنڈا اور رسی لاؤ اور ان صاحب کے ہاتھ پیر بندھوا کر دو ڈنڈا وہ ڈنڈا۔ اب میاں صاحب نے غل مچانا شروع کیا۔ ہائے رے مرا، ہائے رے مرا! مالک نے کہا کہ ہائے ہائے کیا کرتا ہے یہ میں خدا کا، تم خدا کے، رسی خدا کی، ڈنڈا خدا کا، یہ مار پیٹ خدا کی، لا فاعل الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ دو ڈنڈے اور رسید کیے تب تو میاں صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور اس جبری عقیدہ سے توبہ کی۔ مولانا فرماتے ہیں:

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار   اختیار است اختیار است اختیار

کچھ نہیں یہ سب کم فہمی اور بدفہمی کی باتیں ہیں۔ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ اختیار ہے جب اثبات اختیار میں نفس کی غرض ہو اور ایک طرف اختیار کی نفی کرتے ہیں جب نفی میں غرض ہو اس کا علمی جواب تو یہ ہے مگر عملی جواب زیادہ مناسب ہے جو حکایت بالا میں مذکور ہے۔ اس میں کبھی شبہ ہی نہیں ہوتا۔ اول ہی بار میں صبح ہو جاتی ہے۔ اور آدمی روشنی میں آجاتا ہے۔ شیطان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میری تقدیر میں سجدہ تھا یا نہیں۔ اگر ہوتا تو میں ضرور کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تھا۔ تو پھر میں کیوں قصوروار ٹھیرا۔ جواب ملا کہ (اب باتیں بناتا ہے) اس وقت تیری یہ نیت کب تھی کہ تقدیر کی موافقت کر رہا ہوں اس وقت تو تکبر اور شرارت سبب تھا۔ یہ تو اب معلوم ہوا کہ تقدیر میں تھا یا نہیں — یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہ جو طرز آجکل ہے کہ شبہات کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس سے شبہات کا اسقاط نہیں ہوتا۔ گو اسکات ہو جاتا ہے معترض ساکت ہو جاتا ہے۔ البتہ محبّت ایک ایسی چیز ہے جو کافی طور پر کارآمد ہو سکتی ہے۔ اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ محبّت کے پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ سو وہ یہ ہے کہ جو اپنے اندر محبت پیدا کر چکے ہیں۔ ان کی جوتیوں میں جا پڑے۔ جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مردِ حال شو　　　پیشِ مردِ کاملے پامال شو

اگر ان کی صحبت میسّر آجائے تو بڑی دولت ہے۔ اس لیے کہ عشّاق کے مجمع میں جا کر عاشق ہو جاتا ہے۔ نمازیوں کے مجمع میں جا کر خود بخود نمازی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح محبّین کے مجمع میں جا کر محبّ ہو جاتا ہے اور اگر کسی عارض کی وجہ سے محبّت پیدا نہ ہو تو ایک اور دوسرا طریق بھی ہے وہ خوف ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ اگر حاکم سے محبت نہ ہو تو خوف کے سبب اس کے احکام کے خلاف نہیں کر سکتا۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ خوف کیسے پیدا کیا جائے۔ فرمایا کہ یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں۔ جہاں مضرتوں کا مراقبہ کیا خوف پیدا ہو گیا۔ وہ مضرتیں یہ ہیں مثلاً جہنّم ہے، قبر ہے، محشر ہے موت ہے۔ ان کے استحضار اور مراقبہ سے خوف پیدا ہو سکتا ہے۔ بس اس کے

لئے دو ہی طریقے ہوئے ایک محبت اور ایک خوف۔ ایک کا حاصل ترغیب ہے اور ایک کا حاصل ترہیب۔ (۱۲ شوال المکرم ۱۳۵۰ھ)

جبر و اختیار بعض لوگ "جبریہ" کے اعتقاد کو عبدیت کے قریب سمجھتے ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ عبدیت اسی میں زیادہ ہے کہ اپنی مشیت کو تسلیم کر کے اس کو مشیت حق کا تابع سمجھے۔ اس میں عبدیت کچھ زیادہ نہیں کہ اپنی مشیت کی بالکل نفی ہی کر دے اور جبر کا قائل ہو جائے۔ کمال تو یہ ہے کہ اپنے اختیار کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ پھر اس کو ضعیف سمجھ رہا ہے۔ (آثار المحبوبہ فی اسعد التوبہ صہ۱)

بد اعمالیوں میں تقدیر کا عذر فرمایا کہ اگر تقدیر پر بھروسہ کر کے دین کے اعمال سے بے فکری اختیار کی جاتی ہے اور اپنے کو بدعملی میں بے قصور سمجھا جاتا ہے تو دنیا کے کاموں میں بھی تدبیر کو چھوڑ دینا چاہیئے اور اپنے ماتحتوں پر کسی غلطی کی وجہ سے گرفت نہ کرنا چاہیئے ان کو بھی بے خطا بے قصور سمجھنا چاہیئے۔

صاحبو! اس طریقہ کو چھوڑو۔ تم خدا پر ہرگز الزام قائم نہیں کر سکتے۔ بخدا وہ ہر مجرم شخص کو لاجواب اور قائل کر کے سزا دیں گے۔ کسی کو ایسے حال میں سزا نہ دی جائیگی کہ وہ اپنے کو بے قصور سمجھتا ہو۔ پس تم باتیں نہ بناؤ۔ باتوں سے کام نہ چلے گا۔ عمل ہی سے کام چلے گا۔ ارے اگر کسی کے لئے پھانسی کا حکم ہو گیا ہو تو اس کو بجائے پھانسی کی علت کی تحقیق کے اور اس میں شبہات کے، مراحم خسروانہ کی تلاش و تفتیش کرنا چاہیے۔ اس سے تو کچھ کام چلے گا۔ پھانسی کی علت کی تحقیق سے کیا کام چل سکتا ہے۔

(غایۃ النجاح صہ۳۲)

نوشتۂ تقدیر نہ میدانِ کارزار میں جانا موجبِ موت ہو سکتا ہے اور نہ گھر میں رہنا مانعِ موت ہو سکتا ہے۔ بلکہ موت تو خدا کے اختیار میں ہے اور مرقوم فی الکتاب ہے۔ جب وقت اجلِ مقررہ تمام ہو جائے گی خواہ مکانوں کی بند کوٹھڑیوں

میں ہوں خواہ میدانِ کارزار میں ہوں۔ موت کے چنگل سے رستگاری ہرگز نہیں ہوسکتی وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (دنیا و آخرت ص۔)

جنگ کے خطرات سے وحشت بے جا

جنگ کے خطرات پر اظہار تشویش کیا گیا تو فرمایا کہ غیر اختیاری امور کے متعلق زیادہ تشویش نہ چاہیے۔ بس دعائے عافیت کرتا رہے اور بے فکر رہے۔ کیونکہ مرنا تو بہر حال ایک دن ضرور ہے اور موت قبل وقت کے آ نہیں سکتی۔ پھر فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک ساتھ ایک ہزار آدمی مثلاً بم کے گرنے سے مر جائیں تو اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے اور اگر وہی ایک ہزار ایک ایک کر کے مختلف اوقات میں مریں جیسا کہ عموماً واقع ہوتا ہی رہتا ہے تو اس سے اتنی وحشت نہیں ہوتی۔ حالانکہ فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر ہر شخص یہ سمجھ لے کہ مجھے ایک دن ضرور مرنا ہے چاہے اکیلا مروں، چاہے بہت سے لوگوں کے ساتھ مروں، میرے لیے یکساں ہے تو ایسے خطروں سے زیادہ وحشت نہ ہو۔ ہر شخص صرف اپنے ہی مرنے کا خیال کرے۔ دوسروں کے مرنے کا خواہ مخواہ کیوں تصور کرے۔ رہا اپنا مرنا سو وہ تو واقع ہونا ہی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ نہ وقتِ مقدر سے پہلے واقع ہوگا نہ بعد کو: لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ اس کی فکر میں پہلے ہی سے کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو۔

؎

دو روز حذر کردن از مرگ روا نیست
روزیکہ قضا باشد و روزیکہ قضا نیست
روزیکہ قضا باشد و کوشش نکند سود
روزیکہ قضا نیست در و مرگ روا نیست

(ملفوظات ۷ ص ۲۱۴)

تقدیر موت

فرمایا کہ بر ہو یا بحر ہو، حضر ہو سفر ہو۔ پہاڑ ہوں یا بیابان ہوں موت کے لیے سب یکساں ہے مگر انسان کے نہ علم میں نہ قدرت میں بعض لوگ

موت سے اس قدر خائف ہیں کہ اس کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے۔ یہ مہمل بات ہے۔ وہ تو ناگزیر ہے۔ شاہی زمانہ میں قلعہ کے ایک دروازہ کا نام خضر دروازہ رکھا گیا تھا جس سے جنازہ گذرتا تھا گویا نام سے بھی وحشت تھی۔ مگر وہ ایسی وحشت کی چیز نہیں۔ مومن کے لیے تو عقلاً محبوب چیز ہے اس لئے کہ اس کے وقوع کے بعد ہی محبوب تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اتنی وحشت محض بے معنی ہے۔

(ملفوظات ع۳ ص۸۹)

ملاح و مسافر کا مکالمہ

ایک ملاح سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے؟ کہا دریا میں۔ اور ماں کہاں مری؟ کہا دریا میں۔ پھر کہا کہ دادا کہاں مرے؟ کہا دریا میں۔ کہا کہ تم بڑے بے وقوف ہو کہ پھر بھی دریا کو نہیں چھوڑتے۔ ملاح نے پوچھا کہ حضرت آپ کے والد صاحب کہاں مرے؟ کہا گھر میں۔ کہا اور دادا کہاں مرے؟ کہا وہ بھی گھر میں مرے۔ اس نے کہا کہ آپ بھی بڑے بے وقوف ہیں کہ پھر اسی گھر میں رہتے ہیں۔ سبحان اللہ! حقیقت میں خوب جواب دیا۔ خشکی ہی میں کیا اطمینان ہے۔ مکان گر پڑے تو کیا ہو سکتا ہے۔ آگ لگ جائے تو کیا ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم جو دریا سے نکلتے ہی سرکشی کرنے لگے ہو تو کیا اس سے اطمینان ہو گیا کہ ہم تم کو خشکی میں دھنسا نہیں سکتے؟ یا ہم تند ہوا نہیں بھیج سکتے؟ اگر تم اس کو بعید سمجھتے ہو تو کیا ہم اس پر قادر نہیں کہ تم کو دوبارہ کسی ضرورت کی وجہ سے دریا میں لوٹا دیں کہ پھر سفر دریا کرو اور کشتی میں سوار ہو اور ہم تم کو غرق کر دیں۔

(التنبیہ)

اثبات تقدیر

بعض دفعہ اطبا اور ڈاکٹر عاجز ہو جاتے ہیں اور بیمار کو شفا نہیں ہوتی۔ بلکہ جوں جوں دوا کرتے ہیں مرض کو ترقی ہوتی ہے ہر تدبیر الٹا کام کرتی ہے اور جس دوا کو تریاق سمجھا جاتا ہے وہی زہر کا اثر پیدا کرتی ہے۔

اگر شفا طبیبوں اور ڈاکٹروں کے قبضہ میں ہے تو ان کے بیوی بچے تو ہمیشہ مرض کے بعد ضرور صحت یاب ہو جایا کریں۔ کیونکہ اس موقعہ پر طبیب و ڈاکٹر کبھی تدبیر میں کمی نہیں کر سکتا۔ مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ پس مجبوراً ماننا پڑے گا۔

دردا زیار است درماں نیز ہم | دل فدائے او شد و جان نیز ہم
ہر چہ میگویند آں بہتر ز حسن | یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

(علم و عمل ص۸۴)

رزق تقدیر پر موقوف ہے رزق کا مدار عقل پر نہیں ورنہ زیادہ عقل والے کم عقلوں سے زیادہ مالدار ہوتے۔ حالانکہ زیادہ عقل والے آپ کے سامنے موجود ہیں اور بہت پریشان ہیں۔ لیاقت سے رزق ملنا قارون کا عقیدہ ہے۔

(الامتحان ص۹)

کسب میں اثر بالذات نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جب انسان کسب کرتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ اثر دے دیتے ہیں۔ ورنہ اس کے کسب کو بالذات کوئی دخل نہیں۔

(کمالات اشرفیہ ص۳۲)

فصل (۴)

کفر و تعذیب کا راز

کفار سے جہاد کرنے کا سبب بعض ایسے موذی و مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یہ مادہ متعدیہ ہے۔ ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے، اسی کا نام جہاد ہے۔ پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

کفر کی تعریف کفر کہتے ہیں خلافِ اسلام کو خواہ اس کے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کے لیے سزا ابدالآباد جہنم ہے جب ترکِ اسلام کی یہ سزا ہے تو اس سے اسلام کی عظمت و فضیلت اور اس کی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا۔

کافر ہمیشہ جہنم میں کیوں رہے گا؟ جس جگہ دو گھنٹہ ڈکیتی پڑی ہو تو حاکم ڈاکوؤں کو صرف دو گھنٹے کی سزا دے، کیا آپ اس کو انصاف مانیں گے؟ اور سزا کو جرم کے مناسب مانیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سزا اور جرم میں مناسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب و مساوی ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدرِ شدت جرم ہو۔ دوسرے سزا و جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں بلکہ نیت کو بھی اس میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی تو سمجھو کہ ظاہر میں گو کفر کافر متناہی ہے مگر اس کی یہ نیت تھی کہ اگر زندہ رہا تو میں ابدالآباد اسی حالت پر رہوں گا۔ اس لیے اپنی نیت کے موافق اس کو ابدالآباد جہنم کا عذاب ہوگا۔ اور اسی

طرح مسلمان کا اسلام گو بظاہر متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا۔ اس لیے اس کے لیے ابدالاباد ثواب جنت ہے۔

دوسرے یہ کہ کفر سے حقوق الٰہیہ کی تفویت ہے۔ اور حقوق الٰہیہ غیر متناہی ہیں تو ان کی تفویت کی سزا بھی غیر متناہی ہونی چاہیے اور اسلام میں حقوقِ الٰہی کی رعایت ہے اور وہ غیر متناہی ہے تو اُن کی رعایت کا بدلہ بھی غیر متناہی ہونا چاہیے۔

(محاسن الاسلام ص۲)

کفار سب بُرے ہیں ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بعض لوگ کفار کی ایک جماعت کو بُرا کہتے ہیں اور بعض دوسری جماعت کو۔ میں کہتا ہوں دونوں بُرے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نجاست مرئیہ ہے، ایک نجاست غیر مرئیہ اور ہیں دونوں نجاست۔ (الافاضات ج۲ ص۳۰۲ ملفوظ ۴۸۹)

کُفر کی اصل یاد رکھو حبِ دنیا کفر کی اصل ہے اس کو معمولی مت سمجھو اور یہ بات کہ جڑ کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ بزرگوں کے اقوال میری تائید کر رہے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

علتِ ابلیس انا خیر بدست
ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

اس میں تصریح ہے کہ ابلیس کے مردود ہونے کا اصلی سبب تکبّر تھا اور یہ مرض ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ گو اس درجہ کا نہ ہو مگر جب شہر میں آگ لگتی ہے تو اس کی ابتدا ہمیشہ معمولی سی بات سے ہوتی ہے۔ (دہم الآخرہ ص۲۱)

اہل کُفر کے کُفر کا سبب حبّ دنیا اور انہماک فی الدنیا سبب ہُوا ہے اہل کفر کے کفر کا۔ یہود اسی واسطے ایمان نہ لا سکے کہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اب تو ہم پیر بنے ہوئے ہیں مسلمان ہو کر مرید ہو جائیں گے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے مریدوں کو بعد میں اتنا کچھ ملا کہ ان پیروں کے باپ دادا کے بھی خیال میں نہ آیا ہوگا۔

(اہم الآخرۃ صفحہ ۳۸)

کیا اللہ تعالیٰ کو کفار کے عذاب پر رحم نہ آئے گا؟ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایک مولوی صاحب جو اپنے ہی عقائد کے تھے، مجھ سے کہنے لگے کہ اگر تم خفا نہ ہو تو ایک بات کہوں۔ میں نے کہا خفا ہونے کی کیا بات ہے، کہو کیا بات ہے۔ کہا کہ دشمن کو آگ میں جلتا ہوا دیکھ کر ہم کو بھی رحم آجاتا ہے تو کیا حق تعالیٰ کو رحم نہ آئے گا۔ جب کفار دوزخ میں جلیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کا قیاس مع الفارق ہے۔ آپ میں تو انفعال ہے اور اللہ تعالیٰ انفعال سے منزہ ہے۔ وہاں تو جو بھی ہوتا ہے ارادہ سے ہوتا ہے۔ پھر وہ ارادہ حکمت سے ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے توبہ کی۔ (الافاضات ج۵ صفحہ ۳۲۵ ملفوظ ع۴۹۱)

کفار کو جو عذاب مخلد ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر اضاعت ہے حقوقِ خداوندی کی، اور خدا تعالیٰ کی صفات غیر متناہی ہیں اور ہر صفت کا ایک حق ہے تو کافر نے حقوق غیر متناہی کو ضائع کیا جس پر غیر متناہی عذاب مرتب ہونا چاہیے۔ اور اس کا مقتضاء عقلاً یہ تھا کہ معصیت میں بھی عذاب مخلد ہوتا۔ لیکن یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے معاصی غیر کفر میں سزائے مخلد نہیں دی۔

(دعوات ج۲ صفحہ ۲۷۳۔ مقالات صفحہ ۹۱)

کفر و معصیت کے وجود کا راز یہ تشریعاً تو صحیح ہے کہ ایمان لانا اور اطاعت کرنا سب کا مطلوب ہے۔ لیکن ایسا ہونا تکویناً خلافِ حکمت تھا۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ کی جہاں اور صفات ہیں وہاں حکیم ہونا بھی ہے۔ اسی طرح ایک صفت غفور ہونا بھی ہے۔ ان کے ظہور کا اقتضا یہ ہے کہ معصیت اور کفر کا وجود بھی عالم میں ہوتا تاکہ ان صفات کا ظہور ہو۔ اسی کو فرماتے ہیں:

در کار خانہ عشق از کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

(دنیا و آخرت "الدنیا" صـ۹۳)

کفر اور ایمان کے خواص

فرمایا کافر مال کا زیادہ حریص ہے کیونکہ کفر میں طلب دنیا کا خاصہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کافر تو دنیا ہی کو جانتا ہے آخرت کو نہیں مانتا اس لیے وہ دنیا کا حریص نہ ہو تو اور کس چیز کا حریص ہو، اور مسلمان آخرت کو بھی مانتے ہیں۔ اس لیے وہ دنیا کے زیادہ حریص نہیں ہوتے۔ دوسرے کافر تو دنیا میں محض دنیا کو مقصود سمجھ کر مشغول ہوتا ہے۔ تو اس کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ وہ دنیا ہی دنیا ہے۔ بخلاف مسلمان کے کہ وہ دنیا کو مقصود سمجھ کر اس میں مشغول نہیں ہوتا، بلکہ "ذریعۂ اعمال آخرت و ذریعۂ ادائے حقوق" سمجھ کر مشغول ہوتا ہے تو اس کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ دنیائے محضہ نہیں بلکہ چونکہ وہ اس کو "مقدمۂ آخرت" بناتا ہے اس کے لیے یہ متاعِ دنیا بھی متاعِ آخرت ہے پس تمتیع بالدنیا میں کفر ہی کو دخل ہے۔ ایمان و اسلام کو تمتیع بالدنیا میں دخل نہیں بلکہ اسلام کو تو تمتیع بالآخرت میں دخل ہے حتیٰ کہ وہ دنیا کو بھی بحکم آخرت بنا دیتا ہے۔ پس دنیا کافروں کے لیے ہے اور کافر دنیا کے لیے ہیں اور آخرت مسلمانوں کے لیے ہے اور مسلمان آخرت کے لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے بعد محبت دنیا کم ہو جاتی ہے۔ ایمان میں خاصہ ہے کہ وہ محبت دنیا کو سوختہ کر دیتا ہے۔

اس پر شاید کوئی کہے کہ یہ ایمان کامل کا خاصہ ہوگا کہ حق تعالیٰ کا عشق ہو کر اس سے حبّ دنیا کم ہو جاتی ہے۔ مطلق ایمان کا خاصہ تو نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر مسلمان عاشق کہاں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اپنا عاشق فرمایا ہے کیونکہ شدّتِ حب ہی کا نام عشق ہے۔ معلوم ہوا ہر مومن خدا کا عاشق ہے مگر یوں کہیے ایک مانع کی وجہ سے اثر ظاہر نہیں

ہوتا۔ ہم لوگوں نے ایک برف کا ٹکڑا اپنے دل پر رکھ لیا ہے اور وہ غفلت ہے۔ اس برف کو ہٹا دو۔ پھر وہ چنگاری اپنا اثر دکھائے گی۔ اور اس برف کو ہٹانے کی یہ صورت ہے کہ اہتمام کر کے غفلت کو دور کرو، فکر اور سوچ کی عادت ڈالو اور بالخصوص لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کا تکرار کرو۔ ایک دن یہ برف لا الہ الا اللہ کی گرمی سے پگھل جائے گی۔

(جمال الجلیل صـ۱۳-۸)

کفّار کے معبود جہنّم میں کیوں داخل کیے جائیں گے؟

ان چیزوں کا دخول جہنّم قصور کی وجہ سے نہ ہوگا کیونکہ سببیت بلا مقصد کوئی قصور نہیں۔ ورنہ بات بہت دور تک پہنچے گی بلکہ ان کو کفّار کی حسرت بڑھانے کے لیے جہنّم میں بھیجا جائے گا تاکہ وہ ان کو دیکھ کر اپنی حماقت پر افسوس کرتے رہیں کہ ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا۔ اور جہنّم میں کسی کا ہونا اس کے معذّب ہونے کو مستلزم نہیں۔ جیلخانہ میں جانا ایک تو مجرم کا ہے، ایک جیلر کا ہے اور ایک ڈاکٹر کا ہے۔ کیا سب کا جانا برابر ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ حیثیات کا فرق ہے۔ گو بظاہر سب جیلخانہ میں ہیں مگر ڈاکٹر اور جیلر مقرّبین حکومت ہیں اور مجرم معتوب۔

رضا بالکفر و رضا بالقضا

اسی فرق حیثیات سے ایک اور اشکال رفع ہوتا ہے۔ عقائد کا مسئلہ ہے کہ رضا بالقضاء واجب ہے۔

دوسرا مسئلہ ہے کہ خیر و شر سب قضاء و قدر کے تابع ہیں۔ تیسرا مسئلہ ہے کہ رضا بالکفر کفر ہے۔

تو اب رضا بالقضا کیونکر ہو۔ اگر ہر قضا کے ساتھ رضا لازم ہے تو پھر کفر سے رضا لازم ہوگی حالانکہ رضا بالکفر کفر ہے۔

عارفین نے اس کا جواب دیا ہے کہ رضا بالکفر میں حیثیات کا فرق ہے یعنی ایک حیثیت تو کفر میں صدور عن العبد کی ہے اور اس درجہ میں یہ شر محض ہے اور اسی درجہ میں

اس پر رضا کفر ہے۔ اور ایک حیثیت مخلوقیۃ للحق کی ہے۔ یعنی وہ حق تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس درجہ میں وہ حکمتوں کو متضمن ہے اور اسی درجہ میں اس پر رضا واجب ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مکسوب للعبد ہونے کی حیثیت سے اس پر رضا جائز نہیں۔ اور مخلوق للحق ہونے کی حیثیت سے اس پر رضا واجب ہے۔

؎ کفر ہم نسبت بخالق حکمت است
گر بما نسبت کنی کفر آفت است

اور

؎ در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

یعنی حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں بھی حکمتیں ہیں کہ اس سے صفت قہر و جلال اور اسم منتقم کا ظہور ہوتا ہے۔ نیز اس سے ایمان اور مومنین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اضداد ہی سے اشیاء کا ظہور کامل ہوتا ہے۔ نیز اس سے کارخانہ دنیا کی رونق اور ترقی ہے کیونکہ دنیا میں پوری ترقی کافر ہی کر سکتا ہے۔ جس کو آخرت کی کچھ بھی فکر نہیں۔ مسلمان چونکہ آخرت کی فکر میں رہتا ہے وہ دنیا میں پوری طرح منہمک نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ قسم قسم کی ایجادیں کیونکر ظاہر ہوتیں۔ تو خدا تعالیٰ نے جو کفر کو پیدا کیا اس میں بہت حکمتیں ہوئیں۔

اور بندہ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں کوئی حکمت نہیں۔ کیونکہ جو شخص کفر کر رہا ہے اس کا اپنے کفر سے کیا نفع ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اس کا تو ضرر ہی ضرر ہے۔ گو اس کے ضرر سے مجموعۂ عالم کا نفع ہے مگر اس کا تو سراپا ضرر ہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا باغی ہو گیا۔ پس کفر اس حیثیت سے کہ خدا تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ رضا لازم ہے ۔ اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو کیوں پیدا کیا۔ یہ پیدا کرنا برا ہوا تو یہ

کفر ہے۔ اور اس حیثیت سے کہ یہ بندہ کا فعل ہے۔ اس کی ساتھ رضا کفر ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ بہت اچھا ہوا فلاں کافر ہوگیا تو یہ کفر ہے۔

(الوصل والفصل ص ۲۶)

دین سے استہزا سخت بات ہے

استخفاف سوءِ اعتقاد سے بھی زیادہ سخت ہے کہ سوءِ اعتقاد والا مصدق نہیں اور یہ مصدق ہو کر گستاخی کرتا ہے مطلق تصدیق معتبر نہیں۔ تصدیق وہ معتبر ہے جو مقرون ہو عظمت کے ساتھ مثلاً بادشاہ کو مانتا ہو لیکن گستاخی کرتا ہو تو یہی سمجھا جاوے گا کہ یہ باغی ہے۔

(حسن العزیز ج ۱ ملفوظ ۱۴۲)

○

باب دوم

عبادات

فصل (۱)

قرآن مجید

کلام اللہ کی زیارت اور تلاوت کی اہمیّت

قرآن شریف کا ہم کو عطا ہوجانا محض موہبتِ خداوندی ہے جس میں ہمارے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ اسی معنی کر فرمایا ہے۔ اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا..... الخ یعنی "جو لوگ معجزات مانگتے ہیں کیا یہ کافی معجزہ نہیں ہے کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔" معجزہ اسی بات کو کہتے ہیں جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ معلوم ہُوا کہ کتاب اللہ ہمارے ہاتھوں میں ہونا ایسی بات نہ تھی کہ ہم اس کو کسی طاقت اور کسی کوشش سے حاصل کر سکتے۔ یہ نمونۂ رحمت ہے جو بے دریغ ہمارے پاس ہے۔ بخدا اس وقت وہ چیز ہمارے پاس موجود ہے جو تمام دنیا کی کوشش سے بھی نہ مل سکتی اگر کسی سے ان پڑھ ہونے کے سبب اس کا پڑھنا بھی نہ ہوسکے تو زیارت ہی کر لیا کرے۔ اگر آج کوئی چیز ایسی آجائے جو کمیاب ہو اور ہر جگہ نہ مل سکتی ہو تو لوگ دُور دُور سے اُسے دیکھنے کے لیے آئیں عجائب خانہ دیکھنے کے لیے کہاں کہاں سے لوگ پہنچتے ہیں اس کی یہی تو اصل ہے کہ وہاں وہ چیزیں ہیں جو ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔ حالانکہ ان کے دیکھنے سے کچھ آمدنی بھی نہیں ہوتی بلکہ کچھ نقصان ہی ہوتا ہے روپیہ خرچ ہوتا ہے ٹیکٹ لگتا ہے تو جب قرآن شریف ایسی چیز ہے کہ دنیا بھر کی کوشش سے بھی نہ مل سکتا تو وہ ہزار عجائبات کا عجائب ہے۔ اس کی زیارت کیلئے تو بڑی بڑی

رقمیں خرچ کر کے پہنچنا چاہیے تھا نہ کہ زیارت سے بڑھ کر اس کی تلاوت حق تعالیٰ نے ہمارے اختیار میں کر دی ہے پھر اس سے جان چرانا کتنی کم نصیبی ہے۔

بے سمجھے پڑھنا فضول نہیں

حرمان اس کو کہتے ہیں۔ یہ صرف شیطان کے مکر ہیں کہ یوں سمجھاتا ہے کہ سمجھ کر تو ہم پڑھ نہیں سکتے اور بے سمجھے پڑھنا فضول ہے۔ کیوں صاحب عجائب خانہ میں آپ کا نفس یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہ چیزیں دیکھنے سے تو نہیں مل سکتیں۔ پھر دیکھنا فضول ہے۔

غلط پڑھنے پر دوچند ثواب

اور بعض تلاوت کرنے والے اس وجہ سے تلاوت چھوڑ دیتے ہیں کہ اُن سے صحیح پڑھا نہیں جاتا بس شیطان ان کو بہکا دیتا ہے کہ جب صحیح پڑھا نہیں جاتا تو غلط پڑھنے سے کیا فائدہ ؟ بلکہ بعض لوگ تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ غلط پڑھنے سے اور گناہ ہوتا ہے۔

صاحبو! اس غلطی کو سمجھ لیجیے، غلط پڑھنے سے گناہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ صحیح پڑھنے پر قدرت ہو اور لاپروائی سے غلط پڑھا جائے ورنہ

ع
ایں خطا از صد ثواب اولیٰ تر است

ایسے پڑھنے والے کو جو کہ شوق سے پڑھتا ہے مگر غلطی رفع کرنے پر اس کو قدرت نہیں ہے۔ دوچند ثواب ملتا ہے۔ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

ما بروں را ننگریم و قال را ۔۔۔۔۔ ما دروں را بنگریم و حال را

حق تعالیٰ دل کو دیکھتے ہیں اور ایک تلاوت ہی پر کیا شبہہ ہے ہماری عبادت تو کوئی بھی ایسی نہیں جس کو صحیح کہہ سکیں۔ سب ایسی ہی ہیں جیسے غلط قرآن پڑھنا پھر تعجب ہے کہ اور عبادتوں پر تو خوش ہوتے ہیں اور ثواب کی اُمید رکھتے ہیں اور غلط تلاوت سے ناخوش ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے یہاں تو دل کی حالت دیکھی جاتی ہے۔ جو شخص شوق سے پڑھتا ہے اس کی غلطیوں پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ دوچند ثواب دیا جاتا ہے۔ (ارجاء النفوس)

قرآن کی تلاوت آخرت کے لیے عظیم سرمایہ ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن کی شان یہ ہے کہ

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اس کے لیے دس نیکیاں لکھی گئیں۔ تو یہ کتنا بڑا نفع ہوا۔ اور اگر کوئی کہے کہ نیکیوں کو کیا کریں تو سمجھو کہ نیکیاں اس وقت تم کو بے کار نظر آتی ہیں لیکن جب تم دارِ دنیا سے چل کر دارِ عقبیٰ میں پہنچو گے تو معلوم ہوگا کہ حسنات کیا کارآمد سکہ تھا۔ جب قیامت کے میدان میں کھڑے ہوگے اور لوگوں کے اعمال نامے وزن کیے جا رہے ہوں گے اور ان کے موافق جزا مل رہی ہوگی اور تم تہی دست ہوگے اس وقت معلوم ہوگا کہ حسنات کیا چیز تھیں ؎

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہی دست را دل پراگندہ تر

اگر کسی عمدہ بازار میں کسی مفلس کو بھیج دیا جائے تو اس کو انتہائی پراگندگی حاصل ہوگی کیونکہ جدھر نظر پڑے گی اچھی اچھی قیمتی چیزیں نظر آئیں گی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا افلاس اور تہی دستی بھی یاد آئے گی۔ اس لیے حسرت بھی بڑھتی جائے گی۔ بالخصوص جبکہ جاتے وقت اس سے کہا گیا ہو کہ کچھ نقد لیتے جاؤ اور وہ چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ پس یہی حالت میدانِ قیامت میں ان لوگوں کی ہوگی۔ اور وہ ایسا وقت ہوگا کہ سوائے اس سکہ کے کوئی سکہ کام نہ آئے گا۔ (دین و دنیا / ضرورۃ العلم والدین ص۴۹)

ادب کلام اللہ حسی و معنوی

اے مسلمانو! اس نعمت (کلام اللہ) کی قدر کرو اور اگر تم قدر نہ کرو گے تو کیا مخالفین قدر کریں گے۔ ادب بھی ایک شعبہ ہے دین کا۔ ادب کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا۔ کلام اللہ کا ادب ایک تو حسی ہے۔ وہ یہ کہ اس کی تعظیم کرنا، اس کو چومنا، بلندی پر رکھنا وغیرہ۔ اور دوسرا ادب معنوی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو فروخت مت کرو۔ اس پر

اگر کوئی اعتراض کرے کہ مطبع والے بڑے گنہگار ہیں کیونکہ وہ دن رات یہی کام کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نقوش کو فروخت کرتے ہیں۔ نقوش کی بیع جائز ہے اور کلمات کی ناجائز۔ نقوش مجازاً اعدم ہیں اور تلاوت واقع میں کلام اللہ ہے۔ اور ہم کو اس فرق کی بھی حاجت نہ تھی جبکہ شریعت نے لکھے ہوئے کی قیمت کی اجازت دی ہے اور پڑھنے پر اجازت نہیں دی۔ بس ہمارے لیے شریعت کا فیصلہ کافی وافی ہے۔ اور اسی طرح شریعت نے تعلیم پر اُجرت لینے کی اجازت دی ہے۔ اگر کوئی اعتراض کرے کہ اگر حفاظ کو نہ دیں تو تراویح نہ ہوں گی کیونکہ کوئی سنائے گا نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ پڑھنے والے کثرت سے ہیں۔ سنانے والے مل ہی جاتے ہیں۔ پھر بیش بریں نیست کہ اگر تراویح میں سنانا سب چھوڑ دیں تو اس سے دین ضائع نہ ہوگا اور اگر تعلیم کو سب چھوڑ دیں تو دین ضائع ہو جائے گا۔ سو اگر کسی موقع پر کوئی حافظ جائز طریقہ سے سنانے والا نہ ملے تو الم ترکیف سے تراویح پڑھ لیں۔ کلام اللہ بڑی دولت ہے۔ اس کی بے قدری نہ چاہیے۔ قدر کرو اور پڑھو خواہ سمجھ کر یا بے سمجھے۔ کیونکہ کلام اللہ کی تلاوت خواہ سمجھ کر یا بے سمجھے ہو اس میں خاصیت تشبہ بالحق کی ہے۔

(العتق من النیران فی رمضان صفحہ ۱۱/۱)

مقصود قرآن پر عمل کرنا ہے

میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف اور احادیث کے احکام کیا اس لیے ہیں کہ بت پرست اس پر عمل کریں یا نصاری عمل کریں اور مسلمان اپنے ہاتھوں میں لے کر بس فخر ہی کر لیا کریں۔ کچھ بعید نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں شکایت فرمائیں۔

یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔

قرآن کو صرف اپنے گھروں میں رکھنا اور زبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ جو کچھ اس کے اندر ہے اس کو بھی دیکھو اور دل پر اثر ڈالو۔ (تطہیر رمضان صفحہ ۱۸)

ایک عظیم الشان دولت کو چھوڑ دیا

صاحبو! اگر کسی کے پاس بہت سا مال ہو اور وہ اس کو کسی ایسی جگہ رکھ دے کہ اس سے منتفع نہ ہو سکے تو کیا اس شخص کو مالدار کہیں گے۔ پس ایسی حالت میں جیسا وہ صاحبِ مال ہے ایسے ہی آپ صاحبِ کتاب ہیں۔ افسوس آپ نے ایک عظیم الشان دولت کو چھوڑ دیا ہے اور پھر آپ کو ذرا غم نہیں ہے۔ حالانکہ اگر دینی پہلو سے دیکھا جائے تب تو قرآن ہی میں یہ حکم موجود ہے اور اگر کسی کو قرآن میسّر نہ ہو تو میں عقلی قواعد کی رو سے پوچھتا ہوں کہ آیا علوم دینیہ کا باقی رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ جب ضروری ہے تو چونکہ قرآن ان کا منبع ہے اس کا محفوظ رہنا بھی ضروری ہوگا۔ ورنہ وہ کون سی صورت ہے کہ علم بدون الفاظ کے باقی رہ سکے۔ (دین و دنیا صـ۴۳)

قرآن سیکھنے کی فضیلت

کسی چیز کا حکم اس کے اسباب و مقدمات کا بھی حکم ہے۔ الشیئ اذا ثبت ثبت بلوازمہ بنابریں تلاوت کتاب کا مطلوب ہونا اس کے سیکھنے اور پڑھنے کا بھی مطلوب ہونا ہے جو فضیلت تلاوت کی ہوگی وہی فضیلت سیکھنے کی ہوگی۔ اور جس قدر ضرورت تلاوت کی ہوگی اسی قدر ضرورت سیکھنے کی بھی ہوگی۔ (دعواتِ عبدیت حصہ دوم صـ۲۴)

تعلیم قرآن ہر طرح سہل ہے

فرمایا کہ قاعدہ تکوینیہ ہے کہ جو شے زیادہ نافع ہوتی ہے وہ نہایت سہل الحصول ہوا کرتی ہے۔ آدمی کو سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے۔ اگر ایک منٹ بھی ہوا نہ ہو تو حیات ہی معرض ہلاک میں آجائے وہی اس قدر ارزاں ہے کہ اس کی کچھ قیمت ہی نہیں۔ اس کے بعد پانی کی ضرورت ہے وہ اس قدر سستا نہیں ہے، لیکن اور چیزوں کے اعتبار سے ارزاں ہے۔ اس کے بعد غذا کی ضرورت ہے وہ اس سے زیادہ گراں ہے۔ اور جس شے کی بالکل ہی ضرورت نہیں وہ نہایت گراں ہے جیسے جواہرات کہ عمر بھر بھی اگر کسی کو نہ ملیں تو کچھ حرج نہ ہو۔

اسی طرح جس قدر علوم زیادہ کار آمد اور زیادہ نافع ہیں وہ نہایت سہل ہوتے ہیں چنانچہ علوم شریعت بھی ایسے ہی ہیں کہ نہایت ضروری اور نافع ہونے کی وجہ سے نہایت سہل ہیں اور ہر جگہ ان کے بتلانے والے موجود ہیں اور وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے اور یہی راز ہے اس میں کہ قرآن شریف کو تعلیم کرنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور نہایت قلیل معاوضہ پر مل جاتے ہیں بخلاف دیگر علوم کے کہ وہ کم ہیں اور گراں ہیں۔ (ترغیب الاضحیۃ صے۲)

قرآن شریف پڑھانے والوں کی قدر کرنا چاہیے

فرمایا کہ قرآن شریف پڑھانے والوں کی قدر کرنا چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے کہ تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن شریف کی تعلیم کرے۔ ہمت سے زائد ان کی خدمت کرو۔ یہ نہیں کہ پانچ روپیہ میں ٹال دو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف سورہ بقرہ کے ختم پر تین سو دینار کی اونٹنی کہ ایک ایک دینار دس دس درم کا ہوتا ہے اور ایک ایک درم تقریباً سوا چار آنے کا اتنے کی ذبح کر دی جو آج کل یہاں کے سکہ سے ایک ہزار روپیہ سے زائد کی ہوتی ہے۔ اس وقت کوئی تمام قرآن شریف کے ختم پر ایک ہزار پیسے بھی نہیں دیتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ حضرات اس کی قدر جانتے تھے اور اس کو ہی دولت سمجھتے تھے اور زبان حال سے کہتے تھے ؎

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

صاحبو! اس نعمت کے مقابلہ میں تو ساری دنیا بھی ہیچ ہے۔

(اشرف المواعظ المخلط) صـ۶۳

قرآن کریم خوش الحانی سے پڑھنا

قرآن کو سنوار کر پڑھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس نیت سے سنوار کر پڑھیں کہ لوگ ہماری تعریف کریں گے ہم قاری مشہور ہوں گے یہ تو واقعی ریا ہے اور ایک یہ کہ اس نیت سے سنوار

کر پڑھیں کہ ایک مسلمان کا جی خوش ہوگا یہ ریا نہیں بلکہ موجب ثواب ہے کیونکہ تطییب قلب مومن مطلوب ہے اور اس کی دلیل مجھے حدیث سے معلوم ہوئی، وہ یہ کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا قرآن سنا یہ بہت خوش الحان تھے۔ صبح کو آپ نے فرمایا کہ اے ابوموسیٰؓ رات میں نے تمہارا قرآن سنا لَقَدْ اُوْتِیْتَ مِزْمَارًا مِّنْ مَّزَامِیْرِ آلِ دَاوٗدَ تم کو خدا تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی سے حصہ عطا کیا ہے۔ اس پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے عرض کیا لَوْ عَلِمْتُ بِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَحَبَّرْتُهٗ لَكَ تَحْبِيْرًا۔ یا رسول اللہ اگر مجھے یہ خبر ہو جاتی کہ آپ میرا قرآن سُن رہے ہیں تو میں آپ کی خاطر اور زیادہ بنا سنوار کر پڑھتا — اور حضور نے ان کے قول پر نکیر نہیں فرمایا پس آپ کی تقریر سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضور کی خاطر سے قرآن کو بنا سنوار کر پڑھنا جائز تھا۔ کیونکہ اس میں تطییب قلب نبی تھی اور یہ ریا نہیں کیونکہ یہ بھی خدا ہی کے لیے سنوارنا ہے کیونکہ حق تعالیٰ ہی نے تطییبِ قلب نبی کا امر فرمایا ہے۔ حضور کا راضی کرنا خدا کا راضی کرنا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اس درجہ میں آپ کے خوش کرنے کے لیے پڑھنے کو یوں نہ کہا جائے گا۔ کہ غیر حق کے لیے پڑھا مجھ سے ایک دوست نے پوچھا کہ حاجی صاحب نے لا الہ الا اللہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ "لا الہ" کہتے ہوئے یہ تصور کرے کہ غیر حق قلب سے نکل گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قلب سے نکالے۔ میں نے کہا نہیں۔ کیونکہ صوفیہ کی اصطلاح میں جو کہ محاورات کے موافق ہے۔ غیر کہتے ہیں بے تعلق کو۔ اور فلاسفہ غیر کہتے ہیں متغائر فی الحقیقۃ والماہیۃ کو اور حاجی صاحب کی مراد غیر سے اصطلاح صوفیہ کی ہے نہ کہ فلاسفہ کی۔ پس چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے بے تعلق نہیں ہیں بلکہ محبوب اور موصل الی اللہ ہیں۔ اس لیے آپ مصداق غیر کے نہیں ہیں۔ غرض جو کام ایسے شخص کے راضی کرنے کے لیے ہو جس کے ارضاء کا حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ وہ کام خدا ہی کے لیے ہے۔ (وعظ: عمل الشکر)

خانقاہِ امدادیہ: ۱۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۰ھ)

حقوق القرآن قرآن مجید کی تلاوت میں تین مرتبے ہیں : ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے۔ یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے مخرج سے ادا کرنا۔ اور ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا۔ یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے۔ وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ غرض کل تین حق ہوئے۔ ایک حق ظاہری یعنی تلاوت۔ دوسرا حق باطنی یعنی معنی سمجھ لینا۔ تیسرا عمل کرنا۔ یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابطن کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ فیما بینہ وبین اللہ ہے۔ ان تینوں میں وجوداً سب سے مقدم حق ظاہری ہے اور موکد سب سے زیادہ تیسرا درجہ ہے یعنی عمل۔ ان دونوں میں حقیقت اور صورت کا فرق ہے۔ اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صورت مقدم ہوتی ہے اور ضروری دونوں ہیں۔ پس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت کے عاطل۔ (حقوق القرآن ص ۴)

تصحیح الفاظ بقدر وسعت بعض لوگ فن قرأت کو حاصل نہ کرنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم قاری تو ہونے سے رہے۔ پھر اس کے پیچھے کیوں پڑے، کام ہو تو پوری طرح ہو اور نہیں تو چھیڑنا فضول۔ یہ محض حیلہ نفس ہے۔ مانا کہ قرأت میں عاصمؒ اور حفصؒ نہیں ہو جاؤ گے تو دنیا میں بھی تو ہر شخص بادشاہ نہیں ہو جاتا۔ پھر دنیا کی طلب کیوں کرتے ہو۔ اس میں یہ قاعدہ جاری نہیں کرتے کہ کام ہو تو پوری طرح ہو ورنہ چھیڑنا فضول ہے۔

آپ کو صرف اس قدر تکلیف دی جاتی ہے کہ بقدر وسعت کوشش کرو اور بقدر ضرورت قرآن شریف کو صحیح کر لو۔ اگر آپ اپنی حیثیت کے موافق کوشش کریں تو قدر ضروری تو حاصل ہو جائے گا۔ بالفرض اگر کوشش پر کامیابی بھی نہ ہو تب بھی کچھ غم نہیں۔ کسی کا قول ہے ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم ۔۔۔۔۔ کہ من نیز از خریداران اویم

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا کہ فرماتے تھے طلب مقصود ہے وصول مقصود نہیں۔ اور ظاہر بھی ہے کہ اللہ میاں نے تکلیف مالا یطاق نہیں دی صرف امور اختیاریہ کی تکلیف دی ہے اور مقصود تک پہنچ جانا بندے کے اختیار میں ہے نہیں تو اس کی تکلیف کیوں ہو گی۔ کیا اچھا کہا گیا ہے ؎

گر مرادت را مذاقِ شکر است ۔۔۔۔۔ بے مرادی نے مراد دلبر است

(حقوق القرآن ص۱۰)

تلاوتِ بلا فہم بھی باعثِ اجرِ عظیم ہے

امام احمد بن حنبل کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا قراۃ القرآن (قرآن پڑھنا)۔ امام صاحب نے عرض کیا بفہم او بلا فہم؟ (سمجھ کر یا بلا سمجھے؟) ارشاد ہوا بفہم او بلا فہم۔ (سمجھ کر یا بلا سمجھے) یعنی کسی طرح ہو۔

اور کچھ مدار اس کا خواب ہی پر نہیں بلکہ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حروف صرف الفاظ ہیں ان کی تلاوت بلا فہم پر بھی تلاوت صادق آتی ہے۔ معلوم ہوا کہ بلا فہم بھی قبول تام ہے گو بفہم اتم ہوتا ہے۔

تلاوتِ قرآن میں صرف ایک یہی فائدہ نہیں کہ ہم اس کے معنی کو سمجھیں بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہم سے خدا تعالیٰ راضی ہوں۔ اور یہ بات عقل اور عادت کے موافق بھی ہے کہ اگر مصنف کسی کو اپنی کوئی کتاب پڑھتے دیکھے تو اگرچہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص بلا سمجھے پڑھ رہا ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے کلام پر توجہ کی اور اس کی قدر کی۔ مصنف کو پڑھنے والے سے ضرور محبت ہو

جائے گی اور دل میں اس کی قدر ہوگی۔ اسی طرح کلام خداوندی کو جب ہم پڑھیں گے تو خدا تعالیٰ ضرور خوش ہوں گے اور متوجہ ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ کسی طاعت پر اتنا متوجہ نہیں ہوتے جتنا قرأت قرآن پر متوجہ ہوتے ہیں۔ بہرحال قرآن شریف کی تلاوت میں آپ نے سُنا کہ کیا اجرِ عظیم ہے۔ افسوس ہے کہ اس اجرِ عظیم کو چھوڑ کر ہوا و ہوس کے بندوں نے کلام اللہ کو جو کہ رضاءِ خداوندی کا ذریعہ تھا۔ دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیا ہے کہ روپیہ لے کر اور مقرر کر کے قرآن سناتے ہیں یہ صریح دین فروشی ہے لیکن تعلیم قرآن کو اس پر قیاس نہ کیا جائے کیونکہ تعلیم قرآن پر تنخواہ لینا جائز ہے۔

(احکام عشرۂ اخیرہ ص ۱۸، ۱۷، ۱۱، ۱۰)

رونمائے رب

قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں:

چیست قرآں اے کلام حق شناس ۔۔۔ رونمائے ربِّ ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنئے ۔۔۔ معنے در معنئے در معنئے

اور رونما اس واسطے کہا کہ خدائے تعالیٰ کو دنیا میں بلا واسطہ تو دیکھ نہیں سکتے۔ پس کلام اللہ کو پڑھنا گویا دیدار خداوندی سے محظوظ ہونا ہے۔ اس موقع پر مجھے زیب النسا متخلص بہ مخفیؔ کا شعر یاد آیا ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اسی طرح ہمارا مطلوبِ حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں بوجہ اس کے کہ ہم اس کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے گویا فرما رہے ہیں ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اور وہ سخن یہی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے کہ ع معنی در معنی در معنی۔

جس قدر زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف ہوتے جائیں گے اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی لطف آتا ہے اور عالم کو بھی مزا آتا ہے۔ صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے ؎

بہارِ عالمِ حسنش رگ و جاں تازہ میدارد
برنگ اصحابِ صورت رابہوارباب معنی را

اور اگر کہا جائے کہ یہ سارا لطف خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ آخر وہ لطف اور وہ ربودگی جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی اس میں وہ مزا کیوں حاصل نہیں ہوتا اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزہ آتا ہو تو وہ ابھی قابلِ خطاب ہی نہیں اس کو چاہیے کہ صحت ادراک و سلامتِ حال پیدا کرنے کی کوشش کرے، پھر موازنہ کرے۔ لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آئے تو وہ تلاوت کو ترک نہ کرے اس لذّت کو حاصل کرنے کی کوئی تدبیر سوائے اس کے نہیں کہ ہمت کرکے پڑھنے لگو چند روز میں جب تمہارا قلب عالم طفلی سے نکل کر سن بلوغ کو پہنچے گا خود بخود اس کو یہ لذّت حاصل ہوگی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ خاص بلوغ اس وقت حاصل ہوگا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں ہوائے نفسانی کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً اس ہوائے نفسانی کا اتباع چھوڑ دو اور اطاعتِ خدا و رسول میں سرگرم ہو جاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہی ہے ؎

خلق اطفالند جز مستِ خدا　　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(دعوات جلد دوم ص۱۲۶)

جلوہ گاہِ متکلّم

حضراتِ صحابہؓ کی بھی کیا شان تھی کہ ان کو ہر وقت بارگاہِ وحی سے فیضان علوم ہوتا تھا اور الحمدللہ ہم بھی صاحبِ نصیب ہیں کہ ہم پر بھی ہر دم فیضان ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ وہاں فیضان بالمشافہ تھا اور یہاں

بالواسطہ ہے اور یہ فرق ایسا ہے جیسے ایک شخص سے محبوب سامنے ہو کر باتیں کرے اور ایک سے پردہ میں ہو کر باتیں کرے پس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی متجلی ہیں جیسا قرآن شریف میں اللہ سبحانہ جلوہ فرما ہیں ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

جب ایک معمولی شاعر کو یہ دعویٰ ہے کہ جو مجھے دیکھنا چاہے میرے کلام میں مجھ کو دیکھ لے حالانکہ وہ کلام کوئی عظمت نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تو بڑی شان ہے وہ تو واقعی جلوہ گاہ متکلم ہے پس اب یوں کہیں گے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است

خم و خمخانہ با مہر و نشان است

اگر یہ دولت بھی نہ ہوتی تو عشاق کی زندگی کس طرح ہوتی۔

(الفصل والانفصال)

قرآن کے عجائب ختم نہیں ہونگے حدیث میں قرآن کی نسبت آیا ہے کہ "قرآن بار بار تکرار کرنے سے پرانا نہیں ہوتا" بلکہ اس میں ہر دفعہ نیا لطف آتا ہے جیسے محبوبوں کے دقائق حسن روزانہ نئے نئے مدرک ہوتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ؎

یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا

پس وہ حال ہے ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

حضرت شیخ شیرازی اسی کو فرماتے ہیں ؎

دل آرام در بر دل آرام جوے لب از تشنگی خشک بر طرف جوے
نگویم کہ بر آب قادر نیند کہ بر ساحل آب مستسقی اند

صاحبو! جب بعض لوگوں نے محبوبانِ مجازی کی نسبت عدم احاطۂ حسن کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

کہ بعض اداؤں کی لفظوں سے تعبیر نہیں کی جا سکتی بلکہ وہ وجدانی امور ہیں جن کو عاشق کا دل ہی سمجھتا ہے۔ تو اب محبوبِ حقیقی کے غیر متناہی حسن کا ادراک ایک دم سے کیونکر ہو سکتا ہے۔ قرآن و حدیث کے علوم کا جو کہ محبوب کا ایک حسن ہے۔ سچ مچ یہی حال ہے کہ ان کی انتہا نہیں اس لیے حضورؐ نے دوسری عبارت میں اس کو صاف طور پر ارشاد فرما دیا کہ قرآن کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے۔" (تواصی بالحق ص۵)

اعجازِ قرآن کسی شخص کی قدرت میں نہیں کہ وہ کسی آیت کی تفسیر اور تشریح اس قدر کر سکے کہ جس کے بعد اس کے تحت میں مسائل نہ رہیں۔ نکات و مضامینِ عالیہ قرآن شریف کے ختم ہونے والے نہیں۔ یہی تو اعجاز ہے کلام مجید کا جس نے تمام دنیا سے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق کرا دی ؎

چیست قرآن اے کلامِ حق شناس رونمائے ربِّ ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنے معنے در معنے در معنے

ربُّ العزّت تک پہنچانے والا زینہ قرآن شریف خدا کو دکھلانے والا آئینہ اور ربُّ العزّت تک پہنچانے والا زینہ ہے کہ اس کی شاہراہ پر پڑ کر انسان کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا مقصودِ حقیقی تک انشاء اللہ ضرور پہنچ جائے گا۔ کیوں کہ فی الحقیقت قرآن شریف ایک تجلّی ہے۔ تجلّیاتِ خداوند تعالیٰ سے اور جو شخص تجلّی حق کو

رہنما بنائے گا وہ کیونکر اس تجلی کے مبدءِ حقیقی تک نہ پہنچے گا۔

کلام مجید خدا کا عجیب و غریب لذیذ و پُر اسرار کلام ہے جس کی تہ کو پہنچنا اور اس کے جمیع نکات و معنی کو سمجھنا قوتِ بشریہ سے خارج ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت کی قدر کریں۔ اور اس کی تلاوت کی طرف خاص توجہ کریں اور اس کے نکات و معانی سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مطلب پر غور کریں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔ (دنیا و آخرت ص ۱۴۲، ۱۰۴)

صحابہؓ کے علوم کا منبع

حضرات صحابہؓ میں بہت ایسے بھی تھے جن کو لکھنا تک نہ آتا تھا اپنے دستخط بھی نہ کر سکتے تھے مگر ہم کو اس پر فخر ہے کہ باایں ہمہ تمام عالم کے فصحاء، بلغاء، و حکماء و عقلاء کو انہوں نے نیچا دکھا دیا ہے کیونکہ دین کا علم ان کو پوری طرح حاصل تھا۔ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے اور جس پر ہم تمام دُنیا کو دعوت دیتے ہیں کہ کوئی ایسی تعلیم مقابلہ میں لائے جیسی قرآن کی تعلیم ہے حتّٰی کہ آج ایک ادنیٰ طالب علم دعویٰ کر سکتا ہے کہ تمام عالم قرآن کی بلاغت و حکمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بس یہی علم تھا جو صحابہؓ کے پاس تھا اور وہ بھی محض زبانی تھا جو لکھنے پڑھنے سے حاصل نہ ہوا تھا بلکہ محض سننے سنانے سے حاصل کیا گیا تھا، مگر حضورؐ کے فیض صحبت سے اور اس زبانی علم ہی سے ان کا عقل و فہم اس قدر عالی ہو گیا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ جو فقہ و معانی کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ صحابی کی تقلید واجب ہے میں قولِ صحابی کے سامنے قیاس کو ترک کر دوں گا۔"

(تواصی بالحق ص۱۴۱)

کلام پاک طب روحانی ہے

...... ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کتاب کا کمال اس کے موضوع کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی جس فن کی وہ کتاب ہے اس میں یکتا ہونا اور زوائد سے خالی ہونا یہی اس کی خوبی ہے۔ کلام پاک طب روحانی

ہے جن میں امراض روحانی اور ان کا علاج مذکور ہے اور اس کا ثمرہ ہلاکت ابدی سے نجات ہے۔ اس فن کے علاوہ بزرگوں کی تفسیروں میں اگر کچھ چیزیں ملتی ہیں سو وہ مدلولیت کی حیثیت سے نہیں بلکہ لطائف کے درجہ میں ہیں۔

ہاں ضمناً تبعاً کوئی مسئلہ اس حیثیت سے آجائے کہ اس کو بھی طب روحانی میں دخل ہو تو اور بات ہے۔ مثلاً مصنوع سے صانع پر استدلال ان فی خلق السمٰوٰت... ان چیزوں سے تحقیقات منظور نہیں۔

ماہیات بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود قدرت پر استدلال ہے... جن امور کو فلاح اخروی میں دخل ہے خواہ اس کا وقوع دنیا میں ہو یا آخرت میں ہو اس میں ہم کو قرآن مجید کی ضرورت ہے۔

..... باقی اور علوم جو بزرگوں نے قرآن پاک سے نکالے ہیں ان کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں مدلولِ قرآن نہیں ہیں یوں نہ کہیں گے کہ ثابت بالقرآن ہیں ہاں منطبق موافق کہہ دیں گے۔

صوفیہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر نہیں ہیں۔ ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ فرعون سے نفس اور موسیٰؑ سے روح اور وغیرہ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرما رہے ہیں۔ یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علمِ اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو قیاس کیا جائے ..... اور یہ تاویلات لطائف اور نکات کے درجہ میں ہیں تفسیر نہیں ہیں ..... قرآن شریف کے ہر ہر موقعہ سے اپنی حالت پر مطابقت کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ۔

افسوس ان پر جو کوشش کرتے ہیں کہ سب مسائل قرآن سے ثابت ہو جائیں

محرفین پر تو زیادہ افسوس نہیں کہ وہ تو اپنے مطلب کے لیے تفسیر بالرائے کرتے ہیں مگر افسوس ان پر ہے جو قرآن شریف کو مانتے ہیں اور پھر

اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب احکام قرآن سے ثابت ہوجائیں۔ واللہ اس وقت وہ حالت ہے کہ دیندار اور بے دین سب کی حالت خراب ہے۔ وہ شعر یاد آتا ہے جو کسی نے حضور میں عرض کیا ہے ؎

اے بسرا پردہ یثرب بخواب　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

ایک صاحب مجھ سے ملے کہنے لگے کہ ڈاکٹری تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ منی میں کچھ کیڑے ہوتے ہیں۔ مجھے مدت سے خیال تھا کہ قرآن کی کسی آیت سے بھی یہ ثابت ہو تو اچھا ہے۔ چنانچہ ایک روز میں قرآن شریف پڑھ رہا تھا۔ اس میں یہ آیت نکلی: خلق الانسان من علق اور علق جونک کو کہتے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ بھلا خیال تو فرمائیے کہ آیت کے یہ معنی ہیں؟ کہاں جونک کہاں کیڑے۔ کہاں ڈاکٹری کے مسائل کہاں قرآن شریف؟ اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص فن طب کی کتابوں میں کپڑا بننے کی ترکیب تلاش کرنے لگے۔

صاحبو! جس فن کی کتاب ہو اس فن کے مسائل اس میں تلاش کرنے چاہئیں۔ قرآن شریف جغرافیہ نہیں کہ اس میں جغرافیہ کے مسائل ڈھونڈیئے۔ طب ابدان نہیں کہ نجار کھانسی کی ادویہ اس میں ملیں۔ قرآن شریف طب روحانی اور تہذیب نفس کی کتاب ہے۔ اس میں بجز طبِ روحانی کے دوسرے مسائل کی تلاش سعی بے حاصل ہے۔ اور اگر کسی دوسری چیز کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ بھی کسی روحانی مرض کے دفع کے لیے۔ مثلاً منجملہ امراض روحانی کے ایک مرض جہل باللہ و بصفاتہ بھی تھا۔ قرآن نے اس کو دفع کیا اور اس ضرورت کے لیے یہ فرمایا کہ انّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الّیل والنّہار جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کو معلوم کرنے کے لیے مصنوعات میں غور کرو۔ مثلاً آسمان کے وجود میں، زمین کے وجود میں رات اور دن کے وجود میں، مگر نہ اس حیثیت سے کہ آسمان سیّال ہے یا نہیں اور زمین کُروی الشکل ہے یا مسطح بلکہ

مطلق وجود اور مصنوع ہونے کے اعتبار سے پس قرآن میں ایک مسئلہ بھی سائنس کا بحیثیت سائنس کے مذکور نہیں۔ اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کیونکہ کسی طب کی کتاب میں جوتے بنانے کی ترکیب نہ ہونا اس کتاب کا کمال ہے۔

مسلمانو! خدا کی قسم یہ قرآن کا غایت درجہ کمال ہے کہ اس میں یہ خرافات نہیں ہیں نہ قرآن کو اس کی ضرورت کہ زبردستی اس میں ان مسائل کو داخل کیا جائے۔ ع

بہ نقاش احتیاج نیست دیوار گلستاں را

اگر قرآن میں یہ خرافات ہوتے تو قرآن شریف کتاب الطبیعات ہوتی نہ کہ طب روحانی۔ لہٰذا قرآن شریف سے کیڑوں وغیرہ کا وجود ثابت کرنے کی کوشش "دوستی بے خرد چوں دشمنی ست" ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ اگر ان مسائل سائنس پر قرآن شریف کی تفسیر کی بنا رکھی جائے اور چند روز کے بعد یہ دعاوی سائنس کے کاذب ثابت ہوں تو اس کی کیا تدبیر کی جائے گی کہ ملحدین اس وقت آپ کو کہیں کہ دیکھیے تمہارے محققین اس مسئلے کو قرآن کا مدلول بتلا گئے ہیں اور یہ مسئلہ غلط ثابت ہوا تو قرآن کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔ اس کا کیا جواب دو گے؟

افسوس ہمارے بھائی مسلمان ذرا غور نہیں کرتے کہ اس کا کیا انجام ہو گا اور بالکل نہیں سمجھتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سمجھنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ یا تو تحقیق ہو اس کا تو ان کے پاس سامان نہیں۔

۲۔ یا علماء کی تقلید ہو اس سے عار آتی ہے۔

(تقویم الزیغ ص۱۳)

مدعیانِ قرآن دانی

آج کل کے مدعیانِ قرآن دانی کے متعلق فرمایا کہ یہ تو ان نا اہلوں کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہیں اور تفسیر کر

سکتے ہیں۔ اس کے لیے ذوق سلیم اور فہم سلیم کی ضرورت ہے اور وہ پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ سے اور بدون تقویٰ کے تو فہم کہاں نصیب۔ گو نظر بھی وسیع ہو۔ اس وسعت نظر او عمق فہم پر میرے ایک دوست نے عجیب بات کہی تھی کہ متبحر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کدو متبحر۔ ایک مچھلی متبحر۔ کدو تو دریا کی تمام سطح پر پھر جاتا ہے مگر اس کو یہ خبر نہیں کہ دریا کے اندر کیا چیز ہے اور ایک مچھلی ہے کہ عمق میں پہنچتی ہے۔ گو تمام دریا پر نہ تیرے۔ سو یہ آج کل کے مدعی کدو متبحر ہیں۔ اُوپر اُوپر پھرتے ہیں۔ اندر کی خاک بھی خبر نہیں۔ جیسے ایک انگریز نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم اُردو جانتا ہے اور میر کے اس شعر کی شرح کی تھی ؎

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہُوئے ہم ہُوئے تم ہُوئے کہ میر ہُوئے

شرح یہ کی کہ ہم اور تُم اور انڈیا کا بڑا بڑا آدمی سب اس کے بالوں میں پھنس کر جیل خانے چلا گیا۔ بس یہی حال ہے ان مدعیوں کا۔ خُوب سمجھ لو کہ قرآن مجید جیسا لفظاً معجزہ ہے اسی طرح معناً بھی معجزہ ہے۔ بدون نقل صحیح کے محض عقل کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی اور لفظی اعجاز کی سب سے واضح اور کلی دلیل یہ ہے کہ اہل زبان نے اس کو خدا کا کلام تسلیم کیا۔ (الافاضات ع۲ ملفوظ ۲۵۸)

قرآن و حدیث سمجھنے کی شرائط

فرمایا کہ جو شخص علوم عالیہ کو حاصل کیے ہوئے ہو تب قرآن و حدیث کو سمجھ سکتا ہے۔ اب جاہلوں کی اصطلاحوں کو کلام میں ٹھونس کر کام نکالنا چاہتے ہیں جس سے بالکل غیر ممکن ہے کہ حقیقت کا انکشاف ہو سکے۔ اور ان علوم کے ساتھ اس انکشاف کے لیے ذوق کی بھی ضرورت ہے اور ذوق بدون کسی کامل کی صحبت کے پیدا نہیں ہو سکتا مگر ان چیزوں کا اہتمام ہی نہیں۔ اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ لوگوں کے قلوب میں خوف آخرت نہیں رہا اور نہ آخرت کی فکر ہے، اس لیے ہر شخص مُقرر ہے، ہر شخص مُفسّر ہے، ہر شخص محدّث ہے، ہر شخص مصنّف ہے۔ آزادی کا زمانہ ہے۔ نہ اصول ہیں، نہ قواعد،

جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ اگر فکرِ آخرت ہو تو ہر چیز میں احتیاط اور حقیقت کی تلاش ہو اور اس کے لئے اس کے اسباب کی کوشش ہو

(الافاضات ج ۴ ص ۲۰۵ ملفوظ نمبر ۴۳)

قانون کا ترجمہ وکیل سے مستغنی نہیں کرسکتا

ترجمہ کو اردو میں دیکھ کر ایسا آسان سمجھا جاتا ہے کہ کسی سے اس کے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور اس سے بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قانون بھی اُردو میں موجود ہے تو چاہیئے کہ وکیل کی بھی ضرورت نہ سمجھیں حالانکہ ہم نے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ ایک نسخہ زکام کا بھی کتاب میں دیکھ کر بلا طبیب کے مشورہ کے یا ایک کرایہ نامہ بھی بلا مشورہ وکیل کے لکھا ہو۔ کوئی وجہ فرق بیان کی جائے۔ بس فرق یہی ہے کہ دُنیا کے کاموں کی وقعت ہے ان میں بدون مہارتِ کاملہ کے دخل دینا پسند نہیں کرتے اور دین کی وقعت نہیں اس میں ہر شخص مجتہد بنا ہُوا ہے۔ (وعظ: القاف)

محض ترجمہ دیکھ کر قرآن کا سمجھنا دشوار ہے

ترجمہ اُردو کا مطالعہ بھی میں سچ کہتا ہوں بجز عالم کے کسی کا کام نہیں۔ بہت سے واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ترجمہ دیکھنے والوں کو بہت سے مضامین کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ کیوں کہ بہت سے مضامین کا سمجھنا مبادی پر موقوف ہوتا ہے اور مبادئ قرآن صرف و نحو و بلاغت و ناسخ و منسوخ و اصولِ فقہ وغیرہ ہیں جب تک کوئی شخص مبادی سے جاہل ہے۔ وہ ان مضامین کو کس طرح سمجھ لے گا جو ان پر موقوف ہیں۔

(وعظ: المراد)

بعض مسائل کا سمجھنا ان کے مقدمات پر موقوف ہے

ایک نو تعلیم یافتہ نے مجھ سے ایک باریک مسئلہ پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کو یہ میرا جواب بہت ناگوار ہُوا۔ کہنے لگے اس کی کیا وجہ کہ میں اس کو

نہیں سمجھ سکتا؟ میں نے کہا کہ وجہ یہ ہے کہ اس کے سمجھنے کے لیے جن مقدمات ومبادی کے جاننے کی ضرورت ہے۔ آپ نے ان کو نہیں جانا اور جس بات کا علم مقدمات ومبادی پر موقوف ہو اس کو بدون ان کے جانے ہوئے سمجھنا دشوار ہے اور اگر آپ اس کا دعویٰ کریں کہ بدون مقدمات ومبادی کے بھی سمجھ سکتا ہوں تو پہلے آپ میرے سامنے ایک گھس گھدے کو جس نے اقلیدس کے مقدمات واصولِ موضوعہ معلوم نہیں کیے۔ اقلیدس کی کوئی شکل سمجھا دیں اور میرے سامنے اس سے تقریر بھی کرادیں تو میں بھی اس مسئلہ کا جواب بدون مقدمات ومبادی کے آپ کو سمجھا دوں گا۔ (الفاظ القرآن)

کلام اللہ کا ہمارے پاس ہونا محض فضل ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنی کتاب اتاری جو مجموعہ ہے اوراد کا قصص وحکایات کا اور احکام کا اور جامع ہے تمام بھلائیوں کو۔ قطعِ نظر تمام خوبیوں سے محض کلام اللہ ہی ہونا اس کا مقتضی اس امر کا ہے کہ ہم جیسے ناچیز بندوں کی اس تک رسائی بھی نہ ہوتی۔ کہاں وہ کلامِ مقدس کہاں ہم حقیر بندے۔ دنیا کے ذرا ذرا سے بادشاہوں کے دربار کی حاضری کے لیے لوگ عمریں گزار دیتے ہیں تب کہیں سلام وکلام کا موقع ملتا ہے۔ کلامِ الٰہی اگر کچھ بھی نہیں تو دو چار سو برس کی محنت کے بعد تو نصیب ہونا چاہیے۔ مگر نہیں کس درجہ رحمت ہے اللہ میاں کی کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنی کتاب دے دی اور اذنِ عام دے دیا کہ جس کا جس وقت جی چاہے ہم سے باتیں کرے۔ پھر صرف اذن ہی نہیں بلکہ مطالبہ بھی ہے بندوں سے کہ باتیں کرو۔ اب ہم بندے اپنی ذلّت اور احکم الحاکمین کی عزّت کو پیشِ نظر کر کے دیکھیں کہ یہ باتیں کرنے کی فرمائش کیا چیز ہے سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ محض فضل ہے۔ (حقوق القرآن ص۳)

مخارج قرآن مجید کے بارے میں کوتاہیاں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض دو امام بھی پڑھتے ہیں مگر اس کی تصحیح کی طرف اصلاً توجہ نہیں فرماتے نہ مخارج کی خبر نہ صفات کا اہتمام نہ نقص و زیادت سے تحاشی۔

کوئی صاحب "ض" کو صاف مخرج "ظ" سے ادا کرتے ہیں اور کوئی صاحب مخرج "د" سے۔ ث۔ س۔ ص میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، الف کے موقع پر نرا فتح پڑھنا اور فتح کی جگہ الف ملا دینا بعض کی عادت ہو گئی ہے۔ نہ بے موقع وقف کر دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے بعض مواقع پر معنی میں فساد ہو جاتا ہے اگر سانس ٹوٹنے سے اس کی طرف مضطر ہو۔ تو ایسا کرے کہ جس لفظ پر وقف کیا ہے اس کا پھر آگے پڑھنے میں اعادہ کرے۔ البتہ وصل سے ایسا فساد لازم نہیں آتا۔

اہل علم کی کوتاہیاں

نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے کہ اس کوتاہی میں اہل علم کا نمبر غیر اہل علم سے کچھ بڑھا ہوا ہے حتی کہ ایک صاحب سورہ ناس میں "من الجنّۃ والناس" کو اس طرح پڑھتے ہیں "من الجنات والنس"۔ پھر بعضے ان میں مساجد کے امام ہوتے ہیں۔ اس وقت اس غلطی کا اثر دوسروں تک بھی دو طور سے پہنچتا ہے۔

ایک یہ کہ اگر کوئی مقتدی صحیح خواں ہوا۔ تو ان کی نماز ان امام صاحب کے پیچھے نہیں ہوتی اور چونکہ غلط خواں کا حکم صحیح خواں کی نسبت سے اُمّی کا سا ہے بہ نسبت قاری کے، اس لیے اس خاص صورت میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ دوسرے مقتدیوں کی، پس کتنی بڑی تباہی کی بات ہے؟ ہر چند کہ تجوید کے وجوب کے متعلق کلام طویل و مقتضی تفصیل ہے مگر اتنی قدر میں کسی کو کلام نہیں کہ جس قسم کی غلطیوں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان کی تصحیح واجب علی العین ہے جب تک کہ عدم قدرت و عدم مساعدتِ لسان متیقن نہ ہو جائے جس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ بدون اس

قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی اور عربیت بدلالت خصوص لوازم قرآن سے ہے پس اس کے نہ رہنے سے قرآن نہ رہے گا۔ پس اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہو سکتا ہے؟

اس میں قرآن کی یا عربی کی کیا تخصیص ہے؟ ہر زبان کی صحت اس کے خاص طرز ادا پر موقوف ہے مثلاً "پنکھا" اور "رنگ" میں اخفا ہے۔ اگر نون میں اظہار کیا جاوے یقیناً لفظ غلط ہو جاوے گا۔ اور لفظ "کھنبا" اور "دنبہ" میں اقلاب ہے، اگر یہ نہ ہو تو یقیناً لفظ غلط ہو جاوے گا۔ مگر بات یہ ہے کہ قلوب میں ادراک نہیں رہا۔ نعماء آخرت کی رغبت، نعماء دنیا کے برابر نہیں رہی اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن (بقرہ ۱۵۵)

تصحیح قرآن صرف دو ہفتہ میں

کل حروف اٹھائیس ہیں۔ ان میں بعض بعض تو قریب قریب صحیح نکلتے ہیں۔ ان کو مستثنیٰ کر کے جن میں اہتمام کی حاجت ہے۔ تقریباً ایک ربع یعنی سات ہیں، جیسے ث ۔ ح ۔ د ۔ ص ۔ ض ۔ ط ۔ ظ اور جو بالکل دیہاتی ہیں۔ ان کے لیے اتنے ہی اور ہیں جیسے خ ۔ ز ۔ ش ۔ ع ۔ غ ۔ ق ۔ اگر کسی ماہر کو تلاش کر کے ایک گھنٹہ روزانہ مشق کے لیے نکالا جائے تو روزانہ ایک حرف کی ضروری مشق ہو سکتی ہے جس میں ایک ہفتہ اور دیہاتی کے لیے دو ہفتہ کافی ہیں۔ اگر احتیاطاً اس سے دوگنی مدت لی جائے تو آدھا مہینہ اور ایک مہینہ غایت غایت صرف ہوتا ہے تو کیا دین کی اتنی بڑی ضرورت کے لیے اپنی اتنی بڑی عمر میں سے اتنا حصہ بھی نہیں دے سکتے ہو؟ کتنا بڑا غضب اور ستم ہے؟

اسی طرح فتح اور الف کی مقدار کا فرق، اگر ایک پارہ میں اس کی درستی ہو جائے تو تمام قرآن یکساں ہی تمام کے لیے کافی ہے۔ اگر ایک رکوع روزانہ درست کر لیا

جائے، تو یہ کام بھی پندرہ بیس روز سے زیادہ کا نہیں ہے۔ پھر بقیہ قرآن بھی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی ماہر کو سنا دینا، جو متفرق اوقات میں نہایت سہل ہے زیادہ اطمینان اور احتیاط کی بات ہے۔

بعض لوگوں کو ماہر قراۃ میسر نہ آنے کا بہانہ ہوتا ہے لیکن اول تو اتنی تھوڑی مہارت رکھنے والے اکثر جگہ ایک دو پائے جاتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی میسر نہیں تو چند آدمی مل کر کسی ماہر کو بلا کر رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں کوئی طبیب نہیں رہا بستی والوں نے چندہ کر کے تنخواہ دار طبیب کو رکھا ہے۔ پس فرق وہی ضرورت اور عدم ضرورت کے اعتقاد یا استحضار اعتقاد کا ہے۔ یا بستی میں سے دو چار ہونہار شخصوں کو سفر میں بھیج کر ماہر بنوا سکتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے عموم کلام میں یہ صورت بھی داخل ہے۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (التوبہ: ۱۲۱) (سو کیوں نہ نکلا؟ ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصّہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں) بلکہ اگر باہر سے کسی ماہر کو بلا کر رکھا جائے یا بستی میں سے کسی کو باہر بھیج کر ماہر بنوایا جائے تو اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے کہ بچے جس وقت قرآن پڑھیں، پڑھنے کے ساتھ ہی اس تصحیح کا اہتمام رہے یعنی اس میں گونہ تکلیف ہے کہ غلط یاد کر کے پھر تصحیح کی جائے اگر ابتداء ہی سے صحیح پڑھا جائے۔ پھر بالخصوص زمانہ بچپن میں تو یہ صحت ان کے لیے مثل امر طبعی کے ہو جائے اور مشقت کا ایک بڑا حصّہ مختصر ہو جائے

الفاظ و معنی کے آداب میں کوتاہیاں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اس کے الفاظ یا معنی کا ادب بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔

چنانچہ جہری نماز میں قراۃ امام کی طرف توجہ نہیں کی جاتی حالانکہ امر فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ (سورہ الاعراف: ۲۰۴) (تو اس کی طرف کان لگائے رہو) کو داخل نماز کے وجوب کے لیے کہا گیا ہے۔ خارج نماز کے تلاوت کرنے والے کی آواز پر اپنے دنیوی مخاطبات

میں آواز کو بلند کیا جاتا ہے حالانکہ لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ (سورہ الحجرات:۱) یعنی بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے) علماء نے درس حدیث کے وقت رفع صوت کو منع کیا ہے۔ فضلاً عن القرآن (چہ جائیکہ قرآن مجید)

اگر کوئی پڑھنے والا غلط پڑھتا ہے اس کو بتلایا نہیں جاتا حتیٰ کہ اساتذہ اپنے شاگردوں سے سنتے ہیں اور نہیں ٹوکتے اور وہ غلطیاں عمر بھر کے لئے ان کی گلوگیر ہو جاتی ہیں......!!

بعض حفاظ تراویح میں دوسری جگہ جا کر پڑھنے والوں کو کبھی کھٹا کھٹا کر کبھی کھنکھا کر کبھی غلط بتلا کر پریشان کرتے ہیں۔ کیا قرآن مجید سننے کا یہی ادب ہے؟

اور اسی طرح استماع معانی یعنی وعظ کے وقت بعضے آدمی آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں حالانکہ آیہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ الخ (اور جب قرآن پڑھا جائے)۔ سے اور آیہ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (پھر کیا ہوا ہے ان کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں) سے یہ حرام ہے ہاں کسی عذر سے وہاں نہ بیٹھ سکنا یا اُٹھ کر چلے جانا، مضائقہ نہیں وہاں حاضر رہ کر دوسری طرف مشغول ہونا یہ مذموم ہے۔

غرض یہ سب مذکورہ کوتاہیاں اور جو ان کے اشباہ و نظائر ہوں ان سب کا تدارک کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم مضمون کے درمیان میں ہر ایک کے تدارک کا نہایت آسان آسان طریقہ بھی بتلاتے آئے ہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ قیامت میں کہیں ہماری وہی حکایت نہ ہو۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (الفرقان:۲۹) (اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھیرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک) پھر اس وقت کی حالت دیکھ کر یہ کہنا پڑے۔ نعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسول اللہ (یعنی ہم اللہ سے اللہ کے غضب سے اور اللہ کے رسول کے غضب سے پناہ پکڑتے ہیں) مگر وقت ہوگا کہ لا ینفع النادم ندمہ حیث ان الندم عمل

وھو دار الجزاء لا دار العمل۔ اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضی واجعل آخرتنا خیرا من الاولیٰ (یعنی شرمسار کو شرمندگی نفع نہ دے گی اس وجہ سے کہ ندامت ایک عمل ہے اور وہ دار الجزاء ہے نہ کہ دار العمل)

قرآن سے نام نکلوانا ادب کے خلاف ہے

نیز بعض متفرق کوتاہیاں قرآن مجید کے معاملہ میں کہ اس کے الفاظ یا معانی یا نقوش یا اس کے مقاصد و اغراض ادب کے خلاف ہیں، اور بھی خیال میں آئیں وہ بلا لحاظ کسی خاص ترتیب کے معروض ہیں۔

(۱) بعض کی عادت ہے کہ بچہ کا نام رکھنے کے لئے قرآن مجید میں کسی خاص طریقہ سے جو خود ان کا مقرر کیا ہوا یا ان کے کسی معتقد فیہ سے (عام اس سے کہ اس اعتقاد کا مبنی صحیح ہو یا غلط) منقول ہوتا ہے غور کرتے ہیں تو اتفاق سے اس موقع پر کوئی نام لکھا ہوا مل گیا تو وہ، ورنہ کوئی حرف جو شروع سطر وغیرہ میں مل گیا لے کر اس حرف سے جو نام شروع ہو وہ نام متعین کر دیتے ہیں۔ اور اگر جاہل ہوئے تو خود سمجھتے ہیں ورنہ دوسرے جاہل کو یوں سمجھاتے ہیں کہ قرآن مجید سے اس نام کا رکھنا نکلا ہے بعضے اس نام نکلوائی پر کچھ نذرانہ بھی وصول کرتے ہیں اور جہلا یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ حضرت نے بڑی توجہ سے عالم غیب کا راز منگا دیا ہے ان کی خدمت ضروری ہو گئی ہے ــــ قرآن مجید میں جس غرض کے لئے موضوع نازل ہوا ہے جس کی تصریح خود کلام مقدس میں ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (ص: ۲۹)

یعنی (برکت والی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتوں پر اور تاکہ سمجھیں عقل والے) جس کا حاصل دین کا علم و عمل ہے اور اگر اس پر کوئی شخص کاربند ہو اور برکت کے لئے اپنی کسی مباح غرض میں بھی اس سے کچھ اقتباس کرلے تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ اس میں کسی حد شرعی سے تجاوز نہ ہو لیکن قرآن مجید

سے ان اغراض میں ایسے طور پر کام لینا کہ گویا قرآن اسی کام کا رہ گیا ہے جس کا قرینہ اور علامت یہ ہے کہ اس کے علم اور اس پر عمل کی طرف کبھی توجہ نہ کی جائے مگر ایسے موقعوں پر قرآن یاد آئے کیا یہ ظلم وضع الشی فی غیر محلہ (بیجا استعمال) نہیں ہے، پھر اس پر اور مزید اگر یہ سمجھا جائے کہ اس بچہ کا یہ نام ہونا یہ مفہوم قرآنی ہے، کیا یہ افتراء علی اللہ نہیں ہے؟ خاص کر وہ دوسری صورت کہ اگر حرف "خ" نکل آیا تو خدا بخش نام کو قرآن مجید کی طرف منسوب کرنا افتراء در افتراء ہے......!!

پھر اس پر کچھ وصول کر لینا کریلا اور نیم چڑھا کی مثال کا مصداق ہے۔ کیا یہ اشتراء دُنیا بالقرآن کی اقبح الافراد نہیں ہے؟

اگر نام برکت کا مقصود ہے۔ اول تو وہ قرآن کے ایسے مطالعہ پر موقوف نہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کے نام پر نام رکھ دو، اور "اسماء حسنی الٰہیہ" میں سے کسی نام کے ساتھ عبد لگا کر رکھ دو۔ بالخصوص عبد اللہ و عبد الرحمان کی بالتعیین ترجیح وارد ہے اور اگر قرآن سے بھی اس نام کا تلبس مقصود ہے تو کسی عالم محقق سے رجوع کیجئے۔ وہ قرآن کے کسی لفظ کی مناسبت کے لحاظ سے خواہ، قرآن دیکھ کر ایسے طریقہ سے کہ اس میں غلو نہ ہو جیسا عنقریب نمبر ۲ میں آتا ہے۔

یا قرآن کی بے دیکھے کسی محفوظ آیت سے کوئی نام بتلا دیں گے، نہ تلبس کی ضرورت اور نہ اس اعتقاد کی اجازت کہ قرآن میں اس نام رکھنے کا حکم نکلا ہے۔

اس قسم کی خرابیاں ان بندگانِ زر نے پھیلائی ہیں جو عوام کی نظر میں کوئی دینی امتیاز رکھتے ہیں۔ مثلاً خود مکر و فریب پیر بن گئے ہیں، یا کسی بزرگ کی اولاد میں ہوئے فی الواقع یا بالادعا ایسے امور کی نسبت حضرت عارف شیرازی[1] کا ارشاد ہے۔

---

[1] خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ (۱۵/۷ھ/۱۳۱۵ء) ان کی زندگی میں سات بادشاہ یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔ حافظ قرآن، عارف باللہ تھے۔ تفسیر کشاف کا حاشیہ لکھا، معقول و منقول کی،

دام تزویر مکن چوں دیگراں قرآں را (قرآن کو دوسروں کی طرح جھوٹ کا پھندہ نہ بناؤ

قرآن سے فال نکالنا (۲) بعضے کسی مقصد مباح یا غیر مباح میں اوفق بالمصلحۃ پہلو کی تعیین کے لئے اور بعضے اس سے بڑھ کر کسی گذشتہ واقعہ کے معلوم کرنے کے لئے قرآن مجید میں فال دیکھتے ہیں اس کے کسی مضمون سے اپنے مطلب کے مناسب کوئی بات نکال لیتے ہیں اور اس کی صحت کے معتقد ہوتے ہیں۔

افسوس! یہ آفت نیم علم لوگوں میں ہے، کیونکہ بے علم آدمی مضمون ہی کو نہیں سمجھے گا جو "ماخذ ہے"۔ "فال" کا، بخلاف امرِ اول کے نام لکھا ہوا دیکھ لینا، یا کسی حرف کا کوئی نام سوچ لینا یہ تو عامی بھی کر سکتا ہے۔

ہاں زبردستی کوئی بے علم یہاں بھی بین السطور ترجمہ دیکھ کر یا کسی ذی علم سے اس آیت کا ترجمہ پوچھ کر نیم عالموں میں داخل ہو جائے تو اور بات ہے،

بہرحال یہ کام وہ کرے گا جو اہل قرآن کو الٹا سیدھا کچھ سمجھے اس لیے ان لوگوں پر زیادہ افسوس ہے اور اس ناتمام علم سے اس کو "استخارہ" پر قیاس کیا جاتا ہے جب مقیس علیہ ثابت ہو تو مقیس بھی جائز ہ!

بعض فال دیکھنے والوں کا یا اکثر ان عام لوگوں کا جو جلسۂ فال میں موجود ہوں، یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ گویا خدائے تعالیٰ نے قرآن سے یہ خبر دے دی ہے، تو اب اس میں احتمال نقیض کا احتمال محال ہے اور نہایت جرأت سے کہتے ہیں کہ واہ صاحب! کیا قرآن میں غلط لکھا ہے؟ افسوس!! ان حرکات پر ہنسی شروع ہو کر اخیر میں رونا آتا ہے!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴) تطبیق کی۔ شیراز کے سبزہ زار "خاک مصلّٰی" میں (۷۹۱ھ / ۱۳۸۵ء) میں دفن کئے گئے تاریخ وفات بھی "خاک مصلّٰی" سے برآمد ہوئی ہے بجو تاریخش از خاک مصلّٰی ۷۹۱ یعنی اس کی تاریخ کو خاک مصلّٰی سے تلاش کرو۔ ۱۲ محمد علی۔

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ نمبر ایک میں جو بعض شکایتیں مذکور ہوئی ہیں کہ قرآن مجید کے علم و عمل کو چھوڑ کر، اس سے یہ کام لینا، یا اس کو مدلول قرآن اور فرمودۂ حق سمجھنا جو کہ افراد ظلم و افترا سے ہیں۔ یہاں بھی یاد دلائی جاتی ہیں کہ دونوں جگہ مشترک ہیں۔
اور ان کے علاوہ اور بھی بعض خاص تنبیہات قابل عرض ہیں۔

قرآن مجید میں تمام علوم ہونے کے معنی

مثلاً اس میں اس اعتقاد کے ساتھ کہ قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق یہ خبر نکلی ہے۔ "قرآن مجید میں تحریف معنوی لازم آتی ہے" کیونکہ ظاہر بات ہے، کہ قرآن کی تفسیر دوسری ہے جس میں یہ واقعہ ہرگز داخل نہیں اور اگر کسی پڑھے لکھے..... کو یہ شبہ ہو کہ قرآن مجید میں تمام علوم ہیں جیسا کسی بزرگ کا قول ہے ؎

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْآنِ لٰکِنْ	تَقَاصَرَ عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ
تمام علم قرآن میں ہے لیکن لوگوں کی	عقلیں اس کے سمجھنے سے عاجز ہیں

سو یہ واقعہ بھی اس میں ضرور ہے، چنانچہ بعض اہل کشف نے قرآن مجید سے قیامت تک کی پیشن گوئیاں کی ہیں اور وہ صحیح بھی ہوئی ہیں، سو جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام علوم کے ہونے کے یہ معنی ہی مسلّم نہیں کہ علم کونیات کو بھی عام ہے بلکہ وہ علم شرعیات ہے کہ قرآن اس کے تمام اصول پر حاوی ہے مگر وجہ دلالت و طریق استنباط بعض علوم میں غامض ہے کہ بعضے علماء بھی نہیں سمجھ سکتے، اس لئے دوسرے حجج کی حاجت واقع ہوئی۔

رہا بعض عرفاء کا کچھ کونیات کو مستنبط کرنا تو وہ از قبیل تفسیر نہیں ہے، جیسا اہل فال کا اعتقاد ہے، بلکہ از قبیل تعبیر ہے کہ اصول اس کے خود دقیق ہیں، جو اہل فال کے خواب میں بھی نہیں آئے، اور باوجود اس تمام دقّت کے پھر وہ ظنی ہیں، کیونکہ وہ اصول ہی کشفی ہیں، جن کے ظنی ہونے پر اہل حق کا اتفاق اور ان کے کلام میں اس کی

تصریح ہے، پھر اس فال دیکھنے والے کو بزرگوں کے اس قول وعمل سے استفاع کا کیا حق ہے؟

فال اور استخارہ کا فرق مثلاً اس کا استخارہ پر قیاس کرنا کہ محض قیاس باطل ہے کئی وجہ سے، ایک تو یہ کہ استخارہ دلیل شرعی سے ثابت ہے اور یہ بقیود مذکورہ کسی دلیلِ صحیح سے ثابت نہیں۔

دوسرے یہ کہ خود مقیس علیہ بھی واقعات گذشتہ کی تحقیق کے لئے نہیں۔

مثلاً کسی کے یہاں چوری ہو جائے تو استخارہ اس غرض کے لئے نہ جائز اور نہ مفید کہ چور معلوم ہو جائے، جیسا فال والے، اس قسم کی حکایتوں کو بطور ظرافت کے بلکہ بطور اعتقاد کے بیان کیا کرتے ہیں کہ

استخارے کے ساتھ اعتقادِ باطل کا ہونا کسی بادشاہ کا موتیوں کا ہار گم ہو گیا تھا، اس نے دیوانِ حافظ میں فال دیکھی، رات کا وقت تھا چراغ ایک کنیز کے ہاتھ میں تھا، یہ مصرع نکلا۔ ؎

چہ دلاور است دُزدی کہ بکف چراغ دارد

یعنی ، چور کتنا بہادر ہے جس کے ہاتھ میں چراغ ہے۔

بس بادشاہ نے فوراً اسی کنیز کو پکڑ لیا اور تلاشی لینے سے اس کے پاس برآمد ہُوا۔ اوّل تو ان قصّوں کی کوئی سند صحیح نہیں، ثانیاً اگر ایسا واقعہ ہُوا ہو تو اتفاق پر محمول ہو گا، کیونکہ ملازمت کی کوئی دلیل نہیں، اور اگر تجربہ سے ملازمت پر استدلال کیا جائے تو ہم بطور معاوضہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہُوا ہے تو بیس[۲۰] بار اس کے خلاف ہُوا کہ فال میں کچھ نکلا اور واقعہ کچھ اور تھا۔ تو تجربہ یعنی تکرار مشاہدہ سے ملازمت ثابت ہوئی یا عدم ملازمت؟

غرض فال کا مقیس علیہ یعنی استخارہ واقعۂ گذشتہ کے "علم" کے لئے نہ مفید اور

لے استخارہ کا مفہوم خیر طلب کرنا ہے نہ کہ خبر! عبدالرؤف

نہ جائز۔

تا بعال چہ رسد

اور اگر کوئی استخارہ کو اس غرض کے لیے سمجھے ہوئے ہے تو وہ اپنے غلط خیال کی اصلاح کرے کہ بالکل اعتقاد باطل ہے۔

اور یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس سے واقعۂ گذشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح واقعۂ آئندہ بھی کہ فلاں بات یوں ہوگی، معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

بس استخارے کا صرف..... اتنا اثر ہے کہ جس کام میں تردد ہو کہ یوں کرنا بہتر ہے؟ یا یوں؟ یا یہ کہ، کرنا بہتر ہے؟ یا نہ کرنا؟ تو اس عملِ مسنون سے (کہ حاصل اس کا دعا ہے اس امر کی کہ جو میرے لئے مصلحت ہو میرا قلب اس پر مطمئن ہو جائے اور ویسا ہی سامان غیب سے ہو جائے) دو اثر ہوتے ہیں۔

- قلب کا اس شق پر مجتمع ہو جانا،
- اور اس مصلحت کے اسباب میسّر ہو جانا، بلکہ خواب نظر آنا بھی ضروری نہیں۔

من قال سوی ذاک فقد قال محالا (یعنی جس نے اس کے علاوہ کہا بیجا کہا)

اور بعض بزرگانِ دین سے جو بعضے "استخارے" اس قسم کے منقول ہیں جس سے واقعہ صراحتًہ یا اشارتًہ خواب میں نظر آجائے، سو وہ استخارہ نہیں ہے، بلکہ خواب نظر آنے کا عمل ہے۔

"پھر یہ اثر بھی اس کا لازمی نہیں، خواب کبھی نظر آتا ہے کبھی نہیں"۔ اور خواب بھی اگر

---

[1] اگر کوئی مندرجہ ذیل دعا، ۱۰۰ مرتبہ بعد نماز فجر ہر روز پڑھ لیا کرے اور اپنے جائز مقصد کے لیے دعا کرے تو انشاء اللہ حاجت پوری ہوگی۔

یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ اَصْلِحْ لِیْ شَانِیْ كُلَّهٗ وَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَيْنٍ ۔ ۱۲ محمد علی

نظر آیا تو وہ محتاج تعبیر ہے، اگرچہ صراحت سے نظر آئے، پھر تعبیر بھی جو کچھ ہوگی وہ ظنی ہے یقینی نہیں، اس میں اتنے شبہات تو ہوتے ہیں پس اس کو استخارہ کہنا یا مجاز ہے اگر ان بزرگوں سے یہ تسمیہ منقول ہو، ورنہ اغلاط عامہ سے ہے۔

اسی لیے محققین ایسے امور اپنے خاص لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ ان کے قلوب بھی منور ہوتے ہیں اور عقائد بھی مطہر ہوتے ہیں، طہارت عقیدہ کی بدولت غلو فی الدین (دین میں حد سے زیادہ بڑھنا) سے محفوظ ہوتے ہیں اور نورانیت قلب کے سبب ان کا انکشاف و منام راجح الصدق ہوتا ہے جو حقیقت ہے ظن کی، ورنہ عوام پر تو اضغاث احلام (پراگندہ خواب) ہی غالب ہوتے ہیں۔

مثلاً ایسی فال وغیرہ کی بنا اور اعتماد پر کسی مسلمان سے بدگمان ہو جانا اور کسی قول یا فعل یا خیالِ غیر مشروع کا مرتکب ہو جانا یہ خاص خرابیاں اس عمل فال میں ہیں اور یہی حکم ہے عارفین کے کلام سے فال لینے کا غرض یہ عمل مروج طریق پر بالیقین مذموم ہے۔

اگر کسی طالب کو یہ وسوسہ ہو کہ اس تقریر سے تو فال کا محض بے اصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ احادیث میں صاف موجود ہے یعجبہ الفال الصالح او نحوہ۔ اسی طرح اکثر بعضے معتبر بزرگوں سے قرآن یا کلامِ عرفاء سے تفاؤل لینا منقول ہے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ منشاء اس شبہہ کا اشتراک لفظی ہے، ایک شریعت کی اصطلاح ہے۔ وہ ثابت اور ایک غُلاۃ کی اصطلاح ہے وہ غیر ثابت۔

اس ثابت بالسنہ وعن الاکابر کی اصل اتنی ہے کہ کسی شخص کو کچھ تشویش یا فکر ہے اس وقت اتفاق سے یا کسی قدر قصد سے کوئی لفظ خوشی و کامیابی کا اس کے کان میں پڑا یا نظر سے گذرا تو رحمتِ الٰہیہ سے جو اُمید ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس بھی پہلے سے تھی، وہ اس لفظ سے اور قوی ہو گئی۔ پس حاصل اس کا تقویت رجاء

رحمت ہے اس سے آگے اختراع اور ابتداع ہے۔

قرآن مجید، عملیات اور ناجائز اغراض

(۳) بعضے قرآن مجید کو ناجائز اغراض میں بطور عملیات برتتے ہیں، یہ تو عملی تقصیر ہے اور پھر غضب یہ کہ اس کو برا نہیں سمجھتے اور یوں کہتے ہیں کہ صاحب ہم کوئی "سفلی عمل" تو نہیں کرتے۔ قرآن کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ یہ علمی یعنی اعتقادی تقصیر ہے

اول تو اگر جائز ہی اغراض میں عملیات کے طور پر مگر غلو کے ساتھ برتے، یعنی نہ علم سے غرض رکھے نہ عمل سے، جب قرآن کی یہ آیتیں ڈھونڈھی جائیں تو اسی غرض سے کہ اس سے دنیا کا فلاں کام ہو جاتا ہے اور اس سے فلاں مطلب نکلتا ہے۔ جیسے بعض امراء کے گھر میں اسی غرض سے رکھا رہتا ہے کہ:

- جب کوئی بیمار ہو گیا۔ اس کو قرآن کی ہوا دے دی۔
- ایک مصحف نہایت خفی قلمی یا مطبوع تعویذ بنا ہوا رکھا رہتا ہے، جب کوئی بیمار ہوا گلے میں ڈال دیا۔ وَمِثْلُ ذَالِكَ۔

اس کا بھی اس تقریر سے جو نمبر اول میں مذکور ہے غیر مرضی ہونا ثابت ہے اور اگر وہ اغراض بھی ناجائز ہوں جیسے:

(۱) یٰسین پڑھ کر چور کا نام نکالنا۔

(۲) ناجائز موقع پر محبت کی تدبیر یا زوجین میں یا باہم اقارب میں تفریق کی یا بلا اذنِ شرعی مطلق دو شخصوں میں تفریق کی تدبیر کرنا۔

(۳) کسی کو ہلاک کر دینا۔

(۴) دستِ غیب کے ایسے عمل کرنا کہ روپے رکھے ہوئے مل جایا کریں۔

(۵) جنات کو تابع کر کے ان سے کام لینا گو جائز ہی کام ہو اور ناجائز کا تو کیا پوچھنا؟

پس اگر ایسے ناجائز اغراض ہوں تو ناجائز کام کے قصد و اہتمام کا معمولی گناہ تو

ہے ہی جو سب جانتے ہیں، یہاں وہ گناہ اس لئے اور بھی شدید ہو جائے گا کہ اس شخص نے کلام پاک کو ناپاک غرض کا آلہ بنایا۔"

پس اس کی ایسی مثال ہوگئی جیسے نعوذ باللہ کوئی قرآن کو بازاری عورت کی خرچی میں دے کر منہ کالا کیا کرے۔ کوئی مسلمان جس میں ذرا بھی دین کی عظمت ہو اس کو جائز سمجھ سکتا ہے؟

اور اگر ان اغراض کے ناجائز ہونے میں خفا ہو تو مفصلاً اہلِ فتویٰ سے تسلی کر لیجیے مختصراً اتنا یہاں بھی لکھے دیتا ہوں کہ اوّل تو چور کا نام نکلنا اس عمل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا، یہ عامل کے یا کسی صاحبِ مجلس کے خیال کا تصرف ہے، اس کا سمجھنا مسمریزم جاننے پر موقوف ہے اور حاضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں وہ اگر سب نہیں تو اکثر تو اسی قبیل سے ہیں تو اس صورت میں قرآن پڑھنا یہ نرا دھوکہ دینا ہے!

پھر یہ کہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزما لیا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا۔ دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا، مگر جو شخص پہلے کو چور سمجھتا ہو وہ اس دوسرے عامل کے پاس سے اُس وقت بالکل علیحدہ ہو جانا چاہیگا، جب یہ ایسی بُودی بنیاد ہے تو کسی شخص کو محض اس بنیاد پر چور سمجھ لینا یقیناً یا ظناً کہاں جائز ہوگا؟ پھر اگر اس پر تشدد کیا یا زبان سے اوروں کے روبرو اس کا نام لیا تو یہ گناہ اور بڑھنے شروع ہوئے۔

دست غیب سے آمدنی اور تسخیر جنّات ناجائز ہے اور حُبّ و بغض مذکورین اور اہلاک کا ناجائز ہونا تو محتاج بیان نہیں۔

شاید دستِ غیب بالمعنی المذکور یا تسخیر جنّات لغرضِ مباح میں شبہہ ہو، تو سمجھ لیجئے کہ اس دستِ غیب میں یہ ہوتا ہے کہ جنّات اس کام پر مسلّط ہو جاتے ہیں کہ بعضے عمل میں تو وہی روپیہ جس کو یہ خرچ کر چکا ہے وہ جہاں بھی ہو وہاں سے اٹھا لاتے ہیں

اور بعض عمل میں دوسرا روپیہ جس جگہ سے اُن کے ہاتھ آئے نکال لاتے ہیں۔

سو اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص خاص اس کام کے لئے آدمیوں کو نوکر رکھے کہ چوری کر کر کے مجھ کو دیا کرو، اس نے یہی کام جنات سے لیا۔ اور چوری کے ناجائز ہونے کا کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ اور اگر شبہہ ہو کہ ممکن ہے کہ وہ جن اپنے پاس سے لے آتے ہوں تو چوری کہاں ہوئی؟ سو اوّل تو امکان سے دوسرے احتمالات کی نفی نہیں ہو سکتی، دوسرے اگر اپنے ہی پاس سے لاویں تب بھی ظاہر ہے کہ خوشی سے نہیں لاتے۔ ورنہ اوروں کو لا کر کیوں نہیں دیتے؟ محض جبرِ عمل سے لاتے ہیں تو کسی کو مجبور کرنا کہ اپنا مال مجھ کو دے دے خود حرام ہے اور اس تقریر سے تسخیرِ جنات کا ناجائز ہونا سمجھ میں آجائے گا۔

یعنی کسی آدمی سے جو نہ اس کا غلامِ شرعی ہو، نہ نوکر ہو، نہ اس کے زیرِ تربیت ہو کوئی کام جبراً لیا جائے گو وہ کام گناہ کا نہ ہو تو یہ ظلم اور تعدّی ہے۔ اس عامل نے اسی طرح اس جن سے کام لیا ہے جو عمل سے مقہور ہو چکا ہے اور یہ وسوسہ تو نرا جاہلانہ ہے کہ اسماء و کلماتِ الٰہیہ سے عمل چلانا کیسے گناہ ہو گیا؟

دیکھیے اگر کوئی شخص بڑا مجلّد قرآن زور سے کسی کے سر میں اس طرح مار دے کہ وہ مر جائے تو کیا یہ قتل اس وجہ سے کہ بواسطہ قرآن مقدس کے ہُوا ہے، جائز ہو جائے گا؟ اور کیا عدالت اس پر دارو گیر نہ کرے گی؟ کہ اس نے تو قرآن سے مارا ہے، اس لئے مجرم نہیں، بس اسی سے اس کو سمجھ لیجئے البتہ اگر قرآن مجید کے علم و اتباع کو اصلی کام سمجھ کر اس پر کاربند ہو اور کسی موقع پر کسی جائز کام کے لیے کوئی آیت پڑھ لکھ لے تو ناجائز نہیں۔

قرآن مجید کو آلۂ کسب بنانا

(۴) بعض لوگوں نے قرآن مجید کو آلۂ کسب دنیا و جلبِ مال کا بنا رکھا ہے، مختلف طور سے۔

بعض تو تراویح میں اُجرت پر سناتے پھرتے ہیں، بعضے مُردوں پر تیجے میں یا چالیسویں تک یا اس کے بعد بھی پڑھنے کا پیشہ کر لیتے ہیں، ان کا ناجائز ہونا کرّات و مرّات علماء کے فتاویٰ میں طے ہو چکا ہے۔

بعض تو اور بھی غضب کرتے ہیں یعنی یہ بھی نہیں کہ صرف عقدِ اجارہ کے بعد ہی پڑھا کریں بلکہ پہلا جو پڑھا ہُوا ہے، اس کو کچھ لے کر بخشتے ہیں۔ یہ تو اچھا خاصہ مبادلہ اور بیع ہے، جو اس اجارہ سے بھی بڑھ کر ہے کہ اجارہ میں بعض اہلِ تحمّل تاویل تو چلاتے ہیں گو چلتی نہیں۔ یہاں تو اس کی بھی گنجائش نہیں۔

بعض اس کے مطالب کے بیان، یعنی وعظ پر نذرانہ لیتے ہیں اور فی نفسہٖ اس کے جائز و ناجائز ہونے میں تو سردست اس لئے کلام نہیں کرتا کہ اس میں طول ہے، لیکن جو ہیئت اس کی شائع ہے کہ اس کو پیشہ مستقل بنا لیا ہے، اسی لئے سفر کرتے ہیں، زبان سے مانگتے ہیں، جس امرِ حق سے نذرانہ میں کمی آنے کا اندیشہ ہو اس کو بیان نہیں کرتے اور اس" حرفہ" میں سہولت دیکھ کر سینکڑوں جاہل، واعظ بن کر خلقِ خدا کو گمراہ کر رہے ہیں کیا ان مفاسد پر نظر کر کے بھی اس کو جائز کہا جا سکتا ہے؟

البتہ تعلیمِ قرآن کی نوکری اور اسی طرح واعظ کی نوکری، اس میں اگر اور کوئی خرابی نہ ملا لے تو مضائقہ نہیں۔

قرآن میں تحریف

(۵) قرآن مجید کی آیات کو بعض اوقات غیر معنی مقصودہ میں نطقاً یا کتابتہً برتا جاتا ہے۔ مثلاً جنتری پر یہ آیت لکھ دی، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین: ۴) یعنی ہم نے بنایا آدمی خوب سے انداز سے پر، جس کا حاصل یہ دعویٰ ہے کہ ہماری جنتری "احسن تقویم" یعنی محمد جنتری ہے، یا کسی کتاب کی لوح پر کوئی آیت لکھ دی جس میں مطبع یا صاحب مطبع کے نام کے مناسب کوئی لفظ یا معنی ہوں یا کوئی شخص[۱] گذر رہا ہے "یا فُوا" کہہ دیا کہ اس کی

[۱] مہاراجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب نے ایک صاحب سے کہا کہ ہمارا نام قرآن شریف (باقی صفحہ ۱۰۵ پر)

مذمت قرآن میں ہے باؤ بغضب من اللہ (البقرہ: ۶۰) (پھر اللہ کا غضہ لے کر لوٹے)

یہ سب تحریف ہے جس سے توبہ واجب ہے اور بعض اوقات اس میں بعضے اہل علم جن

کو کسی دوسرے فن میں زیادہ غلو وانہماک ہوتا ہے مبتلا ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ احقر نے ایک معقولی کے کلام میں اس جملہ قرآنیہ الالنعلم من یتبع (البقرہ:

۱۴۲) (مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہے گا) کے مشہور اشکال کے جواب میں

یہ توجیہہ دیکھی ہے کہ مراد یہاں "علم تفصیل" ہے، جو حادث ہے پس اب وہ اشکال نہ

رہا، حالانکہ یہ کھلی تحریف ہے کیونکہ اصطلاحِ معقول پر علم تفصیلی عین معلومات ہے،

تو اس کو علم کہنا محض اصطلاح ہے بطور اس کے علم کے ہو گیا ہے۔ سو وہ معنی مصدری

نہیں ہے کہ اس سے نعلم کا اشتقاق ماننا صحیح ہو اور علم تفصیل جس سے نعلم مشتق ہو سکتا

ہے، وہ معنی مصدری لغوی ہے اور اس کے معنی ہیں انکشاف ایک جزئی کا، سو وہ جب

حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا۔ اس کا مصداق ومنشاء انتزاع قدیم ہوگا اور اس کے

مقابل جو اجمالی ہے اللہ تعالیٰ اس سے منزّہ ہے۔ اور جو علمِ اجمالی اہلِ معقول کی اصطلاح

ہے وہ عین ذات ہے۔ سو ان اصطلاحوں کے خلط سے کس قدر خبط ہو گیا۔

اسی طرح، صوفیہ کی تفسیر کو تفسیر سمجھنا ناجائز ہے تحقیق اس کی احقر نے "کلیدِ مثنوی"

میں لکھی ہے اور اقتباس ہماری اس مبحث سے خارج ہے کہ حقیقت میں اس کا

ایراد من حیث القرآن نہیں ہے بلکہ تشبیہہ بالوارد فی القرآن وشتان بین

التّمثیل والتّبدیل۔

۶۱ بعض لوگ قرآن کو بے وضو چھوتے ہیں یا لکھتے ہیں، اس میں کاپی نویس اور تعویذ

لکھنے والے بہت مبتلا ہیں، اسی طرح ورق بردار اور پتھر جمانے والے یا پریس مین، ان

(بقیہ حاشیہ صہ ۱۰۳) میں نہیں ہے؟ انہوں نے کہا حضور! موجود ہے۔ دیکھئے قرآن میں کان من الکفرین

کان۔ کو کانا پڑھا۔ رنجیت سنگھ کانے تھے ۱۲۔

سب کو باوضو رہنا چاہیے۔ ورنہ پاک کپڑے سے چھوئیں۔

(۷) بعضے لوگ قرآن مجید کو پشت کی طرف، یا اپنی نشست کی جگہ سے نیچے یا متبذّل جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ یا قرآن کے اوپر کوئی کتاب یا قلم دوات وغیرہ رکھ دیتے ہیں یا قرآن میں دوسرے کاغذات یا غلاف میں قرآن کے اوپر عینک وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ یہ سب خلاف ادب ہے۔

البتہ سفر میں اگر اسباب، وصندوق وغیرہ میں مستور ہو تو بمجبوری بعض آداب میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس پر بہت متبذّل میلے کپڑے کا غلاف باوجود وسعت بدلنے کے ایک گونہ قلّتِ ادب ہے، گو درجہ حرمت تک نہ سہی۔

(۸) قرآن مجید جب ایسا کہنہ ہو جائے کہ اس سے انتفاع ممکن نہ ہو تو اس کو پاک جگہ دفن کر دینا چاہیے۔ مگر اس پر مٹی نہ ڈالے بلکہ جس طرح مسلمان میت کی قبر میں تختے وغیرہ رکھ کر مٹی دیتے ہیں اسی طرح کرنا چاہیے۔

ایسے ہی اگر کوئی قرآن ایسا غلط لکھا ہو کہ اصلاح دشوار ہو تو اس کو بھی دفن کر دینا چاہیے۔ اس میں اکثر لوگ جو سستی کرتے ہیں وہ "دریدہ" ہو کر منتشر ہو جاتا ہے اور افسوس ہے کہ وہ ردّی میں جا کر دواؤں کی پڑیوں میں یا بچوں کے بعض کھلونوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنا ہم لوگوں کی کتنی بے غیرتی ہے......!!

(۹) جس روشنائی میں کسی نجس چیز کا میل ہو اس سے قرآن لکھنا یا جس کپڑے میں ایسا قوی شبہہ ہو اس کا غلاف بنانا یا جس وارنش میں ایسی چیز ہو اس کو جلد پر ملنا یہ سب گناہ ہے، چنانچہ ظاہر ہے۔

(۱۰) قرآن کی کتابت یا طباعت میں تصحیح کا اہتمام نہ کرنا یہ ایسی بلا کی بات ہے جس کا ضرر دور تک اور دیر تک وبال جان رہے گا، جتنے لوگ پڑھیں گے اور جب تک (خواہ دو سو برس کیوں نہ ہوں) یہ مصاحف رہیں گے، اس بانی مسبّب کو

اس گناہ کا حصہ ملتا رہے گا۔

اس وقت ذہن میں یہی "امور عشرہ" حاضر ہوئے لیکن اگر کوئی امر رہ بھی گیا ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ ان میں جو اصول کی جا بجا تقریر ہوئی ہے وہ امر بھی ان میں داخل ہوگا۔ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ لِکُلِّ مَا یَرْضٰی اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی۔

(اصلاح انقلاب امت)

O

فصل (۲)

نماز

نماز کی اہمیت

موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر حق تعالیٰ ہمکلام ہوئے تھے اور اس وقت ایک تجلی بھی ہو رہی تھی۔ اس وقت میں غور کر لیجئے کہ حق تعالیٰ نے جن باتوں کا موسیٰ علیہ السلام کو امر کیا، وہ باتیں کس درجہ کی ہوں گی ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی ملاقات میں محبوب جن باتوں کا حکم کرتا ہے وہ نہایت عظیم الشان ہوتی ہیں خصوصاً جبکہ ملاقات بھی اس شانِ خاص سے ہو کہ تجلی بھی ہو اور ہمکلامی بھی ہو تو ایسے خاص وقت میں حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نماز کا حکم فرمایا جو کہ موسیٰ علیہ السلام کی معراج اور خاص قرب کا وقت تھا۔ پھر آپ اپنے حضور کی معراج کو دیکھ لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں خاص قرب میں کس عبادت کا حکم ہوا۔ نصوص سے صراحتاً معلوم ہے کہ معراج میں نماز ہی کا حکم ہوا ہے۔ نہ زکوٰۃ اس وقت فرض ہوئی، نہ روزہ، نہ حج۔ بلکہ یہ سب عبادتیں مدینہ میں فرض ہوئیں اور نماز آسمان پر فرض ہوئی بلکہ آسمان سے بھی اُوپر۔ اس سے بھی نماز کا خاص شرف واضح ہے تو اس میں غور کر کے نماز کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

وعظ: الصلات فی الصلوٰۃ

تھانہ بھون: ۲، ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ)

نماز کسی حال میں معاف نہیں

ایک بیمار صاحب نے بار بار اپنی سخت مجبوری نماز سے ظاہر کی۔ کہا کہ کپڑے ناپاک رہتے ہیں۔ فرمایا کچھ

حرج نہیں ناپاک کپڑوں ہی سے نماز ہو جاتی ہے۔ اگر پاک کرنے میں زیادہ زحمت مریض کو ہو۔ کہا کہ حرکت نہیں ہوتی۔ فرمایا کہ اشارے سے لیٹے لیٹے پڑھو۔ کہا کہ زبان سے الفاظ نہیں نکلتے۔ فرمایا کہ کچھ حرج نہیں۔ دل ہی دل میں کہہ لیا کرو۔ نماز کسی حال میں معاف نہیں۔ اس کی بڑی سخت تاکید ہے۔ یہاں تک کہ اگر سمندر میں ڈوب رہا ہو اور نماز کا وقت ہو گیا ہو تو نیّت باندھ کر ڈوب جائے۔ لیکن جہاں اس قدر تاکید ہے وہاں سہولت بھی بے انتہا رکھی گئی ہے۔ ان باتوں سے بھی ان مریض صاحب کی تسلّی نہ ہوئی اور یہ کہتے رہے کہ نماز ایسی حالت میں کیسے ہو سکتی ہے؟

ہماری نماز کبھی کامل ہو ہی نہیں سکتی

فرمایا کہ یہ رائے کی خرابی ہے۔ یُوں سمجھتے ہیں کہ اس طرح نماز ناقص ہو گی۔ حالانکہ حق تعالےٰ کے حقوق اس قدر ہیں کہ ان کے سامنے ہماری نماز کامل کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر کپڑے پاک صاف ہوں۔ وضو وغیرہ سب باقاعدہ ہو خشوع خضوع ہو تو نماز بڑی کامل ہو گی۔ میں کہتا ہوں کہ عظمت حق کے اعتبار سے وہ بھی ناقص ہی ہو گی۔ پھر جب ہر حال میں ناقص ہی ہوئی تو اس طرح پڑھنے سے کیوں جی بھلا نہیں ہوتا۔

اپنی حالت کو اچھا سمجھنا ہی بُرا ہے

اس پر یاد آیا کہ ایک صاحب نے حضرت سے عرض کیا کہ پہلے حالت اچھی تھی، اب بہت خراب ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ میری رائے میں تو جو حالت اچھی سمجھی جاتی تھی وہ بُری تھی۔ کیونکہ اس کو اچھا سمجھنا ہی بُرا تھا۔ اور یہ حالت جس کو آپ خراب سمجھتے ہیں اس پہلی حالت سے اچھی ہے کیونکہ اس کے ساتھ یہ کتنی بڑی دولت ہے کہ اپنے عجز کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

(احسن العزیز ج۱ صہ ۱۸۵ ملفوظ ۳۰۸)

نماز میں مشاہدۂ قربِ حق

نماز میں گو دیدار تو نہیں ہے مگر دیدار کے قریب ہی مشاہدہ ہے کیونکہ حدیث میں ہے: اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ وَھُوَ سَاجِدٌ فِی الصَّلٰوۃِ (او کما قال) کہ بندہ کو سب سے زیادہ قرب نماز میں بحالت سجدہ ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ کہ سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ۔ اگر انسان میں موانعِ قرب یعنی معاصی غفلت وغیرہ کم ہوں تو اس قرب کا بخوبی مشاہدہ ہوتا ہے۔ جتنے موانع کم ہوں گے اسی قدر مشاہدۂ قرب زیادہ ہوگا۔

اور اگر نماز میں خاص مشاہدہ نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص رنج کے وقت نماز کا حکم نہ ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے اس قول سے سخت رنج پہنچا تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ اسْتَلْقٰی عَلَی الْعَرْشِ فِیْ یَوْمِ السَّبْتِ لِلرَّاحَۃِ (نعوذ باللہ منہا) کہ اللہ تعالیٰ چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کر کے ساتویں دن یعنی سنیچر کو عرش پر لیٹ گئے تاکہ تھکن دور ہو اور آرام ملے۔ نعوذ باللہ منہا۔ اور اس پر یہود کے قول کے رد کے لیے یہ آیت نازل ہوئی: وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ ــ ہم نے بیشک آسمان و زمین کو اور ان کے درمیانی اشیاء کو چھ دن میں پیدا کیا، مگر ہم کو کچھ تھکن ذرا بھی نہیں ہوئی (کیونکہ یہ تو تاثر ہے جو ممکن کی شان سے ہے، واجب کو تاثر نہیں ہوا کرتا) پس آپ ان (یہودیوں) کی باتوں پر صبر کیجیے (زیادہ رنج نہ کیجیے)۔ اس کے بعد یہ بڑھایا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ جس میں نماز کا حکم ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس کو تسلّی میں کیا دخل ہے کیونکہ یہ قرآن ہے جس کا لفظ لفظ مربوط ہے۔ کوئی بات بے ربط نہیں تو فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ کے بعد تسبیح بمعنی صلوٰۃ کا امر یہ بتلاتا ہے کہ صلوٰۃ معین

صبر ہے اور یہ ایسی اعانت ہے جیسے عاشق کو کسی دشمن کی گستاخی سے جو اس نے محبوب کی شان میں کی ہو، رنج ہوا ہو اور محبوب یہ کہے کہ تم ان باتوں سے رنج نہ کرو، آؤ تم ہم سے باتیں کرو۔ بیہودوں کی باتوں کو چھوڑو۔ غور کیجیے محبوب کی اس بات سے عاشق کو کس قدر تسلی ہوگی۔ اسی طرح حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ اُن کی بیہودہ باتوں سے رنج نہ کیجیے۔ آئیے نماز میں ہم سے باتیں کیجیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج کا اندازہ دوسری آیت سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ہ: ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے۔ آگے مشہور تفسیر تو یہ ہے اور میں نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ علت ہے ایک جملہ محذوفہ کی تقریر یوں ہے فَلَا تَحْزَنْ وَكِلْ اَمْرَهُمْ اِلَى اللّٰهِ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ الخ۔ یعنی آپ غم نہ کیجیے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجیے کیونکہ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے (کیونکہ آپ کو تو محمدؐ امین کہتے اور صادق مانتے تھے) بلکہ یہ ظالم تو خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (سو آپ کس لیے رنج کرتے ہیں۔ وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہتے۔ ہماری آیتوں سے گستاخی کرتے ہیں سو ہم خود نمٹ لیں گے) مگر ایک بار مجھے ذوقاً دوسری تفسیر سمجھ میں آتی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عشق مع اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس مشہور سے یہ ابہام ہے کہ حضورؐ کو آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب سے رنج نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنی ذات کے ساتھ جب کوئی خلاف بات ہو اس وقت رنج ہونا چاہیے حالانکہ آپ کے عشق و محبت کا مقتضا یہ ہے کہ کفار آپ کو چاہے کتنا ہی کہہ لیتے اس سے آپ کو زیادہ رنج نہ ہوتا۔ آپ کو بڑا رنج اسی کا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ گستاخی کرتے اور آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کرتے تھے۔ پس خاص اس اعتبار سے اس

تفسیر قریب یہ ہو سکتی ہے کہ "اِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ" علت ہے "قَدْ يَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُوْلُوْنَ" کی۔ اور ترجمہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو کفار کی باتوں سے بہت رنج ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ اگر آپ ہی کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو آپ کو زیادہ غم نہ ہوتا مگر آپ کو تکذیب آیاتِ الٰہیہ کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں حذف و تقریر کی بھی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر آپ کی شانِ عشق کے بھی موافق ہے اور اس حدیث کے بھی موافق ہے: كَانَ لَا يَنْتَقِمُ لِنَفْسِهٖ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تُنْتَهَكَ حُرُمَاتُ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ فِيْهَا لِلّٰهِ (او کما قال) کہ آپ اپنے لیے، اپنی ذات کے واسطے کسی سے کسی بات میں انتقام نہ لیتے تھے۔ ہاں اگر حرمات کی توہین ہوتی دیکھتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے لیے انتقام لیتے تھے اور گو ظاہراً یہ تفسیر سیاق سے بعید ہے مگر ایک بار ذوقاً کچھ قریب معلوم ہوئی تھی۔ اسی لیے اس مقام پر اپنے دعویٰ کی تائید میں اس کو ذکر کر دیا۔ گو وہ دعویٰ اس پر موقوف نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ آپ کو کفار کی ان گستاخیوں سے جو حضرت حق کی شان میں وہ کرتے تھے سخت رنج ہوتا تھا تو ایسے شدید حزن کے لیے نہایت قوی تسلّی کی ضرورت ہے اور یہاں تسبیح بمعنی صلوٰۃ کو تسلّی کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور عادتاً عاشق کو تسلّی کسی چیز سے ایسی نہیں ہوتی جیسے محبوب کے قرب و مشاہدہ سے ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نماز میں ایسا قوی قرب و مشاہدہ ہوتا ہے جو کسی اور امر سے نہیں ہوتا۔ ورنہ حق تعالیٰ اُسی امر کی تعلیم کو اختیار فرماتے۔

نماز دافع فکر و رنج

اسی لیے حدیث میں آتا ہے: كَانَ اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ کہ جب حضورؐ کو کوئی بڑا فکر پیش آتا تو آپ جلدی سے نماز میں مشغول ہو جاتے۔ کیوں؟ اسی لیے تاکہ حق تعالیٰ سے باتیں کر کے دل بہلائیں اور تسلّی و سکون حاصل کریں۔ واقعی تجربہ و مشاہدہ ہے کہ رنج و فکر

کے وقت نماز میں مشغول ہو جانے سے رنج بہت کم ہو جاتا ہے اور اگر موانع قرب کم ہوں تو بالکل رنج کا ازالہ ہو جاتا ہے

وعظ: الفضلات فی الصلوٰۃ

تھانہ بھون ۲ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

نماز میں فلاح دارین ہے

فرمایا کہ بعض لوگ مال ملنے ہی کو فلاح سمجھتے ہیں اور نماز پڑھ کر چونکہ فوراً مصلے کے نیچے سے روپے نہیں نکلتے اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز میں کیا فلاح ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ کیا مال خود بالذات مقصود ہے؟ اگر ایک شخص کے پاس ہزار روپے کے نوٹ ہوں یا نقدی ہو اور وہ ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں کوسوں تک نہ کھانا ہے نہ پانی ہے اور اس وقت اس کو بھوک پیاس لگے تو بتلایئے یہ ہزار روپے اس کے کس کام کے۔ اب اگر وہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دے تو کیا آپ اس کو مفلح اور کامیاب کہیں گے؟ معلوم ہوا مال خود فلاح نہیں۔ شاید آپ یہ کہیں کہ کھانا پینا تو فلاح ہے، ہم اس کے طالب ہیں۔ سو یہ بھی غلط ہے۔ کھانا پینا بھی مقصود بالذات نہیں کیونکہ بعض دفعہ کھانا کھا کر ہیضہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہی کھانا سبب ہلاکت ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مقصود کچھ اور ہے اور وہ ہے چین اور آرام۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا کہ فلاح کی حقیقت راحت ہے تو اب دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ نماز سے یہ فلاح ضرور حاصل ہوتی ہے۔ نماز سے قلب کو وہ راحت ملتی ہے جو ہزار کھانوں سے بھی نہیں مل سکتی۔ مگر جس طرح بعض دواؤں کا نفع ایک خاص میعاد پر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اطبا کہا کرتے ہیں کہ اس دوا کو تین دن یا تین ماہ استعمال کر کے پھر آنا اس مدت سے پہلے نفع حاصل نہ ہوگا۔ اگر چھ ماہ کا اندھا کسی قیمتی سرمہ کو دو تین لگا کر سونکھا ہونا چاہے تو وہ بے وقوف ہے۔ اسے چاہیے کہ کم از کم مثلاً تین ماہ تو استعمال کر کے دیکھے۔ اسی طرح نماز کی

راحت کا احساس ایک خاص میعاد کے بعد ہوتا ہے جو ہر شخص کے لیے اس کے مناسب ہوتی ہے۔ پس یہ آپ کی غلطی ہے کہ چار دن نماز پڑھ کر مراقبہ کرنے بیٹھ گئے کہ دیکھوں راحتِ قلب حاصل ہوئی یا نہیں۔ صاحب کسی جاننے والے طبیبِ روحانی سے پوچھ کر نماز کو قاعدہ سے شروع کر دے اور کچھ عرصہ تک ادا کرتے رہو۔ پھر دیکھو کیا حال ہوتا ہے۔ انشاء اللہ چند ہی روز میں یہ حالت مشاہد ہو گی جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ جو شخص نماز کا عادی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نماز پڑھ کر کیا راحت ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ عشاء کی نماز پڑھ کر آدمی "سلطان اللیل" ہو جاتا ہے۔ واقعی سلاطین کو کیا راحت نصیب ہو گی جو نمازی کو عشا کی نماز پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کا ادراک ضد کو دیکھ کر کامل ہوتا ہے تو نماز کی راحت کا احساس بھی اس طرح ہو گا کہ کبھی ریل میں نماز پڑھنا دشوار ہوا ہو تو یاد کیجیے اس وقت کیسی پریشانی ہوئی ہو گی اور خدا خدا کر کے کسی اسٹیشن پر آدمیوں کے اترنے سے جگہ ملی ہو گی تو نماز پڑھ کر کیسا چین ملا تھا۔ مگر یہ بات ایک زمانہ تک نماز کی عادت ہونے سے، نیز اہل اللہ کے پاس بیٹھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اہل اللہ کے پاس بیٹھنے سے نسبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے۔ دل کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک لگاؤ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ نسبت ذوقی چیز ہے اور اس کے حصول کے لیے بھی ایک میعاد ہے، اس کی حقیقت قول سے نہیں معلوم ہو سکتی۔ محض ذوق سے معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر میں بھی تو بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو بدون ذوق کے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ دیکھیے لوگ کہتے ہیں کہ شعر میں مزا آتا ہے۔ مگر کیا کوئی اس مزہ کی حقیقت الفاظ میں بیان کر سکتا ہے؟ ہمارے ایک دوست ہیں ان کو اشعار میں مزہ نہیں آتا جب وہ کسی کو شعر سے مزہ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس پر ہنستے ہیں کہ شعر بھی کوئی مزے کی چیز ہے جو اس میں مزہ آئے۔ ایک دفعہ الہ آباد میں ایک دوست

میرے ساتھ تھے۔ ان کی طبیعت شاعرانہ ہے وہ اپنی ایک غزل سنا رہے تھے جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

کیا بیٹھا ہے سینہ پر زانو کو دھرے قاتل
ہاں پھیر بھی دے خنجر کیا دیر لگائی ہے ؟

لوگ تو اس سے مزے لے رہے تھے اور وہ حضرت ان پر ہنس رہے تھے اور فتوے لگا رہے تھے کہ واللہ یہ بالکل جھوٹ ہے ہم نے تو کسی محبوب کو نہیں دیکھا کہ وہ عاشق کے سینہ پر خنجر چلانے کو بیٹھا ہو۔ اب بتلائیے ایسے لوگوں کو الفاظ سے کیونکر سمجھایا جائے کہ شعر میں یہ مزا ہے کیونکہ یہ محض ذوقی چیز ہے جس کو یہ ذوق حاصل نہیں وہ اس کے لطف کو نہیں سمجھ سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ نے صوفیہ کے حال و قال و وجد کو دماغ کی خرابی پر محمول کیا اور کہا کہ حق تعالیٰ سے محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ غائب ہیں۔ اور حیرت ہے کہ بعض متکلمین بھی حق تعالیٰ کے ساتھ حبّ عقلی کے تو قائل ہیں مگر حب طبعی کا انکار کرتے ہیں۔ افسوس عشاق تو محبّت میں مرے کھپے جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ محبت حق تعالیٰ سے ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو جان دینے کو تیار ہیں اور بہت سے تڑپ تڑپ کر مر بھی گئے اور یہ ان کو دیوانہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ عِنّین طریق ہیں۔ ان کو عشق کا چرکا لگا نہیں اس لیے اس کی حقیقت کے منکر ہیں کیونکہ ؏

ذوقِ ایں مئے نشناسی بخدا تا نچشی

حضرت! یہ لوگ جن کو دیوانہ کہا جاتا ہے ایسے عاقل ہیں کہ ان کے ملفوظات اور حکیمانہ اقوال کے سامنے ارسطو بھی طفلِ مکتب ہے۔ کیا ایسے عاقلانہ اقوال دیوانوں سے صادر ہوا کرتے ہیں۔ مگر چونکہ اس محبّت نے ان سے سلطنتیں چھڑوا دیں۔ جب انھوں نے سلطنت کو مخلِ تعلقِ حق دیکھا تو لات مار کر الگ ہو گئے ان کا مذاق یہ ہے ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار　　عشق را باحی و باقیوم دار

عاشقی با مردگاں پائندہ نیست　　زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

وہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہیں کرنا چاہتے۔ دنیا اور اس کے لذائذ ان کی نظر میں خاک کی برابر بھی نہیں رہے۔ اس لیے اہل دنیا کی نظر میں وہ دیوانے شمار ہونے لگے مگر وہ ایسے دیوانے ہیں کہ ع

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مگر میں سچ کہتا ہوں کہ زندگی انہیں کی زندگی ہے۔ واللہ ان کو کھانے پینے میں وہ مزہ آتا ہے کہ آپ کو اور ہم کو نہیں آتا۔ کیونکہ ان کو کھانے پینے کے وقت میں یہ مستحضر ہوتا ہے کہ سب نعمتیں محبوب کی طرف سے ہیں اور محبوب کے ہاتھ سے اگر گلا ہوا امرود بھی ملے تو وہ الہ آباد کے شاداب امرود سے افضل ہوتا ہے۔ بلکہ محبت کی　تو اس سے بھی بڑھ کر عجیب حالت ہے کہ عاشق کو محبوب کی ایذا میں بھی مزہ آتا ہے۔ اسی لیے اہل اللہ کو جان دینے میں بھی مزہ آتا ہے۔ حضرت عراقی فرماتے ہیں ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

حضرت زلیخا نے جب زنانِ مصر کے سامنے یوسف علیہ السلام کو بلایا تو انہوں نے بدحواس ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور ایذا کا مطلق احساس نہ ہوا۔ اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں صحابہؓ کی یہ حالت ہوئی جس کو حضرت عائشہ فرماتی ہیں ؎

لواحی زلیخا لو رأین جبینہٗ

لآثرن بالقطع القلوب علی الید

واقعی ہزاروں مردوں نے اپنے دل کاٹ دیے۔ غزوات میں حضورؐ کے قدموں

میں جانیں دے دیں اور عورتوں کی یہ حالت تھی کہ جب حضورؐ غزوات سے واپس ہوتے تو عورتیں سڑکوں پر کھڑی ہو جاتیں اور آنے والوں سے اول حضورؐ کی خیریت پوچھتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک عورت کا باپ اور خاوند اور بیٹا اور بھائی غرض سارا کنبہ شہید ہو گیا تو حضرات صحابہؓ نے اس کی تعزیت کی کہ تمہارے فلاں فلاں عزیز شہید ہو گئے تو وہ پوچھتی ہے کہ یہ بتلاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ صحابہؓ نے کہا حضور تو مع الخیر واپس تشریف لا رہے ہیں تو وہ فرماتی ہیں کہ بس حضورؐ سلامت چاہئیں۔ آپ کے اوپر ہزار ماں باپ اور اولاد فدا ہیں ؎

فِدًی لرسول اللہ امی وخالتی
وعمّی و آبائی ونفسی ومالیا

تو حضورؐ کے ساتھ صحابہ کو یہ تعلق تھا کہ عورتیں اور مرد اور بچے سب کے قلوب پارہ پارہ ہو گئے تھے۔ غرض محبت کے ساتھ مصائب بھی شیریں ہو جاتے ہیں ؏

از محبت تلخہا شیریں شود

چنانچہ ان صحابیہ کو حضور کی سلامتی کی اس درجہ مسرت تھی کہ اپنے سارے کنبہ کا مرنا بھول گئیں۔ جب تلخیاں بھی خوشگوار ہو جاتی ہیں تو محبوب کے لذیذ انعامات میں تو عاشق کو کیا کچھ حظ آئے گا؟ اس لیے اہل اللہ کو جب کھانے پینے کی چیزوں میں یہ امر مشاہد ہوتا ہے کہ یہ محبوب نے ہم کو دی ہیں تو ان کو وہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ اہلِ دنیا نے اس کا خواب بھی نہیں دیکھا۔ پھر ان لوگوں کو بھلا نماز میں تو کیوں حظ نہ آئے گا جو خاص قربِ محبوب اور حاضریٔ دربار کی حالت ہے۔ اس وقت واقعی طور پر ان کو حی علی الفلاح کا ادراک ہوتا ہے کہ نماز عجیب راحت کی چیز ہے۔

نماز سے سرورِ نشاط اور راحتِ قلب کا اثر صحت پر

نماز سے ایک خاص سرور و نشاط اور قلب کو راحت حاصل ہوتی

ہے جس کا اثر صحت پر بھی ظاہر ہوتا ہے اور ہم کو اس کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ نماز سے راحت و سرور کیوں ہوتا ہے کیونکہ ہر اثر کے لیے کسی علّت کا معلوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بعض چیزیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں۔ دیکھیے مقناطیس میں جو جذب حدید کی خاصیت ہے اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے جس کی علّت بتلانے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ افسوس اتنی بڑی عبادت جس میں فلاحِ اخروی بھی ہے اور فلاحِ دنیوی بھی اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہم کو پکارتا ہے اور ہم جماعت میں نہیں آتے۔

تارکینِ جماعت کے گھروں میں آگ لگی ہے

حالانکہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایک شخص کو امام بناؤں، پھر چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دیکھوں کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے۔ پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے گھر پھونک دوں"۔ اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو پھونکا نہیں، مگر چاہا تو تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں اِنّی اَرٰی رَبَّكَ یُسَارِعُ فِیْ ھَوَاكَ کہ میں دیکھتی ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کی خواہش کو بہت جلدی پورا کرتے ہیں۔ اور بھلا حضورؐ کی یہ شان کیوں نہ ہو جب ادنیٰ ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مرادِ متقین

تو معلوم ہوا کہ جب حضورؐ نے ایسا چاہا تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے۔ اب بتلاؤ جس کے گھر کو خدا اور رسول پھونکنا چاہیں وہ کیونکر بچ سکتا ہے۔ تو جو لوگ جماعت میں نہیں آتے ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے ۔ شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں جلا وہ تو اچھا خاصا موجود ہے تو اس کے متعلق مولینا رومی کا جواب سن لو، فرماتے ہیں ؎

آتشے گر نامدست ایں دود چیست

جاں سیاہ گشت و رواں مردود چیست

یہ تھوڑی آگ لگی ہوئی ہے جس کے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا اور چہرے پر وحشت و ظلمت برس رہی ہے۔ اس ظلمتِ قلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک اثر ہوتا ہے جس سے اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ نمازی کے چہرہ پر جو نور ہوتا ہے وہ بے نمازی کے چہرہ پر نہیں ہوتا اور یہ اثر قلب کا ہے۔ نمازی کے دل میں نور ہے اس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے اس کا اثر چہرہ کی بد رونقی سے ظاہر ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ آگ ضرور لگی ہے اس کا یہ دھواں ہے جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے۔ دل کی سیاہی یہ ہے کہ بہت لوگوں کو نہ رشوت سے نفرت نہ جھوٹ بولنے سے نہ کسی پر بہتان باندھنے سے، نہ کسی کی زمین دبانے سے، اور نہ قرض لے کر انکار کر دینے سے اور نہ عورتوں کو گھورنے سے۔ اور مولانا کا یہ ارشاد حدیث سے مؤیّد ہے۔ حدیث میں ہے کہ "جب مسلمان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اگر توبہ استغفار کر لے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر گناہ میں بڑھتا گیا تو یہ داغ بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ دل کو گھیر لیتا ہے۔ یہی وہ زنگ ہے جس کی بابت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "یعنی ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے کرتوتوں کا زنگ غالب ہو گیا ہے"۔ اسی کو مولانا ایک مقام پر فرماتے ہیں: ؎

ہر گنہ زنگی ست بر مرآۃ دل — دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی — نفسِ دُوں را بیش گردد خیرگی

اس لیے مولانا کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ آگ ضرور لگی ہے اسی سے دل سیاہ ہوا ہے۔ رہا یہ کہ آگ کے ساتھ سوزش بھی ہوتی ہے اور بے نمازی کو تو سوزش نہیں

ہے۔ تو خوب یاد رکھو کہ سوزش بھی ہے، مگر فالج غفلت کی وجہ سے جسم سن ہو رہا ہے
اس لیے اس کا احساس نہیں ہے۔ جیسے کلوروفارم سونگھنے والے کو زخم نشتر کا
احساس نہیں ہوتا ایسے ہی ان لوگوں نے غفلت کا کلوروفارم سونگھ رکھا ہے۔ اس
لیے گناہوں کی سوزش کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر ایک دن یہ فالج اور یہ سُن اور یہ
بے ہوشی اترے گی اس وقت گناہوں کی سوزش کا احساس ہوگا ؎

فسوف تری اذا انکشف الغبار
افرسٌ تحت رجلك اَم حِمارٌ

اس وقت غفلت کے غبار نے آنکھوں کو اندھا کر رکھا ہے اس لیے گناہ کر کے
بے فکر پھرتے نظر آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم گھوڑے پر سوار ہیں اور دینداروں کو حقارت
کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کو گدھے پر سوار سمجھتے ہیں مگر جس دن یہ غبار بیٹھ جائے گا
اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ گدھے پر سوار کون تھا اور گھوڑے پر سوار کون؟
دوسرے یہ کہ گناہوں کی آگ خدائی آگ ہے جس کی خاصیت یہ ہے نَارُ اللّٰہِ
الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (وہ اللہ کی آگ ہے جو (اللہ کے حکم سے)
سُلگائی گئی ہے جو دلوں تک پہنچ جائے گی)۔ اس آگ کا اصل محل قلب ہے اور دعوے
سے کہا جا سکتا ہے کہ گنہگار کا دل بے چین ہوتا ہے۔ اس کو راحت اور چین نصیب
نہیں ہوتی۔ گناہ سے دل کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے۔ یہ اسی آگ کا تو اثر ہے جس
نے اندر اندر دل پھونک دیا ہے۔

گناہ خود ہی آگ ہیں اور جہنّم ہیں

اور صوفیہ کی تحقیق تو یہ ہے کہ یہ گناہ خود ہی
آگ ہیں اور جہنم انہیں کی صورت مثالی ہے۔
اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہنّم کا فی نفسہٖ وجود نہیں بس معاصی ہی کو مجازاً جہنّم کہہ
دیا گیا۔ جیسا کہ فلاسفہ نے نعیم و جحیم کی حقیقت علم و جہل سمجھی ہے مطلب یہ ہے

کہ جہنم خارج میں موجود ہے اور اسی طرح موجود ہے جس طرح حدیث و قرآن میں خبر دی گئی ہے۔ مگر اس کی حقیقت بھی معاصی ہیں۔ جہنم کی آگ سانپ اور بچھو وغیرہ سب انہی گناہوں کی صورت ہیں۔ چونکہ اس عالم میں اعراض بھی جواہر بن جاتے ہیں اس لیے یہی گناہ جو یہاں کیے جاتے ہیں ان ہی کی یہ صورتیں بن گئیں اور پہلے سے بن گئیں۔

غرض صوفیہ کے قول پر تو یہ گناہ ہی خود آگ ہیں۔ ان کے لیے کسی دوسری آگ کی ضرورت نہیں۔ مرنے کے بعد یہی گناہ آگ، سانپ اور بچھو بن کر ستائیں گے پس گنہگار مرنے کے بعد تو صورت جہنم میں جائے گا اور اس وقت وہ حقیقتِ جہنم میں موجود ہے۔ کیونکہ بڑا جہنم یہ ہے کہ حضرتِ حق ناراض ہوں ؎

شنیدہ ام سخنے خوش کہ پیر کنعاں گفت
فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر
کنایہ ئیست کہ از روزگار ہجران گفت

صاحبو! جہنم انہی کے واسطے جہنم ہے جن سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں اور جس سے خدا راضی ہو اس کے لیے جہنم کوئی چیز نہیں۔ بلکہ ان سے تو جہنم خود پناہ مانگتی ہے۔ ان کے ایمان کے اثر سے وہ خود ٹھنڈی ہونے لگے گی۔ چنانچہ قیامت میں انبیاء علیہم السلام اور بعض مومنین اذن شفاعت کے بعد جہنم میں گھس گھس کر دوزخیوں کو نکال لیں گے مگر جہنم ان کا کچھ بھی نہ کر سکے گی اور اس وقت بھی زبانیۂ جہنم دوزخ میں موجود ہیں مگر ان کو اس سے کوئی ضرر نہیں ہے۔ یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو کامل الایمان ہیں۔

اور جن میں ایمان ضعیف ہے ان کو بھی جہنم پوری طرح نہ جلا سکے گی کیونکہ ان کے دل میں ایمان ہے۔ مومن کے قلب پر آگ کا اثر نہ پہنچے گا۔ اور حدیث میں ہے۔

اَمَاتَهُمُ اللّٰہُ اِمَاتَۃً" کہ گنہگار مسلمان کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کرکے ایک قسم کی موت یعنی نیند کا سا اثر دے دیں گے۔ پھر ان کو عذاب جہنم کا کافر کے برابر احساس نہ ہوگا۔

الغرض اصل جہنم تو خدا کی ناراضی ہے۔ اور خدا کی ناراضی گناہوں سے ہوتی ہے تو گناہ خود جہنم ہیں۔ اگر سزا بھی نہ ہو اور ویسے ہی چھوڑ دیے جائیں تو حق تعالیٰ کا ناراض ہونا ہی خود جہنم ہے۔

پس اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے یا جماعت کی پابندی نہیں کرتے ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے اور ایک دن اس کی سوزش کا احساس ضرور ہوگا۔

گناہوں کا ضرر پورا معلوم ہوتا تو ترکِ نماز کی جرأت نہ ہوتی

صاحبو! بعض طاعات کا موقع تو کبھی کبھی آتا ہے مثلاً روزہ سال میں ایک بار آتا ہے اور بعض طاعات سب پر فرض نہیں مثلاً حج اور زکوٰۃ۔ مگر نماز تو ایسا ظاہر فرض ہے جس کی فرضیت سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے۔ امیر و غریب سب پر یکساں فرض ہے۔ پھر اس کے لیے کوئی خاص مہینہ مقرر نہیں۔ روزانہ پانچ دفعہ فرض ہے۔ تو یہ طاعت سب سے اہم اور ضروری ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ ہے کہ مسلمان بہت کم ایسے ہیں جو اس کے پابند ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوتِ عملیہ کمزور ہے اور قوتِ عملیہ اس لیے کمزور ہے کہ قوتِ علمیہ کمزور ہے۔ اگر ہم کو گناہوں کا ضرر پورا پورا معلوم ہوتا تو ترکِ صلوٰۃ پر ہم کو جرأت نہ ہوتی۔ جیسے سنکھیا کے ضرر کا ہم کو علم ہے تو کبھی تجربہ اور امتحان کے لیے بھی کسی نے نہ کھایا ہوگا۔ اور یہ کچھ علم نہیں کہ دو چار الفاظ یاد کر لیے کہ نماز نہ پڑھنا گناہ ہے۔ رشوت اور سود حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔ علم وہ ہے جس کا طبیعت پر اثر ہو جو دل میں گھس گیا ہو۔

(الاکرامیہ (رسالہ الابقا بابت ماہ نومبر ۱۹۴۶ء) صفحہ ۱۴ تا صفحہ ۲۶)

نماز میں اگر روح نہیں تو محض صورت کو بے کار نہ سمجھو

اعتدال ہر امر میں مطلوب ہے۔ نماز میں بھی اعتدال استغراق سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ استغراق نہ ہو تو ایسی نماز بے کار ہے۔ خوب سمجھ لو کہ جس روز معانی کی خریداری ہوگی یہ صورتیں ہی معانی کے بھاؤ بکیں گی۔ خود فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی الخ

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔" اَعْمَالَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ نہیں، فرمایا بلکہ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ فرمایا جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اعمال تو نہیں مگر نفس اور مال تو ہے۔ زکوٰۃ دی مال خرچ ہوا۔ نماز پڑھی نفس پر تعب ہوا بس وہی خرید لیا گیا۔ گو وہ نفس و مال عبادت معتد بہ نہ سہی۔ مگر بشرطیکہ تم انہیں (نفس و مال کو) اعمال میں مصروف کرو۔ پھر چاہے وہ عمل کامل نہ ہو۔ کیا ٹھکانا ہے رحمت کا ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل می خرد گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   آنچہ در وہمت نہ آید آں دہد

خدمت ناقص مگر معاوضہ اس قدر کہ "نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی بشر کے قلب پر خطرہ گذرا"۔ وہ ایسا خریدار ہے کہ اگر صورت درست ہوگی وہی خرید لی جائے گی۔ چنانچہ قیامت میں دیکھ لینا۔ حدیث شریف میں جو رکوع و سجود کی فضیلت آئی ہے وہ مطلق ہے اس میں یہ نہیں ہے کہ قلب میں فضول خیالات نہ ہوں۔ ہاں اعتدال ضروری ہے۔ چنانچہ جس نے اعتدال نہیں کیا تھا اسے آپ نے فرمایا "نماز پھر سے پڑھو" اور اس سے یہ نہیں پوچھا تھا روح بھی تھی یا نہیں اور یہ رحمت ہے جو بواسطہ آپ ﷺ کے مرحمت ہوئی کہ مبتدیوں کو اعتدال کا تو امر کیا مگر روح ڈالنے کا امر نہیں کیا۔ ابتدا میں عیسیٰ علیہ السلام یہ کیا کرتے تھے کہ تصویر بنا لیتے تھے۔ پھر اس میں روح پھونکتے تھے۔ اسی طرح ابھی تم تصویر بناؤ۔ روح بعد میں پھونک دی

جائے گی۔ مگر تصویر تو پوری بناؤ۔ تم رکوع و سجود اچھی طرح کر لو۔ اگر روح نہ ڈال سکو کچھ ہرج نہیں۔

اسی طرح سالک کو چاہیے کہ اگر ذکر ہو اور فکر نہ ہو تو فکر نہ کرے ذکر اچھی طرح کرتا رہے۔ انشاء اللہ سب کچھ ہو جائے گا۔ یہ نہ کرے کہ بجائے اس کے کہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا دلگیر ہو کر اُسے بھی چھوڑ دے۔

نماز کی روح حق تعالیٰ کی یاد ہے

اور نماز کی روح حق تعالیٰ کی یاد ہے غور کر کے دیکھو کہ نماز میں یہ روح ہوتی ہے یا نہیں۔ لیکن اگر روح نہ ہو تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دو۔ اس لیے مادّہ محفوظ رکھو کہ یہ ہی مردہ تصویریں پھر زندہ ہو جائیں گی جن کے پاس روح نہیں وہ اعضائے نماز کو ضرور درست رکھیں۔

جب روح پڑے گی تو سب میں پڑے گی سیئات حسنات سے بدل جاتے ہیں

اور یہ شبہہ نہ کرو کہ جو نماز ہم پہلے پڑھ چکے ہیں اس کا کیا تدارک ہوا۔ یاد رکھو جب روح پڑے گی تو سب میں پڑ جائے گی اس واسطے کہ ہم توجہ الی اللہ کا اثر دیکھتے ہیں کہ ماقبل میں بھی ہوتا ہے اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِہِمْ حَسَنَاتٍ: "اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گزشتہ گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا۔" پچھلے سیئات حسنات سے بدل جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ "اسلام اپنے قبل کی بداعمالیوں کو منہدم کر دیتا ہے۔" تو دیکھیے "عمل حال" کا پچھلے اعمال میں بھی اثر ہوتا ہے۔ جب تمہارے حال کے اعمال میں روح پڑے گی تو پچھلے اعمال میں بھی پھیلے گی۔ اس میں راز یہ ہے کہ وہ اعمال باعتبار اپنے اثر کے قائم ہیں عامل میں اور عامل ان کا محل ہے۔ اور محل زمانہ حال میں موجود ہے تو حال بھی زمانہ حال میں موجود ہے۔ وہ ماضی کہاں ہے جس پر شبہہ ہوا۔ اور گو اعمال رخصت ہو چکے ان کا اثر ہم میں باقی ہے

اور حقیقت میں عمل تو یہ اثر ہی ہے کیونکہ اس کے معنی مصدری تو محض اعتباری انتزاعی شے ہے پس حاصل مصدری فعل ہے جو کہ اثر ہے اور اثر ہی باقی رہتا ہے۔

اہلِ کشف کو صورتیں اعمال کی نظر آجاتی ہیں

یہی وجہ ہے کہ اہل کشف کو صورتیں اعمال کی نظر آجاتی ہیں۔ حضرت عثمان کی مجلس میں ایک شخص کسی نامحرم عورت کو دیکھ کر آیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا حال ہے لوگوں کا کہ ہماری مجلس میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی طاعت کرتا ہے تو اس کا ایک اثر اس میں پیدا ہوتا ہے۔ فرشتوں کو تو اعمال خفیہ کا نامۂ اعمال دیکھنے سے علم ہوتا ہے اور اہل کشف کے لیے یہ شخص اپنا آپ نامۂ اعمال ہے۔ اسی کو حضرت علی فرماتے ہیں ؎

"تمہاری غذا خود تمہارے اندر ہے اور تم دیکھتے نہیں، تمہاری دوا تمہیں سے ہے اور تم شعور نہیں کرتے۔ تم وہ کتاب ہو کہ اس کے حروف سے پوشیدگیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ تم اپنے آپ کو جرم صغیر سمجھتے ہو حالانکہ تمہارے اندر ایک عالمِ اکبر لپٹا ہوا ہے۔"

تو گویا تم خود کتاب مبین ہو۔ قرآن مجید میں ہے وَوَجَدُوْا مَاعَمِلُوْا حَاضِرًا حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے اس کی بھی تفسیر فرمائی تھی۔ فرماتے تھے کہ خود اعمال حاضر ہوں گے قیامت کے روز۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ جو اعمال ختم ہو چکے وہ کیسے عود کریں گے۔ محقق دوانی نے اسے اس طرح رفع کیا ہے کہ انھوں نے اپنے رسالہ زوراء میں یہ ثابت کیا ہے کہ حقائقِ اعمال جوہر ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات تو نہیں آئی کہ حقائقِ اعمال جوہر ہیں۔ ہاں اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ معنی مصدری قیامت میں نہ ہوں گے بلکہ حسب تصریح مولانا محمد یعقوب صاحب ان اعمال کے اثر قیامت کے روز شکلیں بن بن کر اہل محشر کو نظر آئیں گے۔ مثلاً جو چوری کر چکا ہے

وہاں نظر آئے گا کہ چوری کر رہا ہے۔ زنا کر چکا وہاں نظر آئے گا کہ زنا کر رہا ہے۔ غرض جو آثار اعمال کے اس کے بدن میں جمع ہیں سب وہاں اعمال بن کر نظر آئیں گے۔

تو حضرت تمام اعمال کے آثار اس (عامل) میں پیدا ہو جاتے ہیں تو جو صوت صلوٰتیہ پہلی ہیں۔ وہ سب اس شخص کے اندر موجود ہیں تو یہ صلوٰۃ جس میں نفخ ہوا روح کا اسی سے سب میں رُوح پھیل جائے گی۔ جس وقت ایک آئینہ پر روشنی کا عکس پڑتا ہے تو وہ اپنے پاس کے آئینوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ جو صورت ایک آئینہ کے اندر ہوتی ہے سب میں پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر پہلی نمازوں میں قابلیت ہے تو بھی ایک رُوح ان میں بھی پہنچ جائے گی۔

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ صورت کی حفاظت کی بہت ضرورت ہے۔ مگر صرف صورت ہی پر قناعت نہ کرو اس کی بھی کوشش کرو کہ روح کو اس سے متعلق کر دو۔ اور وہ رُوح حق تعالیٰ کی یاد ہے۔ (روح القیام ص ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۷، ۲۸)

کامل وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو، ہر ادا ویسی ہی ہو

آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا گو خطرات آئیں افضل ہے اور آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا گو خطرات نہ آئیں مفضول ہے کیونکہ خلاف سنّت ہے۔

حضور کا ہمشکل بننا افضل ہے۔ حضرت اللہ کے نزدیک تو صورت بھی حضور کی مقبول ہے۔ یہ یاد رکھو کہ ولایت، شعبہ نبوّت کا ہے جتنا زیادہ کوئی شخص مشبہ بالنبوۃ ہوگا اسی قدر اس کی ولایت میں کمال ہوگا۔ عوام جوش و خروش والے کو زیادہ پسند کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا کامل ہے۔ حالانکہ وہ کامل نہیں البتہ معذور ہے۔ کامل وہ ہے جو حضور کے مشابہ ہو، ہر ادا ویسی ہی ہو نشست و برخاست، خورد و نوش، ہنسنا بولنا۔ غرض یہ کہ سب باتیں حضور ہی کی طرح ہوں۔ بس یہ ہے کامل۔ حضورؐ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو کبھی نماز میں استغراق نہیں ہوتا تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

کہ میں یہ سوچ کر آتا ہوں کہ آج نماز میں تطویل کروں گا، مگر بچّہ کی آواز سنتا ہوں تو اس خوف سے مختصر کر دیتا ہوں کہ شاید کوئی بچّہ والی عورت نماز میں ہو اور بچّہ کی آواز سے پریشان ہو۔

(روح القیام ص۱۴۱)

نماز خود مقصود ہے

ایک بے نمازی تھانہ دار کا قصّہ ہے کہ اس کی بیوی نماز پڑھتی تھی اور وہ اس سے پوچھتا تھا کہ نماز پڑھنے سے تجھ کو کیا ملا؟ افسوس خدا کی عبادت کے متعلق یہ سوال کہ تجھ کو کیا ملا۔ کیا کوئی بیٹے سے بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ تجھ کو باپ کی خدمت سے کیا ملا؟ یہ تھانہ دار مجھ سے پوچھتا تو میں جواب دیتا کہ ہم کو نماز ملی۔ ارے نماز خود مقصود ہے، بندگی اور عبادت خود مطلوب ہے۔ کسی عمل کے متعلق یہ سوال کہ اس سے کیا ملا اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ عمل خود مقصود نہ ہو۔ باقی مقاصد میں یہ سوال نہیں ہو سکتا۔

احوال وکیفیات مقصود نہیں

ہمارے حاجی[1] صاحب امام وقت تھے۔ آپ سے جب کوئی کہتا کہ ذکر سے نفع نہیں ہوتا، فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم ذکر کر رہے ہو۔ یعنی بندگی کا مقتضا یہ ہے کہ ذکر ہی کو خود مقصود سمجھے۔ یہ کیا بندگی کہ مزا آیا تو کر لیا ورنہ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہاں ذکر پر جس ثمرہ کے مرتب ہونے کا وعدہ ہے وہ ضرور ملے گا۔ دنیا میں تو صرف یہ وعدہ عامّہ ہے کہ فاذکرونی اذکرکم (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ احکم الحاکمین آپ کو یاد کریں۔ اور آخرت میں مغفرت وجنّت کا وعدہ ہے۔ باقی ان احوال وکیفیات کا تو کہیں وعدہ بھی نہیں۔

صاحبو! ان احوال وکیفیات کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے کے ساتھ سرکہ چٹنی۔ اب اگر کسی وقت دسترخوان پر سرکہ چٹنی نہ ہو تو کیا آپ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں تو کھانا بھی نہیں کھاتا۔ اگر چٹنی سرکہ ہی کھایا کرو گے تو دماغ چٹنی ہو جائے گا۔ نہ

---

[1] پیرو مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ۔

سر کے رہو گے نہ پھر کے۔ ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

(افناء المحبوب لارضاء المطلوب صہ ۱۵-۱۶)

ہر عاشق کی تمنّا

اگر نماز فرض نہ ہوتی تو جو چیزیں اب نماز کے اندر ہیں کیا آپ ان کو نہ ڈھونڈھتے؟ یقیناً آپ خود ان کو ڈھونڈھتے اور ان کی طلب و تلاش میں عمریں ختم کر دیتے۔ کیونکہ ہر عاشق کی تمنّا ہوتی ہے کہ محبوب کے سامنے اپنا عجز و نیاز ظاہر کرے اور اس کی تعریف و ثنا میں زبان کو تر کرے۔ اور اس کی یاد سے دل کو تسلّی دے تو کیا آپ کو حق تعالیٰ سے محبّت نہیں؟ کوئی شخص اس کا اقرار نہیں کر سکتا۔ حق تعالیٰ سے انسان کو فطری محبت ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ کے اندر صفات کاملہ ایسی ہیں جن کی وجہ سے محبّت ہونا ہی چاہیے۔ اب بتلائیے محبت کا یہ تقاضا ہوتا ہے یا نہیں کہ میں محبوب کا نام لُوں، محبوب سے باتیں کروں، محبوب کے سامنے کھڑا ہوں اس کے سامنے اپنا عجز و نیاز ظاہر کروں۔ حضرت محبت وہ چیز ہے جو کسی حال میں محبوب کا نام لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

(الصلات فی الصلوٰۃ صہ ۱۸)

دنیا میں بڑی کامیابی

دنیا میں بڑی کامیابی بندہ کی یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف یکسوئی کے ساتھ نماز میں توجہ نصیب ہو جائے۔ اسی واسطے صوفیہ مجاہدے کرتے ہیں اور اسی کو مشاہدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(الصلات فی الصلوٰۃ صہ ۲۸)

نماز کی توفیق ہونا ہی بڑی نعمت ہے

ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس آیا۔ مؤذن نے دھمکایا کہ لوگ مسجد میں جانور گھسا دیتے ہیں تو

قصائی نے جواب دیا کہ کیوں بڑبڑ کرتا ہے، جانور تھا گھس گیا کبھی ہم کو بھی مسجد میں دیکھا ہے تو حضرت اگر وہ نہ چاہتے یہی حال آپ کا ہوتا کہ مسجد میں کبھی گھسنے کی بھی توفیق نہ ہوتی۔ ہمارے حاجی صاحب اسی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ صبح کی نماز پڑھ کر جب ظہر کی توفیق ہو جائے تو یہ نمازِ صبح کی قبول کی علامت ہے۔ اگر ان کو تمہارا دربار میں آنا ناگوار ہوتا تو دوسرے وقت گھسنے بھی نہ دیتے۔ اور جب کوئی شخص ذکر میں حال وغیرہ نہ حاصل ہونے کی شکایت کرتا اور یہ کہتا کہ کچھ نفع معلوم نہیں ہوتا تو فرماتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم خدا کا نام لے رہے ہو اور پھر یہ شعر پڑھتے ؎

یابم او را یا نیابم جستجوئے میکنم — حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

واقعی ذکر اللہ کی توفیق ہو جانا ہی بڑی نعمت ہے۔ اس کے بعد اور کیا چاہتے ہو۔ پس تم کیا ذوق شوق لیے پھرتے ہو۔ کام میں لگو اور اس نعمت کی بے قدری نہ کرو کہیں یہ نعمت بھی سلب نہ ہو جائے۔ "بلا بودے اگر ایں ہم نبودے" تم اپنا کام کرو۔ دوسرے کے کام کے پیچھے کیوں ہو۔ کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن۔ ذوق و شوق عطا کرنا ان کا کام ہے۔ یہ تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ تم اس کے درپے نہ ہو جو کام تمہارے اختیار کا ہے اس میں لگو۔ یہ ہے مذہب اہلِ تحقیق کا اور اسی میں راحت ہے۔ ذوق مل جائے تو عنایت نہ ملے تو عنایت تم ہر حال میں راضی رہو۔

(الفصل والانفصال ص۲۸)

○

نماز کے متعلق کوتاہیاں

اصلاح معاملہ بہ نماز

بعدِ ایمان اعمال میں نماز کا جو درجہ ہے وہ کسی عمل کو حاصل نہیں اور اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کا ایک خاص اہتمام ہوتا کہ اس میں کوئی نقص نہ رہتا مگر ہماری کم توجہی و غفلت نے اس کو بھی کوتاہیوں سے خالی نہ چھوڑا جن میں سے بعض کا بیان اس موقع پر کیا جاتا ہے اور اس کے قبل یہ امر بھی قابلِ عرض کر دینے کے ہے کہ نماز میں اختلال کا جو وبال ہے وہ اس خاص حیثیت کے اعتبار سے بہ نسبت دوسرے اعمال کے اختلال کے زیادہ ہے کہ نماز فرض ہے اور ہر دن رات میں پانچ بار فرض ہے اس میں کوتاہی کرنا حق تعالیٰ کو دن بھر پانچ بار ناخوش کرنا ہے۔

بخلاف دوسرے اعمال کے کہ بعض فرض نہیں اور یا فرض ہیں تو روزانہ فرض نہیں، جیسے "روزہ" کہ سال بھر میں فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ کہ وہ بھی سال بھر میں فرض ہوتی ہے اور "حج" کہ عمر بھر میں ایک بار فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ اور حج تو سب پر فرض بھی نہیں ہوتا۔ یہ تفاوت تو نماز کو اور افعال سے ہے۔

بعض لوگ دینداروں میں شمار ہوتے ہیں اور امام میں شرعی عیب نکال کر جماعت ترک کرتے ہیں کبھی تو اصلی سبب اس کا دنیوی رنج ہوتا ہے۔ بہانہ کے لئے کوئی عیب ڈھونڈ کر اس کی آڑ لیتے ہیں کہ وہ تو فلاں معصیت میں مبتلا ہے، فلاں بدعت میں مبتلا ہے بعض متکبروں کو اصل مانع تکبّر و غرباء کی تحقیر ہوتی ہے۔ مگر چونکہ دین دار کہلاتے ہیں اس لئے شرعی عنوان نکال کر اپنی غرض حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً مفتی سے پوچھتے ہیں کہ

جناب جس کی بیوی بے پردہ پھرتی ہو وہ دیّوث ہے یا نہیں؟ اور اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ وعلیٰ ہذا۔

اور کبھی اصلی سبب تدیّن بھی ہوتا ہے۔ مگر احکام کے نہ جاننے سے یا اہتمام نہ کرنے سے غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دل سے بدعت سے نفور ہیں اس لیے امام سے بُغض للدّین ہے اور کوئی رنج دنیوی نہیں ہے، مگر اس مسئلہ کی ان کو خبر نہیں کہ انفراد سے ہر حالت میں جماعت کی نماز افضل ہے۔ اگرچہ امام مبتدع ہو بشرطیکہ بدعت اس کی حدِ کفر تک نہ پہنچ گئی ہو، اگر اصلی سبب دنیوی رنج ہو تو سمجھنا چاہیے کہ دین کو اپنی اغراضِ دُنیویہ کا ذریعہ بنانا سخت نازیبا و ناپسندیدہ اور بے ادبی و گستاخی ہے جس کا قبیح ہونا محتاج بیان نہیں۔ اگر خلق سے اپنا عیب چھپا لیا تو حق تعالیٰ پر تو ظاہر ہے اس کو کیا جواب دو گے؟

اگر اصلی سبب تکبّر ہے تب بھی یہی جواب ہے اور اس سے کچھ اُوپر بھی مفصّل بیان تکبّر کا ہو چکا ہے اور یہ بے پردگی کا بہانہ جو تراشا گیا ہے، سو اس کا کلّی جواب تو یہی ہے کہ نفسانی غرض کو دین کی آڑ کیوں بناتے ہو اور جزئی جواب یہ ہے کہ خود معترض بھی اس اعتراض سے کم محفوظ ہوں گے، کیونکہ پورا پردہ شریعت کے موافق بڑے لوگوں میں بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر اُن کے متعلقات دور و نزدیک کے اعزّہ کے روبرو بے حجاب آتے ہیں، اتنا فرق ہے کہ بعض غریبوں کی عورتیں خود گھر سے نکل کر نامحرموں کا سامنا کرتی ہیں اور امیروں کی عورتیں گھروں کے اندر بیٹھ کر نامحرموں کا سامنا کرتی ہیں، تو دونوں برابر ہوئیں، بلکہ غریبوں کی بیویوں میں اتنی ترجیح ہے کہ وہ میلی کچیلی ہو کر نامحرموں کے سامنے آتی ہیں اور امراء کی عورتیں زیب و زینت کے ساتھ آتی ہیں، تو اب خود دیکھ لیجئے کہ یہ اقبح ہے یا وہ اقبح ہے؟ تو اس حیثیت سے بھی اکثر غرباء اولیٰ بالامامت ہوئے اکثر امراء سے۔

اور اگر تدین ہی سبب ہے تو اس میں جو غلطی ہے وہ مسئلہ کے جاننے سے جاتی رہے گی، جیسا اُوپر بیان کیا گیا کہ انفراد سے جماعت افضل ہے، رہی کراہت تو اول تو کراہت اقتداء اس کے لیے ہے جو اس امام کے معزول کرنے پر قادر ہو، پھر یہ کہ کراہت اخف ہے ترکِ جماعت کی کراہت یا حرمت سے، البتہ اگر ایسے مقام پر شریکِ جماعت ہونے سے احتمال فتنہ کا ہو تو یکسوئی بہتر ہے۔

ان تارکانِ جماعت میں بعض مشائخ دیکھے جاتے ہیں، ان کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ جماعت میں اختلاطِ خلق ہوتا ہے اور اختلاطِ خلق ذاکر و سالک کو مضر ہے۔

اور بعض نے یہ بیان کیا کہ تنہا پڑھنے میں وساوس و خطرات کم آتے ہیں اور جو نماز حضورِ قلب کے ساتھ ہو وہ افضل ہوتی ہے۔ عدمِ حضور والی نماز سے اور جماعت میں یہ حضور میسّر نہیں ہوتا، اس دھوکہ کا منشاء یہ ہے کہ یہ حضرات مواجید و کیفیاتِ ذوقیہ کو مقصود بالذات سمجھ بیٹھے اور وہ بعض اوقات خلوت میں زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت جلوت کے، لیکن واقع میں مقصود بالذات رضائے حق ہے جس کا ذریعہ بجا آوریٔ احکام ہے کہ منجملہ ان کے جماعت کی نماز ہے۔ اگرچہ اس میں ذوقیات و وجدانیات کی قلت ہو۔ پھر تجربہ ہوا ہے کہ بعض افعال شرعیہ گو سردست کسی کیفیتِ خاص کی قلت کا سبب معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی مداومت سے دوسری کوئی کیفیت بتدریج ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کیفیت فائتہ سے اعلیٰ و اقویٰ و ابقیٰ ہو، اُس وقت اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

خشوع کا فقدان

(۷) ایک کوتاہی جس کو عوام تو عوام بعضے خواص بھی کوتاہی شمار نہیں کرتے اور اس حیثیت سے وہ خاص طور پر اہتمام کے قابل ہے۔ نماز میں خشوع و حضورِ قلب کا نہ ہونا ہے، جس کے مطلوب ہونے کے لیے آیۃ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (المؤمنون:۱-۲)

یعنی کام نکال لے گئے ایمان والے، جو اپنی نمازیں جھکنے والے ہیں۔
اور اس میں تقصیر کرنے کی مذمت کے لیے آیت اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ الخ (الحدید: ۱۵-۱۶) (کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گوگڑائیں ان کے دل) کافی ہے۔

اور سبب اس کا بالاستقراء دو امر ہیں:

(۱) بعض کو تو اہتمام ہی نہیں ان کے لیے تو یہ بے اعتنائی۔
(۲) بعض کو اہتمام ہے مگر اس کی حقیقت نہ جاننے سے اس کو اختیار اور قدرت سے باہر سمجھتے ہیں اس لیے اس کی تحصیل کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔

پہلے سبب کا علاج تو آیاتِ بالا کے مضمون میں غور کرنا ہے۔

اور دوسرے سبب کا علاج اس کی حقیقت سمجھنا ہے جس کو مختصراً بیان کرتا ہوں، جس کا وعدہ اس کوتاہی کے ضمن میں کیا گیا ہے کہ بعضے ترکِ نماز کا یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم سے حضورِ قلب نہیں ہو سکتا اور نماز بدون اس کے ہوتی نہیں۔

خشوع کی حقیقت

سو حقیقتِ لُغَوِیَہ خشوع کی سکون ہے اور حقیقتِ شرعیہ اس کی، سکونِ ارادی ہے قلب اور جوارح کا، اور سکون مقابل ہوتا ہے حرکت کے، سو جیسی حرکت ویسا سکون تو جوارح کی حرکت اَیْنِیَّہ یعنی مکانیہ ہوتی ہے ان کا سکون یہی ہے کہ جس حرکت کا شرعاً امر نہیں وہ حرکت نہ کرے یعنی ارادہ سے ہاتھ پاؤں عبث نہ ہلادے، اِدھر اُدھر گردن یا نظر سے التفات نہ کرے، سر اوپر کو نہ اٹھادے، بالوں کو، کپڑوں کو بار بار نہ سنوارے، بدون ضرورت نہ کھجلادے، نہ کھنکارے وغیرہ ذالک

اور قلب کی حرکت فکریہ ہے اس کا سکون عدم التفکر ہے یعنی اپنے ارادہ سے کسی بات کو نہ سوچے، سو جیسی حرکت جوارح کی اگر بلا قصد ہو، مثلاً رعشہ سے کسی

کی گردن ہلتی ہو تو وہ منافی خشوع کے نہیں کیونکہ اختیار سے خارج ہے اور اضطراریات امر و نہی کے تحت میں نہیں ہیں، اسی طرح اگر حرکت قلب کی بلا قصد ہو یعنی کوئی خیال خود بخود آجاوے تو وہ بھی اسی دلیل سے منافی خشوع کے نہیں پس غلطی لوگوں کی یہ ہے کہ خشوع کے معنی یہ ہیں کہ بالکل خیال نہ آوے اور اسی بناء پر اس کو محال عادی سمجھتے ہیں مگر اس بناء کا فاسد ہونا ہماری تقریر سے معلوم ہو چکا ہے جس سے محرر ہو گیا کہ خشوع اختیاری فعل ہے اور ہر شخص اس پر قادر ہے اور بہت آسان ہے البتہ ارادہ و توجہ کی ضرورت ہے۔

حصولِ خشوع کا طریقہ پس جیسے سب افعالِ ارادیہ کی شان ہے کہ ارادہ کرو تو آسان ارادہ نہ کرو تو دشوار حتیٰ کہ اگر منہ میں لقمہ لے کر بیٹھ جاوے اور نگلنے کا ارادہ نہ کرے تو وہ بھی آسان نہیں پس اگر لقمہ نگلنا آسان ہے تو خشوع بھی اتنا ہی آسان ہے اور اگر خشوع محال ہے تو لقمہ نگلنا بھی اتنا ہی محال ہے، دونوں کے یُسر اور عُسر میں کچھ فرق نہیں اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے کہ نماز میں جو کچھ بھی منہ سے نکلے محض یاد سے نہ پڑھے بلکہ ہر ہر لفظ پر مستقل ارادہ کر کے اس کو منہ سے نکالے کہ اب سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ کہوں گا اب وبحمدك کہہ رہا ہوں اب وتبارك اسمك منہ سے نکل رہا ہے وعلیٰ ہٰذا۔

پس جب ہر لفظ پر خاص توجہ رہے گی لامحالہ حسب قاعدہ عقلیہ کہ النفس لاتتوجه الی شیئین فی آنٍ واحدٍ دوسرے خیالات بند ہو جاویں گے (ترجمہ: نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔)

اس مراقبہ کو اول سے آخر تک بالالتزام کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اول تو بلا قصد بھی کوئی خیال نہ آوے گا اور اگر فرضاً آجاوے تو پھر اس سوچ میں نہ پڑے کہ ارے یہ تو پھر خطرات آنے لگے۔ یہ سوچ بھی خیال غیر ہے، بلکہ اسی عمل تجدیدِ تعلقِ ارادہ و توجہ

کو بطریق مذکور آئندہ کیلئے پھر تازہ کر دی جاوے۔ پھر وہ خطرات دفع ہو جاویں گے۔ وھذا من افادات استاذی استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب علیہ رحمۃ اللہ علام الغیوب[1]۔

اور اس احقر کا ایک وعظ خشوع کے ہر پہلو پر مفصل بحث میں شائع ہو چکا ہے جس کا نام "مواعظ اشرفیہ" ہے اس کے ملاحظہ سے انشاء اللہ تعالیٰ اس باب میں کسی قسم کا خفاء باقی نہ رہے گا۔

متفرق کوتاہیاں

ایک کوتاہی کہ ذی شعب مختلفہ ہے اور اسی پر اپنی تحریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ نماز اتنی بڑی ضروری چیز اور پھر روزانہ پانچ بار واقع ہونے والی اور اس کے شرائط و ارکان کے ہر جزو اور ہر موقع پر بے شمار صورت پیش آتی ہیں، جن کے احکام بہت لوگوں کو معلوم نہیں، مگر باوجود اس کے بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ ان احکام و مسائل کو لوگ دریافت کرتے ہوں!

(۱) بہت لوگ ناواقفی سے بلا اضطرار اس طرح جمائی لیتے ہیں یا بلا عذر کھنکارتے ہیں کہ حروف ظاہر ہو کر نماز جاتی رہتی ہے۔

(۲) بہت لوگ ایسے لباس غیر مشروع سے نماز پڑھتے ہیں کہ نماز ان کی قبول نہیں ہوتی بالخصوص بعض اقسام ریشم اور مخمل کے استعمال میں تو خواص تک بے احتیاطی کرتے ہیں۔

---

[1] حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی ولد مولانا مملوک علی صاحبؒ ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ / جون ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام منظور احمد ہے۔ حدیث شریف آپ نے شاہ عبد الغنیؒ سے پڑھی معقولات منقولات غرض کہ تمام فنون میں کامل تھے۔ شاعری میں کسی کی شاگردی نہ کی۔ مگر کبھی جب طبیعت حاضر ہوتی تو اردو فارسی عربی میں بہترین شعر کہتے تھے۔ شاعری میں غلو نہ تھا۔ بلا تکلف اگر کہہ لیا کہہ لیا ورنہ نہیں گمنام تخلص فرماتے تھے۔ یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۴ء میں ہیضہ کی وبا میں وفات پائی۔ ۱۲، محمد علی۔

(۳) بعض لوگ ہجوم میں امام سے پہلے نیت باندھ لیتے ہیں کہ وہ نماز ہی نہیں ہوتی۔

(۴) بعض لوگ امام کے ساتھ رکوع میں اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ اللہ اکبر کہتے ہی رکوع میں پہنچ جاتے ہیں اور اول قیام نہیں کرتے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔

(۵) بعضے لوگ قعدہ اخیرہ میں امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتے ہیں مگر ان کی تکبیرِ تحریمہ ختم کرنے سے پہلے امام سلام پھیر دیتا ہے تو وہ اقتداء صحیح نہیں ہوتی اور نیت اقتداء موضع انفراد میں مفسدِ صلوٰۃ ہے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔ از سرِ نو نماز شروع کرنا چاہیے۔

(۶) اسی طرح بعض اوقات امام سہواً بعد قعدۂ اخیرہ کے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسبوق بھی اقتداء کی حیثیت سے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے حالانکہ اس وقت مسبوق کو اقتداء جائز نہیں تو اس کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے۔

(۷) علیٰ ہذا اگر امام مسافر بعد دو رکعت کے کھڑا ہو جاوے مقتدی مقیم کو اس کے ساتھ مقتدی رہنا بھی مفسد صلوٰۃ فرض ہے۔

اس مقام پر مسائل کا استیعاب مقصود نہیں اور نہ ممکن ہے، محض بعض مثالیں پیش کرنا ہے کہ ایسی صورتیں کس کثرت سے واقع ہوتی ہیں جن میں نماز نہیں ہوتی اور لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

اسی طرح شرائط میں بھی بے پروائیاں کی جاتی ہیں:

(۸) بعضے آدمیوں کو دیکھا گیا ہے کہ کپڑے پر تکیہ پر اگرچہ غبار نہ ہو تیمم کر لیتے ہیں۔

(۹) بعض کو دیکھا ہے کہ اگر وضو و غسل میں کہیں پاؤں وغیرہ خشک رہ جاتا ہے ویسے ہی تر ہاتھ پھیر لیتے ہیں جو کہ مسح ہے، پانی ڈال کر نہیں دھوتے۔

(۱۰) بعض آدمی باوجود اندیشۂ قطرہ کے فوراً صرف پانی سے استنجا کر لیتے ہیں اور

پھر قطرہ آجاتا ہے، اگر خبر بھی ہوگئی اور وضو بھی دُہرالیا مگر پائجامہ پاک نہیں کرتے اور اس طرح کئی بار میں مقدار عفو سے بڑھ جاتا ہے اور اسی کپڑے سے نماز پڑھتے رہتے ہیں اور اگر علم نہ ہُوا تو بے وضو ہی نماز پڑھی جاوے گی اور اگر شبہ ہو کہ بے خبری میں معذور ہے؟ جواب یہ ہے کہ معذور اس وقت ہے کہ جب نقضِ وضو کا احتمال غالب نہ ہو ورنہ اس احتمال کا انسداد واجب ہوگا اور جب قوی کا ضعف مشاہدہ ہو تو قطرہ کا قطع کرنا ضروری ہوگا اور تجربہ سے اس باب میں کلوخ سے بہتر کوئی چیز ثابت نہیں ہُوئی۔

نااہل کو امام بنالینا

اسی طرح بہت جگہ امام ایسے ہیں کہ نماز لوگوں کی فاسد یا مکروہ ہوتی ہے، پھر بعض جگہ تو مقتدی ہی اس خرابی کا سبب ہوتے ہیں، یعنی امام تقرر کرنے کے وقت اس کی صلاحیت واہمیت کو نہیں دیکھتے بلکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ محلّہ بھر میں جو شخص سب سے نکمّا ہوتا ہے اس کو ارزاں سمجھ کر امامت کے لیے تجویز کیا جاتا ہے، چاہے اس کو قرآن پڑھنا بھی نہ آتا ہو، خواہ اُس کو مسائل بھی یاد نہ ہوں اور بعض جگہ مقتدیوں کا کچھ دخل ہی نہیں ہوتا خود ہی براہ تکبّر بعضے اہلِ وجاہت امام بن بیٹھتے ہیں اور قصبات میں جمعہ وعیدین کے اکثر ائمہ اسی شان کے ہیں اور اس خرابی کی ابتداء امامت کا موروث ہونا ہے جس کی بناء بعض سلاطین کے وقت سے پڑی ہے۔ اُس وقت گو اس میں کوئی مصلحت ہو، مگر اب تو اس قدر مفاسد ہوگئے ہیں کہ اس کا توڑنا اور ایسے امام کو چھوڑنا واجب ہے۔ اگر اس کے معزول کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود تو عزلت کرنا ممکن ہے۔ یعنی سب مل کر کسی دوسری جگہ جماعت کا انتظام کرلیں، اور کسی اہل کو امام تجویز کرلیں۔ البتہ جہاں امام سے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو تو یہ بے چارے معذور ہوں گے، صبر کرنا چاہیے۔

(اصلاح انقلاب امت)

فصل (۳)

روزہ

روزہ کی فضیلت جنّت کے آٹھ دروازوں میں سے ایک کا نام باب الرّیان ہے۔ اس حدیث میں روزہ کی فضیلت بیان فرماتے ہیں کہ روزہ دار ہی اس دروازہ سے داخل ہوں گے اور اطلاق لفظ سے روزہ سے مراد عام ہے۔ نفل ہو یا فرض۔ پھر جب نفل کی بھی اتنی فضیلت ہے تو فرض کی تو کیا کچھ فضیلت ہوگی۔ اور روزہ کے فضائل تو بہت ہیں مگر یہ ایک فضیلت نہایت مزے دار ہے کیونکہ پیاسے کو پانی کا نام سننے سے مزا آتا ہے اسی واسطے نام بھی وہ لیا گیا کہ جس کے سننے سے فرحت ہو۔ وہ کیا باب الریّان یعنی تر و تازہ دروازہ جو پانی سے سیراب ہو اور روزہ دار کو جیسی پانی سے فرحت ہوتی ہے اور پانی جیسا محبوب ہے دوسری چیز نہیں اور قاعدہ ہے کہ محبوب کا نام لینے سے بھی مزہ آتا ہے۔ اگر مزہ نہ آتا تو ایک عاشق یہ شعر نہ کہتا۔ اگرچہ وہ شراب ہی کو کہہ رہا ہے ؎

الا فاسقنی خمرًا و قل لی الخمر
ولا تسقنی سرًّا متی امکن الجہر

کہ شراب پلاتا جا اور اس کے ساتھ یوں کہتا جا کہ شراب ہے شراب ہے یہ محبوب کے نام سے لطف حاصل کر رہا ہے اور یہ چاہ رہا ہے کہ پلانے والا زبان سے اس کا نام بھی لیتا جاوے۔ اس میں مزا ہے۔ کوئی عاشق مزاج کبھی نہ کہے گا کہ محبوب کا نام لینا بے مزہ ہے۔

غرض روزہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے پانی، اسی واسطے میں نے ایسی حدیث چھانٹی جس میں پانی کا ذکر ہے اور پانی بھی اللہ میاں کے یہاں کا جس کی یہ صفت ہے لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ۔

جنّت بھی پکارے گی کہ اے اللہ مجھ کو بھر دیجیے۔ فوراً حق سبحانہٗ تعالیٰ

روزہ کا مزہ

ایک مخلوق پیدا کر کے اس میں داخل فرما دیں گے کہ وہ اس میں رہا کریں گے۔ میں نے اپنے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم بھی انہی میں سے ہو جاتے تو کیا اچھا ہوتا۔ فرمانے لگے کہ خدا نہ کرے وہ کیا جانیں جنّت کا مزہ جنہوں نے کبھی تکلیف نہیں اُٹھائی۔ مزہ ان کو ہی آوے گا جو یوں کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ۔ ہمیں چین ہو گا انہیں کیا چین؟ جس نے روزہ نہ رکھا ہو تو اس کو شام کے وقت کیا مزہ؟ استطراداً یاد آ گیا کہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ شام کے وقت روزہ داروں میں بیٹھ کر کہتے ہیں لاؤ ہم بھی روزہ افطار کر لیں۔ مگر جب روزہ نہیں تو جانے کس چیز کو افطار کرتے ہیں۔ یہ بھلے مانس روزہ دار تو ہوتے نہیں مگر افطاری میں سب سے پہلے آموجود ہوتے ہیں۔ مگر انہیں کیا مزہ۔ مزہ تو شام کے وقت سوختہ افروختہ لوگوں کو ہوتا ہے کہ پانی کا نام لینے میں ان میں جان آتی ہے۔ استلذاذ کے لیے پوچھا کرتے ہیں کہ یہ پانی کہاں کا ہے۔ ایک شخص تو کہنے لگے کہ میں تو رمضان شریف میں اسٹیشن پر رہتا کہ وہاں کے کنوئیں کا پانی عجیب ہے اسی طرح جنّت کا مزہ بھی اہلِ مصیبت کو ہو گا۔

فرمایا: باب ریّان کے معنی ہیں دروازہ پانی سے سیراب ہونے والا، دروازہ کا نام لینے ہی سے روئیں روئیں میں جان آ گئی۔ یہ دروازہ کا نام ہے۔ جو صائمین کے لیے بہت ہی مناسب ہے۔ چنانچہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دُعا افطار کی تعلیم فرمائی ہے اس میں بھی ایسی ہی مناسبت ہے یعنی اس میں بھی پانی کا ذکر ہے۔ حکیم ایسے

ہی ہوتے ہیں۔ دُعا یہ ہے:

ذَهَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْشَاءَ اللّٰهُ۔

اور ایک یہ دُعا بھی ہے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ۔

ذهب الظماء الخ کے معنی یہ ہیں کہ پیاس جاتی رہی اور رگیں تر ہوگئیں اور خدا نے چاہا تو ثواب ثابت ہوگیا۔ رہا یہ شبہ کہ سناتے کس کو ہیں۔ بات یہ ہے کہ کسی کو نہیں سناتے بلکہ اللہ میاں کی نعمت کو یاد کرتے ہیں۔ زبان سے کہہ کر مزالے رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدہ بھی کرایا تو ایسا جس میں لطف ہے۔ دن بھر تو انتظار کا لطف اٹھایا اور شام کو روزہ افطار کرنے بیٹھے تو سیرابی کی نعمت بھی حاصل ہوگئی۔ اور زبان سے اس کا تذکرہ بھی ہُوا۔ واللہ عجیب لطف ہے نہ معلوم رمضان میں لوگ کیونکر بے روزہ رہتے ہیں؟

غرض روزہ داروں کو کئی طرح کے لطف حاصل ہوتے ہیں۔ روحانی لطف تو ہے ہی ہم جیسے پیٹ کے کتّوں کو بھی لطف ہے۔ دیکھو انتظار میں اس وقت کیسا لطف ہے۔ کسی غیر محقق کا قول ہے ؎

جو مزا انتظار میں دیکھا پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا

غیر محقق اس لیے کہا کہ یہ کلام علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ دنیا کے محبوبین کا لطف تو بے شک وصل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے لیکن محبوب حقیقی کے قرب کا لطف غیر متناہی ہے کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ کیفیت ہے ؎

دلارام در بر دلارام جو لب از تشنگی خشک و بر طرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

ایک اور شعر ہے ؎

گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد
داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
جن کی یہ شان ہے ان کی طلب بھی غیر متناہی ہے ایک شاعر طلب کے غیر متناہی
ہونے کو بیان کرتا ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد

پس روزہ کا لطف کیا پوچھتے ہو پانی کے انتظار میں ایک لطف پھر پیتے وقت اس سے زیادہ لطف۔ پھر رگیں بھی تر ہو گئیں۔ یہ تیسرا لطف۔ پھر آخرت کے لطف کی خبر دی کہ باب مُسمّٰی ریان یعنی وہ دروازہ تر بتر ہو گا۔ جو اس میں داخل ہو گا وہ بھی تر بتر و سیراب ہو جائے گا۔

روزہ دار کے واسطے دو نعمتیں قرآن سے بھی روزہ دار کے لیے دو نعمتیں ثابت ہوتی ہیں۔ سیرابی کی بھی اشربوا سے اور سیری کی بھی کلوا سے چنانچہ ارشاد ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ـ

پس روزہ دار ریّان بھی بنائے جائیں گے اور شبعان بھی اور حدیث میں گو شبعان صراحۃً مذکور نہیں مگر ریان خود شبعان پر دلالت کرتا ہے کیونکہ پانی پینے کا لطف پیٹ بھرنے ہی پر آتا ہے۔ دوسرے کریموں کی عادت ہے کہ کھانا کھلا کر پانی پلایا کرتے ہیں۔ خالی پیٹ پر نہیں پلاتے۔ ہاں بعض بخیلوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ پانی سے مہمان کا پیٹ بھرنا چاہا کرتے ہیں تاکہ کھانا کم کھاوے۔ کریموں کی عادت یہ ہے کہ کھانے کے بعد پانی دیتے ہیں قبل نہیں دیتے۔ تاکہ کھانا خوب کھایا جاوے۔ لہٰذا ریان عادتاً شبعان کو مستلزم ہے۔ باقی ریان کے عنوان میں صرف پانی کی بشارت اس لیے دی کہ صائم کو زیادہ مرغوب یہی ہے اسی کی بشارت میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

لا یدخلہ الا الصائمون - یعنی اس میں روزہ دار ہی جائیں گے -

فضیلت رمضان

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ - قرآن بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور دلائل واضحہ ہیں ان شرائع سماویہ میں سے جن کی شان ہدایت ہے یعنی شرائع سماویہ تو متعدد ہیں ان میں سے ایک قرآن بھی ہے -

یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ موقع تو ہے رمضان کی فضیلت بیان کرنے کا - چنانچہ اوپر صوم ہی کا ذکر چلا آرہا ہے اور بیان کی گئی قرآن کی فضیلت' اس کی کیا وجہ ہے ؟ جواب یہ ہے کہ فضیلت بیان کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں - ایک تو یہ کہ خود اس چیز کی فضیلت بیان کریں - اور ایک یہ کہ فضیلت تو بیان کریں دوسری شے کی اور اس کی فضیلت اس سے لازم آجاوے اور یہ احسن طریق ہے کیونکہ اس میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی ہے اسی کو کہتے ہیں -

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اس کی فضیلت کے بیان میں قرآن شریف کا نازل ہونا ہی کافی ہے - اور کسی فضیلت کے بیان کی حاجت نہیں - لفظ رمضان کو ان ایام صیام سے لفظی مناسبت بھی ہے کہ رمض سخت گرمی کو کہتے ہیں - اصل وجہ تو اس کی یہ ہوئی تھی کہ جب مہینوں کے نام ہوئے تھے تو ان ایّام میں سخت گرمی تھی اس لیے اس کا نام رمضان رکھا - پھر خدا تعالیٰ نے ان ایام میں عبادت ایسی مقرر کی کہ اگرچہ سردی ہی ہو تب بھی بہ نسبت اور ایام کے اس میں کچھ تو تپش ہوتی ہے یعنی بھوک پیاس کی تپش -

عشرہ اخیرہ کا امتیاز

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ رَمَضَانَ هُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرُهٗ

عِتْقٌ مِّنَ النِّيْرَانِ۔

یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے جو اس وقت آپ کے سامنے پڑھا گیا ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے فضائل بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک فضیلت وہ بھی ہے جس پر یہ جزو مشتمل ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "رمضان ایسا مہینہ ہے جس کا پہلا حصّہ تو رحمت ہے اور اوسط مغفرت ہے اور اخیر حصہ جہنم سے آزادی کا وقت ہے"

گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عشرۂ اخیرہ کا نام نہیں لیا۔ مگر ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اول و اوسط اور آخر تینوں حصّے برابر ہونے چاہئیں۔ کیونکہ تفاوت پر کوئی دلیل نہیں اور تقسیم میں اصل مساوات ہے۔ پھر چونکہ مہینہ کے اکثر تیس دن ہوتے ہیں اس لیے ہر جزو دس دن کا ہُوا۔ اور جزوِ آخر سے عشرۂ اخیرہ مراد ہُوا۔ گو کبھی انتیس دن کا بھی ہوتا ہے مگر کسور کا اعتبار نہیں ہُوا کرتا۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑے عالی نظر ہیں۔ آپؐ کسور کا اعتبار بھی فرما سکتے ہیں۔ مگر آپ کی شفقت عامہ کا مقتضا یہی ہے کہ مذاقِ عام کا لحاظ کیا جائے اور یہ حضورؐ کا کمال ہے کہ اپنے مقام عالی سے ہمارے مقام پر نزول فرما کر ہمارے مذاق کے موافق کلام فرماتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ شیخ کامل وہی ہے جو مرید کے مقام پر نزول کر کے اس کو تعلیم دے۔ ورنہ مبتدی کو اگر شیخ اپنے مقام کے موافق تعلیم دے گا۔ وہ ہرگز کامیاب نہ ہوگا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک فصیح و بلیغ آدمی بچّہ سے باتیں کرتے ہوئے اسی کی زبان میں گفتگو کرتا ہے کہ منّا ممّا پیوگے، ہپّا کھاؤگے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح بلا تشبیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مذاق کی رعایت کے ساتھ کلام فرماتے ہیں۔ اور آپ کی اُمّت امی ہے۔ اس کو کسور کا اعتبار دشوار ہے اس لیے آپ کے کلام میں جزو اول سے دس دن اور جزو اوسط سے دس دن اور جزو آخر سے کبھی دس اور کبھی نو دن مراد ہیں۔ حضور نے اپنی

امّت کی کیفیت خود بیان فرمائی ہے: "نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ"۔ اور غایت رحمت یہ ہے کہ آپ نے امّت کے ساتھ اپنے کو بھی شریک فرمایا کہ ہم اور ہماری امّت سب امّی ہیں۔ ہم کو لکھنا اور حساب کرنا نہیں آتا اور یہ کچھ نقص نہیں کیونکہ پڑھ لکھ کر علوم عالیہ بیان کرنا بڑا کمال نہیں۔ بڑا کمال تو یہ ہے کہ حضورؐ نے بدون لکھے پڑھے وہ علوم بیان فرمائے جن کی نظیر پیش کرنے سے ساری دنیا عاجز ہے۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

نگارِ من بہ مکتب نرفت و درس نکرد
بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا "اُمَّتِيْ اُمِّيَّةٌ" کہ میری امّت امّی ہے کیونکہ مضاف و مضاف الیہ میں تغائر ہوتا ہے اور آپ امّت کے ساتھ اپنا اتحاد بتلانا چاہتے ہیں۔ اگر حضورؐ اس اتحاد کو ظاہر نہ فرماتے تو کسی کو اتحاد کے دعوے کی اتنی ہمت نہ تھی اور یوں کوئی صاحبِ حال غلبۂ حال میں کہہ دے کہ ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو اور بات ہے مگر سب تو صاحبِ حال مغلوب نہیں وہ تو ادب ہی کا خیال کرتے ہیں اور ادب کا مقتضا یہ ہے ؎

نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی ست

اور نسبت تو بڑی چیز ہے اہل ادب تو نام لینے سے بھی شرماتے ہیں کہ ہماری گندی زبان اور وہ پیارا نام۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی ست

محض حکم کی وجہ سے نام لیتے ہیں اور یہ ادب پہلے ادب سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین

خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

حضرات صحابہؓ نے اس ادب کو سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں کُنَّا لَا نَقُوْمُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِمَا نَعْرِفُ مِنْ کَرَاھِیَتِہٖ لَہٗ "کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے وقت کھڑے نہ ہوتے تھے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ آپ کو کھڑا ہونا ناگوار ہے۔ اگر کوئی صحابہ کو دیکھے کہ حضور تشریف لائے اور وہ بیٹھے ہوئے ہیں تو آج کل کے لوگ تو اُن کو بے ادب کہتے۔ مگر بڑا ادب یہ ہے کہ اپنی خواہش کو فنا کردے۔ کھڑا ہونے کو جی چاہتا ہے بیٹھا نہیں جاتا مگر دل پر جبر کرکے بیٹھے ہیں۔ کیوں؟ ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھَجْرِیْ ۔۔۔ فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

اور ؎ میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق

ترکِ کامِ خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

یہاں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اہل اللہ کے ساتھ تکلّف کا برتاؤ ان کے منع کرنے پر کرتے ہیں، ان کے جوتے سیدھے کرتے ہیں وہ ادب میں ناقص ہیں۔ کیونکہ جب ان کو معلوم ہے کہ اُن کو ان افعال سے ناگواری ہوتی ہے تو پھر ان کی ناگواری کی پروا کیوں نہیں کرتے بلکہ اپنی ناگواری کی پروا کرتے ہیں کہ ہم سے نہیں دیکھا جاتا کہ پیر صاحب اپنے جوتے خود اپنے ہاتھ میں لیے جاتے ہیں۔ صاحبو! بڑا ادب یہ ہے کہ اپنے کو فنا کردے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بے وضو لینے کو جی نہیں چاہتا تو خدا کا نام کب لے سکتے تھے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہے۔ یہی ہمارے واسطے سنّت ہے۔ گو ہم اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے سکیں مگر شریعت نے اجازت دی ہے اس لیے اب ادب یہی ہے کہ خدا کا نام لو اور خوب

وہ اسی سے خوش ہوتے ہیں۔

اور اس اجازت میں غایت کرم ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باپ کے سامنے استاد کے سامنے ان کا نام زبان سے نہیں لیا جاتا بخصوص نداء کے صیغہ سے اور ظاہر ہے اللہ تعالی کے ہم ہر وقت سامنے ہیں تو اس شخص کا بڑا کمال ہے جو اللہ تعالی کو حاضر و ناظر سمجھ کر ان کے کہنے سے پھر ان کا نام لیتا ہے۔ گو کبھی اس شخص پر بھی جب ادب کا حال غالب ہوتا ہے تو اس کا نام لینا دشوار ہو جاتا ہے جیسا شاعر کہتا ہے ؎

اُحِبُّ مُنَاجَاۃَ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٖ

وَلٰکِنْ لِسَانُ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْلٗ

"میں محبوب سے مختلف طریقوں سے مناجات کرنا چاہتا ہوں مگر مجرموں کی زبان سلی ہوئی ہوتی ہے" مجرم کی زبان ہی نہیں اٹھتی مگر پھر بھی جب حکم کا اثر غالب ہوتا ہے تو مناجات کرتا ہے۔ یہ تو ان اعمال میں اس کا عمل ہے جو مامور ہیں مگر دعوتے اتحاد تو مامور بہ نہیں۔ تو اس دعوے کی ہمت کسی کی نہ ہوتی اور جن بزرگوں سے ایسا منقول ہے وہ غلبۂ حال سے معذور ہیں جیسے جامی فرماتے ہیں ؎

متحد بودیم با شاہ وجود حکم غیریت بکلی محو بود

باقی غیر معذور ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کے نزدیک تو اپنا وجود بھی خطا ہے چہ جائے اتحاد ؎

وُجُوْدُکَ ذَنْبٌ لَاْیُقَاسُ بِہٖ ذَنْبٌ

وہ تو یہ کہتا ہے ؎

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا ست

کیں دلیل ہستی و ہستی خطا ست

جب بھی ادب کی ہمت دعوئ اتحاد سے قاصر تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

خود ہی ان کا ارمان پورا کر دیا یہ فرما کر کہ نَحْنُ اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ۔ ہم سب لوگ امی ہیں اپنے کو بھی امت کے ساتھ شریک فرما لیا اور آپ نے تو ایک دعا میں اس سے بڑھ کر کمال فرما دیا ہے۔ وہاں اس سے بھی زیادہ اتحاد بیان فرما دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ" اے اللہ میرا حشر مسکینوں کی جماعت میں فرمائیے۔ یہ نہیں فرمایا واحشرنی مسکینا بلکہ یہ دعا کی کہ مجھے ان کے ساتھ کر دیجیے۔ مگر خبردار! تم یہ نہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی میں ہمارے ساتھ ہیں۔ نہیں بلکہ ہم ہی حضور کے ساتھ اور تابع ہیں۔ اس کی مثال ہے جیسے بچے کھیل رہے ہوں اور ان کے کوئی بزرگ آجائیں اور یوں کہیں ہاں بھائی کھیلو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ تو وہ اس کے ساتھ کیا ہوتے بلکہ ان کو اپنے ساتھ لے لیا ہے۔ مگر تحسینِ فعل کے لیے ایسا کہہ دیا کرتے ہیں۔ اور آپؐ نے صرف التزامی قول ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دلالتِ مطابقی سے بھی اس کو ارشاد فرما دیا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے صحابہؓ کو تیر اندازی کرتے ہوئے دیکھا، فرمایا: اِرْمُوْا بَنِیْ اِسْمٰعِیْلَ فَاِنَّ اَبَاکُمْ کَانَ رَامِیًا" اے اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد تیر اندازی کیا کرو کیونکہ تمہارے باپ حضرت اسمٰعیل بھی تیر انداز تھے۔ اس کے بعد فرمایا: "وَاَنَا مَعَ بَنِیْ فُلَانٍ" کہ میں فلاں جماعت کے ساتھ ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعظیم کرانا نہیں چاہتے تھے۔ ورنہ صحابہ کے اس کھیل میں آپؐ کیوں شریک ہوتے۔ آج کل کے پیر اور مشائخ آنکھیں کھولیں جو مریدوں میں تعظیم کے لیے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ آپ کا یہ فرمانا تھا کہ میں فلاں جماعت کے ساتھ ہوں کہ اسی وقت دوسری جماعت نے ہاتھ روک لیے۔ آپ نے پوچھا کہ تم کیوں رک گئے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ جب آپ اس جماعت کے ساتھ ہو گئے تو ہم اس کا مقابلہ کیونکر کر سکتے ہیں (کہ اس صورت میں فی الجملہ حضور کا مقابلہ لازم آئے گا) حضراتِ صحابہؓ کا ادب دیکھنا چاہیے کہ وہ ادب کے کیسے

باریک باریک پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ یہ جواب سن کر حضورؐ نے فرمایا: اِرْمُوا وَاَنَا مَعَ کُلِّکُمْ۔ تیر چلاؤ میں تم سب کے ساتھ ہوں۔ یہ فرمانا تھا کہ صحابہ نے کام شروع کر دیا کیونکہ اب تو حضور سب کے ساتھ ہو گئے تو گویا سب ایک ہی تھے۔

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ
وَکُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ

بہر رنگ کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

پھر حضورؐ نے اتحادِ قولی ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عملاً کر کے بھی دکھا دیا کہ اس جماعت میں شریک ہو گئے۔ حضور کی جو بات ہے فدا ہونے کے قابل ہے۔

مسلمانو! خوش ہو جاؤ کہ تم کو خدا تعالیٰ نے ایسا رسول دیا جو تمہارے ساتھ قولاً و عملاً متحد ہیں۔ ہمارے ایسے کہاں نصیب تھے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا فضل و کرم ہے۔ آہ! ہم جیسے نافرمانوں کے ساتھ حضور اپنا اتحاد ظاہر فرماتے ہیں ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

یہ بات اس پر چلی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نحن امۃ امیۃ فرمایا ہے اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ کسور کا اعتبار نہ کیا جائے کیونکہ محاسبین بھی کسور کا اعتبار نہیں کرتے۔ بڑے محاسب اہلِ یورپ ہیں، مگر وہ بھی کسر کا اعتبار نہیں کرتے۔ چنانچہ شمسی سال کے ایام ۳۶۵ دنوں سے کس قدر زیادہ ہوتے ہیں، جو چند گھنٹے ہیں تو اب انہوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ تین سال کے بعد فروری کو ۲۹ دن کا کر لیتے ہیں تاکہ وہ کسر تین سال کے بعد پوری ہو جائے۔ یہ نہیں کیا کہ ہر سال ایک مقدار کسری بڑھا لیتے تو جب محاسبین بھی کسور کو حذف کر دیتے ہیں تو انبیاء کی تو شان ہی تیسیر و تسہیل ہے۔ ان کے کلام میں کسور کا اعتبار نہ ہونا اولیٰ ہے۔

(وعظ: العشر۔ تھانہ بھون: ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ)

رمضان میں عبادت کی ترغیب

صاحبو! اعمالِ حسنہ کا اہتمام کرو۔ رحمت و مغفرت اسی سے ہوتی ہے۔ خصوصاً اس وقت زیادہ اہتمام کرو کہ رمضان کا آخری حصّہ ہے۔ اگر اس وقت اعمالِ حسنہ کا اہتمام کرکے ہم نے مغفرت حاصل نہ کی تو ایک سخت بات کا سامنا ہوگا۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بددعا لگ جانے کا اندیشہ ہے۔ وہ بددعا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ وَمَنْ اَدْرَکَ رَمَضَانَ فَلَمْ یُغْفَرْلَہٗ وَمَنْ اَدْرَکَ اَبَوَیْہِ اَوْ اَحَدَھُمَا فَلَمْ یُدْخِلَاہُ الْجَنَّۃَ (اوکما قال) ترجمہ: ناک رگڑی جائے ناک رگڑی جائے، ناک رگڑی جائے، اس شخص کی جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے۔ پھر میرے اُوپر درود نہ بھیجے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ وَکُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَکَمَا تَرْضٰی) اور اس شخص کی جس نے رمضان کو پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ کی گئی اور اس شخص کی جس نے اپنے والدین کو یا ایک کو پالیا۔ پھر انہوں نے اس کو جنّت میں داخل نہ کیا یعنی ان کی خدمت کرکے جنّت میں داخل نہ ہوگیا۔ آپ کو خبر ہے کہ یہ بددعا کس کی ہے؟ یہ دُعا اس ذات پاک کی ہے جس کی شان یہ ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

آپ کی دُعا گویا خدا کی دُعا ہے۔ آپ کی بددعا گویا خدا کی بددعا ہے۔ پھر اس کے قبول ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ ؎

چوں خدا از خود سوال و کد کند
پس دعائے خویشتن چوں رد کند

شاید کوئی یہ کہے کہ یہ بد دعا ہم کو تو نہیں لگی کیونکہ ہماری تو ناک نہیں رگڑی گئی۔ ہم تو ویسے ہی چکنے چپڑے صحیح وسالم موجود ہیں۔ تو سمجھ لو کہ یہ بد دعا جان کو لگ کر رہتی ہے مگر چپکے چپکے لگتی ہے جس کی خبر ہر شخص کو نہیں ہوتی۔ جاننے والوں کو ہوتی ہے کیونکہ اس بد دعا کا اثر ایمان پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے دل سیاہ اور پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

آتشے گر نا مدست ایں دود چیست

جان سیاہ گشت و رواں مردود چیست

کہ اگر یہ آگ نہیں لگی تو یہ دھواں کیسا ہے جس نے روح کو سیاہ اور صورت کو بدرونق کر دیا ہے جس کو دیکھتے ہی عارف صاحب کشف معلوم کر لیتا ہے کہ اس صورت پر پھٹکار برس رہی ہے۔

صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بد دُعا ہے وہ معمولی نہیں وہ لگ کر رہے گی اس لیے سنبھلو اور رمضان میں مغفرت حاصل کرنے کا سامان کر لو اور ہمت سے کام لو اور ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ ہمت عطا فرمائیں۔

وعظ: العشر

تھانہ بھون: ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ

مثلث رمضان

فضائل رمضان ص ۲۲، ۲۳

روح اعتکاف عشاق کے نزدیک اعتکاف کی روح یہ ہے کہ گویا اپنے کو مسکین و خوار و زار بنا کر بادشاہ کے دروازہ پر حاضر کر دیا ہے، اپنی محتاجی ظاہر کر رہا ہے کہ اب تو آپ کے دروازہ پر پڑا ہوا ہوں، چاہے نکال دیجیے چاہے بخش دیجیے۔ اسی طرح امیر خسرو فرماتے ہیں:

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

اور یہ شان ہے فنا کی جس کی شان عدمیت ظاہر ہے۔ اور اس کو روح اعتکاف اس لیے کہا گیا کہ اعتکاف اور کسی عبادت پر موقوف نہیں۔ کوئی اگر دربار میں حاضری دے کر ہر وقت پڑا سوتا رہے تب بھی اس کو پورا ثواب اعتکاف کا ملے گا۔ یہ دروازہ پر پڑا رہنا ہی بڑی چیز ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ مردود کو مقبول بنا دیتی ہے۔

○

فصل (۴)

زکوٰۃ وخیرات

یہ بھی مثل نماز کے اسلام کا ایک رکن یعنی بڑی شان کا ایک لازمی حکم ہے۔ بہت سی آیتوں میں زکوٰۃ دینے کا حکم اور اس کے دینے کا ثواب اور اس کے نہ دینے کا عذاب مذکور ہے اور زیادہ آیتیں ایسی ہیں جن میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم ہے۔ یہ سب آیتیں قرآن مجید میں آسانی سے مل سکتی ہیں اور جو شخص عربی نہ جانتا ہو اس کو ترجمہ والے قرآن میں مل سکتی ہیں اس لیے اس جگہ حدیثیں لکھتا ہوں۔

(۱) حضرت ابوالدرداؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا زکوٰۃ اسلام کا پُل ہے یا بلند عمارت ہے (کہ اگر زکوٰۃ نہ دے تو اسلام پر چل نہیں سکتا۔ یا اسلام کے نیچے کے درجہ میں رہا۔) (طبرانی اوسط وکبیر)

ف اس سے زکوٰۃ کا کتنا بڑا درجہ ثابت ہوا اور اس کے نہ دینے سے مسلمانی میں کتنا بڑا نقصان معلوم ہوا۔

(۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی اس سے اس کی بُرائی جاتی رہی (یعنی زکوٰۃ نہ دینے سے جو اس مال میں نحوست اور گندگی آ جاتی وہ نہیں رہی۔ (طبرانی اوسط وابن خزیمہ صحیح)

ف معلوم ہوا کہ جس مال کی زکوٰۃ نہ دی جاوے اس میں برکت نہیں رہتی اس کی تفصیل ۱۳ و ۱۴ میں آتی ہے۔

(۳) حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے جو شخص تم میں اللہ و رسول پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیئے کہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ (طبرانی کبیر)

ف اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ نہ دینے سے ایمان میں کمی رہتی ہے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین کام ایسے ہیں کہ جو شخص ان کو کرے گا وہ ایمان کا ذائقہ چکھے گا، صرف اللہ کی عبادت کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ سوا اللہ کے کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اپنے مال کی زکوٰۃ ہر سال اس طرح دے کہ اس کا نفس اس پر خوش ہو اور وہ اس پر آمادہ کرتا ہو (یعنی اس کو روکتا نہ ہو)

ف۔ زکوٰۃ کا مرتبہ تو اس سے ظاہر ہوا کہ اس کو توحید کے ساتھ ذکر فرمایا اور اس کا اثر اس سے ظاہر ہوا کہ اس سے ایمان کا مزہ بڑھ جاتا ہے۔

(۵) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص سونے کا رکھنے والا اور چاندی کا رکھنے والا ایسا نہیں جو اس کا حق (یعنی زکوٰۃ) نہ دیتا ہو مگر (اس کا حال یہ ہوگا کہ) جب قیامت کا دن ہوگا (اس شخص کے، عذاب کے لیے) اس سونے چاندی کی تختیاں بنائی جائیں گی پھر ان (تختیوں) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان سے اس کی کروٹ اور پیشانی اور پشت کو داغ دیا جائے گا جب وہ (تختیاں) ٹھنڈی ہونے لگیں گی۔ پھر دوبارہ ان کو تپا لیا جائے گا۔ (اور) یہ اس دن میں ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہوگی (یعنی قیامت کے دن کی الخ (بخاری و مسلم واللفظ لمسلم)

(۶) حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان مالداروں پر ان کے مال میں اتنا حق (یعنی زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے غریبوں

---

[1] وروی موقوفاً علی علیؓ وھو اشبہ لکنہ مرفوعٌ حکماً ۱۲

کو کافی ہو جائے اور غریبوں کو بھوکے ننگے ہونے کی جب کبھی تکلیف ہوتی ہے مالداروں ہی کی اس (کرتوت) کی بدولت ہوتی ہے (کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے) یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان سے (اس پر) سخت حساب لینے والا اور ان کو دردناک عذاب دینے والا ہے۔

(طبرانی اوسط و صغیر)

ف ایک حدیث میں اس کی تفصیل میں یہ بھی ارشاد ہے کہ محتاج لوگ قیامت میں اللہ تعالیٰ سے مالداروں کی یہ شکایت کریں گے کہ ہمارے حقوق جو آپ نے ان پر فرض کیے تھے، انہوں نے ہم کو نہیں پہنچائے اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا، اپنی عزت و جلال کی قسم میں تم کو مقرب بناؤں گا اور ان کو دور کر دوں گا۔

(طبرانی صغیر و اوسط و ابوالشیخ کتاب الثواب)

(۷) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم کو نماز کی پابندی کا اور زکوٰۃ دینے کا حکم کیا گیا ہے اور جو شخص زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی (مقبول) نہیں ہوتی (طبرانی و اصبہانی) اور ایک روایت میں ان کا ارشاد ہے کہ جو شخص نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ نہ دے وہ (پورا) مسلمان نہیں کہ اس کا نیک عمل اس کو نفع دے۔ اصبہانی)

ف لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ نماز بھی چھوڑ دیں۔ اگر ایسا کریں گے تو اس کا عذاب الگ ہوگا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ بھی دینے لگیں۔

(۸) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، پھر وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے قیامت کے روز وہ مال ایک گنجے سانپ کی شکل بنا دیا جائے گا جس کی دونوں آنکھوں کے اوپر دو نقطے ہوں گے (ایسا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے) اور اس کے گلے میں طوق (یعنی ہنسلی) کی طرح ڈال دیا جائے گا اور اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیری جمع ہوں۔ پھر آپ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت پڑھی وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ (الآیۃ) اس آیت میں مال

کے طوق بنائے جانے کا ذکر ہے۔ (بخاری و نسائی)

(۹) حضرت عمارہ بن حزم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (علاوہ) لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر ایمان لانے کے) اللہ تعالیٰ نے اسلام میں چار چیزیں اور فرض کی ہیں، پس جو شخص ان میں سے تین کو ادا کرے تو وہ اس کو پورا کام نہ دیں گی جب تک سب کو ادا نہ کرے نماز، زکوٰۃ اور رمضان کے روزے اور بیت اللہ شریف کا حج (احمد)

ف۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر نماز، روزہ و حج سب کرتا ہو مگر زکوٰۃ نہ دیتا ہو وہ سب بھی اس کی نجات کے لیے کافی نہیں۔

(۱۰) حضرت انس بن مالک رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ نہ دینے والا قیامت کے دن دوزخ میں جائے گا۔ (طبرانی صغیر)

(۱۱) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ نے فرمایا نماز تو سب کے سامنے ظاہر ہونے والی چیز ہے اس کو تو قبول کر لیا اور زکوٰۃ پوشیدہ چیز ہے اس کو خود کھا لیا (حقداروں کو نہ دیا) ایسے لوگ منافق ہیں۔ (بزار)

ف۔ یعنی بعضے لوگ نماز اسی لیے پڑھتے ہیں کہ نہ پڑھیں گے تو سب کو خبر ہوگی اور زکوٰۃ اس لیے نہیں دیتے کہ اس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی اور منافق ایسا ہی کرتے تھے، ورنہ خدا کے حکم تو دونوں ہیں۔

(۱۲) حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ جس قوم نے زکوٰۃ دینا بند کر لیا اللہ تعالیٰ ان کو قحط میں مبتلا کرتا ہے۔ اور ایک اور روایت میں یہ لفظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے بارش کو روک لیتا ہے۔ (طبرانی و حاکم و بیہقی)

(۱۳) حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس مال میں زکوٰۃ ملی ہوئی رہی وہ اس کو برباد کر دیتی ہے۔ (بزار و بیہقی)

ف. زکوٰۃ ملنا یہ کہ اس میں زکوٰۃ فرض ہو جائے اور نکالی نہ جاوے اور برباد ہونا یہ کہ وہ مال جاتا رہے یا اس کی برکت جاتی رہے جیسا اگلی حدیث میں مذکور ہے۔

(۱۴) حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی مال خشکی یا دریا میں تلف ہوتا ہے، زکوٰۃ نہ دینے سے ہوتا ہے۔ (الطبرانی اوسط)

ف۔ اور باوجود زکوٰۃ کے شاذ و نادر تلف ہو جائے تو وہ حقیقت میں تلف نہیں ہے کیونکہ اس کا اجر آخرت میں ملے گا، اور زکوٰۃ نہ دینے سے جو تلف ہوا وہ سزا ہے اس پر اجر کا وعدہ نہیں۔

(۱۵) حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ میں اور میری خالہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس حالت میں حاضر ہوئے کہ ہم سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھے۔ آپ نے ہم سے پوچھا کہ کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ ہم نے عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا کیا تم کو اس سے ڈر نہیں لگتا کہ تم کو اللہ تعالیٰ آگ کے کنگن پہنا دے؟ اس کی زکوٰۃ ادا کیا کرو! (احمد بسند حسن) یہ سب روایتیں ترغیب و ترہیب میں ہیں۔

ف۔ ان حدیثوں سے یہ امور ثابت ہوئے (ا) زکوٰۃ کی فرضیت اور فضیلت (ب) زکوٰۃ نہ دینے کا وبال اور عذاب دنیا میں تو مال کی بربادی یا بے برکتی اور آخرت میں دوزخ (ج) زکوٰۃ نہ دینے والے کی نماز و روزہ وغیرہ بھی مقبول نہ ہونا (د) زکوٰۃ نہ دینے والے کی حالت کا منافق کے مشابہ ہونا جس کا بیان (ع۱۱) کے ذیل میں گزرا (ہ) زکوٰۃ کا حقوق العباد کے مشابہ ہونا جیسا کہ (۱۲) کے ذیل میں گزرا۔ اس سے اس کی تاکید دوسری عبادتوں سے اور زیادہ بڑھ گئی۔ اب چند ضروری مضامین زکوٰۃ کے متعلق لکھتا ہوں:

پہلا مضمون جن چیزوں میں زکوٰۃ فرض ہے وہ کئی چیزیں ہیں۔ ایک چاندی سونا خواہ وہ روپیہ اشرفی ہو خواہ نوٹ کی شکل میں، پھر خواہ اپنے قبضے میں ہو خواہ کسی کے ذمے اُدھار ہو جس کا اپنے پاس ثبوت ہو، یا ادھار لینے والا اقراری ہو خواہ سونے

چاندی کے برتن یا زیور یا سچا گوٹہ ٹھپّہ ہو۔ اگر صرف چاندی کی چیزیں ہوں اور وزن میں ساڑھے چوّن روپے کی برابر ہو جاوے اور اگر چاندی کے ساتھ کچھ سونے کی بھی چیزیں ہوں اور سونے کے دام چاندی کے وزن کے ساتھ مل کر وہی ساڑھے چوّن روپے کے برابر ہو جاوے تو جس دن سے ان چیزوں کا مالک ہُوا ہے اس دن سے اسلامی سال گزرنے پر اس کا چالیسواں حصّہ زکوٰۃ فرض ہوگی اور احتیاط یہ ہے کہ اگر پچاس روپے کے برابر بھی مالیت ہو تب بھی سوا روپیہ زکوٰۃ کا دے دے اور دوسری چیز جس میں زکوٰۃ فرض ہے سوداگری کا مال ہے جب وہ قیمت میں اتنے کا ہو جس کا ابھی بیان ہُوا ہے اور اس کی قیمت کے مقدار سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں میں کثرت سے ایسے لوگ ہیں جن پر زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ اتنے زیور سے یا سوداگری کی اتنی مالیت سے بہت کم گھر خالی ہوں گے مگر وہ اس سے غافل ہیں سو اس کا ضرور خیال کرنا چاہیے۔ تیسری چیز ایسے اونٹ یا گائے یا بھینس یا بھیڑ بکریاں ہیں جن کو صرف دُودھ اور بچّے حاصل کرنے کے لیے پالا ہو اور وہ جنگل میں چرتے ہوں چونکہ اس ملک میں اس کا رواج کم ہے۔ لہٰذا ان کی تعداد جس میں زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے نہیں لکھی گئی جس کو ضرورت ہو عالموں سے پوچھ لے۔ چوتھی چیز عشری زمین کی پیداوار ہے اس کے مسائل بھی عالموں سے پوچھ لیے جاویں۔ پانچویں چیز صدقہ فطر ہے جو عید کے دن زکوٰۃ والوں پر تو سب پر واجب ہے اور بعضے ایسے شخصوں پر بھی واجب ہے جن پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اس کو بھی کسی عالم سے پوچھ لیں۔ یہ اپنی طرف سے اور باپ کو نابالغ بچّوں کی طرف سے بھی دینا چاہیے۔

سب سے زیادہ زکوٰۃ کے حقدار اپنے غریب رشتہ دار ہیں، خواہ بستی میں ہوں یا دوسری جگہ، ان کے بعد اپنی بستی کے دوسرے غریب لیکن اگر دوسری بستی کے لوگ زیادہ غریب ہوں تو ان ہی کا حق زیادہ ہے مگر جن کو زکوٰۃ دینا ہو وہ نہ بنی ہاشم ہوں یعنی سیّد وغیرہ اور نہ زکوٰۃ دینے والے کے ماں باپ یا دادا دادی یا نانا نانی یا اولاد یا میاں بی بی لگتے ہوں اور کفن یا

ء ... لعنی ... کار کے حساب سے ۵۲½ تولہ ... [illegible]

مسجد میں لگانا بھی درست نہیں۔ البتہ میت والے کو اگر دے دے تو درست ہے مگر پھر اس کو کفن میں لگانے نہ لگانے کا اختیار ہوگا اور اسی طرح ہر انجمن یا ہر مدرسے میں دینا درست نہیں۔ جب تک مدرسے والوں یا انجمن والوں سے پوچھ نہ لے کہ تم زکوٰۃ کو کس طریقے سے خرچ کرتے ہو اور پھر کسی عالم سے پوچھ لے کہ اس طریقے سے خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں

مسلمانوں کی زیادہ پریشانی ظاہری و باطنی کا سبب افلاس ہے اور زکوٰۃ اس کا کافی علاج ہے۔ اگر مالدار فضول خرچی نہ کریں اور ہٹے کٹے مزدوری کرتے رہیں اور معذور لوگوں کی زکوٰۃ سے امداد ہوتی رہے تو مسلمانوں میں ایک بھی ننگا بھوکا نہ رہے۔

حدیث ۱۶ میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں یہ مضمون صاف صاف مذکور ہے۔ فقط۔

علاوہ زکوٰۃ کے اور نیک کاموں میں خرچ کرنا اور ہمدردی کرنا

(یعنی زکوٰۃ دے کر بے فکر اور بے رحم نہ ہو جاوے کہ اب میرے ذمے کسی کی کوئی ہمدردی لازم نہیں رہی۔ زکوٰۃ تو ایک بندھا ہوا حق ہے۔ باقی بہت سے متفرق کام ایسے بھی ہیں کہ موقع پر ان میں مال خرچ کرنا اور جس کے پاس مال نہ ہو یا اس میں مال کا کام نہ ہو تو جان سے مدد کرنا بھی ضروری ہے۔ باقی ضرورت کا درجہ، اس کی تحقیق علماء سے ہو سکتی ہے، اس کی اجمالی دلیل ایک آیت اور حدیث لکھ کر پھر کچھ تفصیل لکھی جاوے گی۔

اجمالی دلیل

(۱) حضرت فاطمہ بنت قیسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی کچھ حقوق ہیں پھر (اس کی تائید میں) آپؐ نے یہ آیت پڑھی: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا الآیۃ (تائید اس طرح ہوئی کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا بھی ذکر فرمایا اور خاص خاص موقع پر مال دینے کا بھی ذکر فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ یہ مواقع مال دینے کے زکوٰۃ کے علاوہ ہیں)

(ترمذی و ابن ماجہ و دارمی)

ف۔ یہ دعویٰ آیت اور حدیث دونوں سے ثابت ہو گیا۔ حاشیہ میں طیبی و مرقاۃ سے اس کی تفصیل کی کچھ مثالیں لکھی ہیں یعنی یہ کہ سائل کو اور قرض مانگنے والے کو محروم نہ کرے برتنے کی چیز مانگی دینے سے انکار نہ کرے، پانی، نمک، آگ وغیرہ خفیف چیزیں ویسے ہی دے دے۔ آگے آیتوں اور حدیثوں سے زیادہ تفصیل معلوم ہو گی۔

تفصیلی دلیلیں

(آیات) فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور تم لوگ خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں۔ (پ ۲ قریب نصف)

(۳) کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا (یعنی اچھے اخلاص کے ساتھ) الخ (پ ۲ قریب ختم)

(۴) تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔ (لن تنالوا شروع)

(۵) (وہ جنّت) تیار کی گئی ہے۔ خدا سے ڈرنے والوں کے لیے، ایسے لوگ جو کہ خرچ کرتے ہیں۔ فراغت میں اور تنگی میں۔ (پ ۴ بعد ربع)

(۶) بلا شبہہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور اُن کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنّت ملے گی (پ ۱۱ ربع اوّل)

(۷) اور جو کچھ چھوٹا بڑا انہوں نے خرچ کیا اور جتنے میدان (اللہ کی راہ میں) ان کو طے کرنے پڑے یہ سب ان کے نام لکھا گیا، تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔ (پ ۱۱ ربع اوّل)

(۸) اور قرابتدار کو اس کا حق دیتے رہنا اور محتاج اور مسافر کو بھی۔ (پ ۱۵ ربع اوّل)

(۹) اور جو چیز تم خرچ کرو گے سو وہ اس کا عوض دے گا۔ (پ ۲۲ بعد نصف)

(۱۰) اور وہ لوگ خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (پارہ ۲۹ سورہ دہر)

ف۔ اور بھی بہت آیتیں ہیں جن میں زکوٰۃ کی قید نہیں، دوسرے نیک کاموں میں

خرچ کرنے کا مضمون مذکور ہے۔ آگے احادیث ہیں۔

(۱۱) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے بیٹے آدمؑ کے تو (نیک کام میں) خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا۔ (بخاری ومسلم)

(۱۲) حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ حرص (حب مال) سے بچو اس حرص نے پہلے لوگوں کو برباد کر دیا۔ (مسلم)

(۱۳) حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی حیات میں ایک درہم خیرات کرنا مرنے کے وقت سو درہم کے خیرات کرنے سے بہتر ہے۔ (ابوداؤد)

(۱۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیرات کرنے میں (حتی الامکان) جلدی کیا کرو کیونکہ بلا اس سے آگے نہیں بڑھنے پاتی۔ بلکہ رک جاتی ہے۔ (رزین)

ف۔ ثواب کے علاوہ یہ دنیا کا بھی فائدہ ہے۔

(۱۵) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ایک کھجور کی برابر پاک کمائی سے خیرات کرے گا، اور اللہ تعالیٰ پاک ہی چیز کو قبول فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیتا ہے (داہنے ہاتھ کا مطلب اللہ ہی کو معلوم ہے) پھر اس کو بڑھاتا ہے جیسا تم میں کوئی اپنے بچھڑے کو پالتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی برابر ہو جاتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

(۱۶) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیرات دینا مال کو کم نہیں ہونے دیتا (خواہ آمدنی بڑھ جائے یا برکت بڑھ جائے خواہ ثواب بڑھتا رہے۔ (مسلم)

(۱۷) حضرت ابوذر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی قسم کی بھلائی کو حقیر نہ سمجھنا، گو اتنی سہی کہ اپنے بھائی (مسلمان) سے خندہ پیشانی سے مل لو۔ (مسلم)

(۱۸) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ سے روایت ہے رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان کے ذمّے کچھ نہ کچھ صدقہ کرنا ضروری ہے لوگوں نے عرض کیا کہ اگر کسی کے پاس (مال) موجود نہ ہو؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھوں سے کچھ محنت کرے (اور مال حاصل کرے) اپنے بھی کام میں لاوے اور صدقہ بھی کرے۔ لوگوں نے عرض کیا اگر (معذوری کی وجہ سے) یہ بھی نہ کر سکے، یا (اتفاق سے) ایسا نہ کرے؟ آپؐ نے فرمایا تو کسی حاجتمند کی مدد کرے (یہ بھی صدقہ ہے) لوگوں نے عرض کیا اگر یہ بھی نہ کرے۔ آپ نے فرمایا کسی کو کوئی نیک بات بتلا دے! لوگوں نے عرض کیا اگر یہ بھی نہ کرے آپ نے فرمایا کسی کو شر نہ پہنچاوے، یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

ف۔ ان سب کو صدقہ اس وجہ سے فرمایا جیسا صدقہ سے خلق کو نفع پہنچتا ہے ان کاموں سے بھی نفع پہنچتا ہے ورنہ صدقہ کے اصلی معنی تو اللہ کی راہ میں کچھ مال دینے کے ہیں اور نقصان نہ پہنچانے کو نفع پہنچانے میں داخل فرمانا کتنی بڑی رحمت ہے؟

(۱۹ و ۲۰) حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کے ہر جوڑ پر ہر روز ایک صدقہ (لازم) ہے۔ دو شخصوں کے درمیان انصاف کر دے، یہ بھی صدقہ ہے۔ کسی شخص کو جانور پر سوار کرنے میں یا اس کا اسباب لادنے میں مدد کر دے یہ بھی صدقہ ہے۔ کوئی اچھی بات (جس سے کسی کا بھلا ہو جاوے) یہ بھی صدقہ ہے، جو قدم نماز کی طرف اُٹھاوے وہ بھی صدقہ ہے۔ کوئی تکلیف کی چیز راستے سے ہٹا دے یہ بھی صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

ف: مسلم کی ایک دوسری حدیث میں اس کی شرح آتی ہے کہ (گنتی کے قابل) انسان کے اندر تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، جس شخص نے روزمرّہ اتنی نیکیاں کر لیں اس نے اپنے کو دوزخ

سے بچا لیا۔

(۲۱) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا صدقہ یہ ہے کہ کوئی اونٹنی دودھ والی کسی کو مانگی دے دی جاوے اور اسی طرح بکری دودھ والی کسی کو مانگی دے دی جاوے (اس طرح کہ وہ اس کا دودھ پیتا رہے۔ جب دودھ نہ رہے لوٹا دے) جو ایک برتن صبح کو بھر دیوے۔ ایک برتن شام کو بھر دے۔ (بخاری و مسلم)

(۲۲) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان کوئی درخت لگادے یا کوئی کھیتی بو دے، پھر اس میں سے کوئی انسان یا پرندہ یا چرندہ یا جانور کھاوے وہ بھی اس کے لیے صدقہ ہوگا۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں حضرت جابرؓ سے ہے کہ جو اس میں سے چوری ہو جاوے وہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے

ف۔ حالانکہ مالک نے چور کو نفع پہنچانے کا ارادہ نہیں کیا پھر بھی صدقے کا ثواب ملنا یہ کتنی بڑی رحمت ہے؟

(۲۳) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بدچلن عورت کی اس پر بخشش ہوگئی کہ اُس کا ایک کتے پر گزر ہوا جو ایک کنویں کے کنارے زبان لٹکائے ہوئے تھا، پیاس سے ہلاک ہونے کو تھا، اس عورت نے اپنا چمڑہ کا موزہ نکالا اور اس کو اپنی اوڑھنی میں باندھا اور اس کے لیے پانی نکالا اور اس کو پلایا) اس سے اس کی بخشش ہوگئی۔ عرض کیا گیا کہ کیا ہم کو جانوروں (کی خدمت کرنے) میں بھی ثواب ملتا ہے؟ آپ نے فرمایا جتنے تر کلیجے والے ہیں (یعنی جاندار ہیں) ان سب میں ثواب ہے۔ (بخاری و مسلم)

ف۔ مگر جو موذی جانور ہیں جیسے سانپ، بچھو۔ ان کا حکم بخاری و مسلم کی دوسری حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کو قتل کر دو۔ (باب المحرم یجتنب الصید)

(۲۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رحمٰن کی عبادت کرو اور کھانا کھلایا کرو اور سلام کو عام کرو (یعنی ہر مسلمان کو سلام کرو خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو) جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے (ترمذی و ابن ماجہ)

(۲۵) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اپنے بھائی (مسلمان) کا سامنا (یعنی ملاقات) ہو، اس وقت مسکرانا (جس سے وہ سمجھے کہ مجھ سے مل کر اس کو خوشی ہوئی ہے) یہ بھی صدقہ ہے اور کسی کو اچھی بات کا حکم کر دینا اور بُری بات سے منع کر دینا یہ بھی صدقہ ہے اور راستہ بھول جانے کے مقام میں کسی کو راستہ بتلا دینا، یہ بھی تیرے لیے صدقہ ہے، اور کوئی پتھر، کانٹا، ہڈی راستے سے ہٹا دینا یہ بھی تیرے لیے صدقہ ہے۔ اور اپنے ڈول سے اپنی بھائی کے ڈول میں (پانی) انڈیل دینا، یہ بھی تیرے لیے صدقہ ہے۔ (ترمذی)

(۲۶) حضرت سعد بن عبادہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ ام سعد (یعنی میری والدہ) مرگئیں، سو کون سا صدقہ زیادہ فضیلت کا ہے (جس کا ثواب ان کو بخشوں) آپؐ نے فرمایا پانی، انہوں نے ایک کنواں کھدوا دیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ (یعنی اس کا ثواب) امّ سعدؓ کے لیے ہے۔ (ابوداؤد و نسائی)

(۲۷) حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان کسی مسلمان کو اس کے ننگے ہونے (یعنی کپڑا نہ ہونے) کی حالت میں کپڑا دے، اللہ تعالیٰ اس کو جنّت کے سبز کپڑے دے گا، اور جو مسلمان کسی مسلمان کو اُس کے بھوکے ہونے (یعنی کھانا نہ ہونے) کی حالت میں کھانا دے اللہ تعالیٰ اُس کو جنّت کے پھل دے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کو پیاس کے وقت پانی پلا دے، اللہ اس کو (جنّت کی) مُہر لگی ہوئی (یعنی نفیس) شراب سے پلا دے گا۔ (ابوداؤد، ترمذی)

(۲۸) حضرت انس بن مالک رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات چیزیں ہیں جن کا ثواب بندہ کے مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور یہ قبر میں پڑا رہتا ہے جس نے علم دین سکھلایا، یا کوئی نہر کھودی یا کوئی کنواں کھدوایا یا کوئی درخت لگایا، یا کوئی مسجد بنائی، یا کوئی قرآن چھوڑ گیا یا کوئی اولاد چھوڑی جو اُس کے مرنے کے بعد بخشش کی دُعا کرے (ترغیب از بزار و ابو نعیم) اور ابن ماجہ نے بجائے درخت لگانے اور کنواں کھدوانے کے صدقہ کا اور مسافر خانہ کا ذکر کیا ہے۔ (ترغیب) اس حدیث سے دینی مدرسہ کی اور رفاہِ عام کے کاموں کی بھی فضیلت ثابت ہوئی۔

(۲۹) حضرت سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے کچھ (مال) تقسیم فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلانے کو بھی دے دیجیے (حدیث کے اخیر میں ہے کہ) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں (بعض اوقات) کسی شخص کو دیتا ہوں، حالانکہ دُوسرا شخص مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے (مگر) اس اندیشہ سے (دیتا ہوں) کہ اس کو اگر نہ ملے تو وہ اسلام پر قائم نہ رہے، اور (اس وجہ سے) اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں اوندھے منہ ڈال دے (کیونکہ بعضے نو مسلم اوّل میں مضبوط نہیں ہوتے اور تکلیف کی سہار نہیں کر سکتے۔ ان کے اسلام سے پھر جانے کا شبہہ رہتا ہے، تو ان کو آرام دینا ضروری ہے۔ (عین مسلم)

ف۔ اس حدیث سے نومسلموں کی امداد کرنے کی اور ان کو آرام پہنچانے کی فضیلت ثابت ہوئی۔

(۳۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو سچا دین دے کر بھیجا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو عذاب نہ دے گا جس نے یتیم پر رحم کیا اور اس سے نرمی

کے ساتھ بات کی اور اس کی یتیمی اور بے چارگی پر ترس کھایا۔ (ترغیب از طبرانی)

ف۔ اس حدیث سے یتیم خانوں کی امداد کی بھی فضیلت ہوئی۔

خلاصہ یہ دس آیتیں اور بیس حدیثیں ہیں جو مشکوٰۃ سے لی گئی ہیں بجز دو تین کے ان میں دوسری کتاب کا نام لکھ دیا ہے۔ ان سے بہت سے مواقع مخلوق کو نفع پہنچانے کے معلوم ہوئے۔ اور ایسے ہی اور بہت کام ہیں جو سب ایک آیت اور ایک حدیث میں جمع ہیں۔ آیت۔ (ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں (فائدہ) حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب آدمیوں سے زیادہ پیارا وہ ہے جو آدمیوں کو زیادہ نفع پہنچا دے) (ترغیب عن الاصبہانی)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے۔ (حیوٰۃ المسلمین)

زکوٰۃ کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بزکوٰۃ)

بعض لوگ جو مدارس یا مساجد کے مصارفِ عامہ میں صرف کرنے کے لئے ایک حیلہ کیا کرتے ہیں کہ اوّل کسی مسکین مصرفِ زکوٰۃ کو سمجھا دیا کہ ہم تم کو سو روپیہ دیں گے۔ پھر تم مسجد یا مدرسہ میں دے دینا۔ اور پھر اس کو دیتے ہیں اور وہ مسجد وغیرہ میں دے دیتا ہے اور اس کو "حیلہ تملیک" کہا جاتا ہے۔ چونکہ یقینی بات ہے اس میں دینے والا حقیقتاً اس مسکین کو مالک نہیں بناتا محض صورت تملیک کی ہے اس لئے اس طور سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم مشکل ہے۔

اور ایک خرابی اس میں یہ ہے کہ وہ مجبور ہو کر پھر واپس کر دیتا ہے، تو وہ دینا اس کا بہ طیبِ خاطر نہیں ہوتا جو کہ حلتِ مال کی شرط ہے۔ غرض لینا دینا دونوں قواعد کے خلاف ہیں، بعضوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شرع تو ظاہر پر ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باطن کی تفتیش مت کرو، لیکن اگر بلا تفتیش باطن کی اطلاع ہو کہ یہاں تملیک کی نیت نہیں اور طیبِ خاطر نہیں تو شرع نے یہ کب کہا ہے کہ اب بھی باطن کا اعتبار مت کرو؟ اگر یہ نہ ہوتا تو بنصِّ حدیث جو حلّتِ مال کے لئے طیبِ نفس شرط لگایا گیا ہے جو کہ امر مبطن ہے یہ بے معنی ہوتا ہے۔

اگر کہیں ایسے ہی موقع پر زکوٰۃ سے امداد کرنے کی ضرورت ہو اس کی ایک اور تدبیر جو کہ بالکل قواعد کے مطابق ہے یہ ہے کہ کسی مسکین کو مشورہ دیا جاوے کہ تم دس روپیہ مثلاً کسی سے قرض لے کر فلاں سیّد کو دے دو، یا فلاں مسجد و مدرسہ میں دے دو ہم تمہاری اعانت ادائے قرض میں کرائیں گے جب وہ مسکین وہاں دے دے تم اس مسکین کو دس روپے زکوٰۃ میں دے دو۔ پھر اس سے اس کا قرض خواہ وصول کر لے گا۔ اس میں مسکین کو دینا بھی حقیقتاً ہُوا۔ اور اس مسکین پر صدقہ دینے میں جبر بھی نہ ہُوا۔ کیوں کہ وہ آزاد ہے خواہ قبول کرے یا نہ کرے، بخلاف حیلہ تملیک

کے کہ اگر وہ مسکین موافق تعلیم کے نہ دے تو کدورت بلکہ نزاع واقع ہو جاوے اور ہر چند کہ بعد مل جانے اس روپیہ کے قرض خواہ اس سے جبراً لے سکتا ہے مگر قرض تو حق واجب عہد کا ہے اور اس میں جبر جائز ہے اور چونکہ وہ روپیہ حقیقتاً اس مسکین کا ہو گیا اس لیے اس کو جبراً اپنے قرضہ میں لے لینا سہل ہے، جیسے اس مسکین کے پاس خاص اس کا مکسوبہ ہوتا اور اس کو جبراً لینا جائز تھا۔

زکوٰۃ سے دُنیوی مقاصد کا حصول

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض آدمی زکوٰۃ سے دنیوی اغراض نکالنا چاہتے ہیں جو کہ خلوص کے خلاف ہے۔ مثلاً اپنے نوکروں کو زکوٰۃ اس خیال سے دیتے ہیں کہ یہ ہم سے زیادہ دبیں گے۔ اور کام خوب کریں گے اور اس میں کمی ہونے سے ان کو شکایت ہوتی ہے کہ دیکھو یہ لوگ کیسے ہیں کہ اس کا اثر نہیں مانا۔ بلکہ بعض تو زبان سے بھی جتلانے لگتے ہیں کہ نمک حرام تجھ کو اپنی تنخواہ دیتے ہیں اور زکوٰۃ سے بھی تیرا خیال رکھتے ہیں مگر تو ایسا احسان فراموش ہے ونحو ذالک گو ضابطہ سے یہ زکوٰۃ سے ساقط ہو جاتی ہے لیکن حدیث لایقبل اللہ الا الطیب کی رو سے یہ زکوٰۃ مقبول نہیں ہوتی، پھر اوّل اور دوسری کوتاہی والے بعضے عذر بھی پیش کرتے ہیں۔

مثلاً یہ عذر کہ اگر ہر سال زکوٰۃ دیتے رہیں تو بعضے مال تو تقریباً ختم ہو جاویں۔ مثلاً جس روپیہ سے ہم تجارت نہیں کرتے ویسے ہی رکھا ہے، یا زیور کہ تجارت کے کام ہی کا نہیں تو نشو و نما تو کچھ ہوگا نہیں اور ہر سال ایک جزو زکوٰۃ کا نکلا کرے گا تو یوں ہی فنا ہو جاوے گا۔ جواب یہ ہے کہ روپیہ سے تجارت کرنے کو کس نے منع کیا ہے اب اگر خود نہ کرو تو شریعت اس کی ذمہ دار نہیں۔

اسی طرح چاندی، سونا، زیور کے لئے اصل میں موضوع نہیں ہے بلکہ اصل

خلقت میں وہ "ثمن" ہے، جو تجارت کے لیے مخلوق ہوا ہے، سو زیور تم نے خود اپنی خوشی سے بنایا ہے شریعت اس کی ذمہ دار نہیں ہے، جب تم چاہو اس سے سکہ بدل کر تجارت کر سکتے ہو اور بڑھا سکتے ہو جس سے وہ اپنی زکوٰۃ کا خود کفیل و متحمل ہو سکتا ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ دکان میں جب مختلف اقسام کا مختلف قیمتوں کا مال موجود ہے اس کا حساب کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تمہاری دکان میں خرید و فروخت کا حساب لکھا جاتا ہے تو کاغذات سے حساب تیار ہو سکتا ہے اور اگر ایسا نہیں تو نظری تخمینہ کافی ہے، جو تخمینہ قرار پاوے احتیاط کے لیے کچھ اور بڑھا لو۔ مثلاً آٹھ سو روپے کا تخمینہ ہوا تم ہزار سمجھ لو اتنے میں اتنا بڑھا لینے سے احتمال غلطی کا ہرگز نہ رہے گا اور زکوٰۃ میں کل پانچ روپیہ بڑھتے ہیں جو کچھ گراں نہیں اور اسی طرح گوٹہ ٹھپہ کا اور اسی طرح زیور کا جس میں دوسری چیز بھی مرکب ہے تخمینہ کافی ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ صاحب ہمارا مال تو حلال نہیں ہے، حرام مال میں زکوٰۃ ہی نہیں سو سمجھ لیا جاوے کہ یہ مسئلہ غلط ہے حرام مال جب اپنے مال میں مل گیا وہ ملک میں داخل ہو گیا، گو ملک خبیث ہی ہو اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک ہونا شرط ہے طیب ہونا شرط نہیں، طیب ہونا مقبولیت کی شرط ہے سو زکوٰۃ واجب ہو گی، گو مقبول نہ ہو گی، اگر کوئی کہے کہ پھر دینے سے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ نہ دینے سے جو عذاب ہوتا ہے اس سے محفوظ رہیگا اور قبول نہ ہونے سے عذاب نہیں ہوتا بلکہ ثواب سے محرومی رہتی ہے، تو کیا عذاب ہونا اور ثواب نہ ہونا دونوں ایک بات ہیں؟ البتہ خود کسب حرام کا جو عذاب ہے وہ الگ ہے اس کی نفی نہیں کی جاتی، لیکن نہ دینے سے دو عذاب کا استحقاق ہوتا۔ کسب حرام کا الگ اور زکوٰۃ نہ دینے کا الگ اور اب ایک ہی ہو گا۔ تو کیا یہ دونوں بھی یکساں ہیں؟ ہرگز نہیں!

ردّی چیزیں زکوٰۃ میں دینا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ میں ایسی چیز دیتے ہیں جو ردّی اور ناکارہ ہو مثلاً تاجر کتب ایسی کتاب دے جس کی نکاسی نہ ہوتی ہو اسی طرح تاجر پارچہ پرانے تھان نکالے اور تاجر غلہ کِرم خوردہ غلہ نکالے وعلیٰ ہذا۔ سو جس حساب میں اس نے یہ چیزیں لگائی ہیں اگر بازار میں اتنے کو نہ نکل سکے تب تو زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوئی۔ بقدر کمی قیمت اس کے ذمہ رہ گئی اور اگر اتنی قیمت کی ہے تو زکوٰۃ تو ادا ہو گئی مگر بقدر کمی خلوص کے مقبولیت میں کمی رہی۔

دعوت کے ذریعہ زکوٰۃ کا حکم

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ کے روپیہ یا غلہ کا کھانا پکوا کر مساکین کو دعوت میں کھلا دیتے ہیں سو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کھانا پکا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا جاوے کہ ان کو اختیار ہو لے جانے کا، یا بیٹھ کر کھا لینے کا اور اس کی ان کو اطلاع کر دی جائے اور وہ کھانا قیمت میں اس قدر ہو تب تو زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی اور اگر لے جانے کا اختیار نہ ہو بلکہ بٹھلا کر کھلایا جاوے تو زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔

اسی طرح اگر پکا ہُوا کھانا اس قیمت کا ہو جتنی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب تھی تب بھی پوری زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔ مثلاً ایک شخص کو بیس روپے زکوٰۃ کے دینے ہیں اس نے جنس خرید کر پکوائی، کچھ خرید میں صرف ہُوا، کچھ باورچی کو مزدوری میں دیا، غرض بیس روپے صرف ہو گئے۔ مگر کسی وجہ سے خواہ تو جنس خریدنے میں یہ ٹھگا گیا یا مزدوری زیادہ دے دی یا کھانا بگڑ گیا۔ غرض کسی طور پر تیار کھانا بیس روپے کا نہ ہُوا، بلکہ سترہ اٹھارہ کا ہُوا تو یوں نہ کہیں گے کہ اس نے تو بیس ہی روپے خرچ کئے۔ اس لئے زکوٰۃ ادا ہو جانا چاہیے، بلکہ یوں کہیں گے کہ مساکین کو سترہ اٹھارہ ہی روپیہ کی چیز پہنچی، اس لیے اتنی ہی زکوٰۃ ادا ہوئی، دو یا تین روپے اور اس کے ذمّے باقی رہے جس کا ادا

کرنا واجب ہے، اس طرح زکوٰۃ کی رقم کا کپڑا خریدا اور سلوایا۔ اگر وہ بعد تیاری کے
اتنی رقم کا ہے تب تو اس کے دینے سے زکوٰۃ ادا ہو گی اور اگر کسی وجہ سے قیمت
اس کی گھٹ گئی مثلاً کپڑا ناواقفی سے گراں ملا یا سلوانے میں بگڑ گیا تو بقدر گھٹنے
کے اور زکوٰۃ دینا پڑے گی۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی دیکھتے ہیں کہ ہم کو پانچ روپیہ زکوٰۃ کے دینے
ہیں اور فلاں غریب آدمی کے ذمہ کسی سبب سے ہمارا قرضہ بھی پانچ روپیہ ہیں لاؤ اس
کو زکوٰۃ کی نیّت سے معاف کر دیں، سو یاد رکھا جاوے کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہیں
ہوتی، کیونکہ زکوٰۃ میں تملیکِ کامل شرط ہے اور ابراء من وجہٍ اسقاط اور من
وجہٍ تملیک ہے اس لیے زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔

البتہ ایک تدبیر اور جائز ہے وہ یہ کہ اوّل یہ پانچ روپیہ اس شخص کو بہ نیّت زکوٰۃ
دے دے جب وہ اس روپے کا مالک و قابض ہو جاوے، اس سے اپنا قرضہ مانگے
اور اگر وہ نہ دے تو جبراً چھین لینا بھی جائز ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔

ایقاظ (یعنی تنبیہ)

(۱) — اگر کوئی پہلے زکوٰۃ دینے کا خوگر نہ ہو اور اب توفیق ہو تو گذشتہ زکوٰۃ ادا
کرنا واجب ہے، البتہ اگر درمیان میں بدون تلف کئے ہوئے مال خود تلف ہو کر نصاب
سے کم رہ گیا ہو تو اس وقت کی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

(۲) — اگر زکوٰۃ کی نیت سے مال نکال رکھا ہو اور وہ ضائع ہو جاوے تو
زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، جُداگانہ نکال کر رکھنے سے صرف اتنا فائدہ ہے کہ ہر جزو
کے دینے کے وقت نیّت ضروری نہیں ہوتی۔

اِلحاق (یعنی ضمیمہ)

صدقۂ فطر اور چرم قربانی

چونکہ صدقۂ فطر کا ادا کرنا اور قیمت چرم قربانی کا بعد فروخت کر ڈالنے چرم قربانی کے تصدق کرنا بھی واجب ہے، اس لئے وہ بھی اس حیثیت سے "ملحق بالزکوٰۃ" ہے۔ اس لئے اس کے متعلق بھی بعض کوتاہیاں زکوٰۃ کے ساتھ بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔

- ایک کوتاہی صدقہ فطر کے متعلق بعض دیہات میں یہ ہے کہ اس کو جانتے ہی نہیں اس لیے ادا نہیں کرتے، اہلِ علم و واعظین کو چاہیے کہ جمعہ کے خطبہ میں یا کسی موقع پر خود دیہات میں جاکر اس جگہ پر آگاہ کریں۔
- ایک کوتاہی اس کے متعلق یہ ہے کہ غیر مصرف میں صرف کرتے ہیں اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے جن مصارف میں صرف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی جن کا اُوپر بیان کیا گیا ہے ان میں صرف کرنے سے صدقہ فطر بھی ادا نہیں ہوتا۔
- ایک غلطی بناء بر قواعدِ حنفیہ کے اس میں یہ ہے کہ یہ مشہور ہو گیا ہے کہ صدقہ فطر اگر بجز گیہوں کے اور کسی غلّہ سے ادا کرے تو گیہوں کے مضاعف وزن میں دے دے اس میں دو غلطیاں ہیں:

ایک یہ کہ بہت چیزوں میں گیہوں کا مضاعف نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ جو چیزیں منصوص ہیں جیسے جو اور تمر مثلاً اس میں تو گیہوں کا مضاعف ہے اور جو چیزیں منصوص نہیں جیسے چنا، چاول اس میں یہ حکم ہے کہ کسی منصوص چیز کی برابر قیمت میں ہو مثلاً گیہوں نمبری سیر سے احتیاطاً دو سیر دیئے جاتے ہیں اور تیرہ سیر کے نرخ سے اڑھائی آنہ کے ہوئے۔ تو اگر چنا دینا چاہے تو اڑھائی آنے کے جس قدر چنے آتے ہوں اتنے چنے دینے چاہئیں۔ اسی طرح چاول بھی۔ اور مطلقاً مضاعف

دینے میں تو کبھی تو واجب سے زیادہ دیئے جاویں گے تو مضائقہ نہیں لیکن اگر کبھی کم کر دیئے گئے تو واجب کا ایک جزو اس کے ذمہ رہ جاوے گا مثلاً اگر کبھی گیہوں آٹھ سیر ہوئے اور چنے چوبیس سیر تو مسئلہ مذکور کی بناء پر چھ سیر چنے واجب ہوں گے اور مشہور خیال کے حساب سے یہ شخص چار سیر دے گا تو ایک ثلث واجب اس کے ذمے رہا۔

اور قیمت چرم قربانی کے متعلق بھی ایک عام غلطی وہی غیر مصرف میں صرف کرنا بہ الفاظ سابق یہاں بھی ہے یعنی جس قدر صدقہ فطر یا قیمت چرم غلطی سے ادا نہیں ہوئی اس کا اعادہ ضروری ہے اور اگر نکال کر رکھنے کے بعد ضائع ہو جاوے پھر ادا کرنا ہو گا۔

مختلف مالی تبرکات کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ تبرعات مالیہ متفرقہ)

منجملہ تطوعات مالیہ ملحقہ بزکوٰۃ کے اور بھی بعض اعمال ہیں جن میں مختلف کوتاہیاں ہوتی ہیں مختصراً ان کا بیان بھی مناسب مقام ہے۔ ایک[۱] ان میں سے سائل کو دینا ہے۔ اس میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں بعض دینے میں اور بعض نہ دینے میں۔

---

[۱] چنانچہ بعض تو بوجہ بخل یا بے رحمی کے سائل سے نہایت نفرت اور بے رخی کرتے ہیں۔ گو وہ کیسا ہی محتاج یا اپاہج ہو۔ اس کے حال پر ذرا توجہ نہیں کرتے بلکہ بعضے تو بالعکس اس سے تمسخر یا اس کے ساتھ سختی کرتے ہیں۔ دھکے دلوا دیتے ہیں۔ پٹواتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں سائل کا بڑا حق آیا ہے۔ دوسرے سائل کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرنا چاہیے کہ اگر ہم کسی کے دروازے پر سائل نہیں ہوئے۔ اور اس نعمت کے شکر میں سائل پر رحم اور اس کی اعانت کرنا چاہیے۔

سائل سے بے رخی اور اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہئے بلکہ اسے دیکھ کر اللہ کی نعمت کو یاد کرنا چاہیے

اس مضمون کو شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے نظم میں خوب ادا فرمایا ہے:

نہ خواہندہ بر درِ دیگراں
بشکرانہ خواہند از درمراں

البتہ یہ ضروری نہیں کہ جو مانگے وہ ضرور ہی دے۔ یہ اس کی حاجت اور اپنی گنجائش پر ہے اور اگر اتفاق سے دینے کو نہ ہو تو اس کو نرم جواب دے کر سمجھا دے کہ اس وقت میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ اگر دوسرے وقت وسعت ہوئی اور تمہاری حاجت اس وقت تک رفع نہ ہوئی تو انشاء اللہ تعالیٰ خیال رکھوں گا۔

صدقہ دے کر احسان جتلانا ممنوع ہے

اور بعضے دے تو دیتے ہیں لیکن دے کر اس کو خرید نا چاہتے ہیں یعنی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہمارا احسان مند ہو۔ ہمارا شکریہ ادا کرے جب ہم سے ملے ہم کو سلام کرے۔ اگر ہم کچھ حکم دیں تو وہ اس کا امتثال کرے اور اگر سائل کی طرف سے کسی امر میں کوتاہی ہو تو اس کو سخت تعجب ہوتا ہے اور ناگوار گذرتا ہے اور آئندہ کو سلسلہ احسان کا بند کرنے کا ارادہ کر دیتے ہیں بالخصوص اگر اس کی طرف سے کسی معاملہ میں، گو اس میں وہ سائل ہی حق پر ہو۔ صفائی کا برتاؤ عمل میں آوے تو اس وقت تو صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ بڑا نمک حرام ہے۔ ہم نے اس طرح اس پر احسان کئے اور اس نے ہمارا خیال نہ کیا۔ اس طرح بے مروّتی کی۔

منّ واذیٰ جس کی ممانعت قرآن مجید میں آتی ہے وہ یہی ہے۔ اس سے صدقہ کا اجر باطل ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے ایسے دینے والوں کی مدح و فضیلت بیان فرمائی ہے جو دے کر اس کا صلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔ لوجہ اللہ

خدمت کرنا یہی ہے۔ قَالَ اللّٰہُ اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡہِ اللّٰہِ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوۡرًا۔۔۔۔۔ ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ نہ ہم تم سے (اس کا فعلی) بدلہ چاہیں اور (اس کا قولی) شکریہ (چاہیں)

بعضے اس کے مقابل یہ افراط کرتے ہیں کہ ہر سائل کو دینا فرض سمجھتے ہیں بعضے تو تفاخر کے واسطے کہ نام ہوگا کہ فلاں شخص کے پاس سے کوئی سائل محروم نہیں آتا اور بعضے بوجہ غایت تدین و قلت علم کے کہ اس کی حاجت روائی کو فرض شرعی سمجھتے ہیں۔ اور بعضے بوجہ طمع یا خوف دنیوی کے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس پردہ میں کوئی کامل ہو۔ اس کی خدمت کرنے سے ہم مالامال ہو جاویں گے۔ مال میں اولاد میں ترقی ہوگی اور اگر نہ دیں گے۔ شاید بددعا کریں۔ یا ناراض ہو جاویں۔ تو ہم برباد ہو جاویں گے اور اس افراط کے سبب (جس کا منشاء مختلف ہے کہ بعض میں تفاخر بعض میں کثرت تدین ہے اور قلۃ العلم بعض میں غرض دنیوی) یہ لوگ اکثر قرض دار بھی ہو جاتے ہیں اور اس قرض کا خمیازہ کبھی اپنے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کبھی اولاد کو کبھی ادا نہیں ہوتا اور آخرت کا گناہ سرپر رہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں اجازت دی کہ خود منگتے ہو جاؤ مگر سائل کا پیٹ بھرو۔ قال اللّٰہ تعالیٰ لَا تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ۔ اس میں تفریط مذکور اوّلاً کی اصلاح ہے)۔ وَلَا تَبۡسُطۡہَا کُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا۔ اور نہ کھول دے اس کو بالکل، پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہوا (یعنی ایسی کشادہ دستی نہ دکھلا کہ پھر بھیک مانگنی پڑے)۔

کمانے کے قابل شخص کو سوال کرنا جائز نہیں

بلکہ بعض اوقات باوجود اپنی گنجائش و تحمل کے بھی بعض سائل کو دینا بجائے ثواب یا جائز کے گناہ اور ناجائز ہوتا ہے۔

فقہائے نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک سائل قوی مکتسب ہو یعنی ہاتھ پاؤں سے درست ہو اور معاش کی قدرت رکھتا ہو تو ایسے سائل کو سوال کرنا بھی حرام ہے اور سوال پر اس کو دینا بھی بدیں وجہ کہ اعانت علی المعصیت ہے، ناجائز ہے اور جب ناجائز ہوا تو ایسے دینے سے وہی مثل ہو گئی۔ نیکی برباد گناہ لازم اور اکثر تو بلا ٹالنے کے لئے اس طرح دیتے ہیں کہ ثواب کی بھی نیت نہیں ہوتی۔ تو اس صورت میں ثواب نہ ملنا تو زیادہ ظاہر ہے۔

اور ان لوگوں نے ایک غلطی یہ کی کہ یہ تو سمجھ لیا کہ ہم پر سے بلا ٹل گئی لیکن یہ نہ سمجھا کہ ہمارے دینے سے سائل یہ سمجھے گا کہ لپٹنے سے اور سر ہونے ہی سے ملا کرتا ہے۔ تو یہ سمجھ کر اور بھائی مسلمانوں کو پریشان کرے گا۔ تو اپنی بلا تو ٹالی مگر وہ بلا اوروں کے سر ڈالی۔ البتہ اگر ایسے قوی مکتسب کو بلا سوال دے دے تو کچھ مضائقہ نہیں یا باوجود قوی مکتسب ہونے کے بعض صورتوں کا استثناء بھی آیا ہے۔ ان مواقع استثناء میں سوال پر دے بھی تو جائز ہے۔ کیونکہ ان مواقع میں سوال بھی جائز ہے اور وہ مواقع یہ ہیں:

لاتحل الصدقة لغني ولا لذي مرة سوي الا لذي فقر مدقع او غرم مفظع او لذي دم موجع الحديث ... "صدقہ نہ غنی کے لئے حلال ہے اور نہ قوی و تندرست کے لئے مگر (تین شخصوں کے لئے) ایسے فقیر کے لئے جس کو فقر نے مٹی کے ساتھ ملا دیا ہو یا بھاری قرض دار کے لئے یا ایسے شخص کے لئے جس پر دیت واجب ہو اور اس کو ادا کرنے کی طاقت نہ ہو۔"

حاصل ان مواقع کا یہ ہے کہ اس شخص پر بوجہ قرض کے یا کسی مقدمے کے یا ایسے ہی کسی سبب کے مالی بار اتنا پڑا کہ اگر یہ کمانا شروع کرے تب بھی اتنا ذخیرہ جمع نہ ہو سکے کہ روزمرہ کے حوائج پورے ہو کر اس بار سے سبکدوشی حاصل کر سکے تو ایسا شخص اگر سوال نہ کرے تو پھر کیا تدبیر کرے اس لئے ایسے شخص کو سوال کی اجازت

ہے جب سوال جائز ہے تو اس کے سوال پر دینا بھی جائز ہے اور اسی حکم میں ہے۔
وہ مسافر جس کو سفر میں کوئی خسارہ یا حاجت ایسی پیش آگئی کہ اگر کمانا شروع کرے
تو بس سفر ہی میں رہا کرے۔ گھر نہ پہنچ سکے اور گھر سے بھی خرچ منگانا یا تو ممکن نہ ہو یا
اتنی مہلت نہ ہو اور اسی حکم میں وہ شخص بھی ہے جو قوی تو ہے مگر بوجہ خوگر نہ ہونے
کے متحمل تعب کا نہیں اس لیے مکتسب نہیں ہو سکتا بس ان سب لوگوں کو سوال
پر بھی دینا جائز ہے۔

اور اگر سبب اس افراط کا تفاخر و شہرت یا طمع و خوف دنیوی ہے تو اس
دینے کا بیکار ہونا بلکہ موجب گناہ ہونا بہت ہی ظاہر ہے اور بالخصوص اگر یہ طمع و
خوف بے شرعی فقیروں سے ہے جیسا اس زمانہ میں اکثر دنیا پرست لوگ ایسے بھنگڑوں
کو غوث و قطب سمجھ کر اپنا مال اور دین دونوں خراب کرتے ہیں تو اس کو تو مصداق
ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا کہیں گے۔

یہ ذکر تھا سائل کے دینے نہ دینے کے متعلق کوتاہیوں کا۔ اور ایک ان اعمال مالیہ
مقصودہ بالذکر میں سے قرض مانگنے والے کو قرض دینا ہے۔ اس میں بھی چند کوتاہیاں
ہوتی ہیں۔

اگر گنجائش ہو تو قرض مانگنے والے کو قرض دینا چاہیئے

ایک یہ کہ بعضے لوگ باوجود اس
کے کہ اپنے پاس حاجت سے
زائد رقم رکھی ہے یا بآسانی انتظام کر سکتے ہیں اور مانگنے والا سخت حاجت مند ہے
اور بے اعتبار بھی نہیں مگر پھر غایت بے رحمی سے قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔
بعض اوقات جھوٹ بولتے ہیں کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وجہ اس کی یا بخل ہے
یا بے رحمی ہے تو اس کا مذموم ہونا ظاہر اور مسلم ہی ہے۔ محتاج بیان نہیں۔ اور اگر
جہل ہے تو اس کا فائدہ سمجھانا ضرور ہے تا کہ اس علم سے وہ جہل مرتفع ہو جاوے

سو اول تو جس قلب میں ترحم کا جوش ہوتا ہے وہ اس وقت فائدہ کو بھی نہیں سوچتا خود
ترحم حامل علی الاعانۃ ہوتا ہے۔ کیا جو شخص اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے گو اس میں فائدہ
بھی ہے دنیا کا بھی آخرت کا بھی۔ مگر کیا پرورش کے وقت اس فائدہ کو سوچتا ہے کیا
اگر فائدہ نہ سوچے تو پرورش نہ کرے گا؟ پس مسلمانوں میں باہم وہی تراحم و توادد ہونا چاہیے
جو اقارب میں ہوتا ہے۔

اگر بدون فائدہ سمجھے ہوئے قرض دینے کی ہمت نہ ہو تو فائدہ بھی سمجھ لینا چاہیے
اور گو فائدہ دنیوی بھی ہے مثلاً ممنون کے قلب میں محسن کی محبت پیدا ہونا باہم الفت و
ہمدردی بڑھنا، لیکن مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے فائدہ دنیویہ کو مطمح نظر نہ
بنانا چاہیے اس لئے اس سے قطع نظر کر کے فائدہ اخرویہ سمجھنا چاہیے اور وہ ثواب ہے
جو کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ
میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس گناہ ثواب ملتا ہے اور
قرض دینے سے اٹھارہ گنا اور حدیث میں اس کی وجہ بھی آئی ہے کہ صدقہ تو وہ شخص
بھی مانگ لیتا ہے جس کو حاجت نہ ہو۔ مگر قرض بدون حاجت کے (اور حاجت
بھی اکثر اضطراری) کوئی نہیں مانگتا (کیونکہ اپنی گردن کو کون بندھائے) یعنی غالب
عادت یہی ہے۔ پس صدقہ دینے میں ضروری نہیں کہ رفع اضطرار ہوا ہو اور قرض
دینے میں رفع اضطرار ہوتا ہے اور اضطرار پریشانی کا رفع کرنا ظاہر ہے کہ کس قدر
عظیم راحت پہنچاتا ہے اس لئے اس کا ثواب زیادہ ہوا

رہ گئی تخصیص اٹھارہ عدد کی۔ گو اس کا نکتہ نہ سمجھنا ہم کو ضروری ہے اور نہ سمجھانا۔
کیونکہ طبیب کے نسخہ میں مریض کو منصب نہیں اوزان ادویہ کی لِم دریافت کرنے کا
بلکہ استعمال اور اعتقاد ضروری ہے۔ اسی طرح ہمارا مذہب بندہ ہونے کی حیثیت
سے یہ ہونا چاہیے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت از کار تو

حدیث میں اٹھارہ عدد کی تخصیص کیوں کی گئی

مگر تبرعاً و تفریحاً اگر کوئی تقریبی بات سمجھ میں آجاوے تو اس کے ذکر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن چونکہ وہ تقریبی اور تخمینی مضمون ہوگا اس لیے اگر اس میں کوئی خدشہ نکل آوے تو مضر بھی نہیں کیونکہ اصل ایمان نص پر ہے نہ کہ اپنے نکات و لطائف پر غرض وہ نکتہ جو خاطر فاتر میں اس کے متعلق آیا ہے یہ ہے کہ اصل میں ثواب قرض کا صدقہ سے بحیثیت مذکورہ دونا ہے پس صدقہ اگر دس تک مضاعف ہوتا ہے تو قرض بیس تک ہونا چاہیے۔ تو قرض کا ایک درہم صدقہ کے دو درہم کے برابر ہوا لیکن چونکہ وہ درہم واپس آجاوے گا۔ اس لیے بیس کے عدد میں سے دو کم ہو گئے اس لیے اٹھارہ رہ گئے۔ واللہ اعلم۔

اور جب قرض کا ثواب صدقہ سے مضاعف ہونا معلوم ہوگیا۔ تو اسی سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ نصوص سے ثابت ہے کہ دس حصّہ تک ثواب کا بڑھنا یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ ورنہ تفاوت خلوص سے اس سے بڑھ کر سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ پس صدقہ کا ثواب دس سے زائد بھی ہوتا ہے اور قرض کا ثواب اس سے مضاعف بھی ہے اور اخیر میں ایک عشر منہا ہو جاتا ہے پس قرض کا ثواب بھی اٹھارہ تک محدود نہیں بلکہ کبھی چھتیس حصّہ ہوگا یعنی چالیس حصّہ ہو کر گھٹ جاوے گا۔ اور کبھی اسّی ہو کر اس میں سے آٹھ گھٹ کر بہتّر رہ جاوے گا حتیٰ کہ اگر صدقہ کا ثواب سات سو تک ہو تو قرض کا ثواب چودہ سو تک ہوگا جو اخیر میں بارہ سو ساٹھ رہ جاویں گے تو کیا یہ فائدہ نہیں

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را کہ بہ یک گل میخری گلزار را
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچہ در وسعت نیاید آں دہد

اور یہ عدد تو بطور مثال کے فرض کیا گیا ورنہ جب صدقہ میں سات سو کی حد نہیں لقولہ تعالیٰ بعد قولہ۔ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ۔ (پ ۳)

"اُگیں سات بالیں ہر بال میں سو سو دانے، اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے، اور اللہ نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔"

تو قرض میں بھی بارہ سو ساٹھ کی حد نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ توقع ہے۔ کیا اس کو بھی فائدہ نہ کہے گا۔

اور تضاعف ثواب القرض علیٰ ثواب الصدقہ کی تقریر کی تفصیل میں جہاں خاطر فاتر کا حوالہ ہے بحیثیت مذکورہ کی قید اس لیے لگائی گئی کہ اس سے کوئی نہ سمجھ جاوے کہ قرض کا ثواب علی الاطلاق صدقہ سے مضاعف ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر یا تو صدقہ کی جگہ بھی قرض ہی دینے لگے۔ اور یا کہ صدقہ میں بے رغبت ہو جاوے۔ اور اس میں خسارہ سمجھے۔ سو یہ بات ہے کہ مختلف احکام مختلف حیثیات سے ہوتے ہیں۔ سو ایک حیثیت سے تو جس کا کہ ذکر ہوا قرض کا ثواب زیادہ ہے مگر دوسری حیثیات سے صدقہ کا ثواب قرآن سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً قرض میں واپسی ہوتی ہے۔ صدقہ میں واپسی نہیں ہوتی۔ اور اس وجہ سے صدقہ لینے والے کے قلب پر کوئی بار نہیں رہتا۔ اور قرض لینے والے کے قلب پر بار رہتا ہے۔

ایک خدشہ کا ازالہ اور ہم نے قرض دینے میں فائدہ دنیویہ بیان کیا ہے کہ باہم الفت و ہمدردی بڑھتی ہے گو یہ فائدہ مقصود نہیں۔ مگر چونکہ واقعی ہے اس لیے اس پر کوئی خدشہ واقع ہو تو اس کا رفع کرنا ضروری ہے۔ اس میں ظاہراً ایک خدشہ ہے وہ یہ کہ ہم تو اکثر اس کے خلاف یہ دیکھتے ہیں کہ قرض دینے سے پہلی الفت بھی قطع ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کے لیے باہم رنج و کدورت

پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک تجربہ کار بزرگ کا ارشاد ہے

مدہ شان قرض و ستان نیم جبہ
فان القرض مقراض المحبہ

تو آلہ فصل کو آلہ وصل کہنا کیسے صحیح ہوگا۔ دفع اس خدشہ کا یہ ہے کہ قطع محبت اثر قرض کا نہیں ہے۔ اس کا اثر تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی ازدیاد محبت و الفت بلکہ یہ اثر متقرضین یعنی لینے والوں کی بدتدبیری کا ہے۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی حالت دیکھی جاتی ہے کہ قرض لے کر بے فکر سے ہو جاتے ہیں۔ باوجود گنجائش کے وہ تمام فضول کارروائیوں کے قرض کے ادا کا اہتمام نہیں کرتے۔ بعضے تو بہت ہی ٹال کر دیتے ہیں اور بعضے دیتے ہی نہیں۔ اگر تقاضا کیجئے تو بُرا مانتے ہیں۔ اور ان کی اس حرکت سے مقرض (یعنی قرض دینے والے کو) کلفت ہوتی ہے۔ اور جب یہی کلفت روزمرہ مدتوں تک پہنچے تو ضرور اس کا اثر یہ ہوگا کہ محبت قلب سے نکل جاوے گی اور رنج و شکایات پیدا ہو جاوے گی۔ تو اپنی بے عنوانی کے اثر کو قرض کی طرف منسوب کرنا بڑی غلطی ہے۔ پس خدشہ راساً و اساساً منقلع و منقطع ہو گیا۔

لیکن معمولی کلفت سے تنگ دل ہو کر قرض دینے کا سلسلہ بند نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ بھی اجر سے خالی نہیں۔ احادیث میں اس سے کم تنگ دلی پر وعدۂ ثواب آیا ہے کہ اگر کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جاؤ اور اس کی تلاش میں قدرے پریشانی ہو۔ پھر وہ مل جاوے تو اس میں بھی ثواب ہے تو قرض وصول نہ ہونے پر یا وقت پر وصول نہ ہونے پر تو اس سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ تو اس میں اس سے زیادہ اجر کیوں نہ ملے گا۔ اس لیے بقدر تحمل اتلاف کو بھی برداشت کر لینا چاہیے لیکن اس کے ساتھ قرض لینے والے کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ اس کو بھی چاہیے کہ قرض دینے والے کا احسان مانے۔ اور اس کو تکلیف نہ دے۔ اور وقت پر اس کی امانت پہنچا دے

تاکہ پھر بھی قرض لینے کا منہ رہے۔ اور اس نادہندی کی بدولت آپس میں قرض نہیں ملتا۔ پھر کافروں سے سودی قرض لیتے ہیں اور تباہ ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر وقت پر دوسرے کا حق پہنچ جایا کرے۔ تو بہت مسلمان ایسے ہیں کہ وہ خود اپنی مصلحت سے اپنے روپیہ کا قرض پر چلتا رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ حفاظت سے بچتے ہیں اور تجارت کو یہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ یا تو بوجہ احتمال خسارہ کے اور یا بوجہ توحش تعلقات کے۔ یا بوجہ عدم مناسبت کے تو ایسے لوگوں کا روپیہ قرض میں بآسانی مل سکتا ہے اور غیر قوموں کو سُود دے کر اپنا گھر تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ لیکن معاملات خراب ہیں کہ لے کر دینا نہیں چاہتے دو چار جگہ ٹھوکر کھا کر سب سے متوحش ہو جاتا ہے اور بقول شخصے دودھ کا منہ جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ وہ کسی کو بھی قرض نہیں دیتا۔ اور ایک باب عظیم خیر کا بند ہو جاتا ہے جس کا وبال ان نادہندوں کی گردن پر ہوگا۔ اس کوتاہی مذکور کا حاصل تو قرض نہ دینا ہے جس کا مفصل بیان ہو چکا۔

نادار کو مہلت دینا قرآن کی رُو سے واجب ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قرض تو دے دیتے ہیں لیکن تقاضا بے ڈھب کرتے ہیں وقت آنے پر مہلت دینا جانتے ہی نہیں۔ حالانکہ نصِ قرآنی "وَاِن کان ذو عسرة فنظرة الی میسرة"۔ اور اگر وہ تنگ دست ہے تو (اس کو) کشادہ حالی تک مہلت دینی چاہیے۔

تنگ دست نادار کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کی بھی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔

رہن کی چیز سے نفع حاصل کرنا سُود میں داخل ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے بدون سُود کے قرض نہیں دیتے۔ پھر

سود کے طریقے مختلف ہیں بعض صورتیں تو وہ ہیں جن کو یہ لوگ بھی سود سمجھتے اور کہتے ہیں یعنی آدہ آنہ روپیہ پر لینا یا آنہ روپیہ پر لینا۔ اور بعض وہ صورتیں ہیں جن کو سود نہیں سمجھتے مگر وہ سود ہیں، جیسے رہن رکھ کر اس سے نفع حاصل کرنا۔ اس کا سود ہونا مع جواب شبہات عوام و خواص کے رسالہ صفائی معاملات میں احقر نے ثابت کر دیا ہے۔ اور بھی تاجروں میں بہت صورتیں متعارف ہیں۔ پھر ان دونوں قسم کے سود لینے والوں میں بعضے ایسے جری ہیں کہ اس کو حلال سمجھتے ہیں۔ کوئی بعض عبارات فقہیہ سے بزعم خود تمسک کرتا ہے۔ کوئی تمدنی و قومی مصلحتوں کو شریعت پر مقدم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی حربی کی روایت کو پیش کرتا ہے۔ علماء (شکر اللہ تعالیٰ سعیہم (اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کا بدلہ دے) نے ان سب کی اچھی طرح اپنی تحقیقات لسانیہ و کتابیہ میں خدمت کر دی ہے۔ بندہ نے بھی بقدر ضرورت رسالہ صفائی معاملات میں جس کا اوپر حوالہ ہے اور رسالہ تحذیر الاخوان میں اور اپنی تفسیر بیان القرآن تحت آیۃ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا الخ (اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو بقایا سود کو) میں نے اس کی کافی بحث لکھ دی ہے۔ اور اس کا مطالعہ منصف کے لئے انشاء اللہ کافی ہے۔

اور سود کی ان صورتوں میں سے کوئی صورت ظاہر میں بھی تو کسی ضابطہ فقہیہ پر منطبق نہیں۔ بجز ایک صورت بیع بالوفاء کے اور ایک صورت اس کی بھی خارج از ضابطہ ہے

بیع بالوفاء کی تحقیق

تفصیل یہ ہے کہ اس وقت کے عرف میں دو معنے بیع بالوفاء کے مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ ہم کو ایک ہزار روپے قرض دے کر ہمارا باغ رہن رکھ لو اس شرط پر کہ اگر ہم دس سال کے اندر ہزار روپیہ ادا کر دیں تو اپنا باغ چھڑا لیں اور اگر نہ ادا کریں تو وہ باغ اسی ہزار روپے میں تمہارے ہاتھ بیع ہے اور دوسرے یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ تم ہمارا باغ ہزار

روپے میں خرید لو اور زرِ ثمن ہمیں دے دو۔ اور یہ وعدہ ہے کہ اگر ہم دس سال میں تمہارا زرِ ثمن واپس کر دیں تو تم ہمارا باغ واپس کر دو۔ اور بیع کا اقالہ یعنی فسخ کر دو۔ سو اول معنی کے اعتبار سے تو بالاجماع حرام اور سود ہے اور دوسری صورت کو بھی فقہاء متقدمین نے منع کیا ہے لیکن بعض متاخرین نے لوگوں کو مبتلا سود دیکھ کر اجازت دے دی ہے۔ اگر کسی شخص کا دل بوجہ غایت بے مروتی کے ویسے قرض دینے کو گوارا نہ کرے اور بوجہ ضعف قوت تقویٰ کے وہ متقدمین کے قول کو بھی نہ لے۔ تو تجویز سود کی اور صورتوں سے بیع بالوفاء (یعنی بالمعنیٰ الثانی) پھر غنیمت ہے کہ حرمت اس کی متفق علیہ تو نہیں لوگوں کی کم ہمتی پر نظر کر کے بادلِ ناخواستہ کہتا ہوں کہ خیر اسی کو کر لیا کریں اوروں سے تو بچیں۔ یہ بحث تھی قرض کے متعلق کوتاہیوں کی۔

کوئی چیز عاریت دینے میں بخل نہ کرنا چاہیے

اور ایک ان اعمال مالیہ مقصودہ بالذکر میں سے کسی کو کوئی چیز عاریتاً دینا ہے۔

اس میں بھی بعض لوگ بہت بخل کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس میں بخل کرنے کو ناپسند اور اعمال منافقین سے فرمایا ہے۔ حیث قال فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ط (سو ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیز تک نہیں دیتے)۔

اور اسی حکم میں ہے وہ چیز جو بطور عاریت نہ مانگی جاوے۔ بطور تملیک ہی مانگی جاوے لیکن وہ بہت کم قیمت ہو جیسے ایک تولہ نمک جیسے ایک لوٹا پانی جہاں پانی کی فراغت ہو۔ جیسے ایک مٹھی گھاس اور عاریت جیسے دیگچی، پتیلی، چمٹا، قلم بنانے کا چاقو، ایک خط لکھنے کے لئے قلم دوات ومثل ذالک۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو۔ مثلاً ایک شخص کا تجربہ ہو گیا ہے کہ وہ چیز لے کر نہیں دیتا، یا خراب کر دیتا ہے

یا بے پروائی سے کہیں ڈال دیتا ہے۔ اہتمام کر کے ادا نہیں کرتا تو ایسے شخص کو عاریت دینے سے انکار کر دینا جائز ہے لیکن کم قیمت چیز کے دینے سے پھر بھی انکار نہ کرے۔

ان طاعات مذکورہ کے علاوہ اور بھی تطوعات مالیہ ہیں کہ وقتاً فوقتاً ان کو عمل میں لانا موجب نفع خلائق ہے۔ جیسے مہمانوں کی خدمت استادوں کی اور پیروں کی خدمت، دوستوں کو ہدیہ دینا، روزہ داروں کے لیے افطاری لے آنا، اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کرنا۔ اور بعض صورتوں میں اقارب کی خاص خدمات و انفاق واجبہ ہے۔ جس کی تفصیل کتب فقیہہ میں مذکورہ ہے بالخصوص جو صدقات جاریہ ہیں۔ جیسے مساجد کی اعانت تعمیر، بالوٹا بوریہ و تیل سے مدارس اسلامیہ کی اعانت۔ کنواں بنا دینا، پل بنا دینا، راہ پر درخت لگا دینا، قرآن مجید یا کتب دینیہ وقف کر دینا ہو مثل ذالک کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی لکھا جاتا ہے۔

اب میں طاعات مالیہ کی فہرست میں ان مذکورات بعد الزکوٰۃ پر اکتفا کرتا ہوں طالب دین صاحب فہم دیگر متروک صورتوں کو اس سے بخوبی سمجھ کر عمل کر سکتا ہے۔

(اصلاح انقلاب امّت)

○

فصل (۵)

حج و قربانی

حج کرنا (جن اشخاص میں شرطیں پائی جائیں ان پر فرض ہے اور دُوسروں کے لیے نفل) اور حج بھی مثل نماز و زکوٰۃ و روزہ کے اسلام کا ایک رکن یعنی بڑی شان کا ایک لازمی حکم ہے چنانچہ

(۱) فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمے اس مکان (یعنی کعبہ) کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے ذمّے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک (پہنچنے) کی سبیل (یعنی سامان) کی (لمن تنالوا) اور

(۲) ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الخ یہ وہ حدیث ہے جو رُوح چہارد ہم کے ۹ میں گزر چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نماز و زکوٰۃ و روزہ سب کرتا ہو مگر حج فرض نہ کیا ہو تو اس کی نجات کے لیے کافی نہیں اور حج میں ایک خاص بات ایسی ہے جو اور عبادتوں میں نہیں وہ یہ ہے کہ اور عبادتوں کے افعال میں کچھ عقلی مصلحتیں بھی سمجھ میں آسکتی ہیں مگر حج کے افعال میں عاشقانہ شان ہے تو حج وہی کرے گا جس کا عشق عقل پر غالب ہوگا، اور فی الحال اس میں کچھ کمی بھی ہوگی، تو تجربے سے ثابت ہے کہ عاشقانہ کام کرنے سے عشق پیدا ہو جاتا ہے اس لیے حج کرنے سے یہ کمی پوری ہو جائے گی، اور خاص کر جب ان کاموں کو اسی خیال سے کرے اور ظاہر ہے کہ جس کے دل میں خدا تعالیٰ کا عشق ہوگا وہ دین میں کتنا مضبوط ہوگا؟ تو حج کرنے میں دین کی مضبوطی کی خاصیت ثابت ہوگئی (ایسی ہی تقریر روزہ کے بیان میں گزری ہے) اگلی حدیثوں

سے اس کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کے گرد پھرنا اور صفا و مروہ کے درمیان پھیرے کرنا اور کنکریوں کا مارنا یہ سب اللہ کی یاد کے قائم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ (عین ابوداؤد باب الرمل)

ف یعنی گو ظاہر والوں کو تعجب ہو سکتا ہے کہ اس گھومنے دوڑنے، کنکریاں مارنے میں عقلی مصلحت کیا ہے؟ مگر تم مصلحت مت ڈھونڈو۔ یوں سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے اس کے کرنے سے اس کی یاد ہوتی ہے اور اس سے علاقہ بڑھتا ہے اور محبت کا امتحان ہوتا ہے کہ جو بات عقل میں بھی نہیں آئی حکم سمجھ کر اس کو بھی مان لیا۔ پھر محبوب کے گھر کے بل بل قربان ہونا، اس کے کوچے میں دوڑے دوڑے پھرنا کھلم کھلا عاشقانہ حرکات ہیں۔

(۴) حضرت زید بن اسلم رضؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضؓ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ (اب طواف میں) شانے ہلاتے ہوئے دوڑنا اور شانوں کو چادرہ سے باہر نکال لینا کس وجہ سے ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو (مکے میں) قوت دی اور کفر کو اور کفر والوں کو مٹا دیا اور یہ فعل شروع ہوا تھا ان ہی کو اپنی قوت دکھلانے کے لیے جیسا روایات میں آیا ہے) اور باوجود اس کے (کہ اب مصلحت نہیں رہی مگر) ہم فعل کو نہ چھوڑیں گے جس کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں (آپ کے اتباع اور حکم سے) کرتے تھے۔ (کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حجۃ الوداع میں عمل فرمایا جبکہ مکے میں ایک بھی کافر نہ تھا۔ (عین ابوداؤد باب الرمل)

ف ۔اگر حج میں عاشقی کا رنگ غالب نہ ہوتا، تو جب عقلی ضرورت ختم ہو گئی تھی یہ فعل بھی موقوف کر دیا جاتا۔

(۵) حضرت عابس بن ربیعہ رضؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضؓ حجر اسود کی طرف آئے اور اس کو بوسہ دیا اور فرمایا میں جانتا ہوں تو پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔

اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھتا کہ تجھ کو بوسہ دیتے تھے تو میں کبھی تجھ کو بوسہ نہ دیتا۔ (سنن ابوداؤد، باب تقبیل الحجر)

ف۔ محبوب کے علاقہ کی چیز کو چومنے کا سبب بجز عشق کے اور کونسی مصلحت ہوسکتی ہے؟ اور حضرت عمرؓ نے اپنے اس قول سے یہ بات ظاہر کردی کہ مسلمان حجر اسود کو معبود نہیں سمجھتے۔ کیونکہ معبود تو وہی ہوتا ہے جو نفع وضرر کا مالک ہو۔

(۶) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کی طرف رُخ کیا۔ پھر اس پر اپنے دونوں لب (مبارک) ایسی حالت میں رکھے کہ بڑی دیر تک روتے رہے۔ پھر جو نگاہ پھیری تو دیکھتے کیا ہیں کہ حضرت عمرؓ بھی رو رہے ہیں، آپؐ نے فرمایا اے عمرؓ اس مقام پر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ (ابن ماجہ وابن خزیمہ وحاکم وبیہقی)

ف۔ محبوب کی نشانی کو پیار کرتے ہوئے رونا صرف عشق سے ہوسکتا ہے خوف وغیرہ سے نہیں ہوسکتا۔ اور افعال عاشقانہ تو ارادہ سے بھی ہوسکتے ہیں مگر رونا بدوں جوش کے نہیں ہوسکتا۔ پس حج کا تعلق عشق سے ہے اس حدیث سے اور زیادہ ثابت ہوتا ہے۔

(۷) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وسلم نے (ایک لمبی حدیث میں) فرمایا کہ جب عرفے کا دن ہوتا ہے (جس میں حاجی لوگ عرفات میں ہوتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے ان لوگوں پر فخر کے ساتھ فرماتا ہے کہ میرے بندوں کو دیکھو کہ میرے پاس دُور دراز راستہ سے اس حالت میں آئے ہیں کہ پریشان بال ہیں اور غبار آلود بدن ہے اور دھوپ میں چل رہے ہیں، میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے ان کو بخش دیا۔ (بیہقی وابن خزیمہ)

ف۔ اس صورت کا عاشقانہ ہونا ظاہر ہے اور فخر کے ساتھ اس کا ذکر فرمانا اس عاشقانہ صورت کے پیارے ہونے کو بتلا رہا ہے، یہ چند حدیثیں حج میں عاشقی کی شان ہونے کی تائید میں بطور نمونے کے لکھ دی گئیں، ورنہ حج کے سارے افعال کھلم کھلا اسی عاشقانہ رنگ کے ہیں، یعنی مزدلفہ عرفات کے پہاڑوں میں پھرنا، لبیک کہنے میں چیخنا پکارنا، ننگے سر پھرنا،

اپنی زندگی کو موت کی شکل بنا لینا یعنی مُردوں کا لباس پہننا، ناخن بال تک نہ اکھاڑنا جوں تک نہ مارنا جس سے دیوانوں کی سی بھی صورت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح منڈانا کسی جانور کا شکار نہ کرنا خاص حد کے اندر درخت نہ کاٹنا، گھاس تک نہ توڑنا جس میں کوچۂ محبوب کا ادب بھی ہے یہ کام عاقلوں کے ہیں یا عاشقوں کے؟ اور ان میں بعض افعال جو عورتوں کے لئے نہیں ہیں اس میں ایک خاص وجہ ہے یعنی پردے کی مصلحت اور خانہ کعبہ کے گرد گھومنا اور صفا و مروہ کے بیچ میں دوڑنا اور خاص نشانوں پر کنکر پتھر مارنا اور حجرِ اسود کو بوسہ دینا اور زار زار رونا اور خاک آلودہ دھوپ میں جلتے ہوئے عرفات میں حاضر ہونا، ان کے عاشقانہ افعال ہونے کا ذکر اُوپر حدیثوں میں آچکا ہے اور جس طرح حج میں عشق و محبت کا رنگ ہے اس کے ادا کا جس مقام سے تعلق ہے یعنی مکہ معظمہ مع اپنے تعلقات کے اس میں بھی محبت کی شان رکھی گئی ہے جس سے حج کا وہ رنگ اور تیز ہو جائے۔ چنانچہ آیت میں ہے۔

(۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی کہ میں اپنی اولاد کو آپ کے معظم گھر کے قریب آباد کرتا ہوں، آپ کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دیجیے۔ (سورۂ ابراہیم مختصراً)

ف۔ اس دُعا کا وہ اثر آنکھوں سے نظر آتا ہے جس کو ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ

(۹) کوئی مومن ایسا نہیں جس کا دل کعبہ کی محبت میں پھنسا ہُوا نہ ہو حضرت ابنِ عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ دیتے کہ لوگوں کے قلوب،[1] تو یہود و نصاریٰ کی وہاں بھیڑ ہو جاتی لیکن انہوں نے اہلِ ایمان کو خاص کر دیا کہ کچھ لوگوں کے قلوب کہہ دیا۔ (عین درمنثور) اور حدیث میں ہے، چنانچہ:

(۱۰) حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہجرت کے وقت مکہ معظمہ کو خطاب کر کے) فرمایا تو کیسا کچھ ستھرا شہر ہے اور میرا کیسا کچھ محبوب ہے اور

---

[1] حیث قال: من الناس ۱۲

اگر میری قوم مجھ کو تجھ سے جدا نہ کرتی تو میں اور جگہ جا کر نہ رہتا۔ (عین مشکوٰۃ از ترمذی)

ف: اور جب ہر مومن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہے تو آپ کے محبوب شہر مکہ معظمہ سے بھی ضرور محبت ہوگی، تو مکہ سے محبت دو پیغمبروں کی دعا کا اثر ہوا۔ یہ تو حج کی اور مقام کی دینی فضیلت تھی جو کہ اصلی فضیلت ہے اور بعضی دنیوی منفعتیں بھی اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھی ہیں، گو حج میں ان کی نیت نہ ہونا چاہیے مگر وہ خود حاصل ہو جاتی ہیں، چنانچہ آگے دو آیتوں میں اس طرف اشارہ ہے۔

(۱۱) ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ خدائے تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں (کی مصلحت) قائم رہنے کا سبب قرار دیا۔ الخ (مائدہ)

ف: مصلحت عام لفظ ہے، سو کعبہ کی دینی مصلحتیں تو ظاہر ہیں اور دنیوی مصلحتیں بعضی یہ ہیں۔ اس کا جائے امن ہونا، وہاں ہر سال مجمع ہونا جس میں مالی ترقی اور قومی اتحاد بہت سہولت سے میسر ہو سکتا ہے اور اس کے بقا تک عالم کا باقی رہنا، حتیٰ کہ کفار جب اس کو منہدم کر دیں گے قریب ہی قیامت آجاوے گی، جیسا احادیث سے معلوم ہوتا ہے (بیان القرآن بحاصلہ)

(۱۲) اللہ تعالیٰ نے (حج کے لیے لوگوں کے آنے کی حکمت میں یہ) ارشاد فرمایا تاکہ اپنے (دینی و دنیوی) فوائد کے لیے آموجود ہوں (مثلاً) آخرت کے منافع یہ ہیں حج و ثواب و رضائے حق، اور دنیوی فوائد یہ ہیں۔ قربانی کا گوشت کھانا اور تجارت و مثل ذالک، چنانچہ:

(۱۳) حضرت ابن ابی حاتم نے اس کو حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے (کذافی الروح بیان القرآن) اور حج کے رنگ کی ایک دوسری عبادت اور بھی ہے یعنی عمرہ جو کہ سنت موکدہ ہے۔ جس کی حقیقت حج ہی کے بعضے عاشقانہ افعال ہیں۔ اسی لیے اس کا لقب حج اصغر ہے چنانچہ

(۱۴) حضرت عبداللہ بن شداد اور حضرت مجاہدؒ سے روایت ہے (عین درمنثور عن ابی شیبۃ) مگر یہ حج کے زمانے میں بھی ہوتا ہے جس سے دو عبادتیں ایک شان کی جمع ہو جاتی ہیں اور دوسرے زمانے میں بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک مضمون کا ایک سلسلہ تھا، آگے متفرق طور پر لکھا جاتا

-۴

(۱۵) فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور اجب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس) حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے (خوش کرنے کے) واسطے پورا پورا ادا کیا کرو (کہ افعال و شرائط بھی سب بجالاؤ. اور نیت بھی خالص ثواب کی ہو) (بیان القرآن)

(۱۶) حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو کوئی ظاہری مجبوری یا ظالم بادشاہ یا کوئی معذور کر دینے والی بیماری حج سے روکنے والی نہ ہو اور وہ پھر بے حج کیے مر جائے اس کو اختیار ہے خواہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔

(عین مشکوٰۃ از دارمی)

ف۔ فرض حج نہ کرنے میں کتنی سخت دھمکی ہے۔

(۱۷) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص حج کا ارادہ کرے اس کو جلدی کرنا چاہیے۔ (عین مشکوٰۃ از ابوداؤد و ترمذی)

(۱۸) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حج اور عمرہ میں اتّصال کر لیا کرو (جب کہ زمانہ حج کا ہو) دونوں افلاس کو اور گناہوں کو دور کرتے ہیں جیسا بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کو دور کر تی ہے (بشرطیکہ کوئی دوسرا امر اس کے خلاف اثر کرنے والا نہ پایا جائے) اور جو حج احتیاط سے کیا جائے اس کا عوض بجز جنّت کے کچھ نہیں۔ (عین مشکوٰۃ از ترمذی و نسائی)

ف۔ اس میں حج و عمرہ کا دینی نفع مذکور ہے اور ایک دنیوی نفع، اور گناہ سے مراد حقوق اللہ ہیں کیونکہ حقوق العبادؔ تو شہادت سے بھی معاف نہیں ہوتے۔ (الحدیث الا الدین کما فی المشکوٰۃ عن مسلم)

ؔ وما ورد فی ضمان التبعات فبعد ثبوته کما تردد فی ثبوته صاحب الترغیب یحمل علی غیر المالیات کالاغتیاب ونحوه واللہ اعلم ۱۲

(۱۹) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں، اگر وہ دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا ہے۔ اور اگر وہ اس سے مغفرت چاہتے ہیں تو وہ ان کی مغفرت فرماتا ہے۔

(عین مشکوٰۃ از ابن ماجہ)

(۲۰) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص حج کرنے یا عمرہ کرنے یا جہاد کرنے چلا، پھر وہ راستے ہی میں (ان کاموں کے کرنے سے پہلے) مرگیا اللہ تعالیٰ اس کے لیے غازی اور حاجی اور عمرہ کرنے والے کا ثواب لکھے گا۔ (عین مشکوٰۃ از بیہقی)

مشتاقانِ حج عملاً حج میں مشغول ہیں

غیر حجاج کے دل پر بھی ایک نشتر سالگتا ہے۔ اور وہ بھی حسرت کے ساتھ ان جانے والوں کو دیکھتے ہیں اور ہر مسلمان کے دل میں ایک خاص داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ ہائے ہم بھی اس وقت حج کو جاتے۔

"نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ" جو لوگ حج کو جا رہے ہیں وہ رمضان کے بعد عملاً حج میں مشغول ہیں اور جو لوگ حج کو نہیں جا رہے ہیں وہ عملاً حج میں مشغول ہیں کیونکہ ان کو اپنے نہ جانے پر حسرت ہے ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اس وقت ظاہراً تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔ مگر وہ عند اللہ ہر منزل اور ہر مقام میں تمہارے ساتھ ہیں اور ثواب میں برابر کے شریک ہیں، اور یہ وہ معذورین ہیں جو عذر کی وجہ سے تمہارے ساتھ شریکِ سفر نہ ہوسکے، مگر ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی تمہاری طرح جہاد کرتے۔ اس حدیث سے مشتاقانِ حج کا حجاج کے ساتھ شریکِ حج ہونا واضح ہو گیا۔

(وعظ السوال فی الشوال)

زیارت روضۂ شریف

حج کے متعلق ایک تیسرا عمل اور بھی ہے یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ شریف کی زیارت جو اکثر علماء کے نزدیک

مستحب ہے اور جس طرح حج میں عشقِ الٰہی کی شان تھی، اس زیارت میں عشقِ نبویؐ کی شان ہے، اور جب حج سے عشقِ الٰہی میں ترقی ہوئی اور زیارت سے عشقِ نبویؐ میں جس کے دل میں اللہ ورسول کا عشق ہوگا وہ دین میں کتنا مضبوط ہوگا؟ اس شانِ عشقی کا پتہ اس حدیث سے چلتا ہے۔

(۲۱) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص حج کرے اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کرے وہ ایسا ہے جیسے میری حیات میں میری زیارت کرے۔ (عین مشکوٰۃ از بیہقی)

ف: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں زیارتوں کو برابر فرمایا، اور جب کسی خاص بات کی تخصیص نہیں تو ہر اثر میں برابر ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ آپ کی حیات میں آپ کی زیارت ہوتی تو کس قدر آپ کا عشق قلب میں پیدا ہوتا، تو وفات کے بعد زیارت کرنے کا بھی وہی اثر ہوگا۔ اور حدیث تو اس دعوے کی تائید کے لیے لکھ دی ورنہ اس زیارت کا یہ اثر ترقی عشق نبویؐ کھلم کھلا آنکھوں سے نظر آتا ہے اور جس طرح حج کے مقام یعنی مکہ معظمہ میں محبّت کی شان رکھی گئی ہے جس کا بیان اُوپر ہو چکا اسی طرح اس زیارت کے مقام یعنی مدینہ منوّرہ میں محبّت کی شان رکھی گئی ہے چنانچہ:

(۲۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے (ایک لمبی حدیث میں) روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ انھوں نے (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے) تجھ سے مکّہ کے لیے دُعا کی ہے اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے دُعا کرتا ہوں، وہ بھی اور اتنی ہی اور بھی الخ (مشکوٰۃ از مسلم)

ف: (۸) میں گزرا ہے کہ حضرت ابراہیم نے مکّہ معظّمہ کے لیے محبوبیت کی دُعا فرمائی ہے تو مدینہ منوّرہ کے لیے دوگنی محبوبیت کی دعا ہوگی۔

(۲۳) حضرت عائشہؓ سے (ایک لمبی حدیث میں) روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ! مدینہ کو ہمارا محبوب بنادے جیسے ہم مکّہ سے (محبّت) کرتے تھے بلکہ اس

سے بھی زیادہ الخ (مشکوٰۃ از بخاری)

(۲۴) حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے تشریف لاتے اور مدینہ کی دیواروں کو دیکھتے تو سواری کو تیز کر دیتے مدینہ کی محبت کے سبب (مشکوٰۃ از بخاری)

ف: محبوب کا محبوب جب محبوب ہوتا ہے تو ضرور سب مسلمانوں کو مدینے سے محبت ہو گی۔

(۲۵) حضرت یحییٰ بن سعید رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا روئے زمین میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں مجھ کو اپنی قبر ہونا مدینہ سے زیادہ پسند ہو، یہ بات تین بار فرمائی۔ (مشکوٰۃ از مالک) اس میں یہ بھی تقریر ہے جو اس سے پہلی حدیث میں تھی اور حج و زیارت سے محبت کا بڑھ جانا اور خود حج و زیارت کی اور ان مقاموں کی محبت ہر ایمان والے کے دل میں ہونا دلیل کا محتاج نہیں اور اس محبت کا جو اثر دین پر پڑتا ہے اس کا بیان اوپر ہو چکا ہے پس اے مقدور والے مسلمانو! اس دولت کو نہ چھوڑو۔ (الروایات ماخوذۃ من کتب مختلفۃ وصرح باسمائھا عند کل)

(حیوٰۃ المسلمین)

الحج المبرور (تلخیصاً)

بعض رفقاء کا ارادۂ حج اس بات کا محرک ہوا کہ حج کے متعلق کچھ ضروری تنبیہات گوش گذار کر دی جائیں تاکہ جس امر کا انہوں نے خدا کی توفیق سے ارادہ کیا ہے اس کو آداب و شرائط کے ساتھ ادا کریں کیونکہ ہر چیز اپنے آداب و شرائط ہی کے ساتھ کامل ہُوا کرتی ہے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی امر کی طرف اس آیت میں (قُلْ اِنِّیْ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ) تنبیہہ کی گئی ہے جس کو میں نے اس وقت تلاوت کیا ہے۔ اور وہ امر جس کی طرف اس آیت میں تنبیہہ ہے بہت ہی ضروری ہے کیونکہ یہ ایک قاعدہ مسلمہ عقلیہ ہے کہ ہر فعل میں جس چیز کی کمی ہُوا کرتی ہے اس کا تدارک دوسرے محسنات سے مقدم ہوتا ہے۔ یعنی اگر ایک کام میں کمی نہ ہو گو زوائد بھی اس میں نہ ہوں وہ تو مقصود کے لئے کافی ہے اور جس کام میں اصل ہی سے کمی ہو گو محسنات بھی اس میں ہوں وہ ناکافی ہوتا ہے۔ بس ہر کام کی تکمیل کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ان کوتاہیوں کو پُورا کیا جائے جن پر اس کی صحت اور مقبولیت موقوف ہے۔ پھر اگر خدا ہمت دے تو اُن مستحبات اور نوافل و زوائد کو بھی پورا کیا جائے جن سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور اگر نوافل و زوائد کو پُورا بھی نہ کیا جائے تو حسنِ اصلی تو جب بھی رہے گا اور کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے کسی کام میں حُسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے اگر ایک مکان میں تمام ضروریات موجود ہوں کسی معتبر چیز کی کمی نہ ہو مگر استرکاری اور بیل بوٹے نہ ہوں تو اس مکان کو ناقص نہ کہا جائے گا اور اگر اس میں باورچی خانہ یا غسل خانہ یا کوئی ضروری چیز نہ ہو تو چاہے اس میں ہزار بیل بوٹے ہوں اس کو یقیناً ناقص کہا جائے گا اور سب یہی کہیں گے کہ یہ مکان رہنے کے قابل نہیں۔ اسی طرح ہر چیز میں غور کر لیا جائے تو اس عقلی قاعدہ کی تائید ہر چیز میں ملے گی کہ اول ہر چیز کے نقصانات اور کوتاہیوں کا پُورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ محسنات اور زوائد کا مرتبہ بعد میں ہے اس لئے میں نے اس آیت کے

مضمون کو زیادہ ضروری قرار دیا کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس پر ہر نیک عمل کا درست اور مقبول ہونا موقوف ہے اور اس میں آج کل بہت کمی کی جاتی ہے اور وہ اخلاص ہے۔ اگرچہ اخلاص کی کمی ہمارے اکثر اعمال میں آجکل ہے اس لئے بظاہر حج کی کوئی خصوصیت معلوم نہ ہوئی ہوگی۔ مگر میں ابھی بتلادوں گا کہ

اخلاص کی حج میں زیادہ ضرورت ہے

اخلاص کی ضرورت حج میں زیادہ ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ حج کی ایک خاص شان ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر اخلاص سے خالی ہو جاتا ہے اور یہ ہمارے سوءِ فہم کا نتیجہ ہے کہ اس کی وہ خاص شان اس کو مقتضی ہوگئی کہ اس میں اخلاص کم ہوتا ہے ورنہ اُس شان کا اصلی مقتضا یہ تھا کہ اس میں دوسرے اعمال سے زیادہ اخلاص کا اہتمام کیا جاتا۔ حج کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ساری عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جو کام بار بار ہوتا ہے اس میں اگر پہلی بار اخلاص نہ ہو تو آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے۔ اگر کسی کو اول روز اخلاص نصیب نہ بھی ہو تو وہ کوشش کر کے دو چار روز زیادہ دو چار ہفتوں میں اخلاص حاصل کر سکتا ہے۔ روزہ میں اتنا تکرار تو نہیں مگر ہر سال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے اگر کوئی شخص تمنّا کے ساتھ بلوغ کے بعد پچاس سال کی عمر پائے تو پچاس مرتبہ زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دوسرے اعمال میں اخلاص کا پیدا ہونا آہستہ آہستہ ممکن ہے اگر پہلی بار میں نہ ہو۔ دوسری تیسری بار میں ہو جائے گا۔

اخلاص کے درجات

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اخلاص کے وجوداً و عدماً تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایتِ صحیحہ کا قصد ہو یہ تو غایت اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔ دوسرے یہ کہ غایتِ فاسدہ کا قصد ہو یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ کہ کچھ بھی قصد نہ ہو نہ

غایت صحیحہ کا نہ غایت فاسدہ کا بلکہ یونہی معمول کے موافق ایک کام کرلیا۔ یہ درجہ بین بین ہے۔ اس کو اخلاص سے اتنا بُعد نہیں جتنا دوسرے درجہ کو بُعد ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ خدا تعالیٰ ہم سے راضی ہوں گے اس کے سوا اور کچھ نیت نہ ہو یہ تو اخلاص کا درجہ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خشوع خضوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جاوے گا۔ یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ ہم معمول کے موافق نماز پڑھ لیں۔ نہ وہ خیال دل میں ہو نہ یہ خیال ہو۔ یہ مرتبہ بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجۂ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں اس کو اخلاص سے قُرب ضرور ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ فعلِ اختیاری فاعل مختار سے بدون کسی غرض کے تصوّر کے نہیں ہو سکتا تو اس کی کیا وجہ کہ بعض دفعہ ہم ایک فعل کرتے ہیں اور نیّت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض عادت کی برکت ہے جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود صادر ہونے لگتا ہے۔ اس کے لئے اب بار بار ارادہ اور عزم نہیں کرنا پڑتا۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز کی نیت بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی غایت پر نظر نہیں ہوتی۔ تکرار کی وجہ سے عادت ہو گئی ہے اور عادت کے بعد غایات کا لحاظ نہیں ہُوا کرتا۔ پس معلوم ہُوا کہ جس کام میں تکرار ہو اس میں اخلاص سے من وجہٍ قرب ہے اور جس میں تکرار نہ ہو۔ اس میں اخلاص اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ غایتِ صحیحہ کا تصوّر اور اس کا قصد نہ ہو۔ اسی وجہ سے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہا کرتی کیونکہ ریا کرتے کرتے پھر اس کام کی عادت پڑ جاتی ہے اور جس کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس میں پھر کوئی خیال نہیں آیا کرتا۔ پھر وہ اخلاص سے قریب ہو جاتا ہے۔ اب حج کو دیکھئے تو اس میں تکرار بالکل نہیں یعنی فرض کے اعتبار سے گو نفل کے اعتبار سے کوئی کتنا ہی کرے مگر

یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ حج ساری عمر میں فرض صرف ایک ہی بار ہے تو اس میں جب تک غایت صحیحہ کا تصور اور قصد نہ کیا جائے گا اس میں اخلاص نہیں پیدا ہوگا کیونکہ اس میں تکرار نہیں اور تکرار کی وجہ سے عادت بھی نہیں اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس احتمال کی بھی نوبت نہیں آتی کہ بالکل خالی الذہن ہو کر حج کیا جائے۔ بس اس میں دو ہی صورتیں ہیں یا تو غایتِ صحیحہ کا قصد ہوگا یا غایتِ فاسدہ کا۔ اس لئے اس میں اخلاص کے اہتمام کی دوسری عبادات سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہی اس وقت مجھ کو بیان کرنا ہے کہ یوں تو ہر عبادت کے لئے اخلاص کی ضرورت ہے مگر حج کے لئے خصوصاً اخلاص کی بہت ضرورت ہے کہ ساری عمر میں ایک بار اس کے ادا کرنے کا موقع ملتا ہے پھر نہ معلوم کسی کی قسمت میں دوبارہ بھی ہے یا نہیں۔ تو ایسی عبادت میں بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہئے۔ اگر خدانخواستہ اس میں کوتاہی رہ گئی تو بڑی ناکامی ہوگی۔ اول تو حج کرنا دوسری عبادات کی طرح آسان نہیں، جانی اور مالی دونوں قسم کی مشقتیں اس میں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ دوسرے بار بار اس کی توفیق اور ہمت ہونا بھی محتمل ہے۔ اگر ایسی حالت میں یہ ساری محنت اخلاص سے خالی ہوئی تو نیکی برباد اور گناہ لازم ہوا۔ پھر روپیہ الگ ضائع ہوا اس سے زیادہ ناکامی اور کیا ہوگی۔

اخلاص کی حقیقت اخلاص کے معنی لغت میں خالص کرنے کے ہیں اور شریعت میں بھی اس کے معنی وہی ہیں جو ورودِ شرع سے پہلے تھے۔ خالص گھی وہ ہے جس میں کوئی دوسری چیز ملی ہوئی نہ ہو اخلاصِ عبادت کے معنی بھی یہ ہوئے کہ عبادت کو غیر عبادت سے خالی کیا جائے یعنی کوئی ایسی غرض اس میں ملی ہوئی نہ ہو جس کا حاصل کرنا شرعاً مطلوب نہیں ہے۔ مثلاً نماز سے بزرگ مشہور ہونا زکوٰۃ دینے سے نام آوری اور حج سے حاجی کہلانا مقصود نہ ہو اور یوں کوئی نہ کوئی غرض تو ضرور ہوگی کیونکہ فاعل مختار کا فعل غرض سے خالی نہیں

ہو سکتا۔ پس اخلاص کے یہ معنی نہیں کہ رضاء حق اور جنّت کی بھی غرض نہ ہو۔ کیونکہ یہ غرض تو مطلوب ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَفِي ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ اس میں رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہئے اور اس سے پہلے جنّت کی نعمتوں کا ذکر ہے جن کی طرف رغبت کرنے کا امر خود قرآن میں موجود ہے وفی الحدیث اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ حدیث میں ہے کہ حضور اس طرح دُعا کیا کرتے تھے "اے اللہ میں آپ سے جنّت کی درخواست کرتا ہوں اور ان اقوال و اعمال کی جو جنّت کی طرف نزدیک کر دیں" معلوم ہُوا کہ جنّت کی درخواست کرنا سنّت ہے اسی لئے میں نے اخلاص کی حقیقت یہ بیان کی تھی کہ عبادت کے ساتھ کوئی ایسی غرض نہ ملائی جائے جس کا حاصل کرنا مطلوب نہیں اور ثواب اور جنّت کا اور عذاب سے نجات کا مانگنا مطلوب ہے اس لئے یہ غرض اگر عبادت میں ملی ہوئی ہو تو یہ اخلاص کے منافی نہیں بعض لوگ بے دھڑک کہہ ڈالتے ہیں کہ ہم کو جنّت کی پرواہ نہیں، دوزخ کی پرواہ نہیں۔ یہ سخت بے ادبی ہے۔ ان لوگوں کو جنّت و دوزخ کی حقیقت معلوم نہیں ورنہ ساری شیخی رکھی رہ جاوے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا مگر حضورؐ نے بھی جنّت کی طلب کی ہے اور جہنّم سے پناہ مانگی ہے۔ جب آپ کو اخلاص کی ضرورت اور اس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ اب یہ معلوم کیجئے کہ حج کا کن چیزوں سے خالص کرنا ضروری ہے۔

حج کا خالص کرنا کن چیزوں سے ضروری ہے

سو سن لیجئے کہ وہ دنیوی اغراض ہیں جن سے حج کا خالص کرنا ضروری ہے دینی کام کے ساتھ دنیوی غرض کا ملنا ایسا ہے جیسا کہ دودھ میں پانی ملا دیا جائے اور کون نہیں جانتا کہ دودھ خالص وہی ہے جس میں پانی نہ ہو۔ اسی طرح عبادت خالص وُہی ہے جس میں دنیوی غرض کوئی ملی ہوئی نہ ہو۔ اور دُودھ میں پانی ملانے

کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دودھ میں پانی ملایا جائے۔ دوسرے یہ کہ پانی میں دودھ ملایا جائے۔ تیسرے یہ کہ دونوں کو ایک ساتھ کسی دوسرے برتن میں ڈال دیا جائے حج میں آمیزش کی بھی یہی تین صورتیں ہیں (۱) یہ کہ حج سے پہلے ہی کوئی خرابی اس میں ڈال دی جائے (۲) دوسرے یہ کہ حج کرکے اس کو خراب کر دیا جائے (۳) تیسرے یہ کہ حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں بھی ہوتی رہیں۔

حج سے پہلے خرابی ڈالنے کی صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی دنیوی غرض اس کی ساتھ ملالی جائے۔ مثلاً حاجی کہلانے کی نیت ہو یا مال حرام سے سفر کیا جاوے حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں ہونے کی صورت یہ ہے کہ سفر حج میں معصیت کرتے رہیں گناہوں سے توبہ نہ کی ہو۔

حج میں نماز چھوڑنے والوں کے عذر کا جواب

مثلاً بعض لوگ حج کے سفر میں نماز چھوڑ دیتے ہیں اور جو کوئی ان سے کہتا ہے کہ بھائی یہ کیسا حج ہے کہ نماز ہی موقوف کر دی تو کہتے ہیں کہ صاحب ایسی گندی حالت میں نماز کیسے پڑھیں۔ جہاز کے پائخانہ غلیظ ہوتے ہیں۔ چھینٹیں اڑکر کپڑوں پر آتی ہیں۔ کپڑوں کا کیا اعتبار، جوتوں کا کیا اعتبار۔ خدا فقہاء کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے وسوسہ کو اس قدر قطع کیا ہے کہ کوئی کیا قطع کرے گا۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ جب تک قسم کھا کر نہ کہہ سکے کہ میرا وضو ٹوٹ گیا اس وقت تک وہ باوضو ہے۔ اسی طرح کپڑوں کا حکم ہے۔ جب تک یقین نہ ہو جائے کہ ان میں ناپاکی لگ گئی ہے۔ اس وقت تک کپڑوں کو پاک سمجھنا چاہئے خواہ کیسے ہی پاخانے غلیظ ہوں احتیاط کرکے بیٹھو اور احتیاط سے اٹھو جب تم کو ناپاکی کپڑوں پر نظر نہیں آتی ان کو پاک ہی سمجھو۔ لیجئے شریعت میں کس قدر آسانی ہے۔ اب بھی اگر کوئی نماز برباد کرے وہ خود بھگتے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ دو فرقے دین کے محافظ ہیں

فقہاء اور صوفیہ - اور فقہاء کا وجود تو مسلمانوں کے حق میں بہت ہی بڑی نعمت تھی۔ تو حج میں ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ نماز ہی کو بہت سے لوگ حذف کر دیتے ہیں۔ ایک معصیت خاص حج کے متعلق زیادہ پیش آتی ہے کہ گھر سے نکل کر لڑنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ حج کی لڑائی مشہور ہے۔ اچھے اچھے دوستوں بلکہ باپ بیٹوں میں بھی لڑائی ہو جاتی ہے۔ اور پیر مرید کا تعلق حالانکہ باپ بیٹے سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر ہم نے حج میں پیر مرید کو بھی لڑتے دیکھا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ گناہوں سے طاعات کا ثواب کم ہو جاتا ہے۔ تو یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جس ثواب کے لئے روپیہ خرچ کیا جائے۔ جان پر مشقت برداشت کی جائے۔ اس کے ثواب کو دو چار باتوں میں کم کر دیا جائے۔

حج کے سفر میں زیادہ تر لڑائی جھگڑے اس سے پیش آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے توقع ہوتی ہے پھر جب اس توقع کے خلاف برتاؤ ہوتا ہے تو جھگڑے پیش آتے ہیں اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ سفر حج میں زاد میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اس شرکت کی وجہ سے ہر شریک کو دوسرے سے امداد اور راحت رسانی کی توقع ہوتی ہے اور سفر کی حالت میں بعض دفعہ انسان اپنی بھی امداد نہیں کر سکتا تو دوسرے کی کیا خاک امداد کرے گا اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص اپنا سامان کھانے پینے کا جدا رکھے اور انتظام پکانے کا بھی الگ کرے۔ دوسرے کسی سے کچھ توقع نہ رکھے اس کے بعد اگر کسی سے ذرا سی بھی راحت پہنچ جائے گی اس کی قدر ہوگی اور نہ پہنچے گی تو شکایت نہ ہوگی۔ بہرحال ان وجوہ سے یہ قصے حج سے پہلے ہی شروع ہو گئے ہیں ان کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ اس کو دفع کرے۔ یہ بھی انہی معاصی میں سے ہے جو حج سے پہلے ہوتی ہیں۔

حج میں حلال رقم ساتھ لینی چاہیئے

بعض لوگ ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ رقم کی بابت احتیاط نہیں کرتے۔ رشوت وغیرہ کی رقم لے کر حج کو جاتے ہیں۔ کبھی اور کوئی حرام کمائی ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ یُطِیْلُ سَفَرَہٗ وَمَلْبَسُہٗ حَرَامٌ وَمَاکَلُہٗ حَرَامٌ یَرْفَعُ یَدَیْہِ یَدْعُو اللّٰہَ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَہٗ او کما قال۔ بہت سے پراگندہ بال خستہ حال آدمی جو لمبا سفر کرتے ہیں۔ ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعائیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ لباس بھی حرام کا ہے اور غذا بھی حرام ہے۔ پھر ان کی دعا کیونکر قبول ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرام کمائی کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی اور دعا بھی عبادت ہے تو اسی سے دوسری عبادات کا حال بھی سمجھ لیا جائے کہ اور عبادات بھی حرام مال سے اگر کی جائیں گی قبول نہ ہوں گی۔ پس حرام کمائی کے ساتھ حج بھی قبول نہ ہوگا۔ اس لئے اس کا بہت خیال کرنا چاہیئے کہ زاد و راحلہ اور روپیہ وغیرہ حرام مال سے نہ ہو حلال کمائی ہونی چاہیئے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ آجکل تو اکثر آمدنیاں حرام ہی ہیں پھر کسی کا بھی حج مقبول نہ ہوگا۔ سو یہ بالکل غلط ہے۔ وہی فقہاء جو رحمت عالم ہیں ان سے پوچھو، دریافت کرو جو آمدنی ان کے فتوے سے جائز و حلال ہو اس کو حلال سمجھو اور فتوے کی رُو سے بہت سی آمدنیاں اب بھی حلال ہیں۔ اس میں زیادہ غلو کرنے اور تقویٰ بگھارنے کی ضرورت نہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ۔ "دین میں غلو مت کرو"۔ یعنی بات بات میں شبہات مت نکالو۔ بال کی کھال نہ کھینچو۔ ظاہر میں تو غلو اچھا معلوم ہُوا کرتا ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے۔ یہ تو تقویٰ ہے کہ میں ذرا ذرا بات کی چھان بین کرتا ہوں۔ بعض لوگ عوام کے سامنے ایسی حکایات بیان کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب روزیٔ حلال آئے۔ انہوں نے کہا چند روز پہلے تک تو حلال تھی مگر ایک بار میرے بیل دوسرے کے کھیت میں جا گھسے وہاں کی مٹی

ان کے کھریوں کو لگ گئی۔ پھر وہ میرے کھیت میں مل گئی۔ پھر اس میں غلہ پیدا ہوا اس لئے حلال نہیں رہا۔ مگر اس غلو کا انجام ابتلاء فی المعصیت ہو جاتا ہے یعنی تھوڑے دنوں میں یہ تقویٰ بھی جاتا رہتا ہے۔ اور فتویٰ بھی۔ کیونکہ جب ان توہمات کے ساتھ حلال روزی کوئی سمجھ میں نہیں آتی تو شیطان پٹی پڑھا دیتا ہے کہ بس دنیا میں حلال روزی تو میسر آ نہیں سکتی اور بدون کھائے پئے گذران نہیں چل سکتا تو اب حلال و حرام کی تمیز ہی فضول ہے جو آجائے اور جس طرح آجائے کھا لینا چاہئے ہمیشہ غلو کا یہی انجام ہوتا ہے کیونکہ توہمات کا سلسلہ کم نہیں ہوا کرتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ پھر آخر کار گھبرا کر اس کو چھوڑ دیتا ہے جس کا شریعت نے حکم کیا تھا اسی واسطے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص گیہوں کا ایک دانہ لئے پھرے کہ یہ کس کا ہے اس کو سزا دینی چاہیے کیونکہ یہ تقویٰ کا ہیضہ ہے کہ آپ ایک دانہ کو پکارتے ہوئے پھرتے ہیں۔ واقعی فقہا نے شیطان کے فریبوں کو خوب ہی سمجھا ہے۔ ظاہر میں تو یہ حکم فقہاء کا گراں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے دانہ کو پڑا ہوا پائے تو اس کے پوچھنے میں کیا حرج ہے مگر فقہاء کی نظر انجام پر ہے کہ اس تقویٰ کی انتہا معصیت ہے۔

حرام مال کو دل بدل کرنے سے وہ حلال نہیں ہوتا

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حرام مال کما کر حج کو جاتے ہوئے دوسرے شخص کے حلال مال سے اس کو بدل لیتے ہیں گویا خدا سے بہانہ کرتے ہیں مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ بدلین کا حکم ایک ہی ہوتا ہے اس بدلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حلال مال بھی حرام ہو جاتا ہے۔ کوئی یہ شبہہ نہ کرے کہ فقہا نے بھی تو ایسا حیلہ لکھا ہے جواب یہ ہے کہ اول تو وہ حیلہ اس طرح نہیں جس طرح تم کرتے ہو کہ حلال و حرام کا ادلہ بدلہ کرتے ہو وہ حیلہ دوسرا ہے۔ دوسرے فقہاء نے وہ حیلہ بھی اس لئے نہیں لکھا کہ اس کے سہارے سے حرام مال کمایا کریں اور اس کو اپنے تصرف میں لایا کریں۔ فقہا نے وہ

حیلہ صرف اس واسطے بیان کیا ہے کہ اگر کسی وقت کسی کے پاس ایسی رقم آجاوے جو کمانے والے نے تو حرام طریقہ سے کمائی ہو مگر اس کے پاس حلال طریقہ سے آئی ہو مثلاً کسی کو میراث میں رقم مل گئی اور مرنے والا سود خوار رشوت خوار تھا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ ساری میراث سود اور رشوت ہی کی ہے یا بالکل حلال ہے یا دونوں قسم کا روپیہ ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ رشوت کس کس سے لی تھی۔ اس صورت میں آسانی کے لئے وہ صورت بیان کردی ہے۔ باقی جس نے خود رشوت لی ہے اور وہ جانتا ہے کہ فلاں فلاں سے میں نے رشوت لی ہے اس کو اس حیلہ پر عمل کرنا جائز نہیں بلکہ اس پر واجب ہے کہ جس سے رشوت لی ہے اُس کو اُس کی رقم واپس کردے اور جس سے سُود لیا ہے اس کو سود واپس کردے پھر اس کے بعد دیکھے کہ حلال آمدنی کتنی بچتی ہے اگر اس میں حج کرسکے تو حج کو جائے ورنہ اُس پر حج فرض ہی نہ ہوگا مگر آجکل تو لوگوں نے سستا نسخہ یاد کرلیا ہے کہ حرام مال خوب کماؤ بعد میں ادلہ بدلہ کرکے اس کو حلال کرلیں گے۔ یہ محض خدا تعالیٰ کے ساتھ بہانہ ہے جو کبھی جائز نہیں۔ پھر فقہاء نے جو صورت حیلہ کی بیان کی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حیلہ کے بعد گناہ سے بھی بچ جاوے گا۔ گناہ پھر بھی رہے گا۔ کیونکہ اُس حیلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس حرام کی رقم ہو اور کسی دوسرے سے قرض روپیہ لے کر اس سے حج کرنے بعد اس قرض کو اس حرام روپیہ سے ادا کردے۔ تو فقہاء لکھتے ہیں کہ اس صورت میں حج صحیح ہوگیا کیونکہ قرض گو انتہاءً معاوضہ ہے مگر ابتداءً تبرع ہے تو گویا اس نے ایسے مال سے حج کیا جو اس کو دوسرے کے پاس سے تبرعاً ملا ہے اور انتہاءً جو مبادلہ تھا سو وہ مبادلہ دیون میں ہے عین میں نہیں یعنی جب اس نے ادا کیا ہے اس کا دین اس دوسرے کے ذمہ واجب ہوگیا۔ پھر دونوں دین میں مقاصہ ہوگیا اس لئے حرام روپیہ ادا کرنے سے اُس روپیہ میں خبث نہ آئے گا جو پہلے قرض لیا گیا تھا۔

اس سے فقہاء کی فہم کا اندازہ ہوتا ہے۔ بھلا خشک محدث ان دقائق کو کہاں سمجھ سکتا ہے لیکن فقہا کا اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اس صورت میں حج صحیح ہو جائے گا۔ حج میں کوئی خرابی نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ گناہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں یہ شخص دوسری معصیت کا مرتکب ہوا وہ یہ کہ دوسرے شخص کو حرام مال استعمال کے لئے دیا۔

حرام مال سے قرض ادا کرنا بھی ناجائز ہے

حرام مال کا نہ خود کھانا جائز ہے نہ دوسروں کو کھلانا جائز ہے۔ حتیٰ کہ کافر کو بھی حرام مال کھلانا جائز نہیں۔ یہاں تک کہ ناپاک چیزوں کا کھلانا جانوروں کو بھی جائز نہیں۔ بعض لوگ ایسا کھانا جس میں کتا بلی منہ ڈال جائے بھنگی کو دے دیتے ہیں یہ ناجائز ہے بلکہ یہ چاہئے کہ اس سے کہہ دیں کہ اس چیز کو پھینک دو۔ اس کے بعد اگر وہ خود کھالے یا اپنے گھر لے جائے یہ اس کا فعل ہے۔ تم خود اس کو استعمال کے لئے مت دو۔ غرض رشوت اور سود کا مال قرض میں دینا بھی جائز نہیں۔ حدیث میں ہے لعن اللّٰہ آکل الربوا و موکلہ۔ خدا لعنت کرے سود کھانے والے پر اور کھلانے والے پر مراد دوسرے کو دینا ہے۔ چونکہ لینا دینا سبب ہو جاتا ہے۔ کھانے پینے کا اس لئے اس کو آکلہ و موکلہ سے تعبیر فرمایا۔ مقصود یہ ہے کہ سود لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت ہے۔ اس میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ سود لے کر کسی دوسرے شخص کو وہ روپیہ اپنے قرض میں دیا جائے۔ اس میں اس نے اس کو سود کا روپیہ دیا ایک گناہ تو یہ ہوا۔ اس سے بڑھ کر ایک اور گناہ کا مرتکب ہوا۔ وہ یہ کہ اکثر لوگ حرام کا روپیہ قرض میں دے کر اپنے آپ کو بری سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا ہے تاکہ اس سے توبہ کریں۔ اور اگر اس دوسرے شخص کو خبر نہیں کی کہ یہ روپیہ سود اور رشوت سے ہم نے حاصل کیا تھا جو تم کو قرض کے بدلہ میں دے رہے ہیں۔ تو دھوکہ دینے کا تیسرا گناہ اور ہوا۔ خلاصہ یہ کہ حرام کمائی

کرنے والے حج کو جاتے ہوئے جس طرح ادلہ بدلہ کرتے ہیں۔ اُس سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ مال جو بدلہ میں لیا جاتا ہے حرام کا حرام ہی رہتا ہے اور جو حیلہ فقہاء نے بیان کیا ہے اس طریقہ سے اگرچہ حج صحیح ہو جاتا ہے مگر ایک گناہ کے بدلے کئی گناہ لازم آجاتے ہیں۔ اس لئے اس کی بہت ضرورت ہے کہ حج کے لئے خالص حلال سفر خرچ لیا کریں۔

حج میں افتخار و اشتہار نہ چاہئے

ایک کوتاہی حج میں یہ ہے کہ اکثر لوگوں کو افتخار اور اشتہار کی عادت ہوتی ہے جہاں بیٹھتے ہیں۔ اپنے حج کے تذکرے کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو حاجی سمجھیں۔ لوگوں سے فخراً کہتے ہیں کہ ہم نے سفر حج میں اتنا روپیہ خرچ کیا، مکہ میں اتنا دیا، مدینہ میں اتنا خیرات کیا یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا۔ حق تعالیٰ کفار کی مذمت میں فرماتے ہیں کہ کافر خرچ کر کے گاتا پھرا کرتا ہے کہ میں نے مال کے ڈھیر خرچ کر دیئے یہ وہ معاصی ہیں کہ خشک مولوی بھی یہاں تک نہیں پہنچتے۔ حج میں افتخار اور اشتہار اور تعظیم و تکریم کی خواہش نہ ہونی چاہئے۔ اس میں تو اضع و مسکنت، ذلّت و خواری ہونی چاہئے۔ یہ سفر سفرِ آخرت کے مشابہ ہے کہ اپنے گھر بار، زمین جائداد وغیرہ کو چھوڑ کر اقربا سے رخصت ہو کر جاتا ہے اور تھوڑا سا سامان ساتھ لیتا ہے جیسا کہ مردہ سب سامان چھوڑ کر صرف کفن ساتھ لے جاتا ہے بلکہ بعض حاجی بھی اس خیال سے کہ موت ہر ایک کے ساتھ ہے نہ معلوم کس وقت موت آجائے کفن بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور عوام تو اس کو بہت ہی ضروری سمجھتے ہیں مگر افسوس ہے کہ کفن ساتھ لے کر بھی وہ کام نہیں کرتے جو کفن پہننے والے کو کرنے چاہئیں۔ جب کفن ساتھ لیا تھا۔ تو چاہئے تھا کہ اپنے آپ کو اسی وقت سے مُردہ تصوّر کرتے اور ساری شیخی اور تکبر کو یہیں چھوڑ جاتے اور پہلے سے زیادہ اعمالِ آخرت کے لئے کوشش کرتے مگر

بھی نہیں، یہ کفن ساتھ لینے کی بھی ایک رسم ہو گئی ہے ورنہ بعض لوگ سفر حج میں پہلے سے زیادہ گناہ کرنے لگتے ہیں۔ نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ جماعت کا اہتمام تو اچھے اچھے بھی نہیں کرتے اور لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔ حج کرکے اپنے کو سب سے افضل سمجھنے لگتے ہیں۔

حج کو سفر آخرت سمجھنا چاہئے

کیا سفر آخرت کی یہی شان ہونی چاہئے؟ سفر حج اس اعتبار سے بھی قبر کے مشابہ ہے کہ جس طرح قبروں میں کبھی دو آدمی پاس پاس دفن ہوتے ہیں مگر ہر اک کا جدا حال ہوتا ہے۔ کوئی راحت میں ہے کوئی عذاب میں اور ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح حج میں ایک شگفتہ ہے ایک دیگر ہے اور ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوتی ہے دوسرے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ اور جو شخص اس سفر میں دوسروں کی خدمت کرے وہ تو گویا مجاہد فی سبیل اللہ ہے بعض لوگ ایسے بیہودہ ہوتے ہیں کہ حج میں روزانہ کے واقعات قلمبند کرتے ہیں وہاں بھی ان کو مضمون نگاری سوجھتی ہے۔ اگر اس خیال سے کوئی شخص حالات قلمبند کرے کہ دوسروں کو سفر حج آسان ہو جائے گا اس کا مضائقہ نہیں مگر بعض لوگوں کو محض اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ ایک ڈپٹی کلکٹر تھے وہ ہندوستان کے اخباروں میں لکھ لکھ کر وہاں کے حالات بھیجتے تھے اور سفر کی تکالیف کو بہت مبالغہ سے لکھتے تھے تاکہ پھر کوئی حج کا نام ہی نہ لے اسی طرح ایک اور صاحب تھے وہ بھی وہاں کی شکایات جمع کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس ایک محضر لکھ کر لائے جس میں وہاں کی تکالیف کو قلمبند کیا تھا کہ اس پر دستخط کر دو۔ میں نے کہا کہ حضرت تصدیق وہ کرے جس کو ان تکالیف کی اطلاع ہو مجھ کو تو کوئی تکلیف ہی پیش نہیں۔ پھر کاہے کی تصدیق کروں بس وہ خفا ہو گئے اور کہنے لگے کہ بس ہندوستانیوں میں اتفاق نہیں سو اگر پہلے ہی سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ سفر آخرت کا سفر ہے۔ پھر کوئی بھی کلفت معلوم نہ ہو مگر آج کل تو لوگ یہ

چاہتے ہیں کہ جیسے گھر میں آرام کے ساتھ بسر کرتے ہیں ویسے ہی حج کے سفر میں ہو حالانکہ سفر میں گونہ مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے۔ دل میں اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی بھی تکلیف تکلیف نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی اسی وقت سب کلفت رفع ہو جاتی ہے اس وقت یاد بھی نہیں آتا کہ اس سے پہلے کیا کیا پیش آیا تھا۔ بس وہ حال ہوتا ہے جو جنت میں پہنچ کر جنتیوں کا ہوگا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ۔ جنتی جنت میں پہنچ کر کہیں گے کہ "خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے رنج و غم کو دور کر دیا۔ بیشک ہمارا خدا بڑا بخشنے والا قدردان ہے جس نے ہم کو ٹھکانے کے گھر میں پہنچا دیا اپنے فضل سے جس میں نہ ہم کو کوئی مشقت معلوم ہوتی ہے۔ نہ کچھ تھکن محسوس ہوتی ہے"۔ یہی حال بیت اللہ کو دیکھ کر اہل شوق کا ہوتا ہے۔ بعض لوگ سفر حج میں پریشان ہو جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شوق سے خالی ہیں اور وہ اس کو سفر آخرت نہیں سمجھتے۔ نیز جو شخص اس کو سفر آخرت سمجھتا ہوگا اس میں دعویٰ اور افتخار بھی نہ ہوگا۔ ؎

فکر خود و رائے خود در مذہب رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

کلفت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اسی لئے جب سفر میں کوئی بات اپنی شان کے خلاف پیش آتی ہے تو اس سے ناگواری پیدا ہوتی ہے پھر ایک دوسرے سے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے آپ کو مٹا دے اور عزت و آبرو کو بالائے طاق رکھ کر اپنے کو سب کا خادم سمجھے تو یہ باتیں پیش ہی نہ آئیں۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ گھر سے چلتے ہیں یہی خیال کر کے کہ ہماری یوں آؤ بھگت ہوگی

ہم جب لوٹیں گے لوگ ہم کو حج کی مبارکباد دینے آئیں گے اور جو مبارکباد دینے نہ آئے اس کی شکایت کی جاتی ہے کہ ہم حج کر کے آئے تھے ہم کو مبارکباد بھی نہ دی۔ اناللہ۔ ارے بھائی تم نے حج کیا تھا تو کیا کمال کیا۔ تمہارے ذمہ فرض تھا۔ اگر ادا نہ کرتے تو جہنم میں جھونکے جاتے اور نہ معلوم خاتمہ کس حال پر ہوتا۔

حج نہ کرنے پر وعید

کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوا اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو خدا کو پروا نہیں چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ تو اگر تم حج نہ کرتے ان بلاؤں میں گرفتار ہوتے۔ پھر کسی پر کیا احسان کیا جو دوسروں سے مبارکباد ملنے کے منتظر ہو۔ یاد رکھو اس اشتہار اور افتخار سے سب کی کرائی محنت اکارت ہو جاتی ہے یہ وہ معاصی تھے جو زمانہ حج سے پہلے ہوتے ہیں اور زمانہ حج کے قبل سے مراد وہ وقت ہے جو احرام باندھنے سے پہلے ہو۔

حج میں محظورات احرام سے بچنا چاہئے

باقی حج کے زمانہ میں جو گناہ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ محظورات احرام کا ارتکاب کیا جائے یعنی جو باتیں حج میں ممنوع ہیں ان کو کیا جائے۔ مثلاً حج میں مردوں کو سر ڈھانکنا حرام ہے۔ عورتوں کو چہرہ پر کپڑا ڈالنا ناجائز ہے احرام الرجل فی رأسه واحرام المرأة فی وجهها۔

احرام المرأة فی وجهها سے پردہ کے تاکد پر استدلال

مگر اس سے یہ استنباط نہیں ہو سکتا کہ پردہ عورتوں کو نہ کرنا چاہئے بلکہ اس سے تو اور پردہ کے تاکد پر استدلال ہوتا ہے کہ عورت کو ساری عمر چہرہ کا ڈھانکنا ضروری ہے صرف حج میں اس کو منہ کھولنا چاہئے سو اگر یہ حج کی خصوصیت نہ ہوتی تو احرام المرأة فی وجهها کے معنی کچھ نہیں ہوں گے۔ اگر عورت کو

سے کیا معنی کہ عورت کا احرام چہرہ میں ہے ساری عمر چہرہ کا کھولنا جائز ہوتا تو اس کے کیا معنی کہ عورت کا احرام چہرہ میں ہے
اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے لئے چہرہ بہت قابلِ اہتمام ہے جیسا کہ
مردوں کو ڈھانکنے کا اہتمام ہوتا ہے سو احرام میں ان دونوں کے خلاف حکم دیا گیا کہ
مرد سر کھلا رکھیں اور عورتیں چہرہ کھلا رکھیں مگر مطلب اس کا یہ ہے کہ کپڑا چہرہ سے لگے
نہیں یہ نہیں کہ اجنبی مردوں کو چہرہ دکھلاتی پھریں پس عورتیں اپنے چہرہ پر اس طرح
کپڑا لٹکائیں کہ چہرہ سے علیحدہ رہے۔ چنانچہ اس کے لئے ایک پنکھا ایجاد ہوا ہے
جس سے چہرہ پر کپڑا نہیں لگتا۔ اس کے علاوہ اور بھی محظوراتِ احرام بہت ہیں جن کو
فقہاء نے مناسک میں بیان کیا ہے اور قافلہ میں جو لوگ اہلِ علم ہیں اُن سے وقت
پر سب باتیں معلوم ہو جائیں گی اُن سے پوچھتا رہنا چاہئے۔ پس یہ گناہ حج کے ساتھ
ہوتا ہے کہ احرام میں جو چیزیں ممنوع ہیں ان سے پرہیز نہ کیا جاوے۔

حج میں ریاء سے بچنا چاہئے ایک معصیت حج کے بعد یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ
ریاء کرتے ہیں ریاء سے اکثر طاعات کے انوار زائل
ہو جاتے ہیں ثواب جاتا رہتا ہے اس سے بہت احتیاط چاہئے۔ اور مستورات تو
خصوصاً بہت ریاء کرتی ہیں کیونکہ اُن کو ساری عمر میں ایک بار حج کے لئے گھر سے
نکلنا ہوتا ہے اس کو وہ بہت ہی بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں اور حج کے بعد اگر کوئی ان کو
حجّن نہ کہے اس پر خفا ہوتی ہیں اور وہاں سے آکر سب کے سامنے گاتی ہیں کہ ہم نے
سارے مقامات کی زیارت کی ہے۔ اگر کسی غریب نے ایک جگہ کی زیارت نہ کی ہو تو
اس سے کہتی ہیں کہ تیرا حج ہی کیا ہُوا تو جبل نور پر تو گئی ہی نہیں حالانکہ اصل مقصود
عرفات اور بیت اللہ ہے۔ پھر بیت الرسول مگر ان کی زیارت تو ہر شخص کرتا ہے
اس لئے ان کو کوئی فضیلت میں بیان نہیں کرتا۔ ہاں جبل نور، غار ثور اور امیر حمزہ
کا مزار سب گناتی ہیں اور بعض لوگ صراحتہً اپنے حاجی ہونے کا اگر ذکر نہیں کرتے

تو کسی نہ کسی پیرایہ سے مخاطب کو جتلا دیتے ہیں کہ ہم حاجی ہیں۔ ایک بزرگ کسی کے یہاں مہمان ہوئے تو میزبان نے خادم سے کہا کہ اس صراحی کا پانی لانا جو ہم دوسرے حج میں ساتھ لائے تھے۔ مہمان نے کہا کہ حضرت آپ نے ایک بات میں دونوں حج کا ثواب کھو دیا اس بات میں اس نے جتلا دیا کہ میں نے دو مرتبہ حج کیا ہے یہ ریا نہیں تو اور کیا ہے۔ ریا کے طریقے بہت دقیق ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے نفس کی نگہداشت کرے تو اس کو نفس کے دقائق معلوم ہو سکتے ہیں۔ لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ حج کے بعد ہر مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ مسلمان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیئے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

ان قصوں کے لئے اسی کو فرصت ملتی ہے جس کا دل محبت الٰہی سے خالی ہوتا ہے اور جو تذکرہ نمائش و ریاء کے لئے ہو وہ تو روکنے کی قابل ہے ہی۔ محققین تو بعض اوقات ایسے تذکرہ کی بھی اجازت نہیں دیتے جو ظاہراً اطاعت معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً وہاں کے فضائل و محاسن بیان کرنا جس سے وہاں جانے کی رغبت اور شوق ہو۔

حج کا تذکرہ ہر اک سے نہ کرنا چاہیئے

چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر شخص کے سامنے حج کی باتیں کرنا جائز نہیں کیونکہ تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر حج فرض ہے سو ایسے شخص کے سامنے تو ترغیبی مضامین بیان کرنا جائز بلکہ مستحب ہے کہ دلالت علی الخیر ہے۔ دوسرے وہ جن پر نہ فرض اور نہ ممنوع ان کے روبرو بھی بیان کرنا جائز ہے۔ تیسرے وہ جن پر حج فرض نہیں ہے اور ان کو جانا جائز نہیں اس وجہ سے کہ نہ مالی استطاعت ہے اور نہ مشقت پر صبر و تحمل ہو سکے ان کے سامنے تشویق اور ترغیب کے قصے اور مضامین بیان کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے ان کو حج کا شوق پیدا ہوگا اور سامان ہے نہیں نہ ظاہری نہ باطنی تو خوامخواہ دقت اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے جس سے

ناجائز امور کے ارتکاب کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کے سامنے حج کی ترغیب اور تشویق کے مضامین بیان کرنا جائز نہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پر لوگوں نے امام غزالیؒ کی تکفیر پر فتوے دئیے۔ ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کی ترغیب سے لوگوں کو منع کرتے ہیں مگر حاشا وکلا ان لوگوں نے امام کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا اور حج کی ترغیب سے منع نہیں کرتے بلکہ لوگوں کو ناجائز امور میں مبتلا کرنے سے منع کرتے ہیں۔ کیونکہ نادار غیر صابر لوگوں کو ترغیب دینے کا یہی انجام ہوگا۔

ایک کوتاہی بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حج سے آکر وہاں کی تکلیف کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرنا چاہئیں۔ چاہے وہ واقعی کلفتیں ہوں اور اگر وہ واقعی کلفتوں میں اضافہ کرکے بیان کیا جائے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے۔ وہاں کی کلفتیں بیان کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ حج سے رک جاتے ہیں۔ اس کا سارا وبال ان لوگوں پر ہوتا ہے جنہوں نے ان کو ڈرایا ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو وہاں کی تکالیف بیان کرکے ڈرانا اور مَنّاعِ خیر بننا یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ میں داخل ہے یا نہیں۔

یاد رکھئے کہ حج کے مقبول ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دوبارہ پھر وہاں جانے کا شوق دل میں پیدا ہو۔ اور جو شخص وہاں سے آکر پھر دوبارہ جانے سے توبہ کرلے۔ اندیشہ ہے کہ اس کا حج مقبول نہ ہُوا ہو۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے اس کی کوشش کرے کہ دل میں پھر دوبارہ حج کا شوق پیدا ہو اس کی یہی تدبیر ہے کہ وہاں کے ثواب اور منافعِ اخروی پر نظر کرے اور یہ سمجھ لے کہ جنّت میں جو درجات حج کی وجہ سے نصیب ہوں گے ان کے سامنے یہ تکالیف کیا ہیں۔ ان جیسی ہزار بھی کلفتیں ہوں تو کچھ نہیں اور حج میں علاوہ ثواب آخرت کے دنیا کا بھی تو نفع ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ حج کے بعد ضرور رزق میں فراخی ہوجاتی ہے۔ پھر وسعت اور فراخی رزق کے

لئے لوگ کیسی کیسی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ اگر ذرا سی وہاں بھی تکلیف پیش آگئی تو اس کی وجہ سے پریشان ہونا اور دوسروں کو پریشان کرنا اور حج کی دولت سے محروم کرنا یہ کونسی عقل کی بات ہے۔ نیز حج سے اخلاق کی تہذیب پر خاص اثر پڑتا ہے اور اگر کوئی حاجی اس کے خلاف پایا جاوے تو وہ ایک عارض کے سبب سے ہے

حج مقبول ہونے کی علامت وہ یہ کہ علماء محققین نے لکھا ہے کہ حجر اسود میں کسوٹی کی خاصیت ہے یعنی اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے استلام کے بعد جیسا شخص ہوتا ہے وہ اپنی اصل خلقت میں ظاہر ہو جاتا ہے بعض لوگ حج سے پہلے معلوم نہیں ہوتے کہ یہ اندر سے کیسے ہیں مگر حج کے بعد چھپا رہنا مشکل ہے۔ اصلی حالت ضرور کھل جاتی ہے پس جس کی حالت حج کے بعد پہلے سے اچھی ہو جائے سمجھنا چاہیئے کہ اس کا حج قبول ہوا اور جس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے اس کے حج قبول نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ شاید اس سے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ پھر حج نہ کرنا چاہیئے تاکہ قلعی نہ کھلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حج نہ کرنے میں اس سے زیادہ اندیشہ ہے جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ حدیث میں وارد ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوا اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو خدا کو پروا نہیں ہے خواہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔ پس اگر حج نہ کیا تب تو سوء خاتمہ کا اندیشہ زیادہ ہے اور حج کرنے میں تو صرف یہی اندیشہ ہے کہ قلعی کھل جائے گی وہ بھی اس وقت جبکہ اس کے آداب شرائط کا لحاظ نہ کیا جائے۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ شوق اور محبت کے ساتھ جو حج ادا کیا جاتا ہے اس سے دینداری میں ترقی ہی ہو جاتی ہے۔ پس یہ اشکال فضول ہے حج ضرور کرنا چاہیئے اور جو شخص حج میں احتیاط نہیں کرتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار بد پرہیزی کرتا ہے اور جو احتیاط کے ساتھ حج کرتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بیمار کو تنقیہ و ازالہ کی ضرورت ہے اور وہ پوری تدبیر پر عمل کرتا ہے اور پورا پرہیز کرتا ہے۔

اور اسی سے سب موادِ رذیلہ کا تنقیہ ہو جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حج کے بعد پھر علاج کی اور تدبیر کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ جس طرح مسہل کے بعد ہی تو اندہ مواد خبیثہ کی پیدا نہ ہونے دینے کی اور جو تھوڑا بہت پیدا ہو جاوے اس کے تنقیہ کی ضرورت رہتی ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ حج کے بعد بھی ہمیشہ احتیاط کی ضرورت ہے مگر حج میں احتیاط ہونا اسی وقت ممکن ہے جب حج سے پہلے نفس کی اصلاح کر لی جائے ورنہ بالخصوص جھگڑے اور فساد کی ضرور نوبت آجائے گی۔ نیز نماز وغیرہ میں بھی ممکن ہے کہ سفر کی وجہ سے سستی ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سفر کی تکالیف کی وجہ سے شوق اور محبت میں کمی ہو جائے۔ اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ حج سے پہلے اصلاحِ نفس کا اہتمام کیا جائے مگر یہ سمجھ لو کہ نفس کی اصلاح خود اپنے آپ نہیں ہو سکتی۔ اپنی عقل اور فہم اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی مربیِ کامل سے اس کا طریقہ پوچھو ؎

کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ نہ کرنا چاہئے اس میں ضرورت ہے عنایت و عنایاتِ خاصانِ حق کی۔ ؎

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

طریقِ اصلاح میں اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اپنے آپ کو خاصانِ حق کے سپرد کر دو اور اُن کا اتباع اختیار کرو۔ ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

اس میں اپنے ارادے اور اختیار کے فنا کرنے کی ضرورت ہے پستی و شکستگی کی حاجت ہے۔ ؎

ہر کجا پستی است آب آنجا رود
و ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا درد سے دوا آنجا رود　　　　ہر کجا انجے شفا آنجا رود

طلب اور درد اور شکستگی حاصل کرنا چاہئے۔ اب تو یہ حال ہے کہ جو بزرگ سمجھے جاتے ہیں شکستگی انہیں بھی نہیں۔ سب طرارے یہیں چھوڑ دو۔ حج میں تو سب اپنے کمالات کو گم کر دینا چاہیئے۔ حج میں طرارے سے کام لینا نہ چاہئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قبلِ حج ہی اپنے ملکات رذیلہ کو نکالو۔ اور نفس کی اصلاح کرو۔ اب یہ سوال باقی رہا کہ اب تو حج کو جا رہے ہیں۔ اب قبلِ حج یہ مسہل کیسے ہو تو میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ قبلِ حج کامل بن جاؤ۔ کیونکہ کمال ایک دن یا ایک ہفتہ میں حاصل ہونا عادۃً دشوار ہے۔ ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　　　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

میرا مقصود یہ ہے کہ اس وقت سے اس کی فکر میں تو لگ جائیے وہ بھی اثر میں مثل اصلاح ہی کے لئے ہے۔ جیسا قرآن میں یہ حکم نازل ہوا۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کہ خدا سے ایسا ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے تو صحابہ گھبرا گئے۔ اور گھبرا کیوں گئے۔ میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ وہ اس واسطے گھبرا گئے کہ صیغۂ امر اصل میں موضوع ہے وجوب کے لئے اور اگرچہ مطلق امر کے واسطے فور ضروری نہیں مگر فور متبادر ضرور ہے۔ ہاں اگر وہ فعل یقینی طور پر تدریجی ہو تو وہاں فور متبادر نہیں ہوتا ورنہ عموماً امر سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ کام ابھی فوراً کیا جائے۔ پس اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ سے صحابہ یہ سمجھے کہ ہم کو اسی وقت کامل تقویٰ اختیار کرنا چاہیئے اس لئے گھبرا گئے تو پھر یہ حکم نازل ہوا۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کہ جتنا مرتبہ تقویٰ کا اس وقت ہو سکے اتنا اس وقت اختیار کر لو۔ اس میں کوتاہی نہ کرو۔ پھر بتدریج دوسرے مراتب میں بقدر استطاعت ترقی کرتے رہو۔ پس یہ آیت پہلے حکم کے لئے محققین کے نزدیک ناسخ نہیں بلکہ اس کا بیان ہے یعنی مطلوب تو وہی ہے کہ کامل تقویٰ اختیار کرو۔ مگر اس کا طریقہ یہ

ہے کہ اوّل اوّل جتنا ہو سکے اس کو پورا کرو اس میں کوتاہی نہ کرو۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جائے گی اور ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ تم متقی بن جاؤ گے۔ اور یہ تدریج اعمالِ تقویٰ کے اعتبار سے نہیں وہ تو ایک دم سے واجب العمل ہیں بلکہ ضعف و قوتِ مراتب کے اعتبار سے ہے۔ اب اس اشکال کا جواب ہوگیا۔ یعنی اسی وقت سے اُن ملکاتِ رذیلہ کے ازالہ کی فکر شروع کردو۔ بے فکری میں مت رہو۔ اس وقت اگر آپ کے قبضہ میں یہ بات نہیں ہے کہ ملکاتِ رذیلہ کو بالکل زائل کردیں تو یہ بات تو اختیار میں ہے کہ اس کے مقتضا پر عمل نہ کرو۔ جب بار بار نفس کے تقاضوں کے خلاف عمل کیا جائے گا تو اس کی عادت پڑ جائے گی اور ضبط کی عادت سے ملکاتِ رذیلہ کی قوت مضمحل ہو جائے گی اور اضمحلال سے پھر ان میں اتنی کمزوری ہو جائے گی کہ گویا وہ ملکات ہیں ہی نہیں۔ اس طرح سے آپ انشاء اللہ کامل ہو جائیں گے اور اخلاقِ رذیلہ کی بجائے آپ میں ملکاتِ فاضلہ پیدا ہو جائیں گے۔ لہٰذا حج کے سفر میں فکر اور سعی ضرور شروع کر دیجئے۔ جب آپ نے اس نیت سے فکر شروع کر دی تو آپ بھی انھی لوگوں میں شمار ہوں گے جو کامل متقی ہیں کیونکہ اہلِ کمال بھی اسی طرح اہلِ کمال بنتے ہیں۔ ایک دن میں کوئی کامل نہیں ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ کمال کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے اور نہ انسان اس کا مکلف ہے۔ انسان کا کام طلب اور فکر اور سعی ہے۔ اگر طلب کے ساتھ ساری عمر بھی ناقص رہے تو وہ انشاء اللہ کاملین ہی کے برابر ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ بعض باتوں میں کاملین سے بھی بڑھ جائے۔ یعنی مشقت کے ثواب میں۔ بس اس طریق میں فکر اور دھن بڑی چیز ہے۔ اس سے سب کام بن جاتے ہیں۔ ؎

دوست دارد دوست این آشفتگی | کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی
اندریں رہ می تراش و می خراش | تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود | کہ عنایت با تو صاحب سر بود

بس فکر اور دھن میں لگا رہنا چاہیئے انشاء اللہ پھر آپ کا حج مردانہ ہو جائے گا۔

جس کو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

حج زیارت کردن خانہ بود　　حج رب البیت مردانہ بود

اور یہ حج رب البیت ہر شخص پر فرض ہے۔ گو حج البیت بھی اس شخص پر فرض نہ ہو کیونکہ حج رب البیت کی معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف چلنا اس کی طلب اور دھن میں لگنا۔ سو اس کے لئے کعبہ اور مکہ بھی شرط نہیں۔ اسی کو عارف مسعود بک فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید
معشوق دریں جاست بیائید بیائید

مگر قوم بحج رفتہ سے مراد سب حجاج نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن پر حج فرض نہیں اور ابھی تک انہوں نے نفس کی اصلاح بھی نہیں کی اور حج کو جانے سے اُن کو بعض ایسی مضرتیں پہنچنا بھی محتمل ہے ان کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم پر حج تو فرض ہے نہیں اور نفس کی اصلاح فرض ہے۔ تم حج کرنے کہاں چلے تم کو پہلے شیخ کی صحبت میں رہنا چاہئے۔ تمہارا مطلوب یہاں ہے۔ اور جن پر حج فرض ہے ان کو یہ خطاب نہیں ہو سکتا کہ تم حج کرنے مت جاؤ۔ شیخ کے پاس رہو۔ کیونکہ جس پر حج فرض ہے اس کو خدا کا حکم ہے کہ پہلے حج سے فارغ ہو اس کے لئے بدون حج کے مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ترکِ حج کے گناہ کی وجہ سے کمال سے رہ جائے گا۔ کمال یہی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کو پورا کیا جائے تو جس پر حج فرض ہے اس کو حج ضرور کرنا چاہئے۔ پھر کسی شیخ کی صحبت میں وہاں سے آکر رہے۔ لیکن حج کے ساتھ جن احکام کا شریعت نے حکم کیا ہے ان کو بجالانا بھی ہر حاجی کے ذمہ فرض ہے۔ پس اگر وہ حج سے پہلے کامل نہیں بن سکتے تو کم از کم فکر اور سعی تو ابھی سے شروع کر دیں۔ اس طریقہ سے اُمید ہے کہ انشاء اللہ اجر میں کاملین کی برابر ہو جاویں گے۔ لیجئے اب تو بہت سہل نسخہ معلوم ہو گیا۔ اب بھی اگر کوئی اپنے حج کو کامل نہ کرے تو وہ جانے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم کی

توفیق دے۔ اے اللہ سب حجاج کو حج مردانہ نصیب فرمائے اور سب کی کوشش مقبول ہو اور ان کے لئے حج کو آئندہ اصلاح اور کمال کا ذریعہ بنا دیجئے۔ آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

وعظ الحج المبرور
(ملخصاً)

قربانی

قربانی جس شخص پر زکوٰۃ فرض ہے، اس پر قربانی کرنا واجب ہے اور اس کا بیان کہ زکوٰۃ کس پر فرض ہوتی ہے زکوٰۃ کے بیان کے اخیر حصے کے پہلے مضمون میں گزر چکا ہے اور بعضے ایسے شخص پر بھی واجب ہے جس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اس کو کسی عالم سے زبانی پوچھ لے اور جس پر قربانی واجب نہ ہو، اگر وہ بھی کرے یا اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے بھی کرے تو اس کو بھی بہت ثواب ملتا ہے۔ اور اگر کسی مرے ہوئے کی طرف سے کرے تو اس مرے ہوئے کو بھی بہت ثواب ملتا ہے۔ اب اس کے متعلق آیتیں اور حدیثیں لکھی جاتی ہیں۔

آیات: فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کے لیے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر (یعنی گائے، اُونٹ، بکری، بھیڑ پر) اللہ کا نام لیں جو اس نے

ان کو حلال فرمانے تھے (اور یہ وہ جانور ہیں جن کا ذکر دوسری آیت میں ہے) ان کے کھانے کے حلال ہونے کے اس طرح آیا ہے کہ (آٹھ نر و مادہ یعنی بھیڑ میں دو قسم یعنی نر و مادہ اور دنبہ دنبی بھی آگیا، اور بکری میں وہی دو قسم اور اونٹ میں وہی دو قسم اور گائے میں وہی دو قسم اور گائے میں بھینس بھی آگئی) (سورۂ انعام) پھر ارشاد ہے) اور قربانی کے اونٹ اور گائے کو ہم نے اللہ کے دین کی یادگار بنایا ہے (کہ ان کی قربانی سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور دین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے اور اس حکمت کے علاوہ) ان جانوروں میں تمہارے اور بھی فائدے ہیں (مثلاً دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا اور اُخروی فائدہ ثواب) (پھر ارشاد ہے) اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے، اور نہ اُن کا خون، لیکن ان کے پاس تمہارا تقویٰ (اور اخلاص) پہنچتا ہے۔ (پھر ارشاد ہے) اور اخلاص والوں کو خوشخبری سُنا دیجیے۔ (حج)

ف (۱) اس سے معلوم ہُوا کہ قربانی پہلی اُمتوں پر بھی تھی۔

ف (۲) اگرچہ بکری بھیڑ بھی قربانی کے جانور ہیں، اور اس لیے وہ بھی دین کی یادگار ہیں مگر آیت میں خاص اُونٹ اور گائے کا ذکر فرمانا اس لیے ہے کہ ان کی قربانی بھیڑ بکری کی قربانی سے افضل ہے، اور اگر پوری گائے یا اونٹ نہ ہو بلکہ اس کا ساتواں حصہ قربانی میں لے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ یہ ساتواں حصہ اور پوری بکری یا بھیڑ قیمت اور گوشت کی مقدار میں برابر ہوں تو جس کا گوشت عمدہ ہو، وہی افضل ہے اور اگر قیمت اور گوشت میں برابر نہ ہوں تو جو زیادہ ہو وہ افضل ہے۔ (شامی از تاتارخانیہ)

ف (۳) قربانی میں اخلاص یہ ہے کہ خاص حق تعالیٰ کے لیے اور اس سے ثواب لینے کے لیے کرے۔

(۲) آپ اپنے پروردگار کی نماز پڑھیے، اور قربانی کیجیے۔ (کوثر)

ف۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہُوا ہے، جب آپ کو اس کی تاکید ہے تو ہم کو کیسے معاف ہوگی، جیسے اس کے ساتھ کی چیز ہے یعنی نماز، کہ اُمّت پر بھی فرض ہے۔

(احادیث ۳) حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قربانی کے دن میں آدمی کا کوئی عمل اللہ کے نزدیک قربانی کرنے سے زیادہ پیارا نہیں اور قربانی کا جانور قیامت کے دن مع اپنے سینگوں اور اپنے بالوں اور کھروں کے حاضر ہوگا (یعنی ان سب چیزوں کے بدلے ثواب ملے گا) اور (قربانی) کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک خاص درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ سو تم لوگ جی خوش کر کے قربانی کرو (زیادہ داموں کے خرچ ہو جانے پر جی برا مت کیا کرو!) (ابن ماجہ وترمذی وحاکم)

(۴) حضرت زید بن ارقم سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قربانی کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہارے (نسبی یا روحانی) باپ ابراہیمؑ کا طریقہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہم کو اس میں کیا ملتا ہے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا ہر بال کے بدلے ایک نیکی! انہوں نے عرض کیا کہ اگر اون (والا جانور) ہو؟ آپ نے فرمایا کہ ہر اون کے بدلے بھی ایک نیکی۔ (حاکم)

(۵) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے فاطمہؓ اٹھو اور (ذبح کے وقت) اپنی قربانی کے پاس موجود رہ! کیونکہ پہلا قطرہ جو قربانی کا زمین پر گرتا ہے اس کے ساتھ ہی تیرے لیے تمام گناہوں کی مغفرت ہو جائے گی (اور) یاد رکھ کہ (قیامت کے دن) اس (قربانی) کا خون اور گوشت لایا جائے گا اور تیری میزان (عمل) میں ستر حصے بڑھا کر رکھ دیا جاوے گا (اور ان سب کے بدلے نیکیاں دی جاویں گی) ابو سعیدؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ (ثواب مذکور) کیا خاص آل محمدؐ کے لیے ہے؟ کیونکہ وہ اس کے لائق بھی ہیں کہ کسی چیز کے ساتھ خاص کیے جائیں یا آل محمدؐ اور سب مسلمانوں کے لیے عام طور پر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آل محمدؐ کے لیے (ایک طرح سے) خاص بھی ہے، اور سب مسلمانوں کے لیے عام طور پر بھی ہے۔ (اصبہانی)

ف۔ ایک طرح سے خاص ہونے کا مطلب ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا قرآن مجید

ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لیے فرمایا ہے کہ نیک کام کا ثواب بھی اوروں سے دُونا ہے اور گناہ کا عذاب بھی دُونا ہے۔ سو قرآن مجید سے آپ کی بیبیوں کے لیے اور اس حدیث سے آپ کی اولاد کے لیے بھی یہ قانون ثابت ہوتا ہے اور اس کی بنا پر زیادہ بزرگی ہے۔

(۶) حضرت حسین بن علی رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس طرح قربانی کرے کہ اس کا دل خوش ہو اور اپنی قربانی میں ثواب کی نیت رکھتا ہو، وہ قربانی اس شخص کے لیے دوزخ سے آڑ ہو جائے گی۔ (طبرانی کبیر)

(۷) حضرت ابوہریرہ رضی سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قربانی کرنے کی گنجائش رکھے اور قربانی نہ کرے .... سو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آوے۔ (حاکم)

ف۔ اس سے کس قدر ناراضی ٹپکتی ہے! کیا کوئی مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کی سہار کر سکتا ہے؟ اور یہ ناراضی اسی سے ہے جس کے ذمے قربانی واجب ہو اور جس کو گنجائش نہ ہو، اس کے لیے نہیں۔ یہ حدیثیں ترغیب میں ہیں۔

(۸) حضرت جابر رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں اپنی بیبیوں کی طرف سے ایک گائے کی قربانی کی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے بقرعید کے دن حضرت عائشہ رضی کی طرف سے گائے کی قربانی کی۔ (مسلم)

ف۔ یہ ضرور نہیں کہ ایک گائے سب بیبیوں کی طرف سے کی ہو بلکہ ممکن ہے کہ سات کے اندر اندر کی ہو اور اونٹ بکری کثرت سے ملتے ہوئے گائے کی قربانی فرمانا اگر اتفاقی طور پر نہ سمجھا جاوے تو ممکن ہے کہ یہود جو بچھڑے کو پوجا کرتے تھے، اس شرک کے مٹانے کے لیے آپ ؐ نے اس کا اہتمام فرمایا ہو۔ اور بعضی روایتوں میں جو گائے کے گوشت کا مرض (یعنی مضر) ہونا آیا ہے وہ شرعی حکم نہیں ہے بطور پرہیز کے ہے جیسا کہ

روح دہم (۹) میں حضرت علیؓ کو مجبور کھانے سے ممانعت فرمانے کا مضمون گزر چکا ہے چنانچہ حلیمی نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حجاز خشک ملک ہے اور گائے کا گوشت بھی خشک ہے (مقاصد حسنۃ فی علیکم و فی احوم البقر) اور مقاصد والے نے کہا ہے کہ گویا یہ حجاز والوں کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ معنی پسند کیے گئے ہیں یعنی سب علماء نے اس کو پسند کیا ہے۔

(۹) حضرت حنشؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ دو دُنبے قربانی کیے، اور فرمایا ان میں ایک میری طرف سے ہے اور دُوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ میں نے ان سے (اس کے متعلق) گفتگو کی انہوں نے فرمایا کہ حضور صلعم نے مجھ کو اس کا حکم دیا ہے میں اس کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ (ابوداؤد و ترمذی)

ف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا حق ہے، اگر ہم ہر سال حضورؐ کی طرف سے بھی ایک حصہ کر دیا کریں تو کوئی بڑی بات نہیں۔

(۱۰) حضرت ابو طلحہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دُنبہ کی اپنی طرف سے قربانی کی اور) دوسرے دنبہ کے ذبح میں فرمایا کہ یہ (قربانی) اس کی طرف سے ہے جو میری اُمت میں سے مجھ پر ایمان لایا اور جس نے میری تصدیق کی (موصلی و کبیر و اوسط) یہ حدیثیں جمع الفوائد میں ہیں۔

ف (۱) مطلب حضور صلعم کا اپنی اُمت کو ثواب میں شامل کرنا تھا، نہ یہ کہ قربانی سب کی طرف سے ایسی طرح ہو گئی کہ اب کسی کے ذمے قربانی نہیں رہی۔

ف (۲) غور کرنے کی بات ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی میں اُمت کو یاد رکھا تو افسوس ہے کہ اُمتی حضور صلعم کو یاد نہ رکھیں اور ایک حصہ بھی آپؐ کی طرف سے نہ کریں۔

(۱۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی

قربانیوں کو خوب قوی کیا کرو (یعنی کھلا پلا کر) کیونکہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی۔ (کنز العمال عن ابی ہریرۃؓ)

ف۔ عالموں نے سواریاں ہونے کے دو مطلب بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ قربانی کے جانور خود سواریاں ہو جاویں گے اور اگر کئی جانور قربانی کیے ہوں یا تو سب کے بدلے میں ایک بہت اچھی سواری مل جاوے گی، اور یا ایک ایک منزل میں ایک ایک جانور پر سواری کریں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قربانیوں کی برکت سے پل صراط پر چلنا ایسا آسان ہو جائے گا جیسے گویا خود ان پر سوار ہو کر پار ہو گئے اور کنز العمال میں ایک حدیث اس مضمون کی یہ ہے کہ سب سے افضل قربانی وہ ہے جو اعلیٰ درجے کی ہو اور خوب موٹی ہو (احم ک عن رجل) اور ایک حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پیاری وہ ہے جو اعلیٰ درجے کی ہو اور خوب موٹی ہو۔ (اھق عن رجل) (والضعف غیر مضر فی الفضائل لاسیما بعد الجبارۃ بتعدد الطرق)

قربانی سے روکنے کا مسئلہ

بعضے ظالم لوگ قربانی کرنے پر خاص کر گائے کی قربانی پر مسلمانوں سے لڑائی جھگڑا کرتے ہیں اور کبھی عین قربانی کے وقت مسلمانوں پر چڑھ آتے ہیں اور قربانی جو کہ ان کا حق جائز بلکہ واجب ہے اس کے چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں، جو سراسر ان کی زیادتی ہے۔ اور چونکہ اُوپر آیتوں اور حدیثوں میں خاص گائے کا حلال ہونا، اور اس کی قربانی کی فضیلت اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا گائے کی قربانی فرمانا بھی مذکور ہے، اس لیے مسلمان اس مذہبی دست اندازی کو گوارا نہیں کرتے اور اپنی جان دے دیتے ہیں جس میں وہ بالکل بے قصور ہیں سو اس کے متعلق مسئلہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح ایسی مضبوطی کرنا جائز ہے،[1] اگر کہیں ایسی مضبوطی کرنا خلافِ مصلحت ہو تو شرع سے

---

[1] مجمع البحار مادۃ فرۃ ۱۲

[2] دلیلہ ما فی کتاب الاکراہ من الدر المختار فان اکرہ علی اکل میتۃ (باقی صفحہ اگلے پر)

دوسری بات بھی جائز ہے وہ یہ کہ اس وقت صبر کریں اور قربانی نہ کریں اور فوراً حکام کو اطلاع کر کے ان سے مدد لیں۔ اگر قربانی کی مدت میں یعنی بارہ تاریخ تک اس کا کافی انتظام کر دیا جائے، قربانی کر لیں اور اگر اس کے بعد انتظام ہو تو اگلے سال سے قربانی کریں اور اس سال قربانی کے حصہ کی قیمت محتاجوں کو دے دیں اور اگر پہلے سے معلوم ہو جائے کہ جھگڑا ہوگا تو اس وقت وہ طریقہ اختیار کریں جو روحِ دہم میں لکھا گیا ہے، اس کا یہ مضمون ہے کہ اگر کسی مخالف کی طرف سے کوئی شورش ظاہر ہو تو حکام کے ذریعے سے اس کی مدافعت کرو، خواہ وہ خود انتظام کر دیں، خواہ تم کو انتظام کی اجازت دے دیں اور اگر خود حکام ہی کی طرف سے کوئی ناگوار واقعہ پیش آوے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو اگر پھر بھی حسب مرضی انتظام نہ ہو تو صبر کرو، اور عمل سے یا زبان سے یا قلم سے مقابلہ مت کرو، اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ تمہاری مصیبت دور ہو اور اگر کہیں ظالم لوگ چھوڑ دینے پر نہ مانیں اور جان ہی لینے پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو مقابلے پر مضبوط ہو جانا ہر حال میں فرض[1] ہے۔ گو کمزور ہی ہوں۔ خلاصہ یہ کہ حتی الامکان فتنہ و فساد کو امن کے ساتھ دفع کریں اور جو کوئی اس پر بھی سر ہی ہو جائے تو پھر مرتا کیا نہ کرتا۔ بقول سعدیؒ ؎

چو دست از ہمہ حیلتے در گسست | حلال ست بردن بشمشیر دست

اگر صلح خواہد عدو سر مپیچ
وگر جنگ جوید عناں بر مپیچ

(حیوٰۃ المسلمین)

(بقیہ حاشیہ) الیٰ قولہ حل الفعل فان صبرا ثم الا اذا اراد مغایظۃ الکفار فلا باس و کذا لولم یعلم الاباحۃ بالاکراہ وفیہ وان اکرہ علی الکفر الیٰ قولہ یوجر لو صبر ومثلہ سائر حقوقہ تعالیٰ کافساد صوم وصلوٰۃ وکل ما ثبت فرضیۃ بالکتب اہ قلت وسائر الشعائر عامۃ اصلیۃ کانت او خاصۃ لعارض ملحقۃ بالصوم والصلوٰۃ فافہم ۱۲۔

[1] وھذا من باب الصائل حیث یفرض علینا ذھب العر[illegible] ولا مرساد الاکراہ ۱۲۔

باب سوم

عِلم و عُلماء

فصل (۱) عِلمِ دین کی عظمت و اہمیّت

فصل (۲) اہتمامِ حفاظتِ دین

فصل (۳) علمائے دین کا وقار

فصل (۱)

علمِ دین کی عظمت و اہمیت

حقیقت علمِ دین

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ۔ اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر کان ہی لگاتا ہو۔"

اس سے پہلی آیت میں امتوں کے ہلاک کرنے کی خبر دی ہے۔ فِیْ ذٰلِکَ کا اشارہ مذکور قصّہ کی طرف ہے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ نہ من حیث القصہ ہے بلکہ بحیثیت اس قصّہ کے جزوِ قرآن ہونے کے ہے جس کا یہ حاصل ہوا کہ اس جزوِ قرآن سے نفع کس کو حاصل ہوگا۔ جس پر مَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ (جس کے پاس دل ہو) صادق ہو تو ذٰلِکَ سے مراد کل قرآن ہوا۔ قرآن سے مراد میری صرف لکھا ہوا قرآن نہیں ہے، جس کی تلاوت کی جاتی ہے بلکہ مراد وہ چیز ہے جس کے لیے قرآن اترا ہے جس کے لیے جامع لفظ دین ہے جس کے بہت سے اجزاء ہیں جیسے عقائد، اعمال، معاشرت، معاملات، اخلاق۔ یہ وہ سب اجزاء ہیں جن کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں۔ تصوّف بھی انہیں میں داخل ہے کیونکہ تصوّف کی تعریف گیروا کپڑے پہن لینا یا تعویذ گنڈے کرنا یا کشف و کرامات نہیں ہے بلکہ تصوّف کی تعریف ہے تعمیر الظاھر والباطن۔ اس تعریف کی بناء پر اس کا دین ہونا ظاہر ہے۔ غرض دین ایک جامع لفظ ہے جس جزو کو لیجیے قرآن ہی میں داخل ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن سننے والوں کے محاورات میں نازل ہوا ہے۔ یہاں دو صفت ہیں۔

قلب کی علم اور عزم، جب دونوں موجود ہوں گی تب کہا جائے گا کہ اس پر لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ صادق ہے جس فن میں گفتگو ہوتی ہے اس کی اصطلاحیں بولی جاتی ہیں دین بھی ایک فن ہے اس کے متعلق بھی کچھ اصطلاحات ہیں ان میں سے ایک لفظ علم بھی ہے دین میں اس سے مراد علمِ دین ہے۔ علمِ دین کا معلوم حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور احکام ہیں۔ تمام علمِ دین کا خلاصہ یہی ہے۔ قلب کے لیے دو صفت ہیں ایک علم جس کا علمِ دین کے ساتھ خاص ہو جانا ثابت ہو چکا ہے۔ دوسری صفت عزم ہے تو انتفاع بالقرآن کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ دین کا علم ہو اور دوسری اس پر عمل کرنے کا پختہ قصد ہو۔
(وعظ: دنیا و آخرت)

دین کی اہمیت

۱۔ بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ علمِ دین کا تعلق صرف نماز روزہ سے ہے۔ اور اس کے لیے چند اردو رسائل مسائل کا یا معمولی مولوی کا وجود کافی ہے۔ جس کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اور وجہ اس سمجھنے کی یہ ہے کہ اصل میں ان صاحبوں کو یہی خبر نہیں کہ دین کے کیا کیا اجزا ہیں۔ اس لیے دین کو صرف روزہ نماز میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور اول غلطی یہی ہے۔ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ دین کے اجزاء کلیہ پانچ ہیں۔ عقائد[1]، عبادات[2]، معاملات[3]، معاشرت[4]، تہذیب[5] و اخلاق تربیت نفس۔ چنانچہ دلیل و تفصیل اس دعوے کی میرے رسالہ تعلیم الدین کے خطبہ میں موجود ہیں۔ (اور یہ رسالہ انہی پانچ جزو کی مختصر شرح ہے) اور جو شخص ہر وقت اپنے جمیع اقوال و افعال و احوال کو تفصیل وار دیکھتا رہے گا اور ہر جزئیے کے متعلق احکام شرعیہ کی تفتیش کی فکر میں ہوگا اس کو معلوم ہوگا کہ نہ مختصر رسالے اس کے لیے کافی ہیں اور نہ معمولی مولوی۔ اس میں کس درجہ وسعت ہے اور اس کے ماہر کس قدر قلیل ہیں۔ اور کس درجہ جماعت کی ور حاجت ہے جن کو اس کا احاطہ ضرور یہ حاصل ہو۔ پھر اس جماعت کی تیاری کے لیے کس قدر سامان اور اہتمام کی ضرورت ہے اور موجودہ سامان اس کے مقابلہ میں کتنا کم ہے

۲ــــــــــ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مولوی بننے میں اس قدر وقت صرف ہوتا ہے کہ پھر علوم معاش کے تحصیل کی گنجائش نہیں رہتی پھر اگر علوم معاش کو حاصل نہ کیا جاوے اور اولاد کو مولوی بنایا جاوے تو پھر کھائیں پئیں کہاں سے پس اس کا انجام بجز ذلت اور پریشانی کے اور کچھ نہیں ہے اس لیے مولوی بننا ذاتی و قومی ترقی کو مضر ہے ان صاحبوں سے اس میں چند غلطیاں ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ علما کے علم دین کو ضروری کہنے کے معنی یہ سمجھے کہ ہر شخص کو پورا مولوی بننا واجب ہے۔ سو خوب سمجھ لیا جائے کہ علماء کا ہرگز مقصود نہیں کیونکہ علم دین کا ضروری ہونا اور بات ہے اور پورا مولوی ہونا اور بات ہے علم دین کی دو مقداریں ہیں۔ ایک مقدار یہ کہ عقائد ضروریہ کی تصحیح کی جاوے۔ عبادات مفروضہ کے ارکان و شرائط و احکام ضروریہ معلوم ہوں۔ معاملات و معاشرات میں جن سے اکثر سابقہ پڑتا ہے ان کے ضروری احکام معلوم ہوں۔ مثلاً یہ کہ نماز کن کن صورتوں سے فاسد ہو جاتی ہے۔ کن کن صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے۔ اگر سفر پیش آوے کتنے سفر میں قصر ہے۔ اگر امام کے ساتھ پوری نماز نہ ملے تو بقیہ نماز کس صورت میں کس طرح پوری کرے۔ قضا کے کیا احکام ہیں؟ زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے۔ اور اس کے ادا میں کیا کیا شرائط ہیں؟ علیٰ ہذا حج و صوم کے احکام۔ اور یہ کہ نکاح کن کن عورتوں سے حرام ہے۔ کن الفاظ سے نکاح جاتا رہتا ہے؟ عدت و ولایت نکاح کے کیا احکام ہیں۔ رضاعت کے اثر سے کون کون رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ مبادلۂ اموال میں کیا کیا رعایت واجب ہے؟ کسی جائداد یا آدمی کی اُجرت ٹھہرانے میں کون کون صورتیں جائز ہیں، کون ناجائز ہیں؟ فیصلہ قضایا کا (اگر یہ شخص صاحب حکومت ہے) حسب قوانین شرعیہ کس طرح ہوتا ہے؟ (گو اُن کے انفاذ پر قادر نہ ہو مگر جاننا اس لیے واجب ہے کہ دوسرے فیصلوں کے حق ہونے کا اور شرعی فیصلوں کے ناحق ہونے کا اعتقاد نہ کر بیٹھے) کون کون لباس حلال ہیں کیا کیا حرام ہیں؟ نوکریاں کون جائز ہیں کون ناجائز ہیں؟ (اگرچہ بدقسمتی سے ناجائز ہی میں مبتلا ہو، مگر علم

احکام سے اس کو قبیح تو سمجھے گا اور دو جرموں کا مرتکب تو نہ ہوگا۔ ایک مباشرت فعل ناجائز دوسرے اس کو ناجائز نہ سمجھنا) ماکولات و مشروبات میں کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟ اسبابِ تفریح میں کس کا استعمال درست ہے، کس کا نادرست ہے؟ اخلاق باطنی میں محمود و مذموم کا امتیاز ہو۔ اس کے معالجہ کا طریق معلوم ہو۔ مثلاً ریاؤ کبر و غضب و حرص و طمع و ظلم وغیر ذالک کی حقیقت جانتا ہو تاکہ اپنے اندر اُن کا ہونا نہ ہونا معلوم ہو پھر بعد معلوم ہونے کے اُن کے ازالہ کی تدبیر کر سکے اور کوتاہی پر استغفار کیا کرے۔ بحسب مقدار علم کی عام طور پر ضروری ہے کیونکہ بدون ان کے جانے ہوئے اکثر اوقات معصیت اور ناخوشی حق تعالیٰ میں مبتلا ہوگا۔ ہم نے ان احکام سے ناواقف اور علوم معاش کے اعلیٰ درجے کے واقف لوگوں کو سخت غلطیاں کرتے دیکھا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ متنبہ کرنے سے بھی متنبہ نہیں ہوتے کیونکہ ان علوم سے مناسبت ہی نہیں ایسے نمازیوں کو وطن میں عارضی قیام کے طور پر آنے میں قصر کرتے دیکھا ہے زکوٰۃ چندۂ حجاز ریلوے میں دیتے ہوئے پایا ہے۔ روزہ میں سگریٹ پینے کو بعضے مفسدِ صوم نہیں سمجھتے۔ حج میں بے سیے ہوئے اور بنیان کے طور پر بُنے ہوئے کپڑے کو گو وہ پاجامہ کرتا ہی ہو پہننے کو بعضے اُمرا نے جائز سمجھا۔ حقیقی بھانجے کی دختر سے نکاح حلال جاننے والا میں نے دیکھا ہے چاندی سونے کی مبادلہ میں یا حبوب و غلّات کے معاملے میں یا ریلوے ڈاکخانہ کے قوانین میں بے احتیاطی کرنے کو کوئی بھی خلاف شریعت نہیں سمجھتا الا ماشاء اللہ۔ سرکاری نرخ پر اگرچہ مالک سواری کا راضی نہ ہو جبر کر کے کسی سے کام لینے کو بُرا سمجھنے والے شاذ و نادر ہیں نوکری اور لباس اور اسباب تفریح میں تو ایسے صاحبوں کے نزدیک کوئی جزئی ممنوع ہے ہی نہیں۔

احکامِ دین سے لاعلمی کوئی عذر نہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ احکام شریعت پوچھنے نہ چاہئیں کیونکہ معلوم ہونے پر پھر خلاف کیا تو سخت گناہ ہوگا۔

اور بلا معلوم کیے جو کوتاہی ہو جائے وہ قابل گرفت نہیں مگر یہ محض گھڑت ہے کیا نعوذ باللہ
خدا تعالیٰ ایسے بھولے ہیں کہ آپ کے بہانے میں آجائیں گے؟ اگر اللہ تعالیٰ یہ دریافت
فرمائیں کہ تم نے خبر کیوں حاصل نہیں کی تو کیا جواب دو گے؟

یہ عذر بے علمی کا جب مقبول ہو سکتا ہے جبکہ باوجود کوشش کے معلوم نہ ہو سکے
اور جب دل میں ایک بات کے متعلق شک ہے اور بتلانے والے موجود ہیں تو پھر یہ عذر
کیسے معتبر ہو سکتا ہے؟ اور ایسے باطل خیالات اور مقالات لوگوں کے ذہن اور ذہن میں
دین ہی کے باب میں آتے ہیں۔ دنیا کے معاملات میں کبھی نہیں آتے۔ چنانچہ دنیا کے حکام کو
دیکھتے ہیں کہ اگر مجرم عدم قانون کا عذر کرے تو یہ ان کے نزدیک معتبر نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی جوں چرا
نہیں کرتا۔ وہاں تو خود ہی فتویٰ لگا دیتے ہیں کہ وکیل اور بیرسٹر موجود ہیں۔ ملزم کو ان سے
دریافت کرنا چاہیے تھا۔

دو فریضے، علم اور عمل

اور یہ سمجھنا کہ جان کر گناہ کرنا زیادہ عذاب کا باعث ہے من وجہٍ
صحیح ہے مگر علی الاطلاق من کل الوجوہ غلط ہے کیونکہ مسلمان کے
ذمہ دو فرض ہیں: علم اور عمل۔ پس علم فرض کو ادا کر کے وہ ایک فرض سے تو سبکدوش ہو گیا۔
اور بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے۔ البتہ جاننے والے کا عملی گناہ، نہ جاننے والے کے عملی
گناہ سے اشد ہو گا مگر جاننے والا بے علمی کے گناہ سے محفوظ ہو گا اور جاہل بلا عذر کو بے
علمی کا گناہ بھی ہو گا۔ پس لازم ہے کہ عدم عمل کا انتظار نہ کرے بلکہ احکام دریافت کرتا رہے
جب عمل کی توفیق ہو گی اس وقت۔ یہ علم کام آئے گا۔ صاحبو! عمل میں دشواری بھی ہے مگر
دریافت کرنے میں کیا مشقت ہے؟ جس کو حرمت رشوت کا اجمالاً علم ہے اس کو ترکِ
رشوت تو بے شک دشوار ہے مگر اس کے تفصیلی مسائل پوچھنے میں کیا تکلیف ہو گی؟

اور احکام دریافت کرنے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بار بار کان میں بات پڑنے
سے عمل کی ہمت ہو جاتی ہے اور اگر بالفرض نہ ہو تو اعتقاد ہی درست ہو گیا۔ جرم کی ایک

دفعہ سے تو بچ جاؤ گے۔ اگر فرضاً ایک شخص پر کئی دفعات جرم کی قائم ہیں تو ایک کا ٹل جانا کیا غنیمت نہیں؟ اسی طرح بدعملی الگ گناہ ہے اور بے علمی مستقل گناہ اور سخت گناہ کیونکہ عقائد اعمال سے مقدم ہیں۔ پس علم حاصل کرنے سے دفعہ شدید تو ٹلی۔ ایک بدعملی کی دفعہ ہی میں سزا ہوگی۔ دونوں تو قائم نہ ہوں گی۔ (شفاء العی صفحہ ۱۰۹)

قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کا مطلب

آج کل لوگ (قرآن کے) اُردو ترجمے دیکھ دیکھ کر عالم بن گئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ بے سمجھے طوطے کی طرح رٹنے کو بے کار بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھا کر پڑھایا جائے۔ صاحبو! اس رائے میں آپ کے ساتھ میں بھی متفق ہوں کہ قرآن سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اُردو کا ترجمہ دیکھ لینا اس کا نام سمجھ کر پڑھنا نہیں بلکہ یہ اس طوطے کی طرح رٹنے سے بھی زیادہ بُرا ہے کیونکہ وہ بقول آپ کے بے کار سہی مگر مُضر تو نہیں اور یہ مضر ہے۔ کیونکہ ترجمہ دیکھ کر آدمی اپنے آپ کو عالم سمجھنے لگتا ہے اور نیم ملّا خطرۂ ایمان کا مصداق ہو جاتا ہے۔ سمجھ کر پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعلق جتنے علوم ہیں ان سب کو حاصل کیا جائے جس کے لیے دُوسرا لفظ یہ ہے کہ طالب علمی کی جائے اور مدرسہ میں باقاعدہ پڑھا جائے۔ مگر اس کو کون کرے؟ اس میں مدّت بھی صرف ہوتی ہے اور اتنی مدّت کے بعد پھر ملازمت کے لیے تعلیم کیونکر حاصل ہوگی اور عمر زیادہ ہو جانے کے بعد محکموں میں جگہ کیسے ملے گی؟ اس لیے اس کو دُوسروں پر ٹالتے ہیں۔ کہ عربی پڑھنے کے لیے دیوبند کے طالب علم ہی کافی ہیں۔ کیوں صاحب اس کو دوسروں پر کیوں ٹالتے ہو، خود سمجھ کر کیوں نہیں پڑھتے؟ اور اگر کسی کو یہ عذر ہے کہ ہم تو بڈھے ہو گئے۔ اب پڑھنا ممکن نہیں تو میں کہتا ہُوں کہ اپنی اولاد ہی کو پڑھائیے اور اس قابل بنائیے کہ قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھیں اور تمہیں سنائیں اور سمجھائیں، مگر خدارا ترجموں پر اکتفا نہ کیجیے جس کو عالم بنانا ہو باقاعدہ عالم بنائیے اور اس سے پھر آپ بھی فائدہ

حاصل کیجیے۔ اور ہر کام کا یہی قاعدہ ہے کہ اس کا ایک مرکز ہوتا ہے اور دوسرے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً سب لوگ مالدار نہیں ہوتے چند اشخاص مالدار ہوتے ہیں اور ان کے مال سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ سب کے سب نام نہاد عالم بن جائیں صحیح طریقہ یہی ہے کہ چند اشخاص باقاعدہ عالم ہوں اور دوسرے ان کے علم سے فائدہ اٹھائیں

(رجاء الغیوب صہ ۴۵) (۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ)

حجاب علم حجاب جہل سے اشد ہے

محققین کا قول ہے کہ حجاب علم حجاب جہل سے اشد ہے یہی معنی ہیں اس قول کے العلم ھو الحجاب الاکبر۔ سو اس میں ایک قید ہے جس کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ حضرت کا ارشاد ہے: العلم بغیر اللہ ھو الحجاب الاکبر۔ جس علم میں غیر اللہ کی طرف التفات و اشتغال ہو وہ حجاب اکبر ہے۔ اس سے علوم دینیہ اور واردات قلبیہ خارج ہو گئے کہ وہ حجاب نہیں کیونکہ ان سے غیر کی طرف التفات نہیں ہوتا بلکہ ان سے عظمت حق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو علوم ظاہرہ سے التفات الی الغیر نہ رہے۔ وہ بھی حجابیت سے خارج ہو جائے گا۔ اور اگر کسی کو علوم وہبیہ و واردات قلبیہ سے بھی عجب ہونے لگے۔ اس کے لیے یہ بھی حجاب ہو جائیں گے۔ مگر ایسا کم ہوتا ہے۔ بخلاف علوم ظاہرہ کے کہ اس میں اکثر لوگوں کے لیے غوائل نفس زیادہ محتمل ہیں۔

(وعظ: العبد الربانی)

علم دین سے کچھ بھی دلچسپی نہیں

واقعی ہمارے عقلا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ اولاً علماء عموماً پھر ان میں وہ علماء خصوصاً جو کہ درس و تدریس میں مشغول ہیں محض بیکار ہیں۔ سو کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو کام سارے کاموں سے زیادہ ضروری ہو اسی کو سب سے زیادہ بیکار کہا جائے۔ درس و تدریس سب محکموں کی روح ہے خواہ تقریر ہو خواہ تحریر خواہ تصنیف

سب اسی تعلیم کی فرع ہیں مگر اس وقت سب سے زیادہ اس کو بے کار سمجھ رکھا ہے
اور علامت اس کی یہ ہے کہ عام طور سے لوگوں کی نظر میں علماء کی وقعت کم ہے اور
اس علامت کی بڑی علامت یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے علم دین بہت کم تجویز کیا جاتا
ہے پھر ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ مدارس میں چندہ بھی دیتے ہیں اور مدارس
دینیہ کی بقا کو لسانا تسلیم بھی کرتے ہیں جن کے لیے اہلِ مدارس ان کے بڑے بڑے شکریے
ادا کرتے ہیں تاکہ اُن کو دلچسپی ہو لیکن واقع میں ان کو دلچسپی کچھ بھی نہیں ہوتی۔ صاحبو!
دلچسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لیے
بھی اس کو قولاً وعملاً اختیار کر کے دکھلا دیا۔ نیز ارشاد فرمایا کہ ہماری اولاد کے لیے زکوٰۃ
حلال نہیں۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ایسے قوانین مقرر ہوتے کہ سب روپیہ انہیں کو ملتا۔
مگر ایسا نہیں ہُوا۔ تو دلچسپی اس کو کہتے ہیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ریاست رامپور
میں ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو جن کا لڑکا قرآن شریف پڑھتا تھا انگریزی
پڑھنے کی رائے دی۔ انہوں نے کہا کہ ذرا قرآن شریف ختم ہو جائے تو انگریزی میں لگایا
جائے۔ انہوں نے پُوچھا کتنا قرآن ہُوا ہے اور کتنے روز میں ہُوا ہے۔ انہوں نے کہا دو
سال میں نصف ہُوا ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ دو برس تو ضائع کیے اور دو برس بھی کیوں
ضائع کرتے ہو۔

صاحبو! غضب تو یہ ہے کہ خدا کے قائل آخرت کے قائل اور پھر یہ خیالات
اور یہ مقالات! مجھے ایک دہریہ فلسفی کا قول یاد آیا کہ انہوں نے ایک معتقدِ ارتقا کو لکھا
تھا کہ ڈارون نے جو ارتقا کے مسئلے کو مانا ہے اس کو تو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ خدا کا
قائل نہ تھا تو جس امر میں اس کو مشاہدہ نہیں ہو سکا اس کی بابت تخمین کی رائے قائم
کر لی۔ انسان کا تکوّن بھی ایک واقعہ تھا اس کی نسبت بھی ایک رائے قائم کرنی پڑی۔
تو انکار صانع کی صورت میں اس کا قائل ہونا چنداں بعید نہیں۔ لیکن جو شخص خدا کا قائل
ہے اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اس تخمین پہ چلے۔ اگر وہ یوں کہہ دے کہ خدا نے پیدا

کیا تو اس میں کیا اشکال ہے۔ پس وجود صانع کا قائل ہو کر اس کا قائل ہونا سخت بعید ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ تعلیم قرآن کو بے کار اور تضیع اوقات کہنا اس سے تو بعید نہیں جو آخرت کا قائل نہ ہو مگر جو شخص آخرت کا قائل ہے۔ اس کی زبان سے ایسا نکلنا کہ قرآن کی تعلیم میں وقت کے صرف کرنے کو اضاعتِ وقت کہنا سخت عجیب ہے۔ کیا آخرت ہونے کی صورت میں اس کا ثمرہ نہ ملے گا؟

صاحبو! خدا نے عقل اس واسطے دی ہے کہ اس سے انجام کو سوچے۔ افسوس کہ دنیا میں رہنا محض موہوم اور اس کے لیے یہ اہتمام اور کوشش! اور آخرت میں جانا یقینی ہو اور اس کے سامان کو اضاعۃ وقت کہا جائے! اصل یہ ہے کہ خود آخرت سے اس درجہ غفلت ہو گئی ہے کہ وہ یاد بھی نہیں آتی۔ اور اس بے خبری کی یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ جو باخبر ہو کر اس کی فکر کرتے ہیں ان کو احمق سمجھا جاتا ہے۔ غرض جب آخرت حق ہے اور اس کے لیے عمل کی ضرورت اور اس کے لیے علم اور تعلیم کی ضرورت، پھر اس میں مشغول ہونا اضاعۃ وقت چہ معنی؟ مگر بہت لوگ پھر بھی اس کو اضاعۃ وقت سمجھتے ہیں اور اگر یہ اعتقاد بھی نہ ہو تو عمل تو اسی کے موافق ہے جس سے اعتقاد میں بھی ایک گونہ ضعف ثابت ہوتا ہے۔ ورنہ اگر علم دین سے دلچسپی ہے تو علما کی بے وقعتی کی کیا وجہ؟ اور ان کی وقعت بھی کی جائے تو اولاد کو علم دین نہ پڑھانے کی کیا وجہ؟ یہ آثار بڑے ہی عقیدے کے ہیں۔

علماء کی بے وقعتی کے متعلق بعض یہ عذر کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے وعظ سُنا اور معتقد بھی ہوئے مگر آخیر میں جو مولوی صاحب نے سوال کر دیا تو سارا اعتقاد ڈھل گیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص حکیم عبد العزیز وغیرہ سب کو اس وجہ سے چھوڑ دے اور سب برائیاں شروع کر دے کہ اس نے عطائیوں کو دھوکا دیتے ہوئے دیکھا تھا تو آپ اس کو صائب الرائے سمجھیں گے؟ اور کیا آپ نے بھی سب ہی حاذق اطباؒ کو چھوڑ دیا ہے؟ تو جن کی حکایتیں آپ نے یاد کر رکھی ہیں۔ وہ واقع میں اناڑی

علمائی ہیں۔ افسوس عطائیوں کے پھیل جانے سے آپ نے اطبا کو نہ چھوڑا۔ مگر چند سالوں کی وجہ سے محقق مولویوں کو چھوڑ دیا۔

غرض یہ آثار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علماء کو بالکل نکما سمجھتے ہیں مجھ سے ایک شخص کی گفتگو ہوئی، کہنے لگے آپ نے اپنے بھتیجے کے لیے کیا تجویز کیا۔ میں نے کہا کہ عربی پڑھتا ہے تاکہ دین کی خدمت کرے۔ کہنے لگے مدرسہ دیوبند میں ہمیشہ سو ڈیڑھ سو آدمی فارغ ہو کر نکلتے ہیں۔ وہ خدمت دین کے لیے کافی ہیں۔ آپ نے ان کے لیے انگریزی کیوں تجویز نہ کی۔ دنیوی ترقی کرتا۔ میں نے کہا جناب خادم دین ہونا اگر خسارہ کی بات ہے تو کیا وجہ طلباء دیوبند کے لیے یہ پست حالت پسند کی جائے بلکہ چلو اور یہ مشورہ دو کہ سب چھوڑ کر انگریزی میں مشغول ہو جاؤ۔ آخر وہ بھی قوم ہی کے بچے ہیں۔ اور اگر خادم دین ہونا کوئی نافع امر ہے تو کیا وجہ کہ میرے بھتیجہ کے لیے اس کو تجویز نہ کیا جائے آخر بالکل خاموش ہو کر رہ گئے۔ افسوس کی بات ہے کہ دیوبند کے طالب علم تو ایسے ذلیل کہ جس شغل کو آپ بالکل بے کار سمجھ رہے ہیں وہ تو ان کے لیے تجویز کیا جائے اور آپ کی اولاد ایسی محبوب و معزز کہ اس کے لیے ڈپٹی کلکٹری و تحصیلداری تجویز کی جائے۔

صاحبو! میں ڈپٹی کلکٹری وغیرہ سے منع نہیں کرتا لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ آپ نے اپنی اولاد کے لیے دین کی کیا فکر کی ہے۔ کیا آپ کو یہ اطمینان ہے کہ آپ کی اولاد دارِ آخرت میں نہ جائے گی اور اگر جائیں گے تو ان کا کیا حشر ہوگا۔ اسی طرح یہ سوچیے کہ کیا خادمانِ دین کی ضرورت نہیں؟ اور اگر ضروری ہے تو کیا سب مسلمانوں پر اس کا اہتمام ضروری نہیں تو آپ نے کیا اہتمام کیا؟ اور اگر ناکارہ ہونے سے آپ کی مراد یہ ہے کہ وہ ترقی نہیں کر سکتا تو حضرت ایسا ناکارہ ہونا تو عین مطلوب ہے اور آئین وفاداری ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا ایزد بخواہد

از ہمہ کارِ جہاں بے کار ماند

اور فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم   مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

لیکن یہ تو مولینا رومی کا کلام ہے اس سے تو صرف دل والے متاثر ہوں گے۔

اب میں آپ کے مسلمات سے ایک مثال دیتا ہوں کہ آپ کا ایک نوکر ہے جس کو آپ دس روپیہ دیتے ہیں اور آپ کو اس پر اعتماد ہے۔ اتفاق سے کہیں باہر ایک شخص اس کو ملا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو اور تم کو کیا معاوضہ ملتا ہے؟ معلوم ہوا کہ نوکر ہیں اور دس روپیہ ملتے ہیں۔ اس کو سن کر اس مسافر نے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو میں تم کو بیس روپیہ دوں گا اور اس سے نصف کام تم سے لوں گا۔ اب دل میں ذرا غور کر کے بتلائیے کہ اس نوکر کے لیے فخر کی بات کیا ہے۔ آیا یہ کہ ترقی کا نام سن کر پھسل جائے یا یہ کہ صاف جواب دے دے اور کہہ دے کہ آپ مجھے بہکانے آئے ہیں۔ یقیناً آپ دوسری شق کو اس کے لیے خوبی سمجھیں گے۔ اب انصاف سے بتلائیے کہ اگر کوئی خدا کا نوکر ہے اور پانچ روپیہ میں گزر کرتا ہے اور اس حالت میں وہ ہزار روپیہ پر اس طرح لات مار دے کہ باوجود قدرت تحصیل اسباب کے وہ اسباب تعلیم معاش ترک کر دے تو اس کو کم حوصلہ و محروم ترقی کیوں کہا جاتا ہے۔ صاحبو! اس کی قدر تو اور بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ نہ یہ کہ اس کو خشک دماغ بتلایا جائے۔ صاحبو! جس کا نام آپ نے ترقی رکھا ہے اس کا خلاصہ واللہ محض غرض پرستی، خود پرستی ہے۔ اگرچہ اس کے پیچھے ساری عقل اور دین سلب ہو جائے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

عاقبت سازد ترا از دیں بری   ایں تن آرائی و ایں تن پروری

تو مولینا کے قول سے اگر تسلی نہ ہوئی تھی لیکن آپ کے نوکر کی مثال سے تو تسلی ہو گئی ہو گی۔ صاحبو! جس سے دلچسپی نہیں ہوتی اس میں انسان ترقی نہیں کر سکتا ؎

انبیاءؑ در کار دنیا جبریند   اشقیا در کارِ عقبیٰ جبریند

اشقیا را کارِ دنیا اختیار

انبیا را کارِ عقبیٰ اختیار

غرض اپاہج اور چست سب ہیں لیکن اہلِ دنیا کارِ دنیا میں چست اور کارِ عقبیٰ میں سست ہیں اور اہل اللہ کارِ دنیا میں سست اور کارِ عقبیٰ میں چست ہیں۔ اور اگر اب بھی تمہارے نزدیک فیصلہ نہیں ہوا تو سمجھ لیجیے

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ. فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔

(وعظ: ضرورۃ العلماء)

عوام کو غیر مسلموں کی کتابیں نہ پڑھنا چاہیے

واللہ اہلِ باطل کی کتابوں کا بعض علماء پر بھی بُرا اثر ہو جاتا ہے تو عوام کی تو ان کے مطالعہ سے کیا حالت ہو گی۔ لہٰذا عوام کو کوئی کتاب بدون مشورہ علماء کے ہرگز نہ دیکھنا چاہیے۔ اور اگر یہ کہے کہ میں ردّ کے لیے دیکھتا ہوں تو یہ بھی مناسب نہیں کیونکہ یہ کام علماء کا ہے، آپ کا نہیں۔ اور اس میں آپ کی توہین نہیں۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ کام آپ کا نہیں کیونکہ اگر ایک شخص قانون میں ایل ایل بی ہو تو وہ فن انجنیئری سے جاہل ہو گا اور ایک انجنیئر کو یہ حق ہے کہ اس کو کہہ دے کہ آپ قانون داں ہیں، مگر انجنیئری سے جاہل ہیں اس لیے اس میں آپ کو دخل دینے کا حق نہیں۔ ایسے ہی میں کہتا ہوں کہ آپ لوگ ان علوم سے جاہل ہیں جن کی رد کرنے میں ضرورت ہے اس لیے آپ کو اس قصد سے بھی اہلِ باطل کی کتابوں کا مطالعہ جائز نہیں۔ اور اگر کسی کو لفظ جاہل ناگوار ہو تو ناواقف کہہ لو۔

وعظ: الفاظ القرآن

۲۳ شعبان ۱۳۴۳ھ

مطالعہ ان مذہبی کتابوں کا کرنا چاہیے جو نصابِ دین میں داخل ہیں

مجھ سے ایک نائب تحصیلدار صاحب نے کہا کہ میں مذہبی کتابیں

دیکھا کرتا ہوں۔ دریافت جو کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نیا پرچہ کی کتابیں دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب اگر آپ قانون گورنمنٹ یاد نہ کریں اور اخبار ہی دیکھا کریں تو کیا آپ گورنمنٹ کی عملداری میں رہ کر کام چلا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ جو نصاب گورنمنٹ نے تجویز کیا تھا آپ نے اس کو نہیں دیکھا بلکہ اپنی طرف سے ایک نیا نصاب تجویز کر لیا تو اسی طرح مذہب میں بھی وہ کتابیں دیکھیے جو مذہبی نصاب میں داخل ہوں۔

(دین و دنیا: ضرورۃ العلماء، ص ۲۹۳)

دینیات کا کورس علمائے سے پوچھ کر مقرر کیا جائے تاکہ وہ ایسا کورس مقرر کریں جس سے شریعت کی عظمت قلب میں جم جائے اور عقائد اسلامیہ ایسے راسخ ہو جائیں کہ پہاڑ کے ہلائے نہ ہلیں اور اجمالاً اس کے پڑھنے والے کو اسرار کا علم بھی حاصل ہو جائے۔

(علم و عمل ص ۳۱)

تعلیمِ نسواں سے غفلت

سچ یوں ہے کہ مردوں نے بھی دین کی ضرورت کو ضرورت نہیں سمجھا کھانا ضروری، فیشن ضروری، ناموری ضروری، مگر غیر ضروری ہے تو دین۔ دنیا کی ذرا ذرا سی مضرت کا خیال ہوتا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتے اگر دین کی مضرت پہنچ گئی تو کتنا بڑا نقصان ہوگا؟ پھر وہ مضرت اگر ایمان کی حد میں ہے تب تو چھٹکارا بھی ہو جائے گا مگر نقصان جب بھی ہوگا گو دائمی نہ ہو۔ اور اگر ایمان کی حد سے بھی نکل گئی تو ہمیشہ کا مرنا ہو گیا اور تعجب ہے کہ دنیا کی باتوں سے تو بے فکری نہیں ہوتی مگر دین کی باتوں سے کس طرح بے فکری ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا ہے ؎

چوں چنیں کارے ست اندر رہ ترا
خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

اور اسی بے فکری کا ایک شعبہ ہے کہ مرد عورتوں کی تعلیم کو اپنے ذمہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ بعض کی رائے تو یہ ہے کہ تعلیم مضر ہے مگر اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی نے اپنے

گھر والوں کو کھانا کھلایا۔ اتفاق سے بیوی بچے سب کو ہیضہ ہو گیا۔ آپ نے رائے قائم کی کہ کھانے پینے سے تو ہیضہ ہو جاتا ہے اس لیے سب کا کھانا پینا بند اور دل میں جما لیا کہ کھانے کی برابر کوئی چیز بری نہیں۔ سو تعلیم سے اگر کسی کو ضرر پہنچ گیا تو یہ تعلیم کی غلط تدبیر سے ہے نہ کہ تعلیم سے۔ ہاں یہ امر زیر بحث ہے کہ کونسی تعلیم ہونی چاہیئے؟ مختصر یہ کہ تعلیم دین کی ہو۔

(وعظ: العاقلات و الغافلات
۱۲، ربیع اول ۱۳۴۷ھ)

تعلیم جدید

تم اس تعلیم جدید کو اس طریقہ سے حاصل کرو کہ اس سے پہلے عقائد و احکام کا علم حاصل کر لو۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان دینیات کے حاصل کرنے کے لیے وہ مختصر کورس کافی نہیں جس میں راہ نجات وغیرہ دو چار مختصر کتابیں ہیں بلکہ اس کے لیے ایسا کورس تجویز کرنا چاہیے جس سے عقائد و احکام بصیرت کے ساتھ معلوم ہوں اور کچھ اسرار و حکم بھی بتلائے جائیں تاکہ بالاجمال پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے گھر میں اسرار و حکم بھی ہیں۔ مصالح عقلیہ کی بھی رعایت ہے اور تمدن و سیاست بھی کامل ہے۔ اجمالاً اتنا معلوم ہو جانا ضروری ہے تاکہ تعلیم جدید سے شبہات پیدا نہ ہوں۔

وعظ: الفاظ القرآن
۲۳ شعبان المعظم ۱۳۳۴ھ

تعلیمِ جدید حاصل کرنیوالوں کیلئے نصائح

تعلیم جدید حاصل کرنے والے بچوں کو علماء کی صحبت میں بٹھلاؤ۔ تعطیل کے زمانہ میں کچھ دنوں کے لیے ان کو بزرگانِ دین کے پاس بھیجا کرو۔ نیز فرصت کے اوقات میں ان کو علماء شریعت کی کتابیں دیکھنے کی تاکید کرو۔ اور غیر علما کی کتابیں دیکھنے سے منع کرو، کیونکہ غیر علماء کی کتابیں ان کی نظر سے گزرنا بھی جرم ہے جیسا کہ کوئی شخص باغیانہ کتابیں اپنے گھر میں رکھے۔ ظاہر ہے قانونِ سلطنت کی رُو سے یہ بڑا جرم ہے۔ اور سلطنت ایسے شخص کو سخت سزا

دے گی۔ مگر حیرت ہے کہ جس بات کو یہ عقلاء دنیوی قوانین میں جرم مانتے ہیں شریعت کے قوانین میں اس سے روکنے کو تعصب بتلاتے ہیں۔ اگر غیر علماء کی کتاب دیکھنے سے روکنا تعصب ہے تو اہل سلطنت کے اس قانون کو بھی تعصب کہنا چاہیے کہ باغیانہ کتابوں کا رکھنا جرم ہے۔ مگر اس کو سب عقلاء ضروری اور صحیح قانون سمجھتے ہیں اس لیے کوئی سلطنت ایسی نہیں جس نے باغیانہ کتابوں کے مطالعہ کو اور گھر میں رکھنے کو جرم قرار نہ دیا ہو۔

وعظ: الفاظ القرآن

۲۴ شعبان ۱۳۴۲ھ

علم کا نفع

علم میں یہ کتنا بڑا نفع ہے کہ اس سے رضائے حق نصیب ہوتی ہے اس لیے اس کے سلسلہ کو بند نہ کرنا چاہیے اور اگر کبھی سلسلہ ٹوٹ جاوے تو اس کو پھر جوڑ لینا چاہیے۔ اگر کسی سے پابندی کے ساتھ نہ ہو سکے تو بدون پابندی ہی کے علم حاصل کرتا رہے۔ نہ ہونے سے ہونا پھر غنیمت ہے۔ اسی طرح کرتے کرتے انشاء اللہ ایک دن نظام بھی پیدا ہو جائے گا۔ ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی　　　کوشش بیہودہ بہ از خفتگی است

(علم و عمل، تعمیم التعلیم ص۳۰۸-۳۰۷)

ایک نکتہ کا علم!

میں اس متموّل طبقہ کو انگریزی پڑھنے سے منع نہیں کرتا۔ ہاں یہ کہتا ہوں کہ بہت پاس نہ جائیں دُور ہی دُور رہیں، اور اتنی انگریزی تو عربی سے فارغ ہونے کے بعد بھی یہ لوگ سیکھ سکتے ہیں۔ مگر یہ لوگ تو زیادہ مال و جاہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے انگریزی میں ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ اس حرص کی وجہ سے یہ طبقہ سب سے زیادہ دین سے محروم ہے۔ ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ جب خدا نے ان کو فراغت دی تھی تو بے فکر ہو کر دین کی خدمت میں لگتے اور ساری عمر اسی میں ختم کر دیتے، پھر آپ دیکھتے کہ علماء میں کیسے کیسے لوگ

پیدا ہوتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں مشغول ہو کر ان کو وہ لذّت آتی کہ کبھی سیری نہ ہوتی۔ یہ تو خدا کا راستہ ہے کہ قطع کرنے سے بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اس کی طلب کبھی کم نہیں ہوتی۔ اگر قدر شناسی ہو تو ایک نکتہ کا علم ایسا ہوتا ہے جس کے سامنے ساری دنیا گرد ہے۔ (علم و عمل ص۳۱۱)

⊙

فصل (۲)

اہتمامِ حفاظتِ دین

حفاظتِ دین بڑی ضرورت ہے صحبتِ کامل کی۔ بدون اس کے دین کی حفاظت مشکل ہے۔ بزرگوں نے حفاظتِ دین کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ خود حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس حفاظت کا کتنا اہتمام تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے روز نہا کر کرتہ پہنا۔ پھر قینچی لے کر کلائی پر سے آستین کاٹ ڈالی۔ کسی نے پوچھا تو فرمایا کہ محض اس لیے کاٹ دی کہ اس کو پہن کر اپنی نظر میں اچھا معلوم ہُوا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے دیکھا کہ مشک لیے ہُوئے گھروں میں پانی بھرتے پھرتے ہیں۔ وجہ پُوچھنے پر فرمایا۔ رومی قاصد نے میرے عدل کی مدح کی تھی۔ اس کا علاج کر رہا ہُوں۔

سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان ہاتھ میں لیے اور مارتے دیکھا اور پوچھنے پر فرمایا ھذا اوردنی المواردہ۔ آخر یہ کیا چیز ہیں۔ اگر صحابہ سے یہ چیزیں منقول نہ ہوتیں تو خشک لوگ یہ کہتے کہ ان صوفیوں کو جنون ہو گیا ہے اور ان کو ثواب بھی کہتے ہیں۔ اتنا اہتمام تھا حضرات صحابہؓ کو جب کامیابی ہو سکی۔ بات اصل یہ ہے کہ ہم نے امراض نفسانی کو پہچانا ہی نہیں۔ اگر پہچانتے تو کچھ تو اہتمام

کرتے ۔

(ملفوظ ۲۰۵ - الافاضات الیومیہ ۴ شوال المکرم ۱۳۵۰ھ)

دین کے مقابلہ میں دنیا کی مصلحتوں سے متاثر ہو جانا کمزوری کی بات ہے

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ دین میں دنیوی مصالح سے متاثر ہونا سب کمزوری کی باتیں ہیں۔ بڑی چیز دین ہے یہ محفوظ رہے خواہ تمام مصالح بلکہ سارا عالم فنا ہو جائے کچھ پروا نہیں۔

(الافاضات ج۲ ص۳۱۹ ملفوظ ۵۳۸)

مصلحت پرستی مقصودِ اسلام نہیں

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آجکل مصلحت پرستی کا بازار گرم ہے۔ بکثرت مصالح دنیوی کو دین پر مقدم سمجھتے ہیں۔ کتنے غضب اور ظلم کی بات ہے۔ میں بحمد اللہ دین کو مقدم رکھنا چاہتا ہوں۔ مصالح دنیوی پر بس یہی لوگوں سے میری لڑائی کا راز ہے۔ اسی وجہ سے میں بدنام ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ مصالح جس قدر پیسے جائیں اسی قدر سالن لذیذ ہوتا ہے۔ جی ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ خواہ دنیا کی مصلحت نہ ہو مگر دین کی مصلحت محفوظ رہے۔ کسی کام کا کسی بات کا داعی دنیا نہ ہو، محض دین ہو۔

(الافاضات ج۴ ص۶۵، ملفوظ ۹۷۔ ۸ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ)

جب اسلام کا تحفظ نہ کیا تو تمہارے ساتھ ہمدردی کیسی؟

فرمایا، اللہ جس کام سے راضی نہ ہو وہ کام مسلمان کا نہیں۔ ہم جو مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہیں۔ جب اسلام اور شریعت کا تحفظ نہ رہا یا نہ کیا تو کیسی ہمدردی اور خیر خواہی اور کیسا درد۔ یوں تو فرعون نے ترقی کی، شداد نے ترقی کی، نمرود نے ترقی کی، قارون نے ترقی کی۔ آخر ان کی ترقی بھی تو ترقی ہی تھی۔ پھر قابل ملامت اور مذموم کیوں ہوئی؟ اسی لیے کہ وہ حدود سے تجاوز کر کے ترقی کی گئی تھی جس

کہ اکبر الہ آبادی نے ایک شعر میں کہا ہے ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے

تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

(الافاضات ج۳ ص۵ ملفوظ ۹)

دین کی بڑی خدمت فرمایا، اس سے بڑھ کر دین کی کیا خدمت ہوگی۔ خادمین دین کو پیدا کرنا اور شریعت مقدسہ کی حفاظت کرنا۔ سو اس کو مدارس عربیہ بحمد للہ عربی کی تعلیم دے کر اچھی طرح انجام دے رہے ہیں۔ شریعت عربی میں ہے۔ بدون عربی کے شریعت کا تحفظ مشکل ہے۔

(المبلّغ۔ شوال المکرم ۱۳۶۵ھ)

ہر قوم میں مذہبی خدمات کی وقعت دین سب مسلمانوں کی مشترک چیز ہے جس کی خدمت سب مسلمانوں کے ذمّے فرض ہے۔ جس کو طلباء علم دین آپ کی طرف سے ادا کر رہے ہیں۔ اگر قرآن و حدیث سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری قوم کی شہادت سے سہی۔ غیر اقوام بھی اپنی جماعت کی دینی خدمات کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی جماعت ساری قوم کی طرف سے ایک اہم اور ضروری کام انجام دے رہی ہے۔

(رجاء الغیوب ص۵۵)

دین کی حفاظت سب مسلمانوں کے ذمہ ہے فرمایا، اب تو نماز کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ اگر کوئی بچہ امتحان میں فیل ہو جائے تو اس پر تو افسوس ہوتا ہے لیکن نماز اگر برس روز تک بھی نہ پڑھے تو ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ زبانِ حال سے اسلام شکایت کر رہا ہے کہ افسوس میری طرف بالکل توجہ نہیں رہی۔ میں تم کو غیرت دلاتا ہوں یہ بتلائیے کہ اس کی

حفاظت آپ کے ذمہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیوں نہیں کی جاتی کیا نصاریٰ و یہود اس کی حفاظت کریں گے؟ یا مجوس و ہنود اس کی حمایت کریں گے؟ جب اپنے اسباب کی مالک ہی حفاظت نہ کرے تو اور کون کرے گا۔ شاید یوں خیال ہوگا کہ مولوی تو اس کی حفاظت کر رہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ کیا دین صرف مولویوں کا ہے؟ تمہارا نہیں ہے؟ یہ تو مشترک جائداد ہے جس کی حفاظت جملہ شرکاء کے ذمہ ہے اور حفاظت یہ ہے کہ اس کی ضروریات کی پابندی کرو۔

وعظ: العاقلات الغافلات

۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ

ایمان کی حفاظت

فرمایا، آپ کو ایک بات بتلاتا ہوں۔ اگرچہ اس کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن صرف اس لیے بیان کرتا ہوں تاکہ تنگی کے وقت لوگ اپنے ایمان کو محفوظ کر لیا کریں اور کفر سے بچ جاویں۔ وہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسی صورت پیش آتی ہے کہ کوئی بے نمازی نمازیوں میں جا پھنستا ہے۔ نماز کا وقت آگیا اور سب لوگ نماز کے لیے تیار ہوگئے۔ اب یہ بے نمازی آدمی بڑا پریشان ہوتا ہے۔ نماز نہ پڑھے تو سب لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں۔ بُرا بھلا کہتے ہیں اور نماز پڑھتا ہے تو یہ مصیبت ہے کہ اس کو غسل جنابت کی ضرورت ہے سب کے سامنے غسل کرے تو زیادہ بدنامی ہے۔ اب ایسی صورت میں یہ بے نمازی بدنامی سے بچنے کے لیے نماز میں شریک ہوجاتا ہے اور فقہا نے لکھا ہے کہ بے وضو نماز پڑھنا کُفر ہے تو میں کہتا ہوں کہ ایسی حالت میں اگر کوئی ایسا شخص نماز پڑھے تو اس کو چاہیے کہ نماز کی نیّت نہ کرے بلکہ بدون نیت کے نماز کی نقل کرتا رہے اس طرح یہ شخص کُفر سے بچ جائے گا۔ اگرچہ ترکِ نماز کے گناہ کے ساتھ دھوکا دینے کا بھی گناہ ہوگا کہ لوگ اس کو نمازی سمجھیں گے اور ہے بے نمازی، مگر کُفر سے تو بچ جائے گا۔ دیکھیے شریعت میں کس قدر رعایت

ہے کہ مجرم بھی اس سے محروم نہیں۔ پھر بھی افسوس ہے کہ لوگ شریعت کو تنگ بتلاتے ہیں مگر خدا کے واسطے اس ترکیب سے ہمیشہ کام نہ لینا اور نہ اس حالت میں امامت کرنا ورنہ سارے نمازیوں کی نماز کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا۔ غرض عیب کرنے کے لیے بھی ہنر چاہیے۔ اگر کوئی شخص بدنامی سے بچنے کے لیے بے وضو ہی نماز میں شریک ہو تو اس کو کفر سے بچنے کے لیے نماز کی نیت نہ کرنا چاہیے۔

(علم و عمل، تعمیم التعلیم، ص ۹۹-۹۸-۱۹۷)

فصل (۳)

علمائے دین کا وقار

علماء سے وابستگی

بہت بڑی ضرورت دنیا میں اہلِ علم اور دین کی ہے ان کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ، مگر وابستگی کے یہ معنی نہیں کہ چندہ میں روپیہ دے کر بے فکر ہو جاؤ۔ روپیہ تو خدا دے گا بلکہ ان سے کھل کر ملو اور ان سے مسئلے پوچھتے رہو تاکہ تم کو دین اور اہلِ دین کی محبت بڑھے اور تمہارے لیے یہ وعدۂ صادقہ پورا ہو جائے کہ المرءُ مع من اَحَبَّ کہ آدمی قیامت میں اس کے ساتھ ہوگا جسے دنیا میں دوست رکھتا ہے۔ اور اگر تم کو ان کی محبت ہو گئی تو انشاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سے تم کو محبتِ صادقہ ہو جائے گی اور بعض لوگ خود تو علماء کی طرف متوجہ ہوتے نہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری خبر نہیں لیتے۔ تو صاحبو! مریض طبیب کے پاس جایا کرتا ہے طبیب مریض کے پاس از خود نہیں جاتا۔ تم نے علماء کو اپنی خبر کب دی؟ اگر تم دو دفعہ جا کر ان کو اپنے مرض کی خبر دو گے تو وہ ایسے شفیق ہیں کہ چار دفعہ خود آئیں گے۔ اب تو مولوی اس لیے بھی بچتے ہیں کہ ان کا از خود متوجہ ہونا خود غرضی پر محمول ہوگا۔ تو یہ معنی ہیں وابستگی کے اور جب آپ وابستہ ہوں گے تو وہ بھی آپ سے زیادہ متوجہ ہوں گے۔ اس سے ملاپ پیدا ہوگا۔ مگر ابتدا اس کی اہلِ دنیا کی طرف سے ہونا چاہیے اور اس وابستگی کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی علم دین پڑھائیے۔

(دین و دنیا صـ ۵۱۵)

علماء کا اتباع اگر دین کو سنبھالنا چاہتے ہو تو ہر شخص کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی عالم متقی کا اتباع کرے۔ (انفاس عیسیٰ ص۳۹)

سب سے بڑی بیماری سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ بیمار کو بیماری کی اطلاع بھی نہ ہو اور اس سے سخت یہ کہ تندرستوں کو بیمار سمجھنے لگے۔ (تفصیل الدین ص۳۱)

اتباعِ شریعت کا طریقہ تعلیم شریعت کا اتباع یوں ہی ہو سکتا ہے کہ علماء کا اتباع کیا جائے مگر ایسے علماء کا جو خود آپ کے متبع نہ ہوں یعنی وہ آپ کے مذاق کا اتباع نہ کریں بلکہ آپ سے اپنے مذاق کا اتباع کرائیں۔

(مظاہر الآمال ص۳)

اہلِ حق سے عناد یہ بھی نفع سے خالی نہیں کہ اگر انسان کچھ بھی نہ کرے تو کم از کم اس کو اہلِ حق سے عناد تو نہ ہو۔ یہ عناد بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ (ملفوظ ۴ شوال ۱۳۵۰ھ)

غیرت قومی کیسے تقاضا کرتی ہے کہ اپنے علماء کو لوگوں کی نظروں میں بے وقعت دیکھا جائے۔ (رجاء الغیوب ص۶۶)

علماء کی فضیلت میں علماء کی منصبی خدمات کو بہ نسبت صوفیہ کی خدمت کے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ علماء شعائر کے خادم ہیں۔ اس لیے میں ہمیشہ صوفیہ سے علماء ہی کو افضل سمجھتا ہوں اور ان کی ہی خدمت کو اعلیٰ سمجھتا ہوں۔ صوفیہ اعمال کی تکمیل کرتے ہیں باقی اصل خدمت علماء ہی کی ہے۔

(الافاضات ج۶ ص۳۱۹)

حضرت والا کے دل میں علماء کی عظمت

(۷) میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اہل علم سے بہت شرماتا ہوں اور ان کے مقابلہ میں جی چاہتا ہے کہ اپنا ہی نقص پیش نظر رہے۔ میں چھوٹے سے چھوٹے طالب علم کی اپنے قلب میں عظمت و احترام پاتا ہوں۔ میں کبھی اہل علم کو ایسا خطاب کرنا پسند نہیں کرتا جس سے ذرہ برابر بھی ان کی اہانت کا شبہہ ہو۔ (الافاضات ج ۶ ص ۱۴۹)

محقق ہو جائیے یا مقلّد

(۸) علّامہ غزالی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اے عزیز! اگر محقق نہیں تو مقلّد ہو جا، اور مقلّد بھی نہ ہو تو کم از کم محققین کے علوم کا انکار تو نہ کر۔" بعض ایسے بھی ہیں جو ان کے علوم کی تقلید نہیں کرتے تو انکار بھی نہیں کرتے۔ یہ بھی غنیمت ہیں مگر بعض تو ان پر اعتراض کرتے ہیں ان کی اصلاح سے مایوسی ہے۔ (العبد الربانی ص ۱۱)

علماء اسلام کو مٹانا دنیا کے مٹانے کے برابر ہے

حدیث شریف میں ہے کہ زمین میں جب تک خدا کا نام لیا جاتا رہے گا اس وقت تک قیامت نہ آئے گی۔ اور مشاہدہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے نام کی بقا علماء کی وجہ سے ہے۔ پس علماء کا وجود بقاء عالم کا ذمہ دار ہے۔ مگر افسوس لیڈر لوگ ان کو نکمّا سمجھتے ہیں۔ اور سُنا ہے کہ آجکل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے۔ طرح طرح کی تدبیروں سے ان کے اثر کے مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے، بُرا بھلا بھی ان کو کہا جا رہا ہے۔ مگر علماء اس بارے میں خاموش ہیں۔ وہ بہت احتیاط کرتے ہیں۔ وہ کسی کو بلا ضرورت بُرا نہیں کہتے۔ مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جائے جبکہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے۔ اور وہ ضرورت یہ ہے کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہو رہے ہیں۔ یہ لیڈر دین کے احکام میں دخل دیتے اور اپنی رائے سے جس طرح چاہتے ہیں احکام میں تحریف کر دیتے ہیں اور عوام ان کو مولوی اور مولینا سمجھتے ہیں۔ اس

بے دین ہیں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں، مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد ہو اور رسولؐ پر اعتقاد جب ہی ہوگا جبکہ حاملان شریعت سے اعتقاد ہو کیونکہ عوام کو رسولؐ کی معرفت علماء کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس نے علماء کو نہیں پہچانا وہ رسول کو نہیں پہچان سکتا پس جو لوگ علماء کے استیصال کی فکر میں ہیں وہ خود مسلمانوں کے بلکہ عالم کے استیصال کی فکر میں ہیں۔ میں ایک اور بات کہتا ہوں، گو کہنے کی تو نہیں، وہ یہ کہ عالم اگر بدعمل بھی ہو جب بھی تم کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔ کیونکہ وہ مدعی علم کا ہے نہ عمل کا۔ اس کی بدعملی سے علم تو غلط نہیں ہو گیا۔ طبیب اگر بدپرہیز ہے تو مریض کا کیا نقصان ہے۔ وہ مریض کو تو صحت ہی کا طریقہ بتلائے گا۔ اسی طرح عالم بےعمل تم کو فتویٰ تو صحیح دے گا۔ مسائل تو غلط نہ بتلائے گا۔ اور یہ لیڈر جاہل تو احکام غلط بتلاتے ہیں۔

(المرابطہ ص ۱۳)

علماء کا کار منصبی

آجکل بعض لوگ اس کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ تعلیم صنائع کی آدم علیہم السلام اور ادریس علیہم السلام نبیوں نے کی ہے تو مولوی اس کو کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کی اتباع سے یہ شوق پیدا ہوا ہے تو جس نسبت کو انہوں نے محفوظ رکھا تھا وہی نسبت محفوظ رکھ کر آپ بھی مولویوں سے ان کاموں کو کرا سکتے ہیں اور بہت خوشی سے اس کی اجازت ہے۔ وہ نسبت یہ ہے کہ تعلیم دنیا کو ان حضرات نے اصل مقصود اور منتہائے نظر نہیں قرار دیا تھا۔ بقدر ضرورت تعلیم کی اور جب ضرورت پوری ہو گئی تو تقسیم عمل کا مسئلہ شروع ہو گیا کہ انبیا کے ذمہ سے اس کو الگ کر دیا گیا اور ان کو اس کام میں لگا دیا گیا جو نبوت کا اصلی کام تھا۔ اب ان کی تقلید کی صورت یہی ہے جو علماء کر رہے ہیں کہ خود اس کام میں لگے ہوئے ہیں جو ان کا اصلی کام ہے اور دنیا کی تعلیم اوروں کے

حوالہ کر دی ہے۔ علماء نائب انبیاء ہیں جو طریقہ ان کا تھا وہی ان کا ہونا چاہیے ان کی تقلید یہ کیسے ہوئی کہ اہل دنیا بھی دنیا کی تعلیم دیں اور اہل دین بھی دنیا ہی کی تعلیم دیں۔ آخر اس صورت میں دین کی تعلیم دینے کون آئے گا؟ شاید فرشتے آئیں، لیکن اگر ایسا ہوا تو ان کے متعلق بھی مصلحان قوم کا فتویٰ یہی لگے گا کہ ان کو بھی تمدن ہی سکھلانا چاہیے۔ غرض دین کا نام نہ آنے پائے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ طریقہ تو یہ اور دعویٰ انبیاء علیہم السلام کی تقلید کا۔ حضرت ان کی صحیح تقلید یہی ہے کہ دنیا کی تعلیم قدر ضرورت سے آگے نہ بڑھائی جائے اور یہ کہ اصلی کام مصلح کا تعلیم دین سمجھا جائے اور دنیا کی تعلیم دنیا والوں کے حوالہ کی جائے۔ (وعظ: القاف)

علماء کو متبوع بناؤ تابع مت بناؤ

صاحبو! اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو علماء کا اتباع کرو ان کو متبوع بناؤ تابع نہ بناؤ۔ اس کا مضائقہ نہیں کہ ان میں انتخاب کرو جو نا قابل ہوں ان کا اتباع نہ کرو اور جو قابل ہوں ان کو مقتدا بناؤ۔ رہا دنیاداروں کا یہ خیال کہ علماء کو دنیا کی خبر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان معاملات میں علماء کس جزو کو نہیں جانتے۔ آیا اس جزو کو نہیں جانتے جو محض دنیا ہے یعنی واقعات؟

یا ان معاملات میں جو جزو دین کا ہے یعنی اُن واقعات کے احکام، علماء اس کو بھی نہیں جانتے۔؟ تو یہ بالکل غلط ہے وہ دین کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ وائسرائے کپڑا بننا نہیں جانتے تو یہ کوئی نقص نہیں بلکہ ان کے واسطے فخر ہے کیونکہ وائسرائے کا یہ کام نہیں۔ احکام و قوانین ہر پیشہ کے وہ جانتا ہے کہ جلاہوں کو کس قسم کا کپڑا بُننا قانون سے جائز ہے اور کس قسم کا نہیں اور اُن کی آمدنی پر ٹیکس ہوگا یا نہیں۔ یوں ہی علماء کو دنیا کے کام کرنا تو نہیں آتے لیکن احکام ہر کام کے معلوم ہیں۔ تم اپنے معاملات کو ان کے سامنے پیش کرو

پس جو علماء احکام کے جاننے والے ہیں اور بے غرض ہیں ان کو مقتداء بناؤ۔

(تواصی بالحق صنٛ۲)

علمائے سے مزاحمت

نبوت ختم ہو چکی۔ لانبی بعدی تصریحاً حدیث میں آچکا ہے۔ جو کوئی مدعی نبوت موجود ہو یا پیدا ہو اس کو جھوٹا سمجھو۔ ہاں ان کے غلام موجود ہیں اور علوم نبوت محفوظ ہیں وہ ان علوم کو ظاہر کرتے ہیں اور جو وحی نے بتایا تھا وہ وہی بتاتے ہیں تو ان کی مزاحمت نبی ہی کی مزاحمت ہے جیسے ایک چپراسی کی مزاحمت حاکم ہی کی مزاحمت ہے۔ سمن لے کر اگر کوئی چپراسی آئے اور کوئی اس کو بجائے تعمیل کرنے کے پھاڑ کر پھینک دے تو اس پر وہی دفعہ لگائی جائے گی جو منہ در منہ حاکم کے مزاحمت پر لگائی جاتی۔ اور یہ عذر اس کا قابل سماعت نہ ہوگا۔ کہ میں نے ایک چپراسی کی مزاحمت کی تھی نہ کہ حاکم کی۔ وجہ کیا ہے کہ چپراسی صرف واسطہ ہے حکم پہنچانے کا اور حکم حاکم ہی کا ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے غلام اور ورثا یعنی علماء صرف حکم سنا دینے والے ہیں نہ کہ اس کو ایجاد کرنے والے اور ان کے احکام نبی ہی کے احکام ہیں اور نبی کے احکام درحقیقت خدا کے احکام ہیں ان کی مزاحمت پر وہی جرم ہوگا جو نبی اور خدا کی مزاحمت پر ہوتا۔ (وعظ: القاف)

علمائے اسلام کی اہمیّت

عوام کو لازم ہے کہ علوم میں صوفیہ کا اتباع نہ کریں بلکہ علماء اور جمہور کا اتباع کریں کیونکہ یہ لوگ منتظم ہیں۔ نظام شریعت بلکہ نظام عالم علماء ہی کے اتباع سے قائم رہ سکتا ہے۔ یہ علماء منتظم پولیس ہیں کہ مخلوق کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنا کام چھوڑ دیں تو پھر صوفی صاحب کو حجرہ سے نکل کر یہ کام کرنا پڑتا اور سارا حال وقال رکھا رہ جاتا کیونکہ اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے۔

(انفاس عیسیٰ صد۵۳)

دین کی خدمت قوم کی خدمت

جو لوگ علماء پر مسجدوں پر مساکین پر اعتراض کرتے ہیں۔ سمجھ لیں کہ یہ صورت، یہ حالت انہیں کی بنائی ہوئی ہے۔ اگر مساکین اور طلبہ کی خبر گیری رکھیں تو وہ ایسے شکستہ حال کیوں ہیں اور علماء اور طلبہ کی خدمت مفت بھی تو نہیں ہے۔ وہ بھی تو قوم کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی خدمت آپ کی خدمت سے زیادہ اچھی اور زیادہ ضروری ہے۔ اگر آپ ان کی دنیوی خدمت کرتے ہیں تو وہ آپ کی دینی خدمت کرتے ہیں اور دین کی خدمت کرنا قوم ہی کی خدمت ہے کیونکہ دین سب مسلمانوں کی مشترک چیز ہے جس کی خدمت سب مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے جس کو طلبۂ علم دین آپ کی طرف سے ادا کر رہے ہیں۔

اہل علم کی ذلّت کسی طرح گوارا نہیں

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ علماء کو علاوہ پڑھنے پڑھانے کے اور بھی کوئی کام آنا چاہیے جو ذریعہ معاش ہو سکے۔ بدون ظاہری وجہ معاش کے لوگ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ اس ذلّت سے بچنے کے لیے مولویوں کو کوئی کام دستکاری وغیرہ سیکھنا چاہیے پھر سیکھنے کے بعد چاہے اس سے کام نہ لیں، مگر سیکھ لیں ضرور۔ اہل علم کی ذلّت کسی طرح گوارا نہیں ہوتی۔ آجکل بددینوں کا زمانہ ہے۔ اہل دین اور علم دین کو نظر تحقیر سے دیکھتے ہیں۔ بحمد للہ یہاں پر آ کر تو سب کا دماغ درست ہو جاتا ہے۔ خر دماغوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ طلبا اور اہل علم میں بھی اسپ دماغ ہیں۔ میں جو اہل دنیا خصوص اہل مال سے اس قسم کا برتاؤ کرتا ہوں جس کو لوگ خشکی کہتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے دماغوں میں خناس بھرا ہوا ہے۔ ان گدھے دماغوں کو درست کرتا ہوں۔ اگر تمام اہل علم اور اہل دین ان کے دروازوں پر جانا چھوڑ دیں تو ایک دن میں ان کے دماغ صحیح ہو جائیں اور یہ پھر خود ان کے دروازوں پر آنے لگیں۔ خصوص اہل مدارس اگر ذرا صبر سے کام لیں تو یہ خرابی نہ رہے۔ بڑے پیمانہ

"اہل دنیا خصوصاً اہل مال کے دماغ درست ہو جائیں۔ مجھے اہل علم کی ذلت ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں مگر دل میں دل کس طرح ڈال دوں"

(الافاضات ۴، ملفوظ ۳۹ ص ۲۱)

۴۔ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ

علما سے بُعد

علماء سے ایسا بُعد ہوا کہ ان سے ملنا ہی پسند نہیں کرتے۔ مگر دو کام بغیر ان کے اس گئی گذری حالت میں بھی نہیں بنتے جب کوئی بچہ پیدا ہو تو ان کو بلا بھیجا۔ اس وجہ سے نہیں کہ خوشی کا موقع ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اتنی ساری عورتوں میں نووارد کے کان میں اذان پڑھتے شرم آتی ہے۔ یا پھر کوئی صاحب اس دار فانی کو چھوڑ چلے تو مولوی صاحب کو بلا بھیجا۔ زیادہ تر اس وجہ سے نہیں کہ مصیبت میں اللہ میاں یاد آتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ جنازہ کی نماز نہیں آتی کیونکہ سکھاتے تو کوئی مولوی صاحب ہی اور مولوی صاحب سے زندگی بھر بھاگتے رہے مگر بھاگتے کہاں تک۔ آخر ملاقات تو ایک دن ہونی ہے۔

ع بجنازہ گر نہ آئی بمزار خواہی آمد

مولوی صاحب تو چھوڑیں گے نہیں جب تک آپ مسلمان ہیں ان سے استغنا ہو نہیں سکتا۔

اولاد کے لیے تعلیم کی تجویز

علم دین کے لیے اولاد تجویز کرو تو اعلیٰ درجہ کی تجویز کرو اس بچہ کو تجویز کرو جس کے قویٰ اچھے ہوں، فہم درست ہو۔ عالی حوصلہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ آجکل غزالی اور رازی پیدا نہیں ہوتے، میں بقسم کہتا ہوں کہ اب بھی ان سے بڑھ کر پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہاں آجکل ایسے کم پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کی وجہ آپ کی غلطی ہے کہ تندرست اور صحیح الدماغ لوگوں کو عربی نہیں پڑھاتے ایسے لوگوں کو انگریزی میں ڈالتے ہیں۔ اگر انتخاب صحیح ہو تو غزالی اور رازی اس وقت بھی پیدا ہوں گے۔ غزالی اور رازی پر علم ختم نہیں ہو گیا کیونکہ قیامت سے پہلے علم کسی زمانہ میں ختم نہ ہوگا۔ نبوت کا ختم ہو جانا تو ثابت ہے لیکن ولایت اور علم کا ختم ہو جانا

کہیں ثابت نہیں لیکن جب علم دین کے واسطے منتخب وہی بچے ہوں جو نرے بے وقوف ہوں تو یہی پڑھ کر علماء کہلائیں گے پھر بڑے ہو کر عقلمند کہاں سے ہو جائیں گے۔ لوگ مولویوں کو بے وقوف کہتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بے وقوف بن کر مولوی ہوئے یا مولوی ہو کر بے وقوف بنے۔ جیسے ایک لطیفہ ہے کہ کسی مدرسہ میں ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم کی چوری کی۔ پولیس آگئی۔ اس میں سے ایک شخص جو غالباً افسر دوم تھے حیرت سے کہنے لگے کہ طالب علم بھی چوری کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں طالبعلم چوری نہیں کرتے بلکہ یوں کہیے کہ چور بھی طالب علمی کرتے ہیں۔ اس جواب کو سن کر وہ بہت محظوظ ہوئے۔ میں ڈھاکہ گیا تھا وہاں ایک اسکول کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے میری ملاقات ہوئی جو مجھ کو اسکول لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا گستاخی معاف ہو ایک بات پوچھنی ہے میں نے کہا فرمائیے؟ کہنے لگے میرے تحت میں دونوں قسم کے طالب علم ہیں۔ عربی کے بھی اور انگریزی کے بھی۔ انگریزی خوانوں میں جس کو میں دیکھتا ہوں عالی حوصلہ پاتا ہوں اور عربی خواں جتنے بھی ملتے ہیں سب پست خیال۔ میں نے کہا جناب یہ خاصیت انگریزی اور عربی کی نہیں بلکہ یہ اثر خاندانوں کے عالی اور سافل ہونے کا ہے۔ اس زمانہ میں عموماً عالی خاندان والے انگریزی پڑھتے ہیں اور عربی پڑھنے والے اکثر پست خاندان والے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ جو شخص فطری طور پر کم حوصلہ ہے وہ عربی پڑھنے سے عالی حوصلہ کیسے ہو جائے گا۔ عربی پڑھنے سے وہ کم حوصلہ نہیں ہوئے بلکہ وہ اپنی فطرت سے ہی ایسے ہیں بلکہ عربی پڑھنے سے پھر کسی قدر اصلاح ہو جاتی ہے۔ اگر وہ عربی نہ پڑھتے تو نہ معلوم کتنے پست حوصلہ ہوتے اور انگریزی پڑھنے والے انگریزی پڑھنے سے عالی حوصلہ نہیں ہوئے بلکہ چونکہ وہ اکثر شریف النسب عالی خاندان کے ہیں اس لیے عالی حوصلہ ہیں۔ چونکہ آپ نے چھوٹی قوموں کے عربی طلبہ کو دیکھا ہے اس لیے آپ کو شبہہ ہوا۔ آپ ان لوگوں کو دیکھیے جو شریف النسب

اور خاندانی ہیں اور پھر انہوں نے عربی پڑھی ہے ان کی برابر کوئی بھی عالی حوصلہ نہیں ہوسکتا۔

اصل یہ ہے کہ علم سے حوصلہ پیدا نہیں ہوسکتا، بلکہ فطری حوصلہ بڑھ جاتا ہے مگر جب فطرت ہی میں حوصلہ نہ ہو تو علم سے کہاں سے آجائے گا تو یہ غلطی پڑھانے والوں کی ہے نہ کہ علم کی۔ وہ صاحب اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا جزاک اللہ آپ نے میرا ایمان سنبھال لیا اور یہ بالکل صحیح ہے۔ میرے رجسٹر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ ہیں واقعات۔ پھر حیرت ہے کہ اپنے انتخاب میں خود تو غلطی کریں اور خود ہی عربی پڑھنے والوں پر اعتراض کریں ...... خدا جانے عقلیں کہاں ماری گئیں۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ یہ قصور مولویوں کا ہے یا اپنا۔ صاحبو! اس کی اصل وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ اس کو سن کر سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ پھر مولوی جیسے بھی ہوں مگر جب آپ کو یہ تسلیم ہے کہ دین کی اور علم دین کی مسلمانوں کو ضرورت ہے تو اہلِ دین اور علم دین سے آپ کو تنافر اور بُعد ہونا تو کسی طرح ٹھیک نہیں بلکہ ان سے مجانست اور موانست ہونی چاہیے۔ ان کے ساتھ استغنا کا برتاؤ نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنے آپ کو ان کا محتاج سمجھنا چاہیے۔ اور یہ کوئی اختراعی بات نہیں بلکہ واقعی بات ہے۔ کیونکہ کسی مذہب کا بھی آدمی ہو وہ اپنے مذہب کے اہل علم سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ ورنہ مذہب کا نام لینا ہی فضول ہے۔ جب آپ علما اور طلبہ کے محتاج ہوئے تو ان سے الگ نہیں ہوسکتے۔ پس آپ کے ذمہ یہ بات ہے کہ ان سے ملیے اور ان باتوں کی اصلاح کیجیے جو ان میں باعث بُعد و نفرت ہیں۔

سراسر آپ ہی کا قصور ہے

صاحبو! اس میں ایک اور طرح سے بھی سراسر آپ ہی کا قصور ہے اور وہ یہ کہ آپ نے طلبہ کو اس

طرح تنگ حال کیوں رکھا جس سے وہ تنگ خیال ہو گئے کہ کوڑی کوڑی پر ان کی نیت
بگڑنے لگی۔ تنگیٔ معاش ایسی بلا کی چیز ہے کہ اچھے سے اچھے آدمی کی نیت بگاڑ دیتی ہے
الا ماشاء اللہ جب آدمی کے پیٹ کو لگتی ہے تو اس کی آنکھیں ہر طرف اٹھتی ہیں اور
ذرا ذرا سی چیز پر جان دینے لگتا ہے۔ طالب علموں کو چھوڑ کر آپ اپنے حالات میں اور
اپنی برادری کے حالات میں غور کیجیے تو اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ اچھے اچھے خوش حال
لوگوں کو جب تنگی پیش آتی ہے تو نیتیں بگڑ جاتی ہیں اور معمولی ضرورتوں کے لیے وہ کام
کر بیٹھتے ہیں جن سے دنیا میں بھی منہ کالا اور آخرت میں بھی منہ کالا ہوتا ہے۔ سودی
قرض لیتے ہیں اور تیرا میرا حق دبا لیتے ہیں جس میں آخر کار مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں اور
سر بازار رسوائیاں ہوتی ہیں آخرت کا گناہ الگ سر پر رہتا ہے۔ نیز تنگ دستی میں
کہیں رشوت لیتے ہیں کسی کی امانت میں تصرّف کر لیتے ہیں۔ جب خوش حال لوگ جو
کبھی حوصلہ مند تھے ایسا کر گزرتے ہیں تو جس شخص کے پیٹ کو شروع ہی سے نہ ملے
اس کی نیت بگڑے تو کیا تعجّب ہے؟ اس لیے میں پھر کہوں گا کہ طلبہ عربی کے بدنیّت
ہونے میں بڑا قصور مسلمانوں کا ہے۔ آپ نے طالب علم کو اس طرح کیوں رکھا کہ
اس کو تنگی پیش آئے اور بات بات پر نیت بگڑے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کیوں
نہ کیا جو اپنے بچّوں کے ساتھ کرتے ہو۔ اگر آپ کا بچّہ بھوکا ننگا پھرے تو آپ کو کیوں
کوفت ہوتی ہے؟ صرف اسی وجہ سے کہ اس سے آپ کو طبعی محبّت ہے تو اگر
اپنے بچّہ سے طبعی محبّت ہے تو طالب علم سے محبّت عقلی تو ہونا چاہیے۔ بچّہ کے
بھوکا ننگا پھرنے سے اگر اس طرح عار آتی ہے کہ لوگ کہیں گے کہ فلانے کی اولاد
اس طرح پھرتی ہے تو طالب علم کے بھوکا ننگا ہونے سے یہ عار کیوں نہیں آتی کہ
لوگ کہیں گے ان کے مذہبی لوگ اس حال سے پھرتے ہیں۔

ازملفوظات حکیم الامتہ کاپی نمبر۱

کیا مسلمان سب سے زیادہ مذہب پر جان دینے والی قوم ہے؟

دنیا بھر کے خیال میں تو یہ راسخ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ مذہب پر جان دینے والی کوئی قوم نہیں ہے مگر ان کو ہمارے گھر کی خبر نہیں ان کو پہلے قصے یاد ہیں۔ ورنہ آجکل جتنے مسلمان اپنے دین سے بے فکر ہیں اتنی کوئی قوم اپنے مذہب سے بے فکر نہیں۔ بھلا یہ کیا مذہب پر جان دینا ہے کہ اپنے مذہبی لوگوں کی شکستہ حالی کی مطلق پروا نہیں۔ اہلِ ثروت ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جہاں اپنے چار بچے گھر میں پرورش پاتے ہیں وہاں پانچواں بچہ ایک طالب علم کو بھی سمجھ کر اپنے ذمہ لے لیں۔ اور اس کو اپنی اولاد کے برابر رکھیں جو اولاد کو کھلائیں وہی اس کو کھلائیں۔ جو اولاد کو پہنائیں وہی اس کو پہنائیں۔ ایک دو کے ساتھ ایسا کیجیے اور اس طرح طلبہ کو علم دین پڑھائیے۔ پھر میں دیکھوں کہ آپ کو ان کے اخلاق وغیرہ کی نسبت کیا کیا شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جب وہ خوش عیشی میں رہے گا تو اس کا حوصلہ بڑھے گا اور سیر چشم ہوگا ورنہ جو روتیہ آجکل پڑھنے کا ہے اس سے حوصلہ کیسے بڑھ سکتا ہے؟ جو شخص ہمیشہ فاقے کرتا ہے، پیسہ کی صورت کبھی دیکھتا نہیں، دوسروں کا دست نگر رہتا ہے۔ کسی کے پاس جائے تو کوئی مُنہ نہیں لگاتا۔ اس کا حوصلہ بڑھے تو کیسے بڑھے؟ غرض خود آپ نے اس کو اس حالت میں رکھا ہے اور آپ ہی نے اس کو پست حوصلہ بنایا ہے۔ پھر افسوس ہے کہ آپ ہی شکایتیں کرتے ہیں ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

رجاء الغیوب ص۴۹
۲۳ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

علماء کے باہمی اختلافِ رائے سے یہ فیصلہ کر لینا کہ فریقین کو چھوڑ دیا جائے غلط ہے	یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ علماء میں باہم سخت اختلاف

ہے۔ کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو اس کو جائز کہتا ہے۔ کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے۔ تو دوسرا اسے بدعت بتلاتا ہے۔ اب کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں تو ترجیح کی وجہ کیا، لہٰذا البعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں۔ مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورتِ اختلاف فنونِ دنیا کے ماہرین میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا۔ وہاں کسی ایک کو ترجیح دے کر کیوں پکڑا یعنی بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطبّا اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے۔ کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے کوئی کچھ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس اطبّاء میں اتفاق ہی نہیں! اب ہم کس کا علاج کریں۔ بس جاؤ مریض کو مرنے دو۔ ہم کسی کا بھی علاج نہیں کرتے وہاں ایک ایک حکیم کو ترجیح دے کر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں؟ علیٰ ہذا اپنے وکلاء کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے کیا وکلاء میں باہم اختلاف نہیں ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے۔ پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ اور سب کو کیوں نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔ لیجئے میں اس کا جواب بھی دیے دیتا ہوں جو ایک گہری بات ہے وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے۔ دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ان کو تو کسی اختلاف

کی وجہ سے، ترک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی۔ یہ قاعدہ ہے طبیعتِ انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں جان اور ایمان۔ جان چونکہ عزیز ہے۔ اس لئے اس کی صحت و حفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہلِ کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے۔ اس سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے۔ بس اس کا علاج اختیار کر لیں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں۔ اس لیے علماء کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور و تامّل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔ تو اے صاحبو! اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے، جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس آپ کو ایمان عزیز نہیں اس لئے صاف سب کو چھوڑ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے۔ اور آگے میں یہ بھی بتلادوں گا کہ ان میں سے خطا کس کی ہے۔ مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے۔ بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہو جانا چاہیئے۔ نا اتفاقی بُری چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے یا اس کے لئے کوئی قید بھی ہے۔ اگر نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہو جاتا ہے تو عدالت کو چاہیئے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعویٰ پیش

کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ دعویٰ اور انکار سے دونوں میں نا اتفاقی کا ہونا ثابت ہو گیا اور نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں مجرم ہوئے۔ اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور و غل مچا دیں گے کہ یہ کونسا انصاف ہے کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا۔ اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہئے تھا۔ تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہئے تھا کہ مدعی اور مدعی علیہ میں جو باہم مخالفت و نا اتفاقی ہے ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوگا اس کی حمایت کی جاتی۔ اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلہ سے ثابت ہو گیا کہ نا اتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں۔ بلکہ نا اتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو۔ اور جو نا اتفاقی بحق ہو وہ جُرم نہیں۔ اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہو جائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا سکتا۔ بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے اور جو بحق ہو وہ مجرم نہیں پس علماء کی باہم نا اتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے سے اتفاق کر لو غلط رائے ہے۔ بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہئے کہ حق پر کون ہے ناحق پر کون ہے۔ پھر جو ناحق پر ہو اُسے مجرم بنائیے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کرنا چاہئے۔ ورنہ اہل حق کو دوسروں کے ساتھ اتفاق پر مجبور کرنے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کر لیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا۔ تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہو جانے کی رائے دیتے ہیں اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق

ہے مجبور ہے کیونکہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ
میں آیا ہے۔ تو جناب ایسا اختلاف تو اختلاف رحمت ہے۔ اس اختلاف سے
فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا تو اختلاف ہے۔
مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں۔ کوئی ایک دوسرے پر ملامت و طعن نہیں کرتا
بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے۔ اگر ایسا اختلاف ہوتا تو مسلمانوں کو آج یہ
پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آرہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے
میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہلِ حق کے پاس کافی روپیہ ہو۔ اور وہ ان سب فرقوں کی
تنخواہیں مقرر کردیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے۔ یہ سارا اختلاف
پیٹ کی وجہ سے ہے کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے، کوئی فاتحہ پر، کوئی تیجہ دسویں
پر۔ ایک عالم سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ تم مولود و فاتحہ
کو سنّت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو۔ اور جو ان سے منع کرے اس کو بُرا بھلا
کہتے ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں (اللہ کی شان ہے کہ
اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی خیال کے
ہوں چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں) تو انہوں
نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے، ورنہ
حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے۔ میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر کھانے
پر الگ الگ فاتحہ دی جارہی ہے۔ پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوئی تو میں نے
اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و درود کے سنّت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی
سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاتحہ دیں۔ ان کو کچھ
نہ دیا جائے۔ ان سے خوب مولود پڑھواؤ اور الگ الگ ہر رکابی پر فاتحہ دلواؤ
مگر نذرانہ کچھ نہ دو۔ نہ مٹھائی کا دوسرا حصّہ دو۔ پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور

بدعت کہنے لگیں گے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا۔ تو اسی روز شام کو اگر فاتحہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول سا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو۔ ایک ہی کافی ہے۔ میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہو گیا ہوگا۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کر دو تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ یہ سب فضول قصہ ہے۔ یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون بہت زور کا ہوا تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا اور فاتحہ دلانا اور تیجہ دسواں سب موقوف ہے۔ میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہو گیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاتحہ کہاں گئے اور اب وہ تیجے دسویں کیوں نہیں ہوتے۔ کہنے لگے اجی ان باتوں کی کسے فرصت تھی۔ میں نے کہا۔ بھلا اس عدیم الفرصتی میں کسی نے جنازہ کی نماز بھی چھوڑ دی۔ اور کفن دفن بھی چھوڑا کہا نہیں۔ میں نے کہا بس سمجھ لو جو کام حذف ہو گئے وہ دین کے کام نہ تھے۔ بلکہ فرصت کی باتیں تھیں۔ اور یہ دین کے کام تھے۔ اس لئے یہ کم فرصتی میں بھی ترک نہ ہوئے۔ بس خاموش ہی تو ہو گئے۔ اسی طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اس میں سورتوں کا ثواب بھی مردہ کو پہنچ جاتا ہے۔ میں نے کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ روپے پیسے اور کپڑے میں بھی ہو سکتا ہے۔ پھر کبھی اللہ کے نام کے روپے پیسے اور کپڑے پر بھی فاتحہ پڑھی۔ کہنے لگے کبھی نہیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا سورتوں کا ثواب پہنچ جاتا۔ کہنے لگے، اجی بس سمجھ میں آ گیا۔ تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں۔ یہ سارے قصے محض آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں۔ اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بند کر دی جاوے تو پھر دیکھیے وہ بھی وہی کہنے لگیں گے جو ہم کہتے ہیں۔ اس مجلس میں میں نے سنت و بدعت کی

تحقیق بیان نہیں کی، بلکہ وہ باتیں بیان کر دی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے
ہر شخص کو باسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگرچہ بحمد اللہ سنت و بدعت کی شناخت
کے تحقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں۔ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آکر رہے تو اس کو وہ اصول
بھی بتلا دیں گے۔ غرض یہ کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں
ہو سکتا۔ بلکہ پہلے آپ حق کو متعین کیجئے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں
سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون؟ اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہو
جاوے گی، جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ
ہیں بعض تو لکھے پڑھے ہیں۔ خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھ
ہیں۔ پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں
مگر دونوں طرف کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف کے ساتھ دیکھیں
پہلے سے کسی کی طرف داری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں۔ کیونکہ اعتقاد
کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہو گی اور عیب نظر نہ آئے گا۔ سو تحقیق حق کا یہ
طریقہ نہیں۔ بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ خالی الذہن ہو کر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ
انصاف کے ساتھ کیا جائے۔ خدا کے ساتھ معاملہ ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر
دیکھنا چاہیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن
میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا جب ایک کا حق پر ہونا معلوم ہو جائے۔ تو بس اسی
سے تعلق رکھو۔ اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو۔ مگر دوسرے
کو بھی برا نہ کہو۔ کیونکہ کسی کو برا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائے گا۔ بس تم اپنی یہ

حالت رکھو ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے — چہ کنم کہ چشم بدخو نکند بکس نگاہے

دل آرامیکہ داری دل درو بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر کوئی بُرا بھی ہو تو تم اس کو بُرا نہ کہو۔ وہ اگر بُرا ہے تو تم کو کیا۔ اور اگر دوسرا تم کو بُرا کہے۔ جب بھی تم اُسے کچھ نہ کہو۔ ذوق نے خوب کہا ہے ؎

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق
ہے بُرا وہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے

اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
پھر بُرا کہنے سے کیوں اس کے بُرا مانتا ہے

یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے۔ اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا ہو دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا اس میں اُن کے پاس بیٹھیں اور اُن کی باتیں سنیں اور دیکھیں۔ جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی رغبت پیدا ہو، عبادت الٰہی کا شوق بڑھے۔ اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو۔ اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو بس اسی کو اختیار کریں۔ اسی سے ہر بات پوچھا کریں۔ اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں اور یہ طریقہ پڑھے لکھوں کو بھی بہت مفید ہے محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے۔

(اسباب الفتنہ صـ۵۷)

مجتہدین کے اختلاف کا راز

سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے اور غیر مقصود کون ہے۔ یہ کام مجتہدین کا ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے۔ اور عدم رفع بھی ثابت ہے۔ اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھے کہ رفع مقصود ہے۔ اور ترک رفع آپ نے جو فرمایا تو بیان جواز کے لئے ہے۔ مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد جو عدم رفع کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہیئے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو (یعنی سلام کے وقت) نماز میں سکون اختیار کرو۔ پس مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لئے فرمایا۔ اور جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے۔ تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ رفع جس سے منع فرمایا یہ وہ نہیں ہے، جو رکوع میں جانے اور اس سے اُٹھنے کے وقت کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا تھا جیسا بعض حدیثوں میں اس کی تشریح ہے کہ صحابہ جب نماز کا سلام پھیرتے تو ہاتھ اُٹھا کر کہتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ یہ ممانعت حضورؐ نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارہ میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس سے وہی رفع مراد ہے، مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے۔ اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے اس لئے وہ مقصود ہوگا۔ اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے اسی وجہ سے ہوا ہے۔ کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔ مثلاً آمین کہنا۔ ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آمین پکار کر کہنا ہے۔ اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جواز کے لئے اور ایک مجتہد کی رائے

ہے کہ مقصود اخفا ہے۔ کیونکہ یہ دُعا ہے اور دُعا میں اخفا مقصود ہے۔ اگر کبھی
کر کبھی کہہ دیا ہے۔ تو وہ اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ آمین بھی کہا کرتے
ہیں۔ اگر کبھی پکار کر کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آمین بھی آپ کہا کرتے ہیں جیسے کبھی کبھی
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سرّی نماز میں ایک آیت پکار
کر پڑھ دی ہے۔ تعلیم کی غرض سے۔ ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے ہے
ہے۔ یہ اختلاف کاہے سے ہُوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا
اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی
جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس یہ راز ہے اختلافِ مجتہدین کا اسی بنا پر تمام
افعال میں اختلاف ہُوا ہے۔ (احکام المال ص٣٣)

تعلیم یافتہ طبقہ کی اس رائے کا جواب کہ مولوی سب باہم متفق ہو جائیں تو سارا باہمی نزاع دور ہو جائے

واقعی یہ ایک قیمتی رائے ہے مگر اس میں ایک دھوکا ان صاحبوں کو ہو رہا ہے جس
کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اوّل اس کی ایک نظیر پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ آجکل
بدون اس کے لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ اس وقت یہ بات سب کو مسلّم ہے کہ اہل یورپ
آجکل سب سے زیادہ متمدّن ہیں بالخصوص انگریز دنیاوی اُمور میں اُن کی عقل و
فہم سب سے زیادہ حجت سمجھی جاتی ہے۔ ان کا ایک قانون ہے کہ جب کوئی عدالت
میں جا کر نالش کرے تو حاکم کو اس کی تنقیح کرنی چاہئے۔ شہادت اور ثبوت
طلب کرے اور وکلاءِ طرفین میں گفتگو ہو۔ اور اخیر تک حاکم سب کی گفتگو سنتا
رہے۔ پھر اپنی رائے کے موافق کسی ایک کو ترجیح دے کر ڈگری دیتا ہے اور اس
درمیان میں ظاہر ہے کہ ہر ایک وکیل اپنے مؤکل کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے
اور طرفین میں اچھی طرح مباحثہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کوئی

تعلیم یافتہ اس طریقہ تنقیح میں اس حاکم کو ظالم کہے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر ایک شخص اس کو عدل کے موافق سمجھتا ہے۔ پس اگر نا اتفاقی بری چیز ہے۔ تو ان وکلاء طرفین کو کیوں نہیں ملامت کی جاتی اور سب سے زیادہ اس حاکم کو ملامت کرنی چاہئے۔ جس نے اپنی کچہری میں نزاع اور بحث قائم ہونے دی اور اسی پر اپنے فیصلہ کی بنیاد ڈالی۔ مگر جب اس منازعت کو قابل ملامت نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اسی کو عین عدل کہا جاتا ہے تو اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ منازعت اور نا اتفاقی مطلقاً بری نہیں۔ بلکہ طریقہ یہ ہے کہ اول معاملہ کی تنقیح کی جاتی۔ اور قبل تنقیح کے دونوں میں سے کسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔ اور تنقیح کے بعد جو حق معلوم ہو۔ اس کا ساتھ دو۔ اور جو ناحق پر ہو اس کو ملامت کرو۔ یہ کیا کہ دونوں کو ملامت کی جاتی ہے؟ اور دونوں کو اس اختلاف کے چھوڑنے اور اتفاق کر لینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں ایسا اتفاق ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اگر حاکم بھی ایسا ہی کرے کہ دونوں فریق کو ملامت کرنے لگے تو کیسے ہو۔ مگر دنیاوی معاملات میں یہ نو تعلیم یافتہ بھی اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے اور ہمیشہ ایک فریق کا جو حق پر معلوم ہو ساتھ دیا کرتے ہیں۔ پھر دین کے بارہ میں یہ قاعدہ کیوں نہیں برتا جاتا!! اس سے ایک راز معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے دلوں میں دین کی وقعت و عظمت کوئی چیز نہیں اس لیے اس کی کچھ فکر بھی نہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر حاکم کے برابر بھی اُن کے نزدیک مذہب کی ضرورت ہوتی تو یہ ہمیشہ صاحبِ حق کی مدد کرتے یہ کیا کہ زید کو بھی ملامت عمر کو بھی ملامت اُس کو بھی اتفاق کی ترغیب اس کو بھی۔ آخر کس بات میں دونوں متفق ہوں کس بات کو قبول کریں۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جس میں اتفاق ہو سکے تو خیر۔ جب اعتقاد کا اختلاف ہے۔ ایک فریق حضرت علیؓ کو نبی سمجھتا ہے۔ دوسرا فریق ایسا نہیں سمجھتا۔ ایک فریق ابو حنیفہ رحؒ کو فقیہ مجتہد سمجھتا ہے۔ دوسرا

ان کو مخالف خدا اور رسول جانتا ہے تو اب بتلاؤ کہ اتفاق کی کیا صورت ہے دونوں کے عقائد میں تضاد ہے اب سوا اس کے کہ ایک فریق اپنا عقیدہ بدلے اس کے سوا کوئی صورت اتفاق نہیں۔ اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہ کر اتفاق ہو ہی نہیں۔ البتہ اگر مذہب و عقیدہ کوئی ضروری چیز نہ ہو۔ تو پھر واقعی ہو سکتا ہے مگر اس کو بجز ان نو تعلیم یافتہ حضرات کے کوئی عاقل بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور زبان سے تو یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگرچہ دلوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ دوسرے اس طریقہ پر دنیاوی امور میں بھی عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے مجلس میں ایک بات نکالی۔ تو اس میں بھی دو چار اختلاف کرنے والے ہو جائیں گے۔ اب اگر ان دونوں فریق کو ملامت کی جائے اور اتفاق کی ترغیب دی جائے۔ تو سو قیامتیں آجائیں گی۔ مگر اتفاق ناممکن ہوگا۔ پس آپ کا طریقہ تو ایسا ناتمام ہے کہ نہ دین میں کارآمد اور نہ دنیا میں۔ اب میں بتلاتا ہوں کہ اتفاق کیونکر ہو۔ پہلے آپ خود تحقیق کیجئے کہ صورتِ معاملہ کیا ہے۔ پھر جو حق بجانب ہو اس کا ساتھ دیجئے اور دوسرے کو ملامت کیجئے۔ اور پہلے کا تابع بنائیے۔ یہ جو دونوں کو ملامت کی جاتی ہے سخت غلطی ہے۔ اس زمانہ کے نوجوانوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ اتفاق کو محمود اور اختلاف کو مذموم سمجھ کر علماء کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپس میں اتفاق کر لو۔ پس ان کی اتنی بات تو قابلِ تسلیم ہے کہ واقعی نزاع و اختلاف بری چیز ہے۔ اس کے زائل کرنے کا جو طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کو ملامت کر کے اتفاق کی دونوں کو ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ بالکل سراسر عقل کے اور فطرت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ صاحبِ باطل کچھ صاحبِ حق کا اتباع کرے اور صاحبِ حق کچھ صاحبِ باطل کا اتباع کرے کہ پہلے ایک فریق جو خالص حق پر تھا تو اب وہ بھی باطل کا پیرو ہو جاوے۔ اس کو

فطرتِ انسانیہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ خلافِ فطرت کی تعلیم کو ہمیشہ نا قابل اشاعت سمجھتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ مدعی فطرت ہیں۔ مگر دین میں نہ معلوم وہ فطرت کیا ہو جاتی ہے جو خود خلاف فطرت کی تعلیم دیتے ہیں؟ (وحدۃ الحب صہ ۸۲)

غیر محقق واعظین عوام کو گمراہ کرتے ہیں

غیر محقق واعظوں کی تعلیم نے مخلوق کا ناس کر دیا۔ ان کی یہ حالت ہے کہ ایک واعظ نے رمضان میں کسی دیہاتی سے کہا کہ آج روزہ رکھا ہے؟ کہا ہاں رکھا ہے۔ کہا نیت بھی کی تھی؟ کہا ہاں کی تھی۔ پوچھا کس طرح کی تھی؟ اس نے بتلایا کہ سحری کھاتے ہوئے دل میں خیال کر لیا تھا کہ کل کو روزہ رکھیں گے۔ واعظ صاحب بولے یوں نہیں بلکہ زبان سے یوں کہنا چاہیے نویت الصوم للہ تعالیٰ غداً۔ دیہاتی نے کہا کہ بہت اچھا، اب سے یُوں ہی کہا کروں گا۔ اگلے دن واعظ صاحب نے دیکھا کہ چودھری صاحب چوپال میں بیٹھے حقہ بجا رہے ہیں۔ کہا میاں یہ کیا؟ رمضان میں حقہ پیتے ہو کیا روزہ نہیں ہے؟ کہا نہیں آج روزہ نہیں رکھا کیونکہ نیت یاد نہیں ہوئی۔ جب نیت یاد ہو جائے گی تب روزہ رکھوں گا۔

اس واعظ نے بیچارے دیہاتی کا کیسا ناس کیا کہ اس کو روزہ سے محروم کر دیا۔

باب چہارم

شریعت و اطاعت

فصل (۱)

شریعت کی عظمت و وسعت

پابندی شریعت کی حکمت خدا کا کلام سب سے زیادہ کامل ہے کیونکہ حالات کا سب سے زیادہ علم اسی کو ہے۔ پھر وہ باختیار مالک ہے اور تمام اشیاء میں خود مؤثر ہے۔ کوئی کیفیت اس پر غالب نہیں۔ اس لیے جو حکم اس کی طرف سے صادر ہوگا وہ نہایت کامل ہوگا۔ نہ اس کے احکام بہت سخت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اس پر کیفیتِ غضب غالب نہیں۔ نہ بہت نرم ہو سکتے ہیں کیونکہ اس پر کیفیتِ رحمت غالب نہیں بلکہ وہ باختیار خود قہار ہے اور باختیار خود رحیم و کریم ہے۔ کسی صفت میں مجبور یا مغلوب نہیں۔ بس معلوم ہوا کہ جو کلام خداوندی ہے اس کے تمام احکام افراط و تفریط سے پاک ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا پابند ہونا ہر بشر پر لازم ہے کیونکہ وہ احکام سب کے مصالح کو جامع ہیں۔ نیز ہماری یہ حالت شاہد ہے کہ جو کیفیت شدید ہوتی ہے وہ ہم کو مغلوب کر دیتی ہے۔ اس لیے ہم کو شریعت الٰہی کی پابندی ضروری ہے تاکہ ہم اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ (کمالاتِ اشرفیہ صـ ۱۰۵)

شریعت اسلامیہ کا خاص امتیاز ہر وقت میں انسان کی ایک خاص حالت ہوتی ہے اور اس حالت کے مطابق حق تعالیٰ کے کچھ احکام ہوتے ہیں۔ انسان کی کوئی حالت ایسی نہیں ہے جس کے

متعلق قرآن میں کوئی نہ کوئی حکم مذکور نہ ہو خواہ بلاواسطہ خواہ بالواسطہ حدیث شریعت اسلامیہ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ کوئی حالت اور موقعہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس شریعت میں کوئی حکم نہ ہو اور اسکا راز یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی کیا انسان چاہتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے یعنی ایسا نہیں ہوسکتا ۔ مہمل وہ ہے جس کے واسطے کوئی حکم نہ ہو۔ کوئی اس سے تعرض نہ کرے جیسے ہندو بیل کو سانڈ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں کہ چاہے وہ کھیت کھالے۔ چاہے کوئی نقصان کردے مگر اس سے کچھ تعرض نہیں کرتے اور اسے کچھ نہیں کہتے ۔

اسی طرح اگرچہ انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے اور آزادی میں اپنی راحت سمجھتا ہے کیونکہ اس میں خواہش نفسانی اچھی طرح پوری ہوتی ہے ۔ مگر حق تعالیٰ بڑے رحیم و کریم ہیں چونکہ آزادی میں اس کی مضرت تھی اس لیے اس کو آزاد نہیں کیا بلکہ اس کے واسطے احکام نازل فرما کر مقید کر دیا ۔

اگر اس کو مقید نہ کیا جاتا تو ایسی مثال ہوتی جیسے طبیب کسی مریض کو آزاد کر دے کہ جو کچھ چاہے کھائے پیئے۔ پرہیز کسی چیز کا نہیں ۔ اب ظاہر ہے کہ اس مریض کا کیا حشر ہوگا۔

دین زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتا ہے

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک قانون مقرر فرما دیا ہے اور ہر چیز کا ایک قاعدہ بتلایا ہے مگر چونکہ لوگ دین کو ناتمام طور پر دیکھتے ہیں اس لیے صرف نماز روزہ یا زیادہ سے زیادہ معاملات تک شریعت کے احکام کو وسعت دی جاتی ہے اور وضع معاشرت و اخلاق کو اس سے خارج سمجھتے ہیں ۔

نیز بعضے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور شریعت اسلام کو تہذیب سے معرا سمجھتے ہیں ۔ ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال

ہے جیسے ایک یک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی گیا۔ سیر کے لیے چاندنی چوک میں نکلا۔ اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہ مڑسکتی تھی۔ اس لئے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دکانیں نظر آئیں۔ دوسری جانب کی نظر نہ آئیں جب وہ وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دکانیں نظر آئیں۔ آپ ان کو دیکھ کر فرماتے ہیں کہ دلی کے لوگ بھی کیا ستم کے لوگ ہیں۔ ابھی یہ دکانیں داہنی جانب تھیں ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھ دیا۔ تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اس لیے وہ محتاج سمجھتے ہیں۔ ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے۔ (وعظ: مضار المعصیۃ ص ۱۰، ۱۱، ۱۲)

شریعت میں سب مصالح و مضار کی رعایت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نافع و ضار دین سے ہم کو مطلع فرما دیا ہے اور قسم کھا کر فرمایا ہے کہ کوئی چیز نافع نہ تھی جس سے میں نے تم کو مطلع نہ کیا ہو اور کوئی چیز مضر نہ تھی جس سے منع نہ کیا ہو۔ (عصم الصنوف ص ۱۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سب مضار کی رعایت فرما کر ایسی جامع مانع تعلیم ہم کو فرمائی جس میں مضرت کا نام و نشان نہیں بلکہ راحت ہی راحت ہے۔ پس مسلمان اگر شریعت کی تعلیم پر مُو بمُو چلیں تو ہمہ تن راحت ہی میں رہیں۔ روحانی راحت میں بھی جسمانی راحت میں بھی۔

ہمیں تجربہ کر کے ٹھوکریں کھا کے مصالح و مضار معلوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ شریعت کی تعلیم حاصل کریں پھر ہمیں تہذیب و تمدن میں کسی قوم کی تقلید کی ضرورت نہیں۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۰، ۳۰۹)

علومِ شریعت میں دقّت کی وجہ

انبیاء علیہم السلام کے علوم تو فی نفسہٖ سہل ہوتے ہیں، دقّت و غموض مقدمات و مبادی کی وجہ سے ہو جاتا ہے ورنہ مقاصد سہل ہی ہوتے ہیں جن کو شہری اور دیہاتی عورتیں اور مرد، جاہل اور فلسفی سب کے سب آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ مقاصدِ شرعیہ میں کوئی غموض و پیچیدگی نہیں ہے۔ ہاں جب ان پر دلائل قائم کیے جائیں اور ان کے مقدمات و مبادی پر کلام کیا جائے تو اس وقت دقّت و غموض ہو جاتا ہے مگر دلائل و مقدمات قائم کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ بعض لوگ ان مقاصد میں شبہات نکالنے لگتے ہیں۔ اگر شبہات پیدا نہ کیے جائیں تو نفسِ مقاصد علومِ انبیاء میں سہل و آسان ہی ہوتے ہیں۔

(جمال الجلیل صہ ۳)

کمالِ شریعت: وسعت جامعیت

شریعت کا مختصر ہونا حقیقت میں بیاس کا نقصان ہے۔ کمالِ شریعت یہی ہے کہ اس میں تمام انسانی حالات کے متعلق مفصل قواعد موجود ہیں۔ کوئی جزئی ایسی نکلنی ممکن نہیں جس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ہو۔ جب ایک سلطنت کے قانون کا مکمل ہونا اس کا عمدہ وصف ہے تو خدا کے قانون کے لیے نقصان کیوں تجویز کیا جاتا ہے۔

(حقوق اللہ والضراء صہ ۱۰)

بدون مشقت کچھ نہیں ہوتا

فرمایا کہ اگر صحیح طریقہ سے کام کرنا چاہیں، افراط و تفریط نہ کریں تو میں سچ عرض کرتا ہوں کہ دین میں بہت آسانی ہے۔ اب تو جو اڑا ڈال کر بالکل الگ ہو گئے۔ یہ چاہتے ہیں کہ کچھ بھی نہ کرنا پڑے خود بخود سب کام ہو جائیں۔ دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز تو بدون مشقت کے حاصل ہوتی نہیں، دین کیسے حاصل ہو جائے۔ آدمی کچھ تو کرلے پھر نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔

(الافاضات ج ۳ صہ ۱۹۰ ملفوظ ۳۰۷)

تمام احکام تقاضائے طبیعت کے موافق ہیں

تمام احکام شرعیہ تقاضائے طبیعت کے موافق ہیں۔ صرف حدود میں طبیعت منازعت کرتی ہے مگر یہ منازعت بھی بیجا ہے کیونکہ ہر کام کے لیے حدود کا ہونا ضروری ہے۔ بدون حدود کے کوئی چیز مستحسن نہیں خصوصاً جبکہ یہ دیکھا جائے کہ حدود شرعیہ سے آگے ہلاکت ہے۔ اور اگر کہیں طبیعت کو کسی حکم سے موافقت نہ ہو تو اس عدم موافقت کا سبب حقیقت کا معلوم نہ ہونا ہے ابعد علم حقیقت کے ضرور طبیعت کو اس حکم کا خود تقاضا ہو گا۔ اور یہاں سے یہ معلوم ہوگا کہ احکام شرعیہ کی مخالفت سے دنیا کی بھی بے حلاوتی ہے کیونکہ یہ مخالفت کرنے والا خود اپنی طبیعت کے خلاف کام کر رہا ہے اور اس سے بڑھ کر کیا بے حلاوتی ہوگی کہ طبعی تقاضہ کو مردہ کیا جائے۔

(عصم الصنوف صلا ۴۶)

احکام شریعت فی نفسہ آسان ہیں

لوگ شریعت کے احکام کو بہت سخت بتلاتے ہیں حالانکہ سخت قانون کی علامت یہ ہے کہ اگر سب مامورین متفق ہو کر بھی اس پر عمل کرنا چاہیں تب بھی دشواری ہو مثلاً دیانات میں بجائے پانچ وقت کے پچاس وقت کی نماز مقرر ہوتی اور زکوٰۃ میں بجائے چالیسواں حصہ دینے کے نصف دینا واجب ہوتا اور معاملات میں مثلاً تجارت پر ایک خاص نفع مقرر کر دیا جاتا کہ اس سے زائد لینا جائز نہ ہوتا یہ البتہ سختی ہوتی۔ اور اب تو جو کچھ دشواری اور مشکل پیش آرہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کی معاشرت خراب ہو رہی ہے، یعنی ایک شخص عمل کرتا ہے اور دس عمل نہیں کرتے اور چونکہ اس ایک کو انہیں دس سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے اس کو دشواری پیش آتی ہے اور اگر سب متفق ہو کر اس پر عمل کریں تو کچھ بھی دشواری پیش نہیں آتی۔

(دعوات عبدیت جلد ۲ صلا ۲۸۴)

تنگی پیش آنے کی وجہ

فرمایا تنگی شریعت میں نہیں بلکہ آپ کے طرز معاشرت میں تنگی ہے کہ آپ کا سابقہ ایسی قوم سے پڑا ہے جو دین سے آزاد ہے اور دین پر چلنا نہیں چاہتی اور جہاں غلبہ ایسے لوگوں کو ہو وہاں دین پر چلنے والے کو تنگی ضرور لاحق ہوگی۔ گو دین کے احکام کتنے ہی سہل ہوں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عاقل احمقوں میں پھنس جائے تو اس کو مقتضائے عقل پر عمل کرنا دشوار ہوگا وہ کیسا ہی سہل ہو کیونکہ احمق لوگ اس سے مزاحمت کریں گے۔ مثلاً شادی میں فضول رسمیں نہ کرنا مقتضائے عقل ہے اور یہ سہل بھی ہے۔ مگر چونکہ سابقہ جُہلاء اور حُمقاء سے ہے اس لیے عاقل کو تنگی پیش آتی ہے کہ اس کی کوئی بات نہیں چلتی۔

(الصبر و الصلوٰۃ صہ ۵۰۶)

علماء سے ناراضگی کا سبب

مثنوی میں مولینا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بوڑھا آدمی حکیم کے پاس جاکر کہنے لگا کہ میری آنکھوں میں کمزوری ہے۔ کہا بڑھاپے سے، کہا میرا دماغ خالی سا ہوگیا۔ کہا بڑھاپے سے، کہا میرے ہاتھ پاؤں میں درد رہتا ہے۔ کہا یہ بھی بڑھاپے سے، بڈھے نے جھلا کر حکیم کے ایک دھول رسید کی کہ نامعقول تو نے بڑھاپے کے سوا حکمت میں کچھ اور بھی پڑھا ہے۔ حکیم نے ہنس کر کہا کہ میں آپ کے غصہ کا برا نہیں مانتا یہ غصہ بھی بڑھاپے سے! اسی طرح آپ کو جو علماء کے اس جواب سے کہ سود حرام ہے، رشوت حرام ہے۔ اجارۂ مجہولہ حرام ہے، غصہ آتا ہے اس کا سبب وہی جہل اور معاشرت کی تنگی ہے کہ آپ ایسی باغی جماعت کے اندر گھسے ہوئے ہیں جو اعمال قبیحہ اور افعال ظلم کے عادی اور جرائم کے خوگر ہیں ورنہ شریعت میں کوئی تنگی نہیں۔

(التیسیر للتیسیر صہ ۱۳)

الدین یسر دین کے آسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں اگر کسی کو شبہ ہوتا ہے تو حقیقت کے نہ سمجھنے سے ہوتا ہے حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت احنفیہ کا جو مذہب ہے مفقود الخبر کے متعلق اس میں حرج ہے حالانکہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ فرمایا گیا ہے. فرمایا ہاں جی واقعی اس میں بڑا حرج ہے اور جہاد میں اس سے بھی زیادہ حرج ہے جان دینی پڑتی ہے اس کو بھی دین سے خارج کرو. فرمایا کہ مولانا نے خوب ہی جواب فرمایا واقعی اگر ایسا ہی ہے تو پھر تو کوئی چیز بھی اس حرج سے خالی نہ ملے گی۔

(الافاضات ج ۴ ص ۲۶۸، ملفوظ ۴۲۲ - ۲۶ شوال ۱۳۵۰ھ)

شریعت اسلامیہ کا امتیاز ذرا غور سے کام لیجیے تو معلوم ہوگا کہ شریعت میں کیا حصہ سہولت ہے جبکہ ضروریات اور آسائش و آرائش سب کی اجازت ہے تو بجز فضولیات کے اور کونسی چیز باقی ہے جس کے اعتبار سے شریعت میں تنگی کہی جائے۔ فضولیات سے روکنا کسی عاقل کے نزدیک بھی تنگی نہیں ہو سکتی۔ میں تو کہتا ہوں ایسا وسیع کوئی قانون نہیں جیسی شریعت ہے۔ ممنوعات صرف وہ امور رہ گئے ہیں جو آدمی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ تو کیا مہلکات سے منع کرنا بھی تنگی ہے؟ اسی پر تو شکایت ہے کہ باوجود اتنی وسعت کے بھی تجاوز کیا جا رہا ہے۔ ہم لوگ اتنا بھی نہیں کرتے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے اتنا سوچ لیا کریں کہ یہ ضرورت میں داخل ہے یا آسائش میں یا آرائش میں یا ممنوعات میں اگر اتنا ہی کریں کہ ممنوعات کو چھوڑ دیا کریں تو کوئی شکایت کا موقع نہ رہے۔ لیکن صبح سے شام تک صرف دو ہی چار دن محاسبہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ کوئی دن ممنوعات سے خالی نہیں رہتا۔ آخر سوچیے تو یہ ممنوعات کیوں صادر ہوئے؟ ہر فعل کا ایک منشا ہوتا ہے اس کا منشا سوائے اس بات کے اور کیا ہے۔ جس پر دیر سے تقریر ہو رہی

ہے کہ ہم کو موت کا خیال نہیں اور ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی ہے کہ ابھی عمر بہت ہے۔ غرض قانونِ شرعی تو خاطر خواہ وسیع ہے۔ یہ الزام اس پر نہیں آتا کہ اگر ہم کو یاد کر کے شریعت کو دستور العمل بنالیں تو دنیاوی زندگی بھی نہ ہو سکے گی۔ شریعت تو اکثر چیزوں سے روکے گی؟ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ شریعت پر چلنے سے کوئی ضروری اور مفید کام بند نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ گمان غلط ہے کہ سب چیزیں چھوٹ جائیں گی ضروریات کے سامان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ آسائش اور آرائش تک میں بھی مضائقہ نہیں لیکن کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ کوئی کام ایسا نہیں ہو سکتا جس کے لیے کوئی حد نہ ہو۔ دیکھیے کھانا کتنا ضروری ہے کہ موقوف علیہ حیات کا ہے اس کی بھی حد مقرر ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ مطلق العنان ہو کر کھائے اور جو کوئی اس کو ٹوکے تو جواب میں یہ کہے کہ تم کھانے جیسی ضروری چیز سے منع کرتے ہو تو بتلائیے آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔ یہی نا کہ ہم قدرِ ضرورت سے منع نہیں کرتے بلکہ حد سے آگے بڑھنے کو منع کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ مبتلائے ہیضہ ہو کر مر جاؤ گے ـــ میں کہتا ہوں کہ شریعت کو بھی ہم سے اسی بات کی شکایت ہے کہ ہم لوگ دنیا کے سامان میں قدرِ ضرورت و قدرِ راحت پر بس نہیں کرتے بلکہ ہم کو دنیا کا ہیضہ ہو گیا ہے جس سے ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے منصوبوں کے لیے ایسی آزادی کیوں اختیار کر لی کہ اس کے لیے کوئی معیار اور طریقہ ہی نہیں رہا۔ کوئی اندازہ تو ہونا چاہیے۔ دیکھیے میں شکایت کے لیے ایک نظیر دیتا ہوں جس سے بہت افسوس ہو گا۔ بیمہ کمپنی جس کی بنا ہی طولِ امل پر ہے اور جس کو ہم لوگ جُوا کہتے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیجیے کہ جب کوئی بیمہ کراتا ہے تو کمپنی والے کیسی کیسی شرطیں کراتے ہیں۔ قویٰ کو دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹروں کو دکھلاتے ہیں۔ بہت سے اصول ہیں جن کی پابندی کے بعد بیمہ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظ میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ بہت سی شرطوں اور قاعدوں کے

امتداد عمر کو تسلیم کرتے ہیں تو جس جماعت کے تمام افعال کی بناء امتداد عمر پر
ہو اس کے واسطے کچھ قواعد ہوں اور تعجب کی بات ہے کہ وہ مسلمان جو امتداد
عمر کے قائل ہی نہیں اور اس کو خیال باطل سمجھتے ہیں ان کے لیے کوئی بھی قاعدہ
نہ ہو اور ان کے افعال ایسے ممتد ہوں کہ قائلین امتداد کے افعال بھی اس کے برابر
نہ ہو سکیں۔ حیرت کی بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ ہر وقت کو وقت آخر بھی
نہ سمجھیں تب بھی کسی قاعدہ پر تو آپ کو چلنا چاہیے۔ طبیب یا ڈاکٹر سے اپنی عمر کا
اندازہ کرائیے۔ یا قویٰ سے اندازہ کر کے کام کیجیے۔ پھر دنیا کو اتنا ہی پھیلائیے کہ
طبیب یا ڈاکٹر کے بتلائے ہوئے وقت تک کے لیے کافی ہو اور دین کی بھی ذمہ داریاں
اسی میں پوری کیجیے۔ شکایت تو اسی کی ہے کہ اس طرف مطلق خیال ہی نہیں۔ کسی نے
اتنا ہی کر کے دکھایا ہوتا تب بھی ہم معذور سمجھتے۔ بیمہ کمپنی والے کو تو ایک طریقہ
اور انداز کی ضرورت ہو اور دیندار کو ضرورت نہ ہو تعجب کی بات ہے۔ غفلت اسی
کو کہتے ہیں کہ ایک بات مسلّم ہے لیکن اس کے مقتضا پر عمل نہیں۔ بیمہ کمپنی کو ہم
جواریوں کا مجمع کہتے ہیں لیکن اس میں قواعد کا انضباط اور اپنے تمام افعال کی دیکھ بھال
اور تجدید کرنا کوئی کام بے سوچے سمجھے نہ کرنا جو قواعد مقرر کر لینا اس کا ذمہ دار رہنا بلفظ
دیگر عہد کو پورا کرنا یہ لاکھ روپے کی بات ہے۔ اور جو اپنے کو دیندار کہیں ان میں
کسی بات کی بھی پابندی نہیں۔ نہ ان کے قول کا اعتبار نہ فعل کا۔ کیونکہ جو بات تمام
عیبوں کی جڑ ہے وہ ان میں موجود ہے۔ یعنی آزادی اور غفلت۔ اور اس جواری میں
ایک عیب ضرور ہے مگر تمام ہنروں کی اصل بھی موجود ہے۔ یعنی پابندی اور
اپنے افعال کی نگہداشت۔ ان ثقہ لوگوں میں غفلت ہے اور اُس جواری میں تیقظ
(بیداری) دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ افسوس کہ ہم اس جواری کے برابر بھی نہیں
اس صفت میں وہ ہم سے اچھا ہے۔ اسی مضمون میں عراقی کا شعر ہے ؎

بقمار خانہ رفتم ہمہ پاک باز دیدم
چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

یہ شعر تھا تو اور مقام کا مگر یہاں خوب کھپ گیا یعنی ایک خاص صفت پاکبازی کی یعنی وفائے عہد قمار خانہ والوں میں ایسی پائی جو صومعہ والوں میں نہیں تھی۔ اب اس شعر پر کوئی اشکال نہیں رہا۔ کیونکہ وہ ہر حیثیت سے ان کو پاکباز نہیں کہتے بلکہ صرف ایک صفت کے لحاظ سے پاکباز کہہ دیا ہے اور اس سے حدیث جس شخص نے نماز قصداً ترک کر دی وہ کافر ہو گیا۔ پر سے بھی اشکال رفع ہو گیا۔ معنی یہ ہوئے کہ تارک صلوٰۃ میں ایک فعل کفار کا موجود ہے یعنی ترک صلوٰۃ کیونکہ یہ کام کفار ہی کا ہے۔ اس وجہ سے اس پر کفر کا اطلاق فرما دیا۔ اس سے تارکِ صلوٰۃ کا کافر ہونا لازم نہیں آیا۔ جیسے جواریوں میں ایک صفت پاکبازوں کی ہونے سے ان کا پاکباز ہونا لازم نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ باوجود دیندار کہلانے کے غفلت میں مبتلا ہیں جو ام الامراض ہے نماز، روزہ سب کچھ کرتے ہیں مگر یہ غفلت ضرور ساتھ رہتی ہے۔ نماز میں ہیں مگر اس کا تصور کبھی بھی نہیں آتا کہ ایک دن تو مر جائیں گے۔ لاؤ نماز ٹھیک طور سے پڑھ لیں ایمان سے کہیے اور دل کو ٹٹول کر دیکھ لیجیے کہ کبھی بھی یہ خیال آتا ہے۔ آخر جب ایک بات یقینی ہے تو تمام عمر میں کبھی تو اس کا واہمہ گزرنا چاہیے تھا۔

(دواء العیوب صہ ۲۴)

مقصودِ شریعت شریعت کا مقصود یہ ہے کہ خدا کے بندے اور غلام بن کر رہو۔ جہاں وہ آزادی دیں وہاں آزاد رہو اور جہاں پابند کر دیں پابند ہو جاؤ۔ مثلاً کھانے پینے میں چند چیزوں کی ممانعت ہے۔ غیر کا مال مت کھاؤ، رشوت، سود نہ لو، مُردار اور خبیث چیزیں نہ کھاؤ۔ اس کے بعد طیبات سب حلال ہیں، جو قاعدہ کے موافق حاصل کی جائیں اور استعمال میں لائی جائیں۔ اگر موازنہ کیا جائے تو

...ت کا حصہ زیادہ ملے گا اسی طرح لباس میں حریر مردوں کو حرام ہے اور کفار وفساق اور عورتوں کے ساتھ تشبہ ممنوع ہے اس کے بعد سب قسم کے لباس جائز ہیں بشرطیکہ اسراف اور تکبر کو دخل نہ دیا جائے۔

حضرت ابن عباس کا مقولہ ہے: کل ماشئت والبس ماشئت ما اخطاک اثنتان الاسراف والمخیلة۔

اسراف میں سب ممنوع لباس آگئے کیونکہ اس میں حد سے تجاوز ہے یہی قید ترک اسراف وخیلاء کی سب جگہ ہے۔ مگر بعض لوگ شیخ سعدی کے شعر ؎

در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش
تاج برسر نہ و علم بردوش

کو عام لیتے ہیں کہ جو چاہو پہنو۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ ہرگز مراد نہیں کیونکہ اس مطلب سے تو خود سعدی متروک ہوجائیں گے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام جس شخص کا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے خلاف ہو خود اس کے لینے کے دینے پڑجائیں گے۔ حضورؐ کے احکام باطل نہیں ہوسکتے۔ اس لیے سعدیؒ کے شعر کو عموم پر محمول کرنا غلط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ عمل کی درستی کے ساتھ خواہ لباس فقیری ہو یا لباس امیری سب جائز ہے۔ بشرطیکہ شرعاً مباح ہو پس سعدیؒ کا مقصود مباحات میں وسعت دینا ہے نہ کہ محرمات میں۔ چنانچہ آگے دوسرے مصرع میں اس کی تفسیر موجود ہے کہ خواہ امیرانہ لباس پہنو یا غریبانہ دونوں جائز ہیں۔ اب اس شعر کا حاصل وہی ہے جو ابن عباسؓ کے قول کا حاصل ہے۔

(وعظ: العشر)

شریعت کی خاصیت: بقاء نظام عالم ہمارے پاس جتنی چیزیں ہیں وہ سب درحقیقت حق تعالیٰ کی ملک ہیں گو وہ ہم کو ہبہ بھی کر

دیں کیونکہ اس ہبہ کے بعد بھی پھر ان ہی کی ملک ہے جیسے مالک اپنے غلام کو ہبہ کرے تو وہ محض صورت ہے ہبہ کی حقیقت نہیں ہبہ کی۔ مگر اس صورت میں یہ حکمت ہے کہ اس سے دوسروں کو منع کر دینا ہے کہ کسی کا کوئی اچکن نہ اتار سکے۔ کوئی کسی کی ٹوپی نہ اتار سکے، کوئی کسی کی بیوی نہ چھین سکے۔ حاصل یہ ہے کہ دوسرا تصرف نہ کر سکے اگر یہ بات نہ ہوتی تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ کیونکہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی ملک ہیں اور سب اس کے بندے ہیں۔ جو چیز جس کے ہاتھ میں آئے لے سکتا ہے۔ اس لیے یہ صورت ہبہ کی تجویز فرمائی اور اس کا یہ قانون مقرر کیا کہ یہ صورت بھی مانع ہے۔ دوسروں کے تصرف سے اسی قانون کا نام شریعت ہے پس یہ شریعت ہی کے خواص میں سے ہے کہ نظام عالم باقی رہے کسی قسم کا فساد نہ ہو۔ ورنہ بدون شریعت کے اگر صرف حقیقت ہی پر عمل ہوتا تو حقیقت تو وہی تھی کہ ہر چیز خدا تعالیٰ کی ملک ہے تو سب سے اول ان ہی شاہ صاحب کی گدڑی اترتی جو شریعت کی نفی کر کے حقیقت بگھار رہے ہیں۔ غرض قانونِ حقیقت کی بناء پر تو اول شاہ صاحب ہی کا خرقہ اترنا چاہیے تھا۔ سو عالم کا یہ نظم شریعت مقدسہ ہی کی بدولت ہے۔ ورنہ سب درہم برہم ہوتا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس شعر کی شرح میں یہ مضمون فرمایا تھا ؎

فاش اگر گویم جہاں برہم زنم — سرِ پنہاں است اندر زیر و بم

پس ان حکمتوں کی بناء پر شریعت کو ظاہر فرما دیا گیا اور حقیقت کو مستور فرما دیا گیا۔

(الافاضات ج ۵ ص ۳۲۶ ملفوظ ۵۴۵)

شریعت کا کوئی جزو بھی حقیقت سے معارض نہیں

جدید تحقیقات والوں نے علماء کو نیچا دکھا دیا مگر ہماری شریعت کا ایک جزو بھی ایسا نہیں کہ کوئی بھی اس سے کسی واقعی امر کا معارضہ کر سکے اور معارضہ

ہو تو کیونکر ہو وہ خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ کسی محدود العلم انسان کی بنائی ہوئی تھوڑی ہے۔ اور خدا تعالیٰ محیط ہیں تمام واقعیات کو پھر اس کے اخبار میں معارضۂ واقعیات کا کیونکر احتمال ہو سکتا ہے۔

(روح الجوار صـ۳۵)

ہر چیز کا حسن و قبح خدا تعالیٰ کے فرمانے پر ہے۔ (ارجاء الغیوب صـ۲۴)

اصولِ شریعت

اصولِ شریعت کے چار ہیں: قرآن شریف[1]، حدیث شریف[2]، اجماع[3]، قیاس[4]۔ جب کسی حکم کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حکم شریعت سے ثابت ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ حکم ان چاروں میں سے کسی ایک سے ثابت ہے۔ اگر کسی سے بھی ثابت نہ ہو تو حکم شرعی کہنا غلط ہوگا۔ اس کی تائید کے لیے میں ایک قانونی نظیر بیان کرتا ہوں۔ ایک شخص نے عدالت میں جا کر کسی دوسرے شخص پر ایک دعویٰ کیا۔ عدالت نے اس سے دعویٰ کے گواہ طلب کیے اور اس نے قانون کے موافق گواہ پیش کر دیے۔ جن پر کسی قسم کی جرح نہیں ہو سکی۔ کیا اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق ہے کہ وہ یوں کہہ سکے کہ میں ان گواہوں کی گواہی تسلیم نہیں کرتا۔ اگر صاحب جج خود آ کر گواہی دیں تو میں تسلیم کروں گا۔ اگر کوئی مدعا علیہ ایسا کہے تو عدالت یہی جواب دے گی کہ یا تو ان گواہوں میں جرح کرو یا دعویٰ تسلیم کرو۔

وجہ اس جواب کی یہ ہے کہ اثبات دعویٰ کے لیے مطلق حجت کی ضرورت ہے حجتِ خاص کی ضرورت نہیں ہے۔ پس کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میں فلاں حکم کو قرآن ہی سے مانوں گا۔ حدیث یا اجماع وغیرہ سے تسلیم نہ کروں گا۔ البتہ اگر کسی حدیث یا اجماع میں جرح کرے تو اس کا حق ہے اور علماء اس جرح کا جواب دینے کے ذمہ دار ہیں۔

(تقویم الزیغ صـ۱۶)

حدیث سے استغنا نہیں ہو سکتا

حدیث سے کیونکر استغنا ہو سکتا ہے اگر حدیث کو نہ مانا جائے تو رکعات کی تعداد یا اوقات نماز کی

تعیین کس طرح معلوم ہوگی۔ اگرچہ اوقات خمسہ کا ذکر قرآن شریف میں ہے لیکن وہ اس طرح کہ جس کو پیشتر سے معلوم ہو وہ ان پر منطبق کر سکتا ہے۔ ورنہ خود قرآن سے بلا مدد حدیث تعیین نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن میں صراحۃً نہیں ہے اشارات ہیں اور تعداد رکعات کا اشارہ بھی نہیں۔ (اور یوں زمین کا آسمان مان لیا جائے تو اس کو ثبوت با القرآن کہا جائے گا۔ مثلاً ایک صاحب نے تعداد رکعات کو قرآن کی اس آیت سے ثابت کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ اور کہا ہے کہ اس آیت سے نماز کا دو رکعت اور تین رکعت اور چار رکعت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کہاں فرشتوں کا ذکر کہاں رکعات کی تعداد! یہ سب نفس کا زیغ اور کید ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ) نفس کا کید ایسی بلا ہے کہ بہت سی اصلاح کرنے سے بھی دفع نہیں ہوتا۔ اور جس نے اصلاح ہی نہ کی ہو اس کے کید کے دور ہونے یا سرے سے کید نہ ہونے کی تو کیا امید ہو سکتی ہے۔

اور وہ کید یہ ہے کہ نفس نے دیکھا کہ حدیث و فقہ میں احکام بکثرت ہیں اور ان سب پر عمل ہونا دشوار ہے اس لیے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ ان سب کو چھوڑ دو صرف قرآن شریف کو لو۔ اور اپنی مرضی کے موافق تفسیر کر و کہ جس سے کچھ کرنا ہی نہ پڑے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں اعمالِ کیمیاوی کی بہت ترقی ہوئی کہ دین کا بھی ست نکل آیا۔ صاحبو! جس کو طلب شریعت ہوگی وہ کبھی ایسی ترکیبیں نہیں نکال سکتا۔ جس کو بھوک کی شدت ہوتی ہے وہ زیادہ کا طالب ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ موجود کو بھی اڑانے کی فکر کرے۔ جب طلب ہوتی ہے تو موجودہ ذخیرہ کو سن کر بھی تمنا ہوتی ہے کہ کچھ اور ہوتا اور جب طلب نہیں ہوتی تو سب میں اختصار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تفسیر بالرائے کی جاتی ہے۔

(التقویم الزیغ ص۱۲)

دین کی حقیقت لذّت و راحت ہے

صاحبو! لوگوں کو دین کی حقیقت معلوم نہیں۔ اس لیے وہ اس کو دشوار سمجھتے ہیں مگر بخدا دین کی حقیقت لذّت و راحت ہے۔ ذرا اس پر عمل کر کے دیکھو تو ہر کام میں لذت و راحت معلوم ہو گی۔ اسی لیے حضور فرماتے ہیں کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ صاحبو! نماز اور ذکر میں وہ لذّت ہے کہ اس کی مستی میں ذاکر ساری پریشانیاں بھول جاتا ہے۔ آپ ذرا احکام شرعیہ پر عمل کر کے دیکھیں انشاء اللہ لذّت و راحت ہی حاصل ہو گی۔ باقی جو نماز میں کچھ عارضی مشقت پیش آجاتی ہے۔ یہ "یسر" کے خلاف نہیں کیونکہ ایسے اتفاقات تو آسان سے آسان کام میں بھی پیش آجاتے ہیں۔ کیا کھانا کھانے میں کبھی لقمہ نہیں اٹکتا یا پانی پیتے ہوئے پھندا نہیں لگتا تو پھر ان کو بھی دشوار کہنا چاہیے۔ صاحبو! جب یہ بات ہے پھر چاہیے تو یہ تھا کہ حق تعالیٰ مسجد میں آنے کی آپ سے فیس لیتے کیونکہ یہاں آکر نماز پڑھ کر تم کو راحت ہوتی ہے۔ اس راحت پر فیس لگ سکتی ہے۔ مگر وہ تو ایسے کریم ہیں کہ تم کو راحت پہنچا کر اس پر بھی خود ثواب دیتے ہیں کہ تم نے راحت حاصل کر لی اس کا انعام لو۔ کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ وہ کس کس طرح ہم کو راحت دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جو لوگ اندھیرے میں چل کر مسجد میں آتے ہیں ان کو قیامت میں نورِ کامل حاصل ہونے کی بشارت دے دیجیے۔

(وعظ: العبد والوعید)

جمالِ شریعت

عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی کسی جرم کا مرتکب ہو تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن قواعدِ شریعت بعض معاصی کی نسبت جو کہ جرائم ہیں یہ تجویز کرتے ہیں کہ چھوڑنے میں جلدی نہ کرو۔ پہلے کوئی اس کا بدل تجویز کر لو اور اس زمانہ تک اپنے کو گنہگار سمجھ کر استغفار کرتے رہو۔ پھر جب دوسرا انتظام ہو جائے تو اس کو چھوڑ دینا۔ بھلا دنیا کا کوئی قانون بھی ایسا ہے جس میں یہ سہولت ہو۔

واللہ العظیم شریعت میں وہ حسن وجمال ہے، وہ لطف ہے کہ اس کی نسبت بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

مگر افسوس لوگوں نے کبھی شریعت کو تحقیق کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس لیے وہ لوگوں کو ایک خونخوار دیو نظر آتا ہے۔ صاحبو! شریعت آپ کی دستگیری کرنے والی ہے بعض جزائم تک میں مثلاً ناجائز نوکری میں یہ اجازت ہے کہ اگر اس وقت کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا اور کوئی سبیل نہیں نکل سکتی تو پہلے اس کا انتظام کر کے پھر چھوڑ دینا۔ اور اگر اس پر بھی شریعت سے وحشت ہوتی ہے تو ہم ذمہ دار نہیں۔ (ضرورۃ العلماء صـ۲)

شریعت کی روح نکال لی ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ کہہ دیجیے کہ مجھ کو امر کیا گیا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے اور آپ اس کے مامور ہیں تو وہ کیسا بڑا امر ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ۔ اس میں ایک بہت بڑا مسئلہ تصوف کا حل ہو گیا ہے۔ آج کل ایک فرقہ ہے جس نے تمام شریعت کی تمام روح نکال لی ہے اور واقعی روح ہی نکال دی اور اپنی طرف سے دین کو مُردہ کر دیا۔ لیکن اَللّٰہُ یُتِمُّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ۔ خدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔ اگرچہ بددین لوگ ناگواری ظاہر کرتے رہیں۔ وہ لوگ احکام و عبادات کو بے کار سمجھتے ہیں۔ نماز کا خلاصہ نکالا ہے ذکر کہ بس خدا کی دُھن لگی رہنی چاہیے نماز کی کیا ضرورت ہے۔ زکوٰۃ کا خلاصہ یہ نکالا کہ ہمدردی ہونا چاہیے روپیہ غریبوں کو دینے کی ضرورت نہیں۔ حج کا خلاصہ یہ نکالا کہ تعلقات قطع کر دینا چاہیے۔ مکہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غرض تمام عبادات میں اخلاق کو اصل سمجھا ہے اور اعمال کو بیکار کر دیا۔ اس آیت میں ان کا جواب موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں اُمِرْتُ

کا مفعول ان اعبد کو بنایا ہے اور مخلصا لہ الدین اس کا حال ہے اور حال میں اصل یہی ہے کہ عامل کی قید اور اس کے تابع ہوتا ہے۔ الا بدلیل مستقل۔ تو اخلاص کو عبادت کا تابع بنایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عبادات اصل ہیں اور احوال و کیفیات و اخلاق اُن کے تابع ہیں۔ اب کسی کا کیا منہ ہے کہ احکام و عبادات کو بیکار کہے۔ سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے۔ جا بجا عبادات کی تاکید اور اُن کے ترک پر دھمکی ہے۔ ہاں کسی کو قرآن پر ہی ایمان نہ ہو وہ جو چاہے کہے۔

(وعظ الحج مبرور صنا۹)

حکمت و علت میں فرق

فرمایا کہ اکثر لوگوں میں یہ مرض ہے کہ وہ احکام شرعیہ کی علل تلاش کیا کرتے ہیں اور جب علت نہیں ملتی تو حکمت کو علت سمجھ کر اسی کو معترضین کے جواب میں بھی پیش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ علت مایترتب علیہ الحکم کو کہتے ہیں اور حکمت خود مرتب علی الحکم ہوتی ہے۔ تو دونوں جدا جدا ہیں۔ نیز تعیینِ حکمت جہاں منصوص نہ ہو چونکہ تخمینی امر ہے اس لیے اس میں جانبِ مخالف کا قوی احتمال باقی ہے۔ پس اگر کسی وقت یہ حکمت مخدوش ہو جائے تو اس سے حکمِ خداوندی بھی مخدوش ہو جائے گا۔

سلامتی کی روش یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ احکام میں حکمت تو یقیناً ہے لیکن تعیین جہاں شارع علیہ السلام نے نہیں کی وہاں ہم بھی نہ کریں اور محض امتثالِ حکم باری سمجھ کر کرتے رہیں۔ (دعوات جلد ۲۔ مقالات ۱۴۔ ص ۲۵۷)

دین میں تحریف کی کوششیں

افسوس آجکل تو پوچھنے والوں کی یہ حالت ہے کہ مسئلہ پوچھتے ہیں محض اس غرض سے کہ ہمارے خیال کے موافق اس مسئلہ کو حل کر دیا جائے اور جو لوگ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور ریفارمر سمجھتے ہیں وہ تو پوچھتے بھی نہیں بلکہ خود بخود بے دھڑک تحریف کرتے ہیں۔ گویا دین ان کے

گھر کا قانون ہے جو چاہا بنا دیا اور لیاقتوں کی یہ حالت ہے کہ ایک مصنف صاحب نے "حرم الربوا" کی یہ کتربیونت کی کہ ربوا الضم را کہا اور اس کے معنی ربودن سے مشتق کر کے "اچکنے" کے کیے اور کہہ دیا کہ قرآن میں کہیں سُود کی حرمت ہے ہی نہیں اس آیت میں تو غصب کی حرمت ہے اور "را" کے کسرہ کو مولویوں کی گھڑت بتایا اس عقلمند نے اس کی بھی ضرورت نہیں رکھی کہ قرآن میں لفظ عربی زبان کا ہونا چاہیئے خواہ اصل سے خواہ اہل عرب کے استعمال سے۔ ربودن تو لفظ فارسی کا ہے اور عرب نے اس کا کہیں استعمال بھی نہیں کیا۔ فرمائیے کیا ان ترجموں کو بھی منع نہ کیا جائے۔ کوئی حد ہے اس بدتمیزی کی ــ افسوس آج کل ایسے ایسے لوگ قوم کے ریفارمر ہیں اور اسی لیاقت پر حق تعالیٰ کے احکام پر اصلاح دینے کے لیے تیار رہیں۔ اے اللہ کیا ہو گیا عقلوں کو! ایک نوجوان کہنے لگے۔ صدقۂ فطر کی مقدار میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ ایک عالم کے سامنے یہ خیال انہوں نے ظاہر کیا۔ عالم صاحب نے کہا پھر آپ ہی ترمیم کر دیجیے۔ کہنے لگے صاحب میں کس طرح کر سکتا ہوں؟ میرے اُوپر تو کفر کے فتوے لگ جائیں گے۔ انہوں نے کہا کفر کے فتوے سے جیسے آپ ڈرتے ہیں علماء بھی تو ڈرتے ہیں۔ غضب ہے کہ اپنے لیے تو کفر کا فتویٰ پسند نہیں اور علماء کے لیے اس کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ کونسی تہذیب ہے اور کیسی ہمدردی ہے کہ بدتر سے بدتر چیز اپنے مقتداؤں کے لیے تجویز کی جاتی ہے۔ میں اس پر ایک اور بات کہتا ہوں کہ اگر خدا نہ کرے کوئی عالم ایسی حرکت پر آمادہ بھی ہو جائے تب بھی اس دین کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر تمام دنیا کے عالم بھی غلطی پر اکٹھے ہو جائیں تو یہ نہ ہوگا کہ دین بگڑ جائے بلکہ انہیں کو عام لوگ چھوڑ دیں گے۔ بس جس کو مسلمانوں کی نظروں سے گرنا ہو وہ ایسا کرے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب مولوی مل کر ایک مسئلہ کو رواج دیں۔ مثلاً سب مل کر سُود کو جائز کر دیں تو بات چل جائے اور سب لوگ اس کو مان لیں۔ میں کہتا

ہوں کہ بالکل غلط ہے بلکہ وہ مولوی خود ہی مرتد ہو جائیں گے۔ اور اول تو میں کہتا ہوں کہ جو مولوی ہیں وہ ایسا کریں گے ہی نہیں کیونکہ مولوی اس کو کہتے ہیں جو مولا والا ہو یعنی علم دین بھی رکھتا ہو اور متقی بھی ہو۔ خوف خدا وغیرہ اخلاق حمیدہ بھی حاصل کیے ہوئے ہو۔ اس سے ایسے کام کب صادر ہو سکتے ہیں؟ صرف عربی جاننے سے آدمی مولوی نہیں ہوتا، چاہے وہ کیسا ہی ادیب ہو۔ عربی میں تقریر بھی کر لیتا ہو۔ تحریر بھی لکھ لیتا ہو۔ کیونکہ عربی دان تو ابوجہل بھی تھا بلکہ وہ ان آج کل کے ادیبوں سے زیادہ عربی دان تھا۔ تو وہ بڑا محقق عالم ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس کا نام ہی ابوجہل ہوا۔

معلوم ہوا کہ صرف عربی دانی کا نام مولویت نہیں۔ بلکہ مولوی کہتے ہیں عالم متقی متبع سنت کو کیونکہ مولوی میں نسبت مولیٰ کی طرف یعنی مولیٰ والا۔ سو جب تک وہ اللہ والا ہے اسی وقت تک مولوی بھی ہے۔ لائق اتباع بھی ہے۔ اور جب اس نے رنگ بدلا اسی وقت سے وہ مولوی نہیں رہا، نہ قابلِ اتباع ہے بلکہ اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ غرض آج کل آزادی کا زمانہ ہے اس لیے دین میں اس اس طرح کے تصرف کیے جاتے ہیں اور ہر شخص شریعت میں دخل دینا چاہتا ہے۔ یہ خرابی علم دین نہ ہونے کی ہے۔ (رجاء الغیوب ص۲۴۴ تا ص۲۴۵

۳ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ)

من گھڑت مسائل

آجکل مرض ہو رہا ہے کہ احکام میں رائے دے کر اپنی مرضی کے مسائل گھڑ لیتے ہیں۔ اس عمل کی اس سے زیادہ وقعت نہیں جیسے چند ڈاکو جمع ہو کر اور ڈکیتی کی دفعہ کو جو تعزیرات میں جرم ہے اس کے متعلق یہ پاس کر لیں کہ ہم اس دفعہ کو منسوخ یا اس میں اپنی مرضی کے موافق تاویل کر کے ڈاکہ کو جائز سمجھتے ہیں۔

ہماری رائے کی حقیقت

احکام اسلام کے مقابلہ میں تمہاری رائے ہی کیا اور تمہاری عقل ہی کیا؟ تمہاری حقیقت اس باب میں ان کیڑوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو خورد بین کے ذریعہ پانی کے اندر نظر آتے ہیں کہ وہ آپ ہی کے سامنے کھڑے ہو کر کہیں کہ فلاں قانون یا فلاں صنعت میں جو آپ کی یہ رائے ہے قابلِ تسلیم نہیں۔ (ملفوظات ج۵ ص۹۶)

اپنی ہی پامالی

یوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور احکام اسلام کی پائمالی اپنی ہی پائمالی ہے۔ آجکل ایسوں ہی کو بیدار مغز سمجھا جاتا ہے جو احکام اسلام کو پامال کر رہے ہیں۔ (ملفوظات ج۵ ص۱۴۱)

قانون الٰہی سے الجھنے کا مسلمان کو حق نہیں

جب خدا کا خدا ہونا مسلّم، رسول کا رسول ہونا مسلّم، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم۔ پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے؟ اگر آپ الجھیں گے تو ہر شخص آپ کو بے وقوف بنائے گا اور تمام عقلا کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے۔

(تعمیل الدین ص۴۳)

قانون میں رائے زنی کی مذمّت

یہ مرض آج کل بہت عام ہو گیا ہے کہ احکام اور مسائل میں رائے لگاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ شریعتِ مقدسہ کو اپنے تابع بنانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں یوں ہونا چاہیے۔ اس غلط فہمی کا کیا علاج کہ خالق کے مقرر کردہ احکام میں رائے زنی کرتے ہیں۔ ارے تم ہو کیا چیز اور تمہارا خیال ہی کیا چیز ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے ایک دانش مند انسان کی رائے پر چند جھینگے مل کر رائے دیں۔ یا پانی کے اندر جو خورد بین سے کیڑے نظر آتے ہیں وہ دانشمند انسان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش کریں اور اپنے خیال کا اظہار کریں۔ سو جو نسبت ان کیڑوں کو انسان سے ہو گی بندوں کو حق تعالیٰ سے

دا نسبت ہی نہیں۔ ان کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ چہ نسبت خاک را بعالم پاک ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا گیا ہے۔ ؂

گر بہ میر و سگ و زیر و موش را دیوان کنند

ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

واقعی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ خود اپنے دین کے محافظ ہیں ورنہ نہ معلوم اگر ان اہل الرائے کے قبضے میں اسلام اور احکام اسلام ہوتے تو ان کی کیا گت بنتے۔ وہ تو غنیمت ہے۔ ان کے قبضے میں کچھ ہے نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ سو جب دین کے وہ خود محافظ ہیں بھلا اس کو کون مٹا سکتا ہے۔ گو ان بدفہموں نے تو مٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس لیے کہ ان کا مکر اور دام کچھ کم نہیں۔

(الافاضات ۲؍۴ ص۱۳۶، ملفوظ ع۱۰۲)

آجکل عجیب مذاق ہو گیا ہے کہ ذرا کسی نے پڑھ لکھ لیا اور اعمالِ شرعی میں دخل دینے کے لیے تیار ہو گیا	تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے قانونِ شریعت میں دخل دینا عقل کی بات نہیں،

اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عقل کی بات ہے۔ حتیٰ کہ زبان پر یہی لفظ آتا ہے کہ ہم ایسے بیوقوف نہیں ہیں کہ بلا سوچے سمجھے مان لیں اور وہ زمانہ نہیں رہا کہ بلا علت معلوم کیے کسی بات کو تسلیم کر لیں۔ اب تعلیم کا زمانہ ہے۔ حیرت ہے کہ یہی بات ڈاکٹر یا طبیب سے کیوں نہیں کہی جاتی۔ میں کہتا ہوں کہ نقصانِ عقل کی دلیل ہے کہ اس کام میں دخل دیا جائے جس کو آدمی جانتا نہ ہو۔ کتنا ہی کوئی عاقل ہو اس کو ایک ادنیٰ درجہ کے کام میں جس کو جانتا نہ ہو

تعلیم سے جہلاء کے برابر بھی عقل پیدا نہیں ہوتی۔ اور آج کل تو یہ مسئلہ تمام جہان کے نزدیک مسلّم ہو گیا ہے کہ تقسیم عمل سے چارہ نہیں اور ترقی کا مدار یہی ہے چنانچہ جس فن کا جو ماہر ہوتا ہے اس کا فیصلہ اس فن کے متعلق نافذ مانا جاتا ہے:

ایک ڈاکٹر ایک شخص کو کہہ دیتا ہے کہ اس کے قویٰ قابلِ ملازمت نہیں تو اس کو ملازمت نہیں مل سکتی خواہ ڈاکٹر نے یہ حکم کسی غرضِ فاسد سے غلط ہی لگا دیا ہو۔

ایک انجینئر ایک لاکھ روپیہ کی عمارت کو کہہ دے کہ یہ گرا دینے کے قابل ہے تو گرا دی جاتی ہے خواہ اس نے بد دیانتی ہی سے کہا ہو مگر چونکہ اس کو ایک فن میں ماہر تسلیم کر لیا گیا ہے اس لیے اس کے احکام میں مزاحمت نہیں کی جاتی۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا کمالِ عقل حاصل ہو گا اتنا ہی مزاحمت سے روکے گی نہ یہ کہ عقل جوں جوں بڑھتی جائے اتنا ہی ہر کام میں دخل دینے کی اجازت ہوتی جائے جیسے آجکل کے تعلیم یافتوں کا مذاق ہو گیا ہے۔ (وعظ: القاف)

دورِ جدید کے محقق

فرمایا، بعض لوگوں نے کمال کیا ہے کہ انگریزی کے بی اے، ایم اے ہو کر شریعتِ مقدسہ کے محقق بنتے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ جس نے پچاس برس دین کی خدمت میں صرف کر دیے ہوں اور چراغ کا دھواں سیروں اس کے دماغ میں سما گیا ہو۔ وہ تو محقق نہ ہو اور یہ حضرت تھوڑی سی انگریزی پڑھ کر محقق ہو گئے۔ آج کل کے محققین اور مدققین کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص گلستان دیکھ کر اس کا محقق ہو گیا تھا۔ اتفاق سے دو شخصوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک ان میں سے ان حضرت کے دوست تھے، وہ پٹ بھی رہے تھے اور پیٹ بھی رہے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر دوست

آج اس پر عمل کرنے کا اچھا موقع ملا۔ اور اپنے نزدیک دوست کا پورا حق ادا کر دیا تو جیسے وہ گلستان کے محقق تھے ایسے ہی یہ لوگ آجکل قرآن و حدیث کے محقق ہیں۔

(احکام الجاہ)

اسلام کے ساتھ خیر خواہی کی مثال

ان اجتہاد کرنے والوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے ایک بڑھیا کے گھر میں شاہی باز جا گرا ایسی چونچ خم کھائے ہوئے اور بڑے بڑے پنجے دیکھ کر کہنے لگی کہ ہائے یہ کس طرح کھاتا ہوگا، کیسے چلتا ہوگا، چونچ اور پنجے کاٹ ڈالے۔ بیچارہ "اپاہج" ہو کر رہ گیا تو جس طرح اس بڑھیا بد فہم، بد عقل نے باز کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کی تھی ایسے ہی ان لوگوں کی خیر خواہی اور ہمدردی اسلام کے ساتھ ہے۔ اگر ایسے ہی مجتہد اور عقلا ہوں گے تو بس دین کا اللہ ہی حافظ ہے۔ (ملفوظ ۵ ص۹۰)

دین کا مقصود اصلاح دنیا نہیں ہے

بات یہ ہے کہ جب دنیا نے لوگوں کے قلوب کو گھیر لیا ہے۔ بس اسی کی ضرورت ان کے قلب میں آتی ہے دین کی ضرورت قلب میں آتی ہی نہیں۔ مگر اس کا صریح انکار بعض مصالح سے نہیں کر سکتے۔ اس واسطے اس کے متعلق کچھ من سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور ادنیٰ سی تاویل پر خواہ وہ بداہتہً غلط ہو قناعت کر لیتے ہیں بس مقصود دنیا ہے اور اسی کو اپنا کام سمجھتے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ مذہبی لوگوں کا اور انبیاء علیہم السلام کا بلکہ حق تعالیٰ کا کام بھی اسی کو سمجھتے ہیں کہ تمدن سکھلائیں۔ دین کا کہیں نام بھی لیتے ہیں تو وہ بھی صرف تمدن کی ضرورت سے۔ چنانچہ اگر کبھی دین کی تعریف ہوتی ہے تو یہ سبحان اللہ ہمارا کیسا دین ہے جس نے نماز سکھلائی تو جماعت کے ساتھ تاکہ آپس میں میل جول ہو، مال میں بھی حقوق رکھے تاکہ غریب اور امیر میں تعلق رہے۔ حج کی تعلیم دی تاکہ ایک مرتبہ سال بھر میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع ہو جایا کرے اور تمدن قائم رہے غرض

تمدن ہو چکا ہے کچھ بھی نہ ہو ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ان احکام شرعیہ میں رعایت ان مصالح کی بھی ہو۔ مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ مصلحت حکمت کے درجہ میں ہے علت کے درجہ میں نہیں۔ ورنہ ایسے احکام دین میں کیوں ہیں دین کو تمدن سے علاقہ نہیں مثلاً وضو کرنا، روزہ رکھنا، رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنا کہ ان اعمال میں تو تکلیف ہی تکلیف ہے۔ ترقی قومی اور تمدن میں بظاہر ان کو کوئی دخل نہیں۔ اور یوں بہت سے وسائط سے تو ہر کام کو ہر نتیجہ سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔

خوب یاد رکھیئے کہ دین کا مقصود اصلاح دنیا نہیں ہے اور بالتبع اصلاح ہو جانا اور بات ہے۔ یہ خوبی ہے دین کی کہ دنیا کی اصلاح بھی اس سے لزوماً ہو جاتی ہے مگر مقصود ہرگز نہیں۔ اور نہ اصلاحِ دنیا علماء کا منصبی کام ہو سکتا ہے۔ نہ انبیاء علیہم السلام کا۔ بلکہ انبیاءؑ کا اصلی کام صرف دین ہے۔ (وعظ: القاف)

اسلامی شعائر کی وقعت ہمارے دل میں نہ رہی

فرمایا کہ مسلمان دوسروں کے شاکی ہیں کہ مذہب اسلام کے شعائر کی وقعت نہیں کرتے اہانت کرتے ہیں۔ لیکن خود مسلمانوں ہی میں ایسے ہیں کہ اتنی بھی وقعت دین کی ان کے قلوب میں نہیں کہ جتنی حکومت کے قانون کی ہے۔ یہ شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ وکلاء کے پاس جاتے ہیں، مقدمات لڑاتے ہیں، لیکن کبھی کوئی شبہہ قانون پر نہیں کرتے اور مولویوں کے پاس آکر احکام اسلام پر شبہات کی پوٹ کی پوٹ کھل جاتی ہے۔ کیا احکام شعائر میں سے نہیں؟ کیا یہ معاملہ وقعت کا ہے؟

(الافاضات ج ۵ ص ۹۴، ملفوظ ۱۶۳)

اگر مسلمان مسلمان ہو جائیں تو سب اُن کے سامنے سر جھکا دیں،

فرمایا کہ بعضے ہمارے بھائی دوسروں پر الزام رکھتے ہیں کہ فلاں قانون تکلیف کا ہے، فلاں آئین سے نماز کی فرضیت نہیں ملتی۔

لیکن اصل یہ ہے کہ سب خرابیوں کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ یہ خود ہی احکام سے اعراض کیے ہوئے ہیں پھر جب خود ہی ان کے قلوب میں احکام شرعیہ کی وقعت و عظمت نہیں اور خود ہی ان کی پابندی و احترام نہیں کرتے تو دوسری قومیں کیا احترام کریں گی اور اُن سے کیا توقع کی جا سکتی ہے، مثلاً نماز کی پابندی مسلمانوں میں نہیں۔ داڑھی منڈانا ان کا شعار ہو گیا۔ دوسری قومیں بعض ایسی چیزوں کی پابند ہیں جو بظاہر نہایت دشوار ہیں مگر چونکہ ایک قوم کی قوم اس کی عامل اور پابند ہے۔ اس میں کوئی بھی مداخلت نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ حکومت بھی کسی قسم کی دست اندازی نہیں کرتی۔ دیکھ لیجیے سکھوں کی قوم کو وہ داڑھی رکھنے کے پابند ہیں۔ ان پر نہ پولیس میں نہ فوج میں کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا۔ حضرت ہماری شکایت واقع میں اپنا قصور دوسروں کے سر منڈھنا ہے۔ اگر مسلمان فی الحقیقت مسلمان بن جائیں تو پھر آپ دیکھیں کہ ایک دم کایا پلٹ جائے اور سب ان کے سامنے سر جھکا دیں۔ ایک سیاح انگریز کا واقعہ ہے اس نے ایک رسالہ فضائل اسلام پر لکھا ہے۔ یہ رسالہ ترجمہ ہو کر ندوہ کے ایک پرچہ میں نکلا تھا۔ اس انگریز نے عرب کی بھی سیر کی ہے۔ یہ جب عرب پہنچا ہے تو اس نے چند بدوی ملازم رکھے، جو سفر میں اس کے ہمراہ بطور رہنما کے چلتے تھے۔ آگے یہ انگریز ہوتا تھا پیچھے پیچھے یہ بدوی۔ سب گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ سب سوار گھوڑوں پر چلے جا رہے تھے۔ ایک مقام پر پہنچ کر نماز کا وقت ہو گیا۔ ان بدوؤں نے بدون اس انگریز کی اطلاع یا اجازت کے دفعۃً گھوڑے روک لیے اور اتر کر وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ انگریز نے پشت کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ گھوڑے کھڑے ہیں اور بدوی صف باندھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس انگریز کے سامنے نماز پڑھنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ وہ اس رسالہ میں لکھتا ہے کہ میں اس وقت ان کی صف سے الگ کھڑا ہوا خود اپنی نظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اپنے آقا کا

سرکش غلام ہوں اور یہ فرمانبردار غلام ہیں یہ شریف ہیں اور میں ذلیل ہوں۔ اس وقت ایک کتے سے بدتر میں اپنی حالت پاتا تھا اور بے اختیار دل چاہتا تھا کہ میں بھی ان کی صف میں داخل ہو جاؤں۔ پھر لکھتا ہے کہ اسی روز سے اسلام کی محبت میرے دل میں جگہ کر گئی اور فضائل اسلام پر یہ کتاب تصنیف کی۔

اس واقعہ سے سبق مسلمانوں کو حاصل کرنا چاہیے۔ اگر یہ خود احکام اسلام اور شعائر اسلام کے پابند ہو جائیں تو دوسروں پر خود بخود اثر ہو۔ یہ بھی ایک نہایت زبردست تبلیغ ہے اسلام کی۔ ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان میں بڑا امتیاز یہ ہے کہ اپنے مالک کے سامنے شرمندہ نہیں۔ سرخرو ہے بخلاف دوسری قوموں کے۔ غرض دوسروں کو بھی اسلام کی خوبیوں کا اقرار ہے۔ مگر آج کل خود مسلمانوں ہی نے تعلیم اسلام کو بدنام کیا ہے۔ اسلام مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر بزبانِ حال یوں کہتا ہے ؎

طعنۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

(الافاضات الیومیہ صــ ، ملفوظ ــ)

کافر خواہ کیسا ہی باکمال اور خوش اخلاق ہو جہنم میں جائے گا

بعض لوگوں نے بلا دلیل کہہ دیا ہے کہ اعراف میں کفار ذی اخلاق جائیں گے اور ان میں سے نوشیرواں اور رستم اور حاتم کو بھی شمار کر لیا ہے۔ کیونکہ نوشیرواں عادل تھا اور رستم شجاع اور حاتم کی سخاوت کے سب ہی معتقد ہیں۔ مگر یہ سب واہیات ہے۔ اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ رستم میں اول تو جو کچھ کمال ہے صرف شاہ نامہ اس کی دلیل ہے تو سنیئے خود ہی شاہ نامہ والے نے اس کا فیصلہ کیا ہے۔ ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان	وگرنہ یلی بود در سیستان

تو اس کے کمال کی حقیقت اس شعر ہی سے ظاہر ہے کہ رستم کس قدر شجاع تھا دوسرے شجاعت کا نوع تو عدل و سخاوت کی برابر بھی نہیں۔ اب عدل و سخاوت کو سنو۔ نوشیرواں کی بابت کہا جاتا ہے کہ بڑا عادل تھا۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ عدل کہتے کس کو ہیں۔ عدل کے معنی ہیں حقوق کو حدود پر رکھنا۔ پھر یہ دیکھو کہ حدود کیا ہیں سو حدود وہ ہیں جن کو خدا و رسولؐ نے بتلایا ہے کیونکہ بغیر ان کے بتلائے۔ ہم کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ حدود ہیں یا نہیں تو جو ان حدود سے متجاوز ہوگا وہ عادل نہیں ظالم ہے۔ اس کو عادل کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ ہاں ظلم کی دو قسمیں ہیں: ایک ظالم بقصد ظلم۔ دوسرا ظالم بلا قصد ظلم۔ تو اگرچہ نوشیرواں ظالم بقصد ظلم تو نہیں مگر عادل بھی نہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ نیّت سے عادل تھا اور عمل سے ظالم۔ سو نیّت سے حقیقت تو نہ بدلی۔ رہی سخاوتِ حاتم تو اس کے مخالف کوئی روایت نظر سے نہیں گزری۔ لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ سخاوت کی حقیقت کیا ہے؟ آیا مطلق انفاق، سخاوت ہے یا اس کا کوئی محل بھی ہے۔ اگر اس کے لیے کوئی محل نہیں تو اگر دریا میں کوئی شخص لاکھ روپے پھینک دے تو کیا اس کو بھی سخی کہو گے۔ حالانکہ اس کو کوئی سخی نہیں کہتا بلکہ جاہل محض سمجھتے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ انفاق کے لیے محل ہونا ضروری ہے۔ اگر محل میں خرچ ہو تو سخی ہے ورنہ نہیں۔ اور محل معلوم ہوتا ہے شریعت سے۔ جب اس کو محل ہی معلوم نہ تھا اور شریعت کی اس کو خبر نہ تھی تو وہ سخی کیسے ہوا۔ پس اوّل تو وہ سخی نہیں اور اگر ہو تو کیا ہوا۔ جب باغی تھا اور باغی کا کوئی کمال، کمال نہیں ہے۔ پھر وہ سخاوت کس کام کی۔ دیکھیے اب جو شورش ہوئی تھی اس میں اگر کوئی باغی ہوا اور وہ بہت بڑا تعلیم یافتہ متبحر عالم ہو تو کیا سرکار کے نزدیک اس کے اس کمال کی کوئی وقعت ہوئی تھی، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس پر تو اور زیادہ غیظ ہوا کہ جان بوجھ کر اس نے بغاوت کی۔ ایسے ہی جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے اس کا کوئی کمال مقبول نہیں جب تک کہ ایمان نہ ہو۔ پھر وہ دوزخ سے کیوں

بچے گا۔ اور جب اس سے نہ بچے گا تو اعراف میں کیوں جائے گا۔ بس اعراف میں تو ہی لوگ جائیں گے جن کو دوزخ سے نجات مل چکی ہے اور جنت میں جلدی جانے کا سرمایہ پاس نہیں۔

(وعظ: رطوبۃ اللسان ص۱۴۰۱۳)

جنت و دوزخ سے انکار

بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ مذہب صرف اس لیے ہے کہ دنیا کی ترقی کی جائے۔ بعض کو جنت و دوزخ سے بھی انکار ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف ڈرانے کی غرض سے جنت و دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ کوئی واقعی چیز نہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر واقعی چیز سے جس کا غیر واقعی ہونا بھی بتلا دیا جائے کیسے تخویف ہو سکتی ہے۔ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز سے ڈرایا جا رہا ہے اس کا وجود الفاظ ہی میں ہے واقع میں نہیں تو وہ اس سے کیا خاک ڈرے گا۔ پس یہ دعویٰ عقلاً بھی غلط ہوا کہ صرف ڈرانے کی غرض سے دوزخ کا ذکر کیا ہے۔ جب عقلاً یہ مصلحت محض باطل ہوئی تو یوں کہو کہ فضول ذکر کیا ہے۔ سو ایسا ایمان اور اسلام آپ ہی کو مبارک ہو، جو خدا کی طرف لغو اور عبث کو منسوب کرے۔ اور اگر فرض بھی کر لو (نعوذ باللہ) جنت و دوزخ واقعی کوئی چیز نہیں اور اللہ تعالیٰ نے محض بطور پالیسی کے ان کا ذکر کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو ڈرایا ہے تو معلوم ہو گیا کہ اس کی غرض یہی ہے کہ لوگ جنت و دوزخ کا اعتقاد رکھیں تو پھر اس کی کیا وجہ کہ خدا تعالیٰ ایک پالیسی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آپ اس کو توڑنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے ذمہ یہ بات لازم نہیں کہ خدا کی پالیسی کی حفاظت کریں۔ نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں چلی گئی یا مسخ ہو گئی۔

ان لوگوں کے نزدیک اصل تو ہے دنیا۔ باقی دین و مذہب وہ سب دنیا کی حفاظت کے لیے ہے اس طرح سے کہ مشاہدہ ہے کہ مذہب کی برابر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ جب مذہب کی پابندی ہو گی، فتنہ و فساد نہ ہو گا۔ کوئی کسی کا حق نہ مارے گا، چوری

پر رہے گا۔ آپس میں اتفاق قائم رہے گا پس دنیا پُرامن ہو گی۔ گویا مذہب ان کے نزدیک اس لیے بنایا گیا ہے کہ دنیا کی حفاظت رہے۔

کج فہمی اور بے ذوقی

ایک صاحب کے جواب میں فرمایا کہ صاحب جن چیزوں کو قرآن و حدیث میں صراحتاً منع کیا ہے۔ ان کو ہی لوگوں نے کونسا چھوڑ دیا۔ اسی میں صدہا شبہات نکال دیتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا، ایک جنٹلمین بھی اسی درجہ میں سفر کر رہے تھے جن کے پاس ایک کتّا بھی تھا۔ کہنے لگے معلوم نہیں کہ شرع نے اس کے پالنے کو کیوں منع کیا ہے؟ حالانکہ اس کے اندر فلاں فلاں خوبیاں ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کے دو جواب ہیں، ایک جواب خاص اور ایک جواب عام۔ آپ کونسا جواب چاہتے ہیں؟ کہا کہ دونوں فرما دیجیے۔ میں نے کہا کہ جواب عام تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پالنے کو منع فرمایا ہے، مگر اس جواب عام سے ان کی کہاں تسلّی ہو سکتی تھی؟ کہا کہ جواب خاص کیا ہے؟ میں نے کہا کہ جواب خاص یہ ہے کہ اس میں ساری خوبیاں ہیں لیکن اس میں ایک کمی ایسی ہے کہ ساری خوبیوں پر پانی پھر گیا۔ وہ کمی یہ ہے کہ اس میں "قومی ہمدردی" نہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک کتّے کا دوسرے کتّے کو دیکھ کر کیا حال ہوتا ہے؟ بس پھر کیا تھا بہت محظوظ ہوئے اور کہا کہ بس آج حقیقت معلوم ہوئی۔ عجیب فہم کے آدمی تھے۔ حقیقت کو معمولی بات سمجھا اور محض نکتہ کو حقیقت سمجھا! حالانکہ اس جواب کا درجہ ایک شاعرانہ نکتہ سے زیادہ نہیں۔ یہ ہے ان لوگوں کا فہم اور عقل۔

(الافاضات ع۵ صا۳)

مسلمان کی عزت اطاعتِ رسول میں ہے

فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے دین و دنیا دونوں کی عزت جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی میں ہے باقی اس کے علاوہ سب اسباب ذلّت کے ہیں۔

(الافاضات ۲ صا۱۷، ملفوظ ۳۰۳)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں اسکی تردید

ایک اشتہار خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ روزے صرف تین ہی ہونا چاہئیں۔ یعنی گیارھویں، بارھویں، تیرھویں

اور اس پر دلیل کیا خوبصورت لائے۔ اس کو بھی سنئے۔ آپ نے یوں استدلال کیا کہ روزے کے بارے میں قرآن میں آیا ہے اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ۔ یعنی چند روز جس کا اصلی مطلب تو یہ ہے کہ ہماری ہمّت بڑھانے کے لیئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ کے تھوڑے ہی دن ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ مگر آپ نے اس میں یہ اجتہاد کیا کہ حج کے بارہ میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ ایاما معدودات اور وہاں ایاما معدودات سے یہی گیارھویں، بارھویں، تیرھویں تاریخیں مراد ہیں۔ جب وہاں حج میں ایاما معدودات سے یہ مراد ہیں۔ تو یہاں صوم میں بھی وہی مراد ہیں۔ کیونکہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً حالانکہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً کے قاعدے سے وہاں کام لیا جاتا ہے۔ جہاں ایک آیت کی تفسیر معلوم اور دوسری کی تفسیر معلوم نہ ہو۔ اور یہاں تو دونوں کی تفسیر الگ الگ معلوم ہے۔ مگر اس اندھے نے ایک جگہ کی تو تفسیر لے لی اور دوسری جگہ کی تفسیر نظر انداز کر دی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایاماً معدودات سے بقرینہ دوسری آیت کے گیارھویں، بارھویں، تیرھویں مراد ہوں۔ تو یہ تاریخیں تو ذی الحجہ کی ہوں گی پس گیارھویں، بارھویں، تیرھویں ذی الحج کا روزہ رکھنا قرآن سے ثابت ہوگا اور یہ ہیں ایّام تشریق۔ ان میں روزہ رکھنا اجماعاً حرام ہے۔ تو قرآن سے ایسے ایّام کا روزہ رکھنا فرض ہوگا۔ جس کا روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے۔ اچھا اجتہاد کیا۔ اور نیز میں کہتا ہوں کہ اگر ہر جگہ ایاماً معدودات سے یہی گیارھویں، بارھویں، تیرھویں مراد ہیں تو یہود نے جو کہا ہے۔ لن تمسنا النار الا ایاما معدودات کہ ہم کو دوزخ میں تھوڑے دن رہنا پڑے گا۔ تو کیا وہاں بھی وہی تین دن مراد ہیں۔

ایمان سے کوئی بتلا دے کہ کیا یہود کی یہی مراد تھی کہ فقط گیارھویں، بارھویں، تیرھویں کو دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ اور وہ بھی ذی الحج ہی میں۔ اگر یہاں بھی یہی مراد ہے تو یہ ایسا ہوا کہ جو کالا وہی میرے باپ کا سالا۔ غرض اسی طرح لوگوں نے فتنے ایجاد کئے ہیں۔ کوئی کہاں تک ان کا انسداد کرے۔ بغیر حکومت کے ہو نہیں سکتا۔ کوئی سلطنت اسلام کی ہوتی وہ ان کو بند کرتی۔ (اجر الصیّام من غیر الصرام، حصہ اول صہ ۹)

فصل (۲)

تلاش اسرار وحکمت

تلاش علّت فقدان عظمت کی دلیل ہے

جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کے احکام میں علتیں نہیں تلاش کی جاتیں بے چون وچرا تسلیم کر لیا جاتا ہے اور جس کی عظمت دل میں نہیں رہتی اس کی ہر بات میں لم اور کیف کیا جاتا ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ کوئی ایسا حکم سرکار کی طرف سے آتا ہے کہ جس سے طبیعت منقبض ہوتی ہے عقل بھی ابا کرتی ہے، لیکن اس کو بلا تامّل تسلیم کر لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب گورنمنٹ نے حکم دیا تو اس میں کوئی مصلحت ضرور ہو گی۔ اس طرح بہت سے احکام ہیں جن کی علت عوام کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ان کو مانا اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک روپیہ کا عدالتی ٹکٹ لفافہ پر لگا کر ڈاک میں بھیج دیا جائے تو لفافہ بیرنگ ہو جائے اور ڈاک خانہ کا دو پیسہ کا ٹکٹ لگا دیں تو بیرنگ نہ ہو۔ ہزار آدمی ہوں گے جو اس قانون کی لم نہیں جانتے لیکن کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا کہ اس کی مخالفت کی جائے یا علّت تلاش کی جائے۔ برخلاف اس کے اگر ایک دوست کوئی حکم کرے یا کسی امر میں رائے دے تو اس میں صدہا عیب نکال دیتے ہیں۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ گورنمنٹ کی وقعت دل میں ہے اور دوست کی نہیں کیونکہ وہ آپ کی برابر کا ہے اور گورنمنٹ بالا دست ہے۔ صاحبو! ذرا غور کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام میں علّت ڈھونڈھ کر آپ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ

کی عظمت آپ کے دلوں میں نہیں رہی۔ اور اگر اس کے سوا کوئی دوسری وجہ ہو تو بتلائیے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے حکم یا رائے کو باوجود اس کے بالادست نہ ہونے اور ہمارے دل میں اس کی عظمت نہ ہونے کے بھی اس وجہ سے کہ ہم اس رائے کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ تو اگر احکام خداوندی کی وقعت بھی دل میں نہ ہو تب بھی اس لیے ان کو تسلیم کر لو کہ وہ صرف تمہارے ہی فائدے کے لیے تجویز کیے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعراض سے خدا تعالیٰ خفا ہو جائیں اور تم پر کوئی مصیبت آپڑے ۔

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

(تقویم الزیغ صٹ)

تعیینِ علل کا حق نہیں

فرمایا کہ ہمارے دوستوں میں ایک شخص ہیں۔ اول وہ فوٹو گرافی کا کام کرتے تھے۔ پھر خدا تعالیٰ نے ان کو توفیق فرمائی تو وہ اس سے تائب ہو گئے۔ ایک صاحب مدعیٔ تحقیق ان کو بہت پریشان کیا کرتے تھے کہ تم نے اس کام کو کیوں چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً ان مدعیٔ تحقیق سے میری ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے تصویر کشی کی ممانعت تو صرف اسی لیے تھی کہ یہ فعل منجر ہو جاتا تھا بت پرستی کی طرف۔ آج چونکہ تہذیب کا زمانہ ہے یہ احتمال مرتفع ہے۔ پس اب وہ حرمت بھی نہ رہی ہوگی۔

میں نے کہا کہ ہم کو تعیین علل کا بلا ضرورت کب حق حاصل ہے۔ گورنمنٹ کے سینکڑوں قانون ہیں اور ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن رعایا کو ان قوانین کی علت دریافت کرنے کا استحقاق نہیں تو خدائی قوانین میں علل تلاش کرنے کی کیوں ضرورت ہے؟

پھر میں نے ان سے سوال کیا کہ اچھا بتلائیے زنا کی حرمت کی کیا وجہ؟ کہنے

لگے مجھے تو علم نہیں میں نے کہا کہ لیجیے تبرعاً میں بتلاتا ہوں کہ وجہ اس کی احتمالِ اختلاط نسب ہے۔ یعنی اگر کوئی مرد ایک عورت سے صحبت کریں اور بچہ حمل رہ جائے تو ممکن ہے کہ ہر ان میں سے اپنے نسب کا دعوی کرے تو اس صورت میں ان میں سخت جنگ و جدال کا اندیشہ ہے اور ممکن ہے کہ ہر ایک انکار کردے تو اس صورت میں اس عورت اور بچے پر سخت مصیبت ہوگی۔ یہ وجہ سن کر وہ صاحب بہت ہی محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ بیشک یہی وجہ ہے۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی ایسی تدبیر کرلے کہ علوق کا احتمال ہی نہ رہے۔ مثلاً کوئی ایسی دوا استعمال کرے۔ یا کوئی عورت سنِ ایاس کو پہنچ گئی ہو یا جوانی میں کسی مرض سے حیض بند ہوگیا ہو۔ نیز جنگ و جدال کا بھی احتمال نہ ہو۔ مثلاً زانیوں کی کسی جماعتِ خاصہ میں محبت اور اخوت ہو جائے جس سے احتمال بھی جنگ و جدال کا نہ رہے تو اس صورت میں زنا جائز ہو جائے گا، کیونکہ علت حرمت کی مرتفع ہے، ہرگز نہیں۔ حالانکہ جو علت بتلائی گئی تھی وہ یہاں مرتفع ہے۔ اب تو وہ بہت خاموش ہوئے

پھر یہ قصہ نقل کرکے فرمایا کہ نہایت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں بعضے تعلیم یافتہ حضرات ہر امر کی علت دریافت کرنے کی فکر میں ہیں اور اسی طرح اکثر احکام شریعت پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ جس کا نام فہم ہے اس کی ہوا بھی انہیں نہیں لگی۔

(مجادلاتِ معدلت۔ دعوات عبدیت)

اردو میں خطبہ

ایک صاحب نے لکھا ...'' بعض محتاط اصحاب کا خیال ہے کہ اگر عربی کے بجائے اردو میں خطبہ پڑھنے کا رواج ڈالا جائے گا تو آئندہ چل کر لوگوں کے قلوب سے کلام اللہ اور حدیث شریف کی عظمت و محبت زائل ہو جائے گی اور پھر اس کے فیوض و برکات سے وہ محروم ہو جائیں گے۔ بعض اصحاب

کی یہ رائے ہے کہ خطاب کے معانی و مطالب اور اس کی غایت و ضرورت کو سمجھنا نہایت ضروری ہے تاکہ سامعین پر اس کا اثر ہو اور وہ ہدایت حاصل کریں اور یہ فائدہ اُردو زبان کے خطبات سے بہ سہولت اور بلا سعی حاصل ہو سکتا ہے بس اس میں کونسی صورت محمود ہے ؟

جواب : ان دوسرے اصحاب سے یہ پوچھا جائے کہ جب صحابہؓ نے عجم کے شہر فتح کیے اور جمعہ قائم کیا۔ حاضرین میں سے زیادہ لوگ عربی سے ناواقف تھے اور اس ملک کے بعض مسلمان ترجمہ پر قادر بھی تھے تو صحابہؓ نے اس مصلحت کی رعایت کیوں نہیں فرمائی ؟ نیز جب خطبہ کا سمجھنا ضروری ہے، قرآن کا سمجھنا اس سے زیادہ ضروری ہے تو کیا قرأت بھی اُردو میں تجویز کی جاوے گی ؟

دالنور بابتہ ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ

حکمتوں کا دروازہ کھولنا اسلام پر سخت حملہ کرنا ہے

حدیث شریف میں آیا ہے کہ میرا صحابی اگر نصف مد یعنی آدھ سیر جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے کے اُحد کی برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ تو اس کی وجہ کیا ہے ؟ یہ تو ہے نہیں کہ ان کی اللہ تعالیٰ سے تو بہ توبہ رشتہ داری ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ ان حضرات کے اندر خلوص اور محبت اس قدر تھا کہ اوروں کے اندر اتنا نہیں۔ اسی واسطے ان کے صدقات و احسانات بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں دنیا میں بھی ہم اس کی نظیر دیکھتے ہیں کہ ایک ہی کام ہے۔ ایک آدمی اس کو ضابطہ کے مطابق کرتا ہے اور دل سے نہیں کرتا اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ضابطہ ہی کا برتاؤ بھی ہوتا ہے۔

اور ایک دوسرا شخص اسی کام کو محبّت سے اور دل لگا کر کرتا ہے۔ اس کی دل میں قدر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ قانونی معاملہ نہیں کیا جاتا بلکہ جی چاہتا ہے کہ اس

کو زیادہ نفع پہنچایا جائے۔
یہ بحث تو مضاعفت کے متعلق تھی یعنی جس قدر اخلاص ہوگا اسی قدر ثواب بڑھتا
چلا جائے گا۔ لیکن روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے لیے دوسرا قانون ہے۔
فائدہ لی۔ یہ وجہ ہے۔ دوسرا قانون ہونے کی یعنی وہ میرا ہے میرے لیے خاص ہے
اس لیے ہم اس کا قانون دوسرے حسنات سے جدا قرار دیتے ہیں۔ وانا اجزی۔
یعنی وہ قانون دوسرا اس کے لیے یہ ہے کہ اس کی جزا بلا واسطہ ملائکہ کے ہم خود
دیں گے۔

ذرا بھی کسی کو عقل ہو تو وہ اس سے سمجھ سکتا ہے کہ جس عمل کی نسبت جناب
باری تعالیٰ یہ فرمائیں کہ ہم خود اس کا بدلہ دیں گے تو وہ جزا بڑی عظیم الشان ہوگی جیسے
حاکم یہ کہے کہ فلاں کارگزاری کا انعام ہم خود دیں گے۔ ہر شخص سمجھے گا کہ خدا جانے کیا
عنایت ہوگا۔ اور احکم الحاکمین یہ فرمادے تو وہ جزا تو بے حد ہوگی۔ اور بے حد کے یہ
معنی نہیں کہ غیر متناہی بالفعل ہوگی کہ اس پر محال ہونے کا اشکال ہو بلکہ بے حد ہونے کی
صورت یہ ہے کہ غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد ہے یعنی وہ جزا کسی وقت ختم نہ ہوگی۔
یہ امتیاز تو باعتبار کمیت کے ہے اور ہو سکتا ہے کہ کیفیت کے اعتبار سے
اس میں اور جزا سے کچھ امتیاز ہو کہ روزہ کی جزا کیفاً اور اعمال کے اجزیہ سے ممتاز ہو۔
غرض روزہ کے درمیان میں خواہ مقدار کے اعتبار سے ہو یا کیف کی رو سے
ہو اور حسنات سے اس جزا کی نوع علیحدہ ہوگی۔

حدیث میں اس سے بحث نہیں کہ وہ جزا کیا ہے اور اس کو کیا مناسبت ہے؟
اس لیے کہ حاکم کو یہ ضرور نہیں کہ رعایا سے وہ یہ بھی بیان کر دیا کرے کہ کیا جزا دیں گے
اور اس کو کیا مناسبت ہے اور نیز مقصود تو امتثال امر کی ترغیب ہے اور جزا کا بیان کرنا
اس کا مدار نہیں۔ مدار ترغیب امتثال کا تو اہل اطاعت کے نزدیک اتنا بھی کافی ہے

کہ حاکم کا حکم ہے ۔ اور خیر ایک درجہ میں استظار تو اس کا اجمالاً بھی مضائقہ نہیں مگر یہ کہ اس کی تعیین بھی ہو اور اس کے وجوہ مناسبت بھی معلوم ہوں ۔ یہ کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں اور اس باب میں دو لغزشیں ہو جاتی ہیں ۔ ایک لغزش تو دین میں مضر نہیں ۔ گو ایک درجہ میں لغزش ہے مگر دوسری مضر ہے ۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فضائل و ثواب کا جو وعدہ ہے اس پر امتثال کو مبنی کرنا کہ ان فضائل اور ثواب کے سبب تو عمل کرنا ہے ۔ یہ لغزش تو ہے مگر مضر نہیں اس لیے کہ وعدہ تو ہو ہی چکا ہے اس کا وجود تو متعین ہے ، تو اس شخص نے عمل کو ایسی شے پر مبنی کیا ہے کہ اس کا وجود یقینی ہے ثابت بالنص ہے تو اس میں ضرر کچھ نہیں لیکن یہ دلیل قلت محبت کی ہے اور یہی سبب ہے اس کے لغزش ہونے کا ۔ اپنے مطلب کی محبت ہے ۔ ذاتِ محبوب اس کو محبوب نہیں ۔ اگر ذاتِ محبوب اس کو مطلوب ہوتی تو فضائل تو کیا ۔ اگر امتثالِ امر میں کوئی تکلف ہونا بھی معلوم ہوتا تب بھی امتثال ترک نہ کرتا ۔ دیکھو دنیا میں اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس سے ملنے میں کتنی مصیبتیں جھیلتے ہیں ۔ گوارا اور ناگوار سب ہی کچھ برداشت کرتے ہیں ۔ واللہ اگر محب صادق ہے اس کا مشرب تو یہ ہے کہ جس میں محبوب خوش ہو وہ کام کرنا چاہیے ۔ ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے ۔

اور صرف اس کی خوشنودی کے لیے کرنا چاہیے حتیٰ کہ یہ کہنا کہ آپ مل جائیں یہ بھی نہ چاہیے لیکن چونکہ ایسی طبیعتیں بہت کم ہیں ۔ زیادہ طبیعتیں ایسی بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعیدوں کو سن کر عمل کی توفیق ہوتی ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اعمال پر وعدہ فرمایا ہے ۔ ایک بناء تو یہ تھی عمل کی جو کہ مضر نہیں ۔

ایک بناء دوسری ہے جو نہایت خطرناک ہے ۔ وہ کیا ہے فہم حکمت یعنی عمل

جب کریں گے جب اس عمل کی حکمت اور وجہ مناسبت عمل و جزا بھی ہماری سمجھ میں آجائے
افسوس ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر تعلیم بڑھتی جاتی ہے اسی قدر اس بناء فاسد کا شیوع
ہوتا جاتا ہے، جس کو دیکھئے کیا علماء کیا جہلاء سب اس میں مبتلا ہیں الا ما شاء اللہ
یہ جاہل کہنے پر شاید بعض تعلیم یافتوں کو شبہ ہوا ہو کہ ہم تو خاصے پڑھے لکھے ہیں چنانچہ خواندہ
لکھے جاتے ہیں ہم کو جاہل کیوں کہا؟ بات یہ ہے کہ جاہل کے معنی یہ نہیں کہ لکھنا پڑھنا نہ
جانتا ہو بلکہ جس فن کو کوئی نہ جانے وہ اس فن کا جاہل ہے۔ اگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں تو
اس فن کے اعتبار سے میں جاہل ہوں جس
فن میں دخل دوں تو میری حماقت ہے۔
شخص نے جو فن حاصل کیا نہ ہو وہ اگر اس میں محقق ہونے کی حیثیت سے گفتگو کرے
یہ اس کی غلطی ہے اور اگر سائلانہ گفتگو کرے تو اگر وہ سوال غیر ضروری ہے تو یہ بھی
حماقت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی طبیب کے پاس دو مریض جو کہ فن طب سے
بالکل نا آشنا ہیں آئے تو ایک نے تو نبض و قارورہ دکھلا کر نسخہ لکھوا لیا اور دوا کی ترکیب
وغیرہ دریافت کر کے دوا پینا شروع کر دی۔ اور دوسرے نے بھی نسخہ تو لکھوایا مگر نسخہ کو دیکھ
کر اپنے طبیب سے قیل و قال شروع کر دی کہ کیوں حکیم صاحب آپ نے گل بنفشہ کیوں
لکھا ہے؟ بجائے اس کے فلاں دوا کیوں نہ تحریر فرمائی؟ اور گل بنفشہ پانچ ہی ماشہ کیوں
لکھا چھ ماشہ کیوں نہ لکھا۔ ظاہر ہے کہ طبیب کو یہ گفتگو اس مریض کی ضرور ناگوار گزرے گی۔
اس کو تو اس قدر سوال کافی ہے کہ میرا مرض کیا ہے؟ اور دوا کیا ہے؟ اور بلا حجت
دوا پینا شروع کر دیتا۔ اس پر طبیب عتاب بھی کرے گا، لیکن اسی عتاب کی حالت میں
اگر کوئی طالب علم جو اس طبیب کے فن حاصل کرنے کے لیے رہتا ہے آجائے اور
وہ بعینہٖ یہی سوالات کرے کہ شیخ نے اس دوا کی یہ مقدار کیوں لکھی اور بجائے اس کے
فلاں دوا کیوں نہیں لکھی تو طبیب برابر جواب دے رہا ہے۔ اس پر وہ مریض سائل بگڑ
گیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم نے یہی سوال کیا تھا تو ہم پر تو عتاب ہوا اور اس نے پوچھا تو

تو آپ نے جواب دیا۔ وہ طبیب ظاہر ہے کہ یہ کہے گا کہ یہ تو فن حاصل کرنے آیا ہے اس کو سوال کا حق ہے اور اس کا مقصود یہی ہے اور آپ کا مقصد یہ نہیں۔ آپ کو تو شفا مطلوب ہے۔

صاحبو! یہ مثال جب سمجھ میں آگئی تو اب اس سے صاف واضح ہو گیا کہ آپ صاحبوں کا حکمت سے سوال کرنا بالکل بے موقع ہے تعجب ہے کہ شب و روز گراموفون اور فوٹوگراف کمروں میں اور بنگلوں میں رہنے کا شغل اور سوال یہ کریں کہ نماز کی فلاسفی کیا ہے؟ اور روزہ کی حکمت کیا ہے؟ آپ اپنے امراض کا علاج کیجیے۔

حقیقت میں اپنے مرتبہ سے زیادہ سوال کرنا خود ذلیل ہونا ہے۔ ایسے ہی ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات ہیں ان کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے ایک شخص پر فوجداری کا مقدمہ قائم ہو گیا ہو اور وہ دریافت کرتا پھرتا ہے کہ فلاں دفعہ جو تعزیراتِ ہند میں ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کے ذمہ تو یہ ضروری ہے کہ اس کو فکر ہو جائے اور وکلا سے مشورہ کرے اور اپنی خلاصی کی کوئی صورت تجویز کرے۔ افسوس ہے کہ ہمارے اوپر ہزاروں مقدمے فوجداری کے قائم ہیں لیکن ہم کو تنبہ نہیں۔ ہم کو تو یہ ضروری تھا کہ قوانین دریافت کرتے اور اپنی گلوخلاصی کی کوئی تدبیر نکالتے۔ ہم اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ سو یہ سخت مضر ہے اس لیے کہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو حِکَم و عِلَل کچھ سمجھ میں آ گئے یا نہیں۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تب تو یہ ضرر ہو گا کہ امتثال کو مبنی کیا تھا فہم پر اور فہم ہوا نہیں اس لیے احکام پر عمل بھی نہ کرے گا اور ان کو لغو سمجھے گا جیسا کہ آجکل ہمارے بہت سے نوجوان مذہب کی پابندی صرف قومیت کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ احکام الٰہیہ کی کچھ عظمت ان کے قلوب میں نہیں۔ بلکہ اس قسم کے سوالات کرنا یہ خود دلیل اس کی ہے کہ عظمت نہیں۔ دیکھو گورنمنٹ کے احکام کی چونکہ دل میں عظمت ہے اس لیے ان کی وجہ کبھی نہیں پوچھی جاتی۔ اگر کوئی پوچھتا بھی

ہے تو یہ جواب ملتا ہے، میاں احمق ہو سرکاری حکم ہے۔ اور یہاں علمائے حکمتیہ او
علتیں دریافت کی جاتی ہیں یہیں بلکہ ہم کہتا ہوں کہ علما جو جاننے کی چیزیں ہیں سب کچھ
جانتے ہیں بہت سے احکام کی حکمت بھی جانتے ہیں اور علت بھی مگر اس حکیم کی مثل
ہیں کہ جاہل مریض کو اس نے جھڑک دیا تھا اور اگر کوئی طالب علم سوال کرتا ہے تو وہ
شگفتہ ہوتا ہے اور جواب دیتا ہے۔ایک شخص میرے پاس ایک فرائض کا مسئلہ لائے
اس میں بھتیجا اور بھتیجی تھے۔ میں نے کہا کہ میراث بھتیجے کو ملے گی۔ کہنے لگے کہ اس کی کیا وجہ
کہ بھتیجی کو نہ ملے گی حالانکہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ میں نے کہا کہ جناب نوکری چھوڑ دیجیے
اور فارغ ہو کر ہمارے پاس رہیے۔ ہم اول سے صرف و نحو فقہ پڑھا کر سراجی آپ کو
پڑھائیں گے اس وقت اس وجہ کے متعلق آپ سوال کرنے کے قابل ہوں گے اور اب
تو یہ جواب ہے کہ سرکاری حکم اسی طرح ہے۔

بہر حال یہ طرز اور اس پر بناء رہنا سخت مضر ہے کہ اگر معلوم نہ ہو تب تو عظمت و
وقعت نہ ہوگی۔ اور اگر کچھ سمجھ میں بھی آئے تو چونکہ علل و حکم منصوص کم ہیں اسی لیے اکثر
تخمینی و ظنی ہوں گے۔ کیونکہ بدون خدا اور رسول کے بتلائے ہوئے ہماری رسائی
حقائق تک کب ہو سکتی ہے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کے علم سے ہمارے علم کو جو
نسبت ہے وہ اس سے بھی زیادہ بعید ہے کہ جیسے ایک صغیر سن بچے کے علم کو باپ کے
علم سے۔ چنانچہ اب ملاحظہ فرمائیے کہ چھوٹے بچے کو آپ منع کرتے ہیں کہ کھٹا آم مت
کھاؤ۔ اور دلیل اس کی کچھ بیان نہیں کرتے۔ دو وجہ سے:

ایک تو اس لیے کہ ہمارا اس پر زور ایسا ہے کہ ہم جو بات اس سے کہہ دیں گے
بلا دلیل و بلا چون و چرا اس کو ماننا ضرور ہے۔

دوسری وجہ اس کی کم فہمی ہے کہ اگر وجہ بیان کی جائے گی تو اس کی سمجھ میں نہ
آئے گی۔ صاحبو! کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی زور نہیں یا یہ گمان ہے کہ ہمارا علم کافی ہے۔؟

جب تھوڑے حقوق اور تھوڑے تفاوت علم پر لِمَ وکَیفَ قطع ہو جاتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ شانہٗ کے حقوق وعلم تو کہیں زیادہ ہیں۔ تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ سے اس کا انتظار کریں کہ جب وجہ سمجھ میں آئے گی اس وقت مانیں گے!

اور چونکہ وہ محسن ہیں، خالق ہیں اس لیے بعض جگہ حِکَم واسرار خود بھی بیان فرمائے ہیں۔ جیسے بچے کی مثال میں باپ بعض مرتبہ کہتا ہے کہ کھٹے آم مت کھاؤ، پھنسیاں نکل آئیں گی اور جہاں بیان نہیں فرمایا وہاں اپنی طرف سے تراشنا سخت مضر ہے۔

بعض لوگ اس کاوش اسرار کے عذر میں کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہم کو تو شبہ نہیں ہے لیکن بعض مخالفین پوچھتے ہیں، ہم کیا جواب دیں؟ اس لیے پوچھتے ہیں۔ سو یہ بھی نادانی ہے۔ وجہ یہ کہ پوچھ پوچھ کر جواب دو گے تو کہاں تک دو گے۔ کہیں تو بند ہو کر کہنا پڑے گا کہ ہم نہیں جانتے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ سیدھی بات کہہ دو کہ بھائی علماء سے پوچھو ہم نہیں جانتے۔ جب وہ علمائے سے پوچھیں گے تو علماء ان سے خود نمٹ لیں گے اور باقاعدہ ان سے گفتگو کر لیں گے۔

اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ مذہب حق کے کچھ اصول ہیں اور کچھ فروع اور اصول مذہب حق کے عقلی ہیں نقل کو اس میں دخل نہیں۔ تو جو شخص اصول کو تسلیم کیے ہوئے ہے اس کو تو اس قدر کافی ہے کہ جب اصول تمہارے مسلّمہ ہیں تو فروع تم کو ضرور تسلیم کرنا ہوں گے۔ اور اگر اصول ہی مسلّم نہ ہوں تو اوّل اصول میں گفتگو کرنا چاہیے۔ جب اصول طے ہو جائیں گے فروع خود ان کے تابع ہیں۔

پس اس قاعدہ سے معلوم ہو گیا کہ مسلمان ہو کر جزئیات کی وجہ دریافت کرے۔ اس کے کوئی معنی نہیں۔ جزئیات کی وجہ دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اصولِ اسلامیہ ہی میں کلام ہے۔ ایسے شخص کو اوّل توحید و رسالت میں گفتگو کرنا چاہیے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے دو شخص ایک بادشاہ کی حکومت میں رہتے ہیں

ایک شخص اہلِ اطاعت میں سے ہے اور ایک باغی ہے۔ جو مطیع ہے اس کو قوانین کی وجہ اور لم دریافت کرنے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ جب اس نے بادشاہ کا بادشاہ ہونا تسلیم کر لیا تو اب احکام میں حجت کا نکالنا بے معنی ہے اس کے لیے یہی کافی ہے کہ جس کو میں بادشاہ مانتا ہوں یہ اس کے احکام ہیں۔

اور باغی اگر دریافت کرنے لگے تو وہ اس لیے بے کار ہے کہ وہ بادشاہ کو بادشاہ ہی نہیں مانتا اس لیے بجائے توجیہہ جزئیات کے اوّل اس سے بادشاہ کو بادشاہ منوائیں گے۔ جب وہ مانے گا پھر احکام خود ہی اس کو ماننا پڑیں گے۔

غرض مخالفین کو جواب دینے کی غرض سے علمتوں کا پوچھنا تو جیسا مثال مذکور مفہوم ہوا بالکل ہی لغو ہے اور اپنے عمل کے لیے اگر ہے تو اس لیے لغو ہے کہ مسلمان کا بس یہ مسلک ہونا چاہیے۔

زباں تازہ کردن زاقرارِ تو ... نینگیختن علت از کار تو

اگر کوئی کہے کہ بعض بزرگوں کے کلام میں بھی حکمتیں پائی جاتی ہیں! بات یہ ہے کہ جن حضرات کی زبان سے کچھ حکمتیں نکلی ہیں وہ انہوں نے کسی سے پوچھ پوچھ کر حاصل نہیں کی بلکہ اس کا طریق الہام کا بھی یہ ہے کہ بدون کاوش انہوں نے عمل شروع کر دیا تھا عمل کرتے کرتے حق تعالیٰ کی طرف سے ایک نور عطا ہو گیا اس سے سب حقائق کھل گئے۔ تو تم بھی ایسا ہی کرو حسبِ استعداد تم پر بھی فضل ہو جائے گا۔

اور حقیقت میں شریعت نے یہ احسان کیا ہے کہ تفتیش حکمت سے منع کر دیا ہے اور اس میں بڑی حکمت ہے۔ اس لیے کہ اگر حکمتیں سوچ کر تم نے عمل کیا اور رہوں گی وہ تخمینی جیسا پہلے معلوم ہوا۔ تو ممکن ہے پچاس برس بعد وہ حکمتیں مخدوش ثابت ہوں۔ تو جب بنا منہدم ہو گئی تو مبنی بھی نہ رہے گا۔ تو ان حکمتوں کا دروازہ کھولنا گویا اسلام پر سخت حملہ کرنا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے بھائی اس راز کو سمجھتے نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس پر

استدلال کو مبنی کرنا سخت مضر ہے اس لیے روزہ کے متعلق بھی اس کے درپے مت ہو۔ ضروری بات سمجھ لو کہ روزہ کی جزا خود دیں گے۔ خواہ کچھ ہو اور خواہ وجہ مناسبت اس میں تم کو معلوم نہ بھی ہو۔

(وعظ: الصوم)

محبت تمام شبہات کا علاج ہے

ایک بار میں قصبہ مہنارنی گیا۔ وہاں میرا بیان ہوا جس میں بہت سے علیگڑھ کالج کے تعلیم یافتہ بھی جمع تھے۔ میں نے بیان میں یہ بھی کہا کہ آپ لوگوں نے جو یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ جہاں کسی عالم سے ملاقات ہوئی اور آپ نے اپنے شبہات کا دفتر اس کے سامنے کھول دیا۔ یہ طریقہ کامیابی کا نہیں۔ اس سے آپ کے مرض کو شفا نہیں ہو سکتی۔ میں بتلاتا ہوں شفا کا طریقہ کیا ہے۔ آپ اپنے قلب کے اندر محبت پیدا کریں۔ محبت وہ چیز ہے کہ اگر ایک کسبی عورت کسی فلسفی سے یہ کہے کہ لنگوٹا باندھ کر بازار کے اس سرے سے اس سرے تک گشت لگاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ کسبی کا سچا عاشق ہے تو کبھی بھی پس و پیش نہ کرے گا۔ بھلا وہ کہہ سکتا ہے کہ تمہاری اس میں کوئی منفعت نہیں اور میری اس میں ذلت ہے۔ بلکہ اگر کوئی دوسرا بھی اس سے وجہ دریافت کرے گا تو یہ فلسفی اس سے بھی یہ کہے گا اجی پوچھو مت۔ کہیں اس کی رائے نہ بدل جائے۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ اس نے ایک تدبیر تو بتلا دی ہے اپنے ملنے کی۔ تو دیکھیے اس کسبی کے امر و عمل میں اس شخص کو وسوسہ تک نہیں ہوا کہ اس میں کیا حکمت ہے؟ کیا فائدہ ہے؟ نہ خود اس سے حکمت پوچھتا ہے نہ کسی دوسرے کو پوچھنے دیتا ہے۔ نہ کسی کے اعتراض پر توجہ کرتا ہے۔ تو یہاں کونسی چیز تھی جس کی وجہ سے وسوسہ تک بھی نہ آیا۔ یہ محبت تھی اور کچھ نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ محبت حق پیدا کیونکر ہو تو میں نے کہا کہ میں تم کو ایسی آسان بات بتلاتا ہوں کہ ساری علیگڑھ کی تعلیم میں تم کو ایسا آسان سبق آج تک نہ ملا ہوگا۔ وہ یہ کہ محبت والوں کے پاس بیٹھنا شروع کر دو۔ (وعظ: الحوبۃ فی اسرار التوبۃ)

(تھانہ بھون یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۵۰ھ)

...مِنِ الاهلةِ قُل

هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۖ (البقرہ آیت نمبر ۱۸۹)

"(بعضے آدمی) آپ سے (ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ (فائدہ اس کا یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے لزوماً یا سہولتہً) آلہ شناخت اوقات ہیں۔ لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل عدّت و مطالبہ حقوق کے) لیے (اور غیر اختیاری عبادات مثل) حج روزہ زکوٰۃ کے لیے۔" (بیان القرآن)

ف (۱): حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے یہاں صحابہ کے ذہن کے رُخ کو موڑ دیا۔ یعنی سائنسی تحقیق چاند کے گھٹنے بڑھنے کی بیان کرنے کی بجائے اس کا دارو مدار عملاً عبادات کے لیے ارشاد فرمایا۔ ف (۲): اس میں اعراض عن الفضول پر دلیل ہے۔

(۲) اِنَّ اللّٰهَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ۝ (المائدہ آیت نمبر ۱)

"بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہیں سو کریں۔"

ف: اس میں اسرار احکام کی تفتیش کی طرف اشارہ ہے۔ (مسائل السلوک)

دُنیاوی حکّام اپنے قانون کی مصلحت بیان کرنے سے عاجز ہیں

اگر کوئی ڈاکخانہ کے حکام سے سوال کرے کہ کیا وجہ ہے کہ اگر لفافے پر چالیس پیسے کے ڈاک ٹکٹ لگائے جائیں تو بیرنگ نہیں ہوتا لیکن اسی لفافے

نکال دے گا اور حاکم کہے گا کہ ہم عالم قانون ہیں۔ واضع قانون نہیں تو ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ (علماء عالم قانون اور مبلغ احکام دین ہیں۔ مؤسس احکام نہیں، کہ ہم عالم قانون ہیں۔ ہمارے ذمہ اس کے وجوہ اور اسرار بتلانا نہیں ہے (المطلب الاعلم ص۱۱۰)

احکام شریعت کی مصلحت اور علل پوچھنے والوں سے استاذ العلماء عارف باللہ حضرت مولانا یعقوب صاحب کے حاکمانہ جوابات

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے زمانہ میں مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں ایک سوال آیا، وہ حضرت نے میرے سپرد فرمایا کہ اس کا جواب لکھ دو۔ میں نے جواب لکھ دیا۔ وہاں سے پھر اس پر کچھ اشکال لکھا ہوا آیا۔ میں نے یہ پیش کیا تو فرمایا کہ لکھ دو کہ ہم مرغان جنگی نہیں ہیں یہ ہمارا تبرع اور احسان تھا کہ وقت نکال کر جواب لکھ دیا۔ اگر آپ کو ہمارے جواب سے شفا نہیں ہوتی تو فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور کسی سے تحقیق کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کچھ تو جواب ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ نہیں جی۔ چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔ بعد میں اس کا مصلحت ہونا معلوم ہوا، غرض ہم کو بچپن ہی سے اس کی تعلیم کی گئی ہے اور یہی ہمیں پسند ہے۔ (الافاضات الیومیہ، حصہ دوم ص۲۸۷)

ایک مرتبہ کسی نے دریافت کیا کہ عورتوں کے معمول (حیض) ایام میں جو روزے فوت ہوں ان کی قضا ہے اور نمازوں کی قضا نہیں؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر خلاف کرو گے تو اتنی جوتیاں پڑیں گی کہ سر پر بال نہ رہیں گے

مولانا کا مذاق ان کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے:

؎ اَلْوَعْظُ يَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِكَمِ
وَالسَّيْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٍ عَلَى الْقِمَمِ

(ازالۃ الغین من آلۃ العین ص۴۲)

" یعنی وعظ نفع دیتا ہے اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو اور تلوار سے بڑا وعظ ہے"

بقول اقبال مرحوم :-

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے بے بنیاد

مجذوب کامل حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی کا اسی قسم کا ایک حکیمانہ جواب

مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ ایک عورت کا شوہر گم ہو گیا ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا مرد کی نوّے برس کی عمر ہونے تک انتظار کرو۔ کہنے لگا جناب اس میں تو بڑا حرج ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر یہ حرج ہے تو جہاد میں بھی حرج ہے۔ غرض مسئلہ کی نوعیت اور حکمت ارشاد نہ فرمائی اور نہ اسے پسند فرمایا۔

(فوائد الصحبت صہ ۴۳ معارف الاکابر صہ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ہارون آباد)

دلائل احکام شریعت پوچھنے والوں کو مرشد نا حضرت حکیم الامت تھانوی کے چند حکیمانہ جوابات

فرمایا میں پچھلے دنوں علی گڑھ گیا تو کالج کے ایک حدیث داں پروفیسر میرے پاس آئے۔ حدیث کا متن پڑھا جس میں آیا ہے کہ طاعون معاصی سے آتا ہے اور کہنے لگے کہ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنابت وعقوبت میں وجہ ارتباط سمجھ میں نہیں آئی تو کہنے لگے کہ معاصی اور طاعون کا ربط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا تو ضرر کیا ہوا۔ کیونکہ یہ تو حکم کی لِم ہوئی اور ضرورت صرف حکم کا سمجھنا ہے۔ یہ لِم کا سمجھنا ضروری نہیں۔ آپ اس کو بدوں سمجھے ہی مان لیجیے۔ کیا ہر بات کو اس کی سمجھ کر ہی ماننا ضروری ہے۔ کہنے لگے کہ سمجھنے میں ضرر تو کچھ نہیں، لیکن معلوم ہو جانے میں نفع ہے کہ اطمینان زیادہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اطمینان مطلوب ہونے کی کیا دلیل؟ کہنے لگے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا قول ہے اور اگر [illegible] کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے [illegible] نافع ہو وہ آپ کے لیے [illegible] نافع ہو۔ اس کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا، تو خاموش ہو گئے۔ جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے کہا کہ یہ نہ سمجھیے گا کہ مجھ کو وجہ ربط معلوم نہیں مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

اور جب وہ صاحب اُٹھ کر چلے گئے اور دوسرے لوگ بھی چلے گئے اور مجلس میں خاص احباب رہ گئے تو پھر میں نے معاصی اور طاعون میں تعلق اور ربط بیان کیا جو میں نے اپنے اکابر سے سُنا تھا۔ جب وہ تقریر ختم ہو گئی تو بعض احباب کہنے لگے کہ وہ صاحب اس تقریر کو سنتے تو ان کو بہت حظ آتا اور ہمارے اکابر کے علوم کے گرویدہ اور قائل ہو جاتے۔ میں نے کہا تم کیا جانو ان کو اس تقریر سے ضرر ہوتا۔ اس خاص معاملہ میں تو ان کو اطمینان ہو جاتا مگر آئندہ کے لیے یہ ضرر عظیم ہوتا کہ وہ اطمینان کو مطلوب سمجھتے۔ گو یہ تقریر ان کو ناگوار ہوئی مگر ان کی بڑی غلطی کی اصلاح ہو گئی۔ کیونکہ یہ بات کسی نے بھی ان سے آج تک نہ کہی ہو گی کہ اطمینان ہی کی کیا ضرورت ہے۔

(خیر الحیات و خیر الممات صـ۳۳، ۳۴، ازالۃ العین صـ۴۲)

فرمایا کہ ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی۔ میں نے بطور نظیر کے ان سے پوچھا کہ اوّل یہ بتلائیے کہ آپ کی ناک چہرے پر کیوں لگائی گئی، کمر پر کیوں نہیں لگائی گئی؟ جب اس ترتیب کے وجوہ اور مصالح سب آپ کو معلوم ہو جائیں تو اس کے بعد اوقاتِ نماز کی تعیین کے مصالح دریافت کیجیے گا۔

(ضرورت التوبہ صـ۱۲)

فرمایا بہشتی زیور کے ایک مسئلہ کے متعلق ایک صاحب نے وجہ پوچھی۔ میں نے

کہا کیا آپ کو سب مسائل کی وجہ معلوم ہے؟ اگر ہے تو مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں دو چار کی وجہ پوچھوں، اور اگر معلوم نہیں تو چلو اس مسئلہ کی بھی وجہ معلوم نہیں۔ (الطیب العلم [illegible])

فرمایا میرے پاس ایک ماسٹر صاحب آئے اور انہوں نے تقدیر کے متعلق ایک سوال کیا۔ میں نے کہا کہ آپ اس کا جواب نہیں سمجھ سکتے، بہت دقیق ہے، جو آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ان کو اس جواب پر حیرت ہوئی اور شاید وہ یہ سمجھے ہوں کہ مولوی [illegible] جواب پر قادر نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کو اس کا جواب سننے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ کسی طالب علم کو میرے پاس لایا جائے جس کے ذہن میں اس علم کے مقدمات حاضر ہوں جس سے اس سوال کا تعلق ہے، وہ مجھ سے یہی سوال کرے، میں اس کے سامنے جواب کی تقریر کروں گا، آپ بھی سن لیجیے گا۔ اس وقت آپ کو بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپ اس کا جواب سمجھ سکتے ہیں یا نہیں! اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگوں کے پاس اس کا جواب ہے۔ (محاسن الاسلام ص۹)

فرمایا، ایک انجینئر نے مجھ سے علم بلاغت میں مسئلہ پوچھا۔ میں نے کہا اس کا جواب سمجھنے کے لیے چند علوم کی ضرورت ہے۔ کہنے لگے کہ پھر مجیب کا کمال ہی کیا ہوا۔ میں نے کہا جناب اقلیدس اُردو میں ہے۔ آپ اس کی ایک سہل سے سہل شکل کسی ایسے شخص کو سمجھا دیجیے جو اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ کو نہ جانتا ہو۔ مگر آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ (اجلاء القلوب ملقب بہ جامع جمشید ص۴۲)

---

[1] مرشدنا حکیم الامت تھانوی سرہٗ نے تحدیث بالنعمت کے طور پر یہ بھی فرمادیا تھا کہ میرے پاس کوئی دو برس رہے تو میں ثابت کر دوں گا کہ حِکَمِ شریعت میں حِکَمِ عقلیہ ہیں مگر ہم ان کو علوم عظیمہ نہیں سمجھتے، کیونکہ وہ سب ظنی ہیں۔ لوگوں نے وہ بہت سے حِکَم لکھے ہیں اور اب بھی الہام سے ہوتے ہیں مگر یہ سب علوم ظنیہ ہیں اس لیے علماء ان میں مشغول نہیں ہوتے۔ (فوائد الصحبت ص۲۰)

فرمایا مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کافر سے سُود لینا کیوں ناجائز ہے تو ان کی مرضی کے موافق تو یہ تھا کہ میں دو ورق میں مدلل جواب دیتا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا ان کی مصلحت کے خلاف تھا۔ بلکہ میں نے یہ لکھا کہ کافر عورت سے زنا کیوں ناجائز ہے؟ یہ اس سوال کا جواب تحقیقی ہی تھا لیکن اس وقت کم علمی اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ اس کو سمجھے ہی نہیں۔

حاصل اس جواب کا یہ تھا کہ جو حرام قطعی ہے وہ کسی محل میں بھی جائز نہیں۔ اس کو سمجھ کر وہ جتنے شبہے کرتے صحیح ہوتے۔ (ضرورت العمل فی الدین ص۲۶)

عُلماء حاکمانہ شان میں نائبِ رسولؐ ہیں ان کو چاہیے کہ اسرارِ احکام پوچھنے والوں کو جواب نہ دیں،

مندرجہ بالا بزرگانِ دین کے چند واقعات سے ثابت ہوا کہ علماء کو چاہیے کہ وہ احکامِ دین کی مصلحتیں پوچھنے والوں کو جواب نہ دیں اور یہ کہہ دیں کہ اسرارِ احکام بتلانا ہمارا فرضِ منصبی نہیں اور منادی کرنے والے سے منادی کے مصالح نہیں پوچھا کرتے (فوائد الصحبت)

کیونکہ علماء حاکمانہ شان میں نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کو اپنی اس شان کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کیونکہ احکام دینیہ کی مصلحتیں بتلانے سے عوام الناس کا دماغ سڑ جائے گا۔ اور وہ ہر حکم کی مصلحت پوچھا کریں گے اور اس کے بغیر نہیں مانیں گے اس لیے علماء کرام کو بے لوک جواب دینا چاہیے کہ ہم اسرار نہیں جانتے۔ قیامت میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لینا۔ (فوائد الصحبت ص۲۰)

مگر افسوس آج کل یہ بات خواص میں بھی نہیں دیکھی جاتی۔ اِلّا نادراً وہ محض اس خیال سے کہ لوگ سمجھیں گے کہ انہیں کچھ آتا جاتا نہیں، جواب دیتے ہیں۔ کیا واہیات خیال ہے؟ علماء کو ایسے لغو خیالات سے اجتناب چاہیے۔ ان کی تو یہ شان ہونی چاہیے کہ: ؎

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند　　　دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

(الافاضات الیومیہ ج ۲ ص ۱۸۷)

مسلمانوں کو احکام شریعت کے مصالح پوچھنے کا حق نہیں ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر اور نبی ماننے کے بعد مسلمان کو احکام میں حکمتیں پوچھنا حق نہیں۔ جیسے حکیم عبدالمجید یا حکیم اجمل خاں کو حکیم ماننے کے بعد ان کے نسخے میں اعتراض اور چوں چراں کرنے کا کسی کو حق نہیں رہتا۔

(فوائد الصحبت ص ۱۹)

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں" اے عزیز! محمد بن زکریا طبیب اگر کہہ دیں کہ فلاں دوا میں یہ خاصہ ہے تو تو اس کے کہنے سے ایسا یقین رکھتا ہے کہ اس میں شبہہ ہی نہیں ہوتا۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر کسی فعل کا خاصہ بیان فرمائیں تو اس میں تم کو شک ہوتا ہے۔ (ترغیب الا ص ۱۴)

افسوس مسلمان ہو کر احکام دین کے ساتھ تمسخر اڑائیں اور اس کی مصلحتیں و حکمتیں دریافت کریں۔ اسلام کو غیروں کی شکایت نہیں، اس کو تو مسلمان ہی سے شکایت ہے۔ اسلام بزبان حال کہتا ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　　کہ با من آنچہ کرد آشنا کرد

جس کا ترجمہ گویا یوں ہوا۔

طعنۂ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا ہے　　　تم بھی ہنستے ہو میرے حال پر رونا ہے یہی

جو لوگ احکام الٰہی کا تمسخر اڑاتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ اسلام اتنا بے غیرت نہیں کہ وہ اسلام کا مذاق اڑاتے رہیں، پھر بھی اسلام ان کو چمٹا رہے۔

"أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ"

"کیا ہم تم کو رحمت زبردستی چپکا دیں گے اور تم ان سے نفرت کرتے ہو۔"

احکامِ شریعت میں مصلحت ڈھونڈھنا انکارِ نبوت کے مترادف ہے

حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ شرائع میں حکمت و مصلحت ڈھونڈھنا مرادف ہے انکارِ نبوت کے کیونکہ اگر نبوت کے قائل ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سُن کر پھر ماننے اور عمل کرنے میں آخر انتظار کس چیز کا ہے۔

(الافاضات الیومیہ ج ۲ ص ۲۸۰)

ظاہر ہے کہ مصلحت پوچھنے والا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع نہیں کرنا بلکہ اپنی عقل اور حکمت کا اتباع کرنا چاہتا ہے۔

(خیر الافادات ص ۶۹)

اسرار احکام شریعت دریافت کرنے کی مثال

اسرار کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کا محل سرائے اور زنانخانہ یا خزانہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اگر کسی کو خود اپنے محل سرائے اور زنانخانہ کی سیر کرادے تو اس کی عنایت و رحمت ہے۔ خود کسی کو اس کی درخواست کا حق نہیں ہے کہ مجھے اپنے زنانخانہ یا خزانہ پر مطلع فرما دیجیے اور اگر کوئی ایسی درخواست کرے گا تو شاہی عتاب میں گرفتار ہوگا۔

(استمرار التوبہ ص ۵)

اسرار احکام معلوم ہونے کے درپے نہ ہونا چاہیے

حضرت شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اسرار کے درپے ہوتے ہیں اسرار ان کو نہیں بتلائے جاتے اور جو درپے نہ ہوں اس کو بتلا دیے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن حضرات پر اسرار کا انکشاف ہوا ہے وہ وہی تھے جن کو اسرار کی طلب نہ تھی۔

(استمرار التوبہ ص ۵)

اسرار و حِکَم میں غور کرنا مناسب نہیں

اسرارِ احکام میں غور کرنا مناسب نہیں کیونکہ جو کچھ فکر سے حاصل ہوگا تمہارے ذہن کا

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ مے نگیرد فضلِ شاہ

اسرار احکام کے اخفا ہی میں حکمت ہے

اگر اسرار کا مخفی ہونا حکمت نہ ہوتا حق تعالیٰ کو بخل نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سب کو ظاہر فرما دیتے۔ اب جو مخفی رکھے گئے ہیں تو ان میں اخفا ہی حکمت ہے اس لیے ان کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے: ؎

حدیث مطرب و مے گو و راز دھر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاد بحکمت ایں معمّہ را

(الاستمرار التوبہ ص۵)

شریعت کے احکام میں بے شمار حکمتیں مضمر ہیں، مگر ہماری عقلیں اس کے ادراک سے عاجز ہیں، اس لیے: ؎

بدریا منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت بر کنار است

اس لیے شریعت نے براہ شفقت ایسے امور کی تفتیش سے روک دیا ہے اور ضروری کاموں میں لگا دیا ہے: ؎
(بیان القرآن ج۱ ص۱۱)

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّہ را

اسرار احکام معلوم کرنے کا طریقہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کے اسرار پوری طرح بیان میں نہیں آ سکتے۔ بس جس کو اسرار معلوم کرنے ہوں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کر کے دیکھے، کیونکہ علمِ اسرار کے لیے نورِ قلب کی ضرورت ہے۔ جب عمل کرو گے تو عمل کے بعد خود بخود یہ علوم و اسرار اپنے اندر پاؤ گے۔

بینی اندر خود علوم انبیاؑ
بے کتاب و بے معید و اوستا

(مظاہر الاقوال ص۱۲۲)

فصل (۳)

مُسلمانوں سے شکایت

مسلمانوں سے شکایت اور گلہ

حق تعالیٰ ہی اپنے دین کے محافظ ہیں ورنہ اس سے پہلے بھی لوگ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں اپنی تمام قوتیں صرف کر گئے مگر کچھ بھی نہ ہُوا۔ اگر اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی محافظت نہ ہوتی اور اس کی حمایت کے لیے حق تعالیٰ وہ جماعت پیدا نہ فرماتے جس کی خبر مخبر صادق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ "میری اُمت میں ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا جو حق پر ہوگا اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی امداد ہوتی رہے گی کسی کی مخالفت اس کو ضرر نہ پہنچا سکے گی۔" تو آجکل کے ریفارمر اور عقلا کی سازش اور شر کچھ کم نہ تھا حق تعالےٰ فرماتے ہیں: "واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔" ان سازشوں کو دیکھ کر اسلام بزبانِ حال کہتا ہے:

ؔ
قتلِ ایں خستہ بہ شمشیرِ تو تقدیر نہ بود
ورنہ ہیچ از دلِ بے رحمِ تو تقصیر نہ بود

اسلام کو غیروں کی شکایت نہیں اس کو تو مسلمانوں ہی سے شکایت ہے۔

ؔ
من از بیگانگان ہرگز نہ نالم
کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

(الافاضات ع۷ ص۱۰۴ ملفوظ ۱۸۲)

موجودہ صورتِ حال اب لوگوں نے حق سبحانہ تعالیٰ کے حکم کا اتباع تو بالکل چھوڑ ہی دیا اور دل ہی کا اتباع اختیار کرلیا۔ اور اتباع کرنے کی دو چیزیں تھیں، عقائد اور اعمال۔ اعمال میں تو یہ گنجائش نکال لی گئی کہ ہم مجبور ہیں اور یہ احکام مصلحتِ وقت کے موافق نہیں۔ مگر اب عقائد میں بھی خواہشِ نفسانی کو ترجیح ہونے لگی ہے۔ اعمال کو پہلے ضروری تو سمجھتے تھے مگر تکلیف سمجھ کر ان کے ادا میں قصور کرتے تھے اب ان کی ضرورت ہی ذہن سے اڑ گئی۔ ادائے اعمال کو تو چھوڑا تکلیف کی وجہ سے مگر ان کے وجوب کے عقیدہ میں کیا تکلیف تھی۔ !

(اشرف المواعظ ع۲ صـ۳۳)

مسلمانو! دنیا کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ اگر اسلام پر قائم رہ کر مان لیا کہ کچھ تھوڑی سی تکلیف بھی بھگت لی تب بھی مرنے کے ساتھ ہی ایسے عیش اور چین دیکھو گے کہ یہاں کی سب تکلیفیں بھول جاؤ گے۔ اور اگر کسی لالچ سے تکلیف سے بچنے کے لیے کوئی شخص خدانخواستہ اسلام سے پھر گیا تو مرنے کے ساتھ ہی ایسی مصیبت کا سامنا ہوگا کہ دنیا کے سب عیش بھول جائے گا۔ پھر اس مصیبت سے کبھی نجات نہ ہوگی تو جس کو تھوڑی سی بھی عقل ہوگی وہ ساری دنیا کی بادشاہی کے لالچ میں بھی اسلام کو نہ چھوڑے گا۔ اے اللہ ہمارے بھائیوں کو ہدایت کر اور ان کی عقلیں درست رکھ۔

(حیات المسلمین صـ۲۶)

حیلہ بازی اور اس کا سبب اے مسلمانو! قانون کی وجہ سے تو تم نے خواہش نفسانی کو چھوڑ دیا اور اللہ اور رسول کے حکم سے نہیں چھوڑتے کیا غضب کی بات ہے؟ اگر قانوناً ممانعت ہو جائے تو ایک بھی حیلہ باقی نہ رہے اور اللہ میاں اگر کسی کام کی ممانعت کریں تو اس میں حیلے نکالے جائیں اور ایسی ایسی تاویلیں کی جائیں کہ تاویل کے مرتبہ سے نکل کر تحریف تک پہنچ جائیں اور

اگر بالکل ہی صریح حکم ہو تو اس کا مقابلہ ضرورت سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حکم تو یہی تھا مگر اب ضرورت ہے۔ قانون کے مقابلہ میں یہ ضرورتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ افسوس محبتِ الٰہی مصلحتِ دنیوی کے برابر بھی نہ ہوئی۔

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود   گوئے گشتن بہر او اولٰے بود

غور کریں تو آجکل احکامِ الٰہی کی اتنی بھی تو قدر نہیں جتنی کہ ایک عورت کے احکام کی۔ احکامِ الٰہی خواہ کتنے ہی سہل ہوں اور سراسر مفید اور حکمت ہوں مگر شاق ہوتے ہیں۔ اگر عورت انہیں احکام کو کہے جن کو اللہ میاں نے فرمایا ہے تو کچھ تکلیف نہ رہے بلکہ اگر کبھی ان احکام کو بھی کہے جو اللہ میاں کے خلاف ہیں۔ تب بھی کچھ شاق نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ احکام فی نفسہٖ شاق نہیں۔ صرف محبّت کی کسر ہے مسلمان کی شان تو یہ تھی کہ اللہ میاں کے سامنے ایسا ہونا چاہیے تھا جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم اور غیر کے سامنے لوہے اور پتّھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا۔

(اشرف المواعظ ۲۔ صـ ۱۳۱)

عہد شکنی پر شکایت اور ترغیب اطاعت

مسلمانو! کیا جواب ہو گا۔ اگر پوچھا جائے گا: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ۔ الآیۃ۔ کہ اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا دشمن ہے۔ میری عبادت کرنا۔ یہ سیدھا راستہ ہے اور دیکھ چکے تھے۔ بہتوں کو اس نے گمراہ کر دیا تھا۔ کیا تمہیں عقل نہ تھی۔ اب یہ جہنم موجود ہے۔" میں کہتا ہوں اگر صرف پوچھا ہی جائے اور دوزخ نہ بھی ہو تو کیا یہ تھوڑا ہے کہ کہا جائے کیوں صاحب ہمارا عہد یاد ہے؟ ہم سے تعلق قطع کر کے باوجودیکہ ہم ہر وقت مہربان تھے اس سے جوڑا جو ہر وقت دشمن تھا۔ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ خجالت اٹھانی پڑے۔ دنیا میں تو قاعدہ مسلمہ ہے کہ بھلائی کا

بدلہ بھلائی مگر اللہ میاں کے ساتھ معاملہ برعکس کیا جاتا ہے جس قدر اس طرف سے احسانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اُسی قدر اِس طرف سے کفرانِ نعمت ہوتا ہے جس قدر ادھر سے ساتھ دیا جاتا ہے اسی قدر ادھر سے قطع کیا جاتا ہے اور بمقابلہ محسن کے دشمن کی پیروی ہوتی ہے۔ دشمن نے جس چیز کا حکم کر دیا اس کو کہا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہے اور اللہ میاں نے جس چیز کا حکم دیا وہ قدرت سے باہر ہے اور ترقی سے روکنے والا ہے بحضرت یہ چیزیں جن کو نفس ضروری ثابت کرتا ہے ان میں انہماک سے حق تعالیٰ سے بُعد بڑھتا ہے اور غفلت پیدا ہوتی ہے۔ ؎

ایں تن آرائی وایں تن پروری	عاقبت سازد ترا از دیں بری
چوں لیضلک عن سبیل اللہ اوست	با ہوا و آرزو کم باش دوست
چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست	تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست

دیکھو ایک جگہ شکایت فرماتے ہیں: اَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ۔ اُس شخص کو بھی دیکھا تم نے جس نے اپنا معبود خواہش نفسانی کو بنایا" ہم کو چھوڑ کر اپنے دشمن کی اطاعت اختیار کی۔ تعجّب ہے کہ اللہ میاں نے انبیاء علیہم السّلام کو بھیجا، احکام کی مصلحتیں بتائیں اور سمجھایا اور خاک نہ سنا۔ اور نفس نے اندر سے ایک شرہ چھوڑ دیا کہ یہ اس طرح کرو۔ بس ایسی بیعت کی ہے کہ کوئی ضرورت نہیں دلیل کی اور کچھ حاجت نہیں مصلحت دریافت کرنے کی، جو حکم ہُوا فوراً تعمیل۔

خواہش نفسانی وہ بری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صدہا معصیتیں ہیں کہ ان میں دنیوی نقصان بھی ہیں معصیت میں دنیا کی مضرتیں بھی ہوتی ہیں ایک یہ کہ اللہ میاں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ رزق میں تنگی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے ہم پر تو تنگی نہیں۔ میں کہتا ہوں رزق سے مقصود کیا ہے؟ اطمینان۔ یہ معصیت کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ اطمینان فراغ قلب کا نام ہے نا جائز

طریق سے کتنا ہی مال حاصل کر لیجیے مگر جو نشاط اور بے فکری قلب کو تھوڑے حلال کے مال سے ہوتی ہے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی بات ہے کہ تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ وجدانی سی بات ہے؛

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　گفتم کہ چو ما شوی بدانی

معصیت کو چھوڑ کر طاعت اختیار کرو، دیکھو قلب میں کیا بات پیدا ہوتی ہے آشکارا ہو جائے گا کہ اطمینان یہ چیز ہے:

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　آزموں را یک زمانے خاک باش

ارے غافل! پتھر تو برسوں رہا ہے، امتحان کے لیے ذرا دیر خاک ہو کر بھی دیکھ جو کبھی نام بھی لے پتھر ہونے کا۔ خاک ہونا وہ چیز ہے کہ خاک ہو کر پتھر ہونا کسی نے قبول نہیں کیا اور پتھر بہتیرے خاک ہو گئے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ جب تک کسی نے کی نہیں جب ہی تک وہ علیحدہ ہے، جہاں تھوڑی سی بھی کی پھر طاعت خود اس کو نہیں چھوڑتی۔ وہ چھوڑنا چاہتا ہے مگر یہ اڑ اڑ کر لپٹتی ہے۔ کر کے دیکھو، امتحاناً ہی سہی میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو اثر کیا بھولے سے بھی طاعت اگر ہو گئی تو اثر ضرور کرے گی۔ کپڑا بھولے سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا مگر دھبے تو ضرور پڑ ہی جائیں گے۔ تجربہ ہوا ہے لوگوں کو دھوکے سے طاعت ہو گئی اور اثر ہو گیا۔ طاعت ایسی چیز ہے کہ بعض اوقات گو اس میں غرضِ صالح نہ ہو مگر انجام کار اسی سے درستی ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں نے علم سیکھا تو تھا غیر اللہ کے لیے، مگر علم نے خود نہ مانا اور اللہ ہی کا ہو کر رہا۔ آگ جلاؤ اور یہ قصد نہ کرو کہ لکڑی جلے، تھوڑی دیر میں لکڑی راکھ ہو جائے گی۔ آگ میں یہ اثر ہے کہ لکڑی میں خود گھس جاتی ہے۔ آپ کے قصد پر موقوف نہیں۔ کسی بزرگ سے کسی نے کہا کہ دیکھیے صاحب فلاں آدمی دکھلاوے کا ذکر کیا کرتا ہے۔ فرمایا کہ تو تو دکھلاوے کا بھی

نہیں کرتا۔ وہ دکھلاوے کا کرتا ہے مگر کرتا تو ہے۔ کبھی نہ کبھی ذکر اس کے دل میں جگہ کر ہی لے گا۔ اور تجھے کیا امید ہے ـــــ؟ (اشرف المواعظ صفحہ ۲۵۔۲۱)

حکومت اور شریعت کے قانون سے ہمارا برتاؤ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا، ارادہ انسان میں وہ قوت ہے کہ اس کے ساتھ وہ تمام مخلوق پر غالب آسکتا ہے۔ آپ میں اتنی بڑی قوت موجود ہے اور پھر آپ یوں کہتے ہیں کہ ہم گناہ چھوڑنے سے عاجز ہیں۔ آپ عاجز ہرگز نہیں، ہاں یوں کہیے کہ ابھی تک چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ارادہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں نہیں۔ گناہ کو ایک معمولی چیز سمجھ رکھا ہے اور جس گناہ کی عظمت دل میں ہے اس میں کسی طرح کی بھی کوئی تاویل منہ سے نہیں نکلتی۔ کیونکہ گناہ دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو شریعت مقدسہ میں حرام ہیں۔ دوسرے وہ جو قانون اور شریعت دونوں کے اعتبار سے ناجائز ہیں۔ بتلائیے ان گناہوں میں آپ کیا برتاؤ کر رہے ہیں جو قانون کی رُو سے بھی ناجائز ہیں اور موجب سزا ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے اجتناب کریں گے۔ ڈاکہ کوئی نہیں مارتا، چوری شریف آدمی بالکل نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ راستوں میں پیشاب تک نہیں کرتے کیونکہ قانوناً جرم ہے۔ اگر کوئی ڈاکو کہنے لگے کہ میں اپنے عیال کو بدون ڈاکہ کے پال نہیں سکتا اس لیے کہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے تو کیا حاکم اس کا یہ عذر قبول کرے گا اور اس کو سزا نہ دے گا؟

اے اللہ کے بندو! ایک جواب حاکم دنیا کے سامنے نہیں چل سکتا وہ خدا کے سامنے پیش کرتے ہوئے کچھ تو شرمانا چاہیے۔ آج کل لوگ بہت بے باک ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ صاحب کیا کریں مجبور ہیں۔ بدون سود و رشوت کے خرچ نہیں چلتا اور علماء کو تنگ کرتے ہیں کہ اس مجبوری پر نظر کریں اور جواز کے فتوے دیں اور یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ جواز کے فتوے دے بھی دیں گے تو وہ بھی آپ ہی کے شمار میں ہو جائیں گے بلکہ

ان کی آپ سے زیادہ گردن نیچے گی. بھلا کسی مولوی کے جائز کرنے سے کوئی حرام حلال ہوسکتا ہے ایں سچ کہتا ہوں کہ عوام مسلمان جن کو ذرا شریعت کا پاس ہے ایسے مولوی صاحب ہی کو چھوڑ دیں گے۔

(امداد)

غفلت کی خاصیت

فالج غفلت کی وجہ سے جسم سُن ہو رہا ہے یا غفلت کا کلوروفارم سونگھ رکھا ہے اس لیے گناہوں کی سوزش کا اثر نہیں ہوتا۔ مگر ایک دن یہ فالج اور یہ سُن اور بے ہوشی اترے گی۔ اس وقت گناہوں کی سوزش کا احساس ہوگا۔

(کمالاتِ اشرفیہ ص۵۹)

گناہوں کی آگ خدائی آگ ہے جس کی خاصیت یہ ہے: نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ۔ اس کا اصل محل قلب ہے اور دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ گناہ گار کا دل بے چین ہوتا ہے۔ اس کو راحت اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ گناہ سے دل ضعیف اور کمزور ہو جاتا ہے جس کا تجربہ نزولِ حوادث کے وقت ہوتا ہے کہ متقی اس وقت مستقل مزاج رہتا ہے اور گنہگار کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔

(کمالاتِ اشرفیہ ص۵۹)

اچھے اور بُرے عمل کی خاصیت

معاصی میں قنوط و یاس پیدا کرنے کی خاصیت ہے جیسا کہ اعمالِ صالحہ میں رجا پیدا کرنے کی خاصیت ہے۔

(کمالاتِ اشرفیہ ص۷۱)

امورِ دین میں کون لوگ سند ہو سکتے ہیں

صاحبو! دین کے لیے تو محض دین کا ہو کہ پچاس پچاس برس محنت کی جائے

کیا غضب ہے کہ ہر کام کے لیے تو اس کا ماہر تلاش کیا جاتا ہے ایک چارپائی کا ڈھانچہ بھی درست کرانا ہو تو اس بڑھئی کو تلاش کیا جاتا ہے جو اس کام کا مشتاق اور مشہور ہو اور دین کے لیے اس کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ عالم دین ہو اور کتابیں باقاعدہ پڑھی ہوں۔ بس اس کے لیے انگریزی پڑھنے والے اور ڈپٹی کلکٹری کرنے والے بھی کافی ہیں! اور غضب ہے ان کے قول کو ماہرین کے قول پر ترجیح دی جاتی ہے اور یہ شخص علماء کی غلطی نکالنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور احکام خداوندی میں اپنی رائے سے ترمیم کرتا ہے۔ بھلا انصاف سے کہیئے میں اگر فنِ زراعت میں غلطی نکالوں تو یہ خلل دماغ ہو گا یا نہیں؟ پھر علم دین نہ جاننے والے علماء کی رائے میں غلطی کیسے نکالتے ہیں۔ آج کل تعلیم کا بڑا چرچا ہے ہر کام کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک انجن کی ڈرائیوری بلا تعلیم کے نہیں ملتی۔ حیرت کی بات ہے کہ ان معمولی کاموں کے لیے تو لیاقت کی ضرورت ہو اور خدائی پارلیمنٹ کا میمبر بننے کے لیے کسی لیاقت کی ضرورت نہ ہو۔ ع

آرزو میخواہ و لیک اندازہ خواہ

حوصلہ بڑھائیے لیکن حد کے اندر۔

(رجاء الغیوب۔ ۳ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ)

احکامِ شریعت میں چون و چرا انکارِ رسالت کے مترادف ہے

اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو پھر ہر بات کو بلا چون و چرا ماننا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہو گا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی ورنہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے ابھی تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جائے اور امورِ آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

ماجرا جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلا چون وچرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیونکر چلے گا۔ (دین ودنیا تفصیل الدین) صفحہ ۱۴۹)

عقل وذکاوت سے کام نہ چلے گا

ایسی عقل جو محبوب سے دوری پیدا کردے وہ عقل نہیں نہایت درجہ اور پرلے درجہ کی بدعقلی ہے۔ اور جو محبوب سے واصل کردے اگر وہ دیوانگی بھی ہے تو ہزاروں عقلوں سے افضل ہے۔ اور وہ دیوانگی وہ ہے جس کو فرماتے ہیں: ؎

باز دیوانہ شدم من اے طبیب ۔۔۔ باز سودائی شدم من اے حبیب

نری عقل اور ذکاوت سے کیا کام چل سکتا ہے جب تک کہ اطاعت اور محبت نہ ہو۔ بس راستہ صرف ایک ہی ہے کہ محبت واطاعت کے ساتھ احکامِ شریعت کے سامنے اپنے کو پیش کردو۔ اور بجز اس کے کوئی راستہ نہیں۔ کیوں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہو کہیں راہ نہ ملے گی۔

(الافاضات ج۵ ص۲۳۲ ملفوظ ۲۷۱)

قبلِ عمل محض عقل سے حقیقت کا ذہن میں آجانا مشکل ہے اور یہ حقیقت ہے کہ شرائع کی مصلحتیں عمل کرنے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہیں جیسے طبیب کامل کے نسخہ کی خاصیتیں بعد استعمال ہی کے معلوم ہوتی ہیں۔ (الافاضات ج۲ ص۱۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ایسی ہیں کہ ان کو استعمال کرکے دیکھو خود ان کی قدر جان لوگے۔ (مظاہر الاقوال ص۴۲)

اہلِ علم کو مشورہ

دین کے مقابلہ میں مصلحت کوئی چیز نہیں۔ حقیقت میں وہ دین کی مصلحت نہیں بلکہ اپنی مصلحتیں ہیں۔ سو یہ تو مصلحت پرستی ہوئی

خداپرستی نہ ہوئی۔ چھوڑو ان مصلحتوں کو ان میں کیا رکھا ہے۔ خصوص اہلِ علم کو تو ہرگز اس طرف نظر نہ کرنی چاہیے۔ ان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

مجدّد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شرائع میں اسرار و مصالح کا تلاش کرنا مرادف ہے۔ انکار نبوّت کا یہ نبی کا اتباع نہیں بلکہ مصالح کا اتباع ہے۔
(ملفوظات ۳ صفحہ ۱۸)

غیر اہلِ علم کو ہدایت

عوام کو لازم ہے کہ اپنے کو جاہل سمجھیں۔ عاقل اور ذی رائے نہ سمجھیں اور اگر عاقل و ذی رائے سمجھیں تو دنیا کی باتوں میں عقل چلالیا کریں۔ قرآن و حدیث کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔ (غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح صفحہ ۲۵)

عقل کا ادراک لامحدود نہیں

یہ بڑی غلطی ہے کہ آدمی اپنی عقل کو کافی سمجھ لے۔ اس سے چھوٹی سے بڑی تک سب قسم کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ عقل ایک قوّت مدرکہ کا نام ہے۔ جس طرح تمام حواس کا ادراک محدود ہے اسی طرح عقل کے ادراک کی بھی ایک حد ہے۔

دین کا راستہ صاف ہے مگر رہبر کی ضرورت ہے

میں بقسم کہتا ہوں کہ دین کا راستہ صاف ہے مگر صاف راستہ کے لیے بھی تو دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سڑکیں کتنی ہی صاف اور چکنی ہوں مگر ان سے بھی تو واقفیت کی ضرورت ہے۔ کوئی نئے راستہ پر بلا رہبر کے نہیں چل سکتا بلکہ بسا اوقات دیکھے ہوئے راستہ پر بھی رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کس قدر فاش غلطی ہے ان لوگوں کی جو اپنی رائے اور عقل

اسی رائے کے انباع سے بڑے بڑے عقلاء نے ذات وصفات کے مسائل میں بڑی بڑی موشگافیاں کیں جن کو لوگوں نے بہت ہی نظر استحسان سے دیکھا اور ان کو بڑا محقق سمجھا مگر جب وحی آئی تو معلوم ہوا کہ تحقیق سے ان کو مس بھی نہ تھا اور سارے اقوال خیالی ڈھکوسلے تھے۔

(الفاف)

آجکل جو لوگ عقل کے مدعی ہیں اور اپنے نزدیک کسی چیز کی نسبت پورے وثوق کے ساتھ رائے قائم کر لیتے ہیں جب اہل حق سے مقابلہ ہوتا ہے تو ذرا دیر میں ان کی تحقیقات لاشئ محض نظر آنے لگتی ہیں۔ آخر حق حق ہے اور باطل باطل قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ بس اسی واسطے دوسرے کے اتباع کی ضرورت ہے۔

رسول ؐ کے حکم سے مزاحمت کا مسلمان کو حق نہیں

امام غزالیؒ نے افسوس کیا ہے کہ طبیب جسمانی کے حکم کو تو بے چون وچرا مان لیا جائے اور طبیب روحانی کے سامنے لِمَ وکَیفَ کیا جائے۔ ...

کر لو یا عظمت حاصل کر لو۔ یہ رافع شبہات ماضیہ ہونے کے ساتھ قاطع شبہات مستقبلہ بھی ہے کیونکہ محبت یا عظمت کے بعد محبوب یا معظم کے کسی حکم میں شبہہ ہی نہیں ہوتا چور کو گھر میں گھسا کر نکالنا کون سی عقل کی بات ہے۔ تدبیر ایسی کرنا چاہیئے کہ چور گھر ہی میں نہ آئے تو یہ تدبیر ایسی ہے کہ اس سے شبہات کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔ بس یہ ہے لوہار کی ایک۔ (خیر الحیات والممات ص۱۸)

ایجادات

فرمایا کہ موجدانِ یورپ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے ایسی ایسی ایجادیں کی ہیں حالانکہ ان سب ایجادوں کی جو چیز جڑ ہے وہ کسی کے بھی اختیار میں نہیں یعنی کسی صورت صنعت کا قوتِ فکریہ میں فائز ہو جانا۔ اگر یہ ان کے اختیار میں تھا تو قوت فکریہ تو بیس برس پہلے بھی تھی۔ اس وقت کیوں وہ صورت ذہن میں نہیں آ گئی؟ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات ذہن سے اتر جاتی ہے تو لاکھ قوت فکریہ کو عمل میں لائیے وہ یاد ہی نہیں آتی۔ کسی بات کا سوجھا دینا یہ حق تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ (حسن العزیز ج۱ ملفوظ ۹۴، ص۶۷)

ایجادات کی حقیقت اور قادر مطلق

آجکل ایجادوں کی کثرت ہے۔ ان میں کامیابی دیکھ دیکھ کر عقلاء کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ کوئی تصرف ایسا نہیں جو ہمارے اختیار میں نہ ہو۔ چنانچہ بہت سے وہ کام جو انسانی قوت سے باہر سمجھے جاتے تھے آجکل ذرا اشارہ میں ہو جاتے ہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ان کاموں میں آپ کا تصرف صرف ترکیب و تحلیل کا ہے ایک چیز کو ایک چیز کے ساتھ ملا دیا اور ایک اثر پیدا ہو گیا یا ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کر دیا اور وہ اثر جاتا رہا۔ اس میں آپ کا کام صرف ملا دینا یا الگ کر دینا ہے۔ باقی اثر کا پیدا ہو جانا یا اثر کا جاتے رہنا آپ کے اختیار سے نہیں ہوتا۔ چونکہ ہمیشہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ پانی ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے۔ اس

واسطے عام طور پر ذہنوں میں یہ سما گیا کہ آگ بجھانا ہمارے اختیار میں ہے حالانکہ دیکھو کہ ہے کیونکہ قدرت کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق مقدور کی دونوں طرفوں سے ہوتا ہے: عدم سے بھی وجود سے بھی۔ یعنی کسی کام پر قدرت جب کہہ سکتے ہیں کہ وہ اور اس کی ضد دونوں ہمارے اختیار میں ہوں۔ پانی ڈالنے سے آگ کا بجھ جانا۔ یہ درحقیقت دو کام ہیں: ایک پانی ڈالنا اور ایک آگ کا بجھ جانا۔ پانی ڈالنا بیشک آپ کا فعل اختیاری ہے اور اس پر ضرور آپ کو قدرت ہے کیونکہ اس کا تعلق ضدین سے ہو سکتا ہے کہ چاہے آپ پانی ڈالیں اور چاہے نہ ڈالیں۔ اور دوسرا کام یعنی آگ کا بجھ جانا۔ یہ آپ کا فعل اختیاری نہیں ہے کیونکہ قدرت کے معنی اس پر صادق نہیں آتے۔

قدرت کے معنی اس پر جب صادق آتے جبکہ آپ کو اتنا اختیار ہوتا کہ پانی ڈالنے کے بعد اگر آپ چاہیں تو آگ بجھے اور اگر نہ چاہیں تو باوجود پانی ڈالنے کے بھی نہ بجھے اور ایسا ہے نہیں کیونکہ پانی ڈالنے کے بعد آگ بجھ ہی جاتی ہے خواہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں تو قدرت کا اطلاق اس پر کیسے ہوگا اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آگ کا بجھنا آپ کا فعل اختیاری ہے۔!

جس کام کو بھی آپ تحقیق کی نظر سے دیکھیں گے اس سے زیادہ نہیں پائیں گے کہ آپ کو اختیار ترکیب و تحلیل اور اسباب کو جمع کرنے کا ہے۔ ہاں عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ ترکیب و تحلیل اور اسباب کے جمع کرنے کے بعد اس کام کو وہ اپنی قدرت سے پورا کر دیتے ہیں۔

لہٰذا آگ اپنی ذات سے جلانے والی چیز نہیں بلکہ جلانے والی چیز کوئی اور ہے اور آگ کا وجود صرف علامت ہے اس بات کی کہ اب وہ فاعل جلانے کا فعل کرے گا جیسے کہ سُرخ جھنڈی خود ریل کو روکنے والی نہیں بلکہ سُرخ جھنڈی کا دکھائی دینا علامت ہے اس بات کی کہ اب ڈرائیور ریل کو روک دے گا۔ چنانچہ ادھر جھنڈی ہلی اور ادھر ریل رک گئی۔ ایسے ہی ادھر آگ روشن ہوئی اور ادھر جلانے کا اثر ظاہر ہوا۔ بس

دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ آگ میں خاصیت ہے جلانے کی۔ حالانکہ جس طرح ریل کا رکنا ڈرائیور کے ارادہ سے ہوا ہے۔ اسی طرح آگ سے جل جانا خالق نار کے ارادہ سے ہوا ہے۔

غرض اس دوام سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے اور خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سب تصرفات حق تعالیٰ کے ہیں۔ تمام تکوینیات موت وحیات، صحت ومرض اور ان کے تمام اسباب جیسے گرمی سردی، بارش وغیرہ سب کو حق تعالیٰ نے اپنے تصرف میں رکھا ہے۔ آپ کو صرف ترکیب وتحلیل کا اختیار دیا ہے۔ جب آپ ترکیب یا تحلیل کرتے ہیں حق تعالیٰ اس فعل کو موجود کر دیتے ہیں جس طرح مجازاً کبھی ریل کو روکنے کی نسبت جھنڈی کی طرف کر دینا بھی درست ہے اس طرح برائے نام اگر افعال کی نسبت اسباب کی طرف کر دی جائے تو مضائقہ نہیں۔ مگر دل میں یہی ہونا چاہیے کہ سبب اصلی کوئی چیز نہیں یہ سب تصرفات اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ (الاسلام الحقیقی)

اللہ تعالیٰ کی عطاء قدرت کا اقرار

مخلوق جو شفقت کرتی ہے وہ اپنے ذاتی مصالح دنیویہ یا اخرویہ کی وجہ سے کرتی ہے اور حق تعالیٰ اس سے مستغنی ہے۔ نہ مخلوق کی وجہ سے اس کی ذات پاک کو کوئی نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان، وہ لم یزل ولا یزال ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

پس حق تعالیٰ کی شفقت نہایت ہی کامل درجہ کی ہوگی۔ مگر ہم لوگ مخلوق کا تو احسان مانتے ہیں جن میں خود اپنی بھی غرض ہوتی ہے اور احسانات خداوندی کا خیال بھی نہیں کرتے۔ دیکھو اگر کوئی ہمیں سامان دے دے تو آیا ہم سامان کا احسان مانتے ہیں یا کہ سامان دینے والے کا۔ پس ہر شے اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے: وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ۔ ہمارا فقط نام ہی نام ہے۔ ورنہ حقیقت میں ہمارا

دخل ہی کیا۔ چنانچہ میں کہتا ہوں تم نے غلہ بونے میں کتنا کام کیا؟ بس یہ کیا کہ جا کر جنگل میں غلہ بکھیر دیا، گھر میں سے نکال کر باہر پھینک آئے، پھر پانی دے کر اور بھی برباد ہونے کا کام کر دیا کہ جلدی گل گلا کر خراب ہو جائے۔ تم نے غلہ پیدا ہونے کا کون سا کافی انتظام کیا؟ یہ شاخ کس نے نکالی اور ڈھیلوں کے اندر سے اُوپر لانے کی کیا کوشش کی؟ کیا تم نے ڈھیلوں میں سوراخ کیا تھا؟ آفتاب کو حرکت کون دیتا ہے؟ بارش کس کے قبضہ میں ہے؟ اور طرح طرح کی آفتوں سے کون محفوظ رکھتا ہے؟ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے۔ انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت برائے نام کرتا بھی ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے کرتا ہے۔ ہماری کوشش پر نتیجہ مرتب ہونا اور خود ہمیں کوشش کی توفیق ہونا یہ سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اسی طرح ایجادات میں سمجھ لو کہ تمہارا کام صرف دماغ سے سوچنا تھا مگر دماغ میں بات کا آجانا یہ تو اختیاری نہیں۔ اگر اختیاری ہے تو اتنی دیر تک کیوں سوچتے رہے؟ اگر قبضہ میں تھا تو فوراً ہی دماغ میں لے آتے۔ ایجاد میں اتنا عرصہ کیوں لگا؟ پھر ایجادات کی حقیقت ہے ترکیب و تحلیل۔ اس کے سوا موجد کیا کر سکتا ہے؟ اگر اس نے کئی چیزوں کو ملا ہی دیا، مگر آخر وہ مفردات کہاں سے آئے؟ اور ان کی جداگانہ تاثیرات پھر مرکب ہونے کے بعد نئی تاثیر کس نے پیدا کی؟ بہرحال ہر کام میں خدا کی قدرت کا اقرار کرنا لازمی ہے۔ بس ہمارا نام کرنے کو بندہ کی طرف نسبت کی اجازت دے دی ہے مگر اس کی اجازت نہیں دی کہ خدا کو بالکل بھول ہی جاؤ۔

ارشاد ہے: أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۔ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۔ کیا پیداوار تم کرتے ہو یا ہم؟ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا ۔ اگر ہم چاہیں تو سب کو فنا کر ڈالیں، بنا بنایا کھیت برباد کر دیں۔

اور تم جو دعویٰ کرتے ہو آبپاشی کا کنوے سے اور نہروں سے أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ

مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ کیا بادل میں سے تم پانی برساتے ہو یا ہم؟

اور اگر دیا سلائی رگڑ کر آگ لگا دی تو یہ بتلاؤ کہ اس میں یہ خاصیت کس نے رکھی؟

پس ہر شے اسی کی ملک ہے، انسان کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور یہ شفقت ہے

اللہ تعالیٰ کی کہ وہ بلا کسی اپنی غرض کے ہمارا کام کر دیتے ہیں۔ پھر جب ہم مخلوق کا احسان

مانتے ہیں جو کہ سب کاموں میں اپنے اغراض کا بھی محتاج ہے تو خدا کی عنایات بے علت

میں غور کر کے تو اس پر جان قربان کر دینی چاہیے۔ (شرط التذکر صہ۳)

جب ان کی طرف سے ایسی جاں بخشی کا برتاؤ ہے تو ہم کو بھی حق تعالیٰ کے ساتھ

جاں دادن کا یہ برتاؤ کرنا چاہیے۔

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ شاد و خنداں پیشِ تیغش جاں بدہ

(دنیا و آخرت صہ۵۱۵)

قانون سے مزاحمت باعث ذلت ہے

عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام ہونا معلوم کر لو۔ اس سے

آگے فروع میں عقل سے کام نہ لینا چاہیے بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے

گردن جھکا دینی چاہیے۔ چاہے ان کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جب بادشاہ کا

بادشاہ ہونا مسلّم اور قانون کا قانونِ سلطنت ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ؟ ضرور

ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ (تفصیل الدین صہ۴۳)

شانِ بندگی

شریعت یہ ہے کہ آدمی اس بات کے لیے آمادہ ہو کہ چاہے میرا نفع ہو یا نقصان اور میری مرضی کے موافق ہو یا مخالف وہی کروں گا جو

شریعت کا حکم ہوگا ۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

جو حالت اختیاری ہو اس میں شریعت پر عمل کرو اور جو غیر اختیاری ہے اس

ہیں تفویضِ تام کرو اور کچھ چون و چرا مت کرو جو تصرف بھی حضرتِ حق تمہارے اندر کریں کرنے دو۔ بس اس کو اپنا حال بنا لو تب یہ کہہ سکو گے: ان صلوتی .... رب العلمین۔

شانِ بندہ پروری

اور دیکھیے قرآن شریف کی بھی کیا بلاغت ہے۔ اللہ اکبر: یہاں رب العلمین کا لفظ کیا موقع سے بڑھایا ہے جس کے معنی ہیں تمام جہان کا پالنے والا۔ اس میں یہ بتلا دیا کہ ہمارے احکام میں وسوسہ ہی نہ لاؤ۔ ہم نے ربوبیت اور تربیت کے لیے احکام مقرر کیے ہیں تم کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ ہم تم کو پرورش کرنے والے ہیں۔ اگر کسی حکم میں کچھ تکلیف بھی معلوم ہوتی ہو تو اس کی ایسی مثال ہے۔ ؎

طفل می لرزد ز نیش احتجاج   مادر مشفق ازاں دم شاد کام

اسی طرح حق سبحانہٗ و تعالیٰ تربیت کرتے ہیں کہ گناہ سے بچانے کے لیے بندوں کو احکام کی تکلیف دیتے ہیں کیونکہ گناہ کا انجام دوزخ ہے۔ اس لیے وہ ہم کو احکام کا مکلف کر کے اس دوزخ سے بچاتے ہیں یا دنیا کی کوئی مصیبت نازل کر دیتے ہیں تو اس کے ذریعے سے معاصی کا کفارہ کرتے ہیں گویا مادہ فاسد کا آپریشن کرتے ہیں۔ مگر مرہم بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ؎

درد از یار است درمان نیز ہم
دل فدائے او شدہ جان نیز ہم

درماں نیز

نیز

تکلیف بھی وہی دیتے ہیں اور اس کی جزا بھی وہی دیں گے۔ ناگوار حالت آپریشن ہے اور گوارا حالت مرہم ہے۔ اصل مرہم تو آخرت میں ملے گا اور دنیا میں بھی تھوڑا سا مرہم ملتا ہے وہ مرہم کیا ہے دل کی راحت اور چین۔

راحتِ قلب

جو شخص احکامِ الٰہی کا اتباع کرتا ہے اور گناہ سے بچتا ہے اور اپنی حالتِ اختیاری اور غیر اختیاری کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دیتا

ہے اس کے قلب میں وہ اطمینان اور راحت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ناگوار حالت اور مصیبت کچھ بھی اثر نہیں کر سکتی۔ ان کے واسطے مصیبت بھی صورۃً مصیبت ہوتی ہے اور حقیقت میں راحت ہوتی ہے۔ جنھوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے ان سے پوچھیے۔ بعض وقت عین کلفت میں ان پر وجد کی سی حالت طاری ہوتی ہے انہی کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش
اگر ریش بینند و گر مرہمش
گدایانے از پادشاہی نفور
بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم میکشند
وگر تلخ بینند دم درکشند

ان کی حالت ناگواری میں بھی وہی ہوتی ہے جو خوشی میں ہوتی ہے:۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی نظر ہر وقت ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اور ہر چیز کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور حق تعالیٰ محبوب ہیں تو جیسا کہ راحت محبوب کا عطیہ ہے ایسے ہی مصیبت کو بھی اسی محبوب کا عطیہ سمجھتے ہیں لہٰذا جس طرح وہ راحت کو سر آنکھوں پر لیتے ہیں ایسے ہی مصیبت کو بھی سر آنکھوں پر لیتے ہیں۔ جب دونوں کا تعلق محبوب سے ہے تو دونوں میں فرق کرنے کی کیا وجہ؟ ان کے قلب میں یہ بات مرکوز ہے کہ ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

حیات بھی ہے تو ادھر ہی سے اور موت بھی ہے تو ادھر ہی سے ہے اور درد بھی ہے تو ادھر ہی سے ہے اور درماں بھی ہے تو ادھر ہی سے جب ہر چیز محبوب

ے یہاں کی ہے تو وہ ہر چیز بھی محبوب ہے ۔ حق تعالیٰ یہ حالت نصیب کریں کہ حقیقت سمجھ میں آجائے اور ہر وقت یہ امر منکشف ہوتا رہے کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہ رب العلمین ہیں۔ ہمارے بدخواہ نہیں ہیں جو کچھ امر تکوینی کرتے ہیں یا تشریعی وہ سب ہمارے لیے خیر ہی خیر ہے۔

آزمائش حالت تکوینی اور تشریعی دونوں ہم نے اپنے قبضہ میں رکھی ہیں۔ اگر تم حالت تشریعی میں آزادی چاہتے ہو تو تکوینی میں بھی کر کے دکھاؤ لیکن وہاں آزادی نہیں چلتی تو امور تشریعہ میں کیوں آزادی کا دم بھرتے ہو۔ ہمارے اختیار دینے پر مت بھولو ہم نے تم کو فی الجملہ اختیار امتحان کے لیے دیا ہے کہ دیکھیں کون ہمارا حکم اپنے قصد سے بے چون و چرا مانتا ہے اور کون اس میں تاویلیں کرتا ہے۔ اختیار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم کو ہمارا حکم بدل دینے کا بھی اختیار ہے تم اس درجہ کے فاعل مختار نہیں ہو۔

جبر و اختیار اس کے ثبوت کے لیے اپنے اختیار کو اس حالت میں دیکھو جس میں ہم بالجبر حکومت کرتے ہیں اس میں غور کر کے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم بالکل بے بس ہو۔ ذرہ برابر تم کو اپنے امور میں اختیار نہیں کبھی ہم ایک شخص کو مارتے ہیں۔ ایسی حالت میں کہ اس کی صدہا مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ اس نے کیا کیا منصوبے دل میں گانٹھ رکھے تھے کہ یوں کروں گا اور یوں کروں گا۔ جب ہمارا حکم پہنچا ان سب کو ناتمام چھوڑ کر اور ایک دم قطع کر کے چل دینا پڑا۔ ہزاروں آدمی روتے اور کلیجہ پھاڑتے رہ گئے کسی سے یہ نہ ہو سکا کہ ایک لمحہ کی بھی مہلت دلا دے۔ بچے روتے رہ گئے۔ بی بی سر پیٹتی رہ گئی۔ احباب منہ تکتے رہ گئے اور ہم نے انہی سب کے ہاتھوں بلا لیا۔ اے انسان تو اس سے سمجھ لے کہ تجھ کو اپنے اوپر قبضہ نہیں تو بالکل دوسرے کے قبضہ میں ہے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے تھے نہ اپنی خوشی چلے

مالک و مملوک اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم کو جانا ہے) میں اللہ تعالیٰ نے مصیبت کے متعلق ہم کو ایک تعلیم فرمائی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ مالک کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے اندر ہر طرح تصرف کرنے کا اختیار ہے۔ پھر پریشانی کیوں ہے؟ یہ کیا ظلم ہے کہ تم کو تو برائے نام مالکیت کی وجہ سے اپنی مملوکات میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہو اور اللہ تعالیٰ کو باوجود مالکیت حقیقیہ کے اپنے مملوکات میں تصرف کا اختیار نہ ہو۔ پس ہم کو یہ تعلیم ہے۔

مصیبت و غم کے وقت اس مضمون کو پیش نظر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت اور غم اس لیے دیا ہے تاکہ بندہ کا عاجز ہونا اور حق تعالیٰ کا مالک و مختار ہونا مشاہد ہو۔ اگر انسان پر مصیبت و غم نہ آئے تو یہ تو فرعون ہو جائے۔

ایک بڑی بے ادبی خلاصہ یہ کہ غم کا سبب یہ ہے کہ تم خدا کی مملوکات میں اپنی تجویز لگاتے ہو۔ حالانکہ دوسرے کی ملک میں تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں۔ بالخصوص احکم الحاکمین کی مملوکات میں اپنی تجویز لگانا تو سخت بے ادبی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہم کو غم اس واسطے ہوتا ہے کہ غم کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

حقیقت غم کی تجویز ہے اگر ہم غم کی حقیقت سے خبردار ہو جائیں تو اس سے خبردار ہونا ہی زوال غم ہے۔ چنانچہ حقیقت غم کی تجویز ہے۔ اگر ہم اس کو سمجھ جائیں تو یقیناً اس کو قطع کر دیں اور جب قطع کر دیں تو پھر غم پاس کو نہ آئے یعنی غلبہ نہ ہو۔

مگر آج کل تو یہ حالت ہے کہ ایک شخص لڑکے کو انگریزی پڑھاتا ہے، اور بہت

سے امتحان پاس کراتا ہے اور حقیقت میں اس کو خدا سے دور کراتا ہے، پھر دفعۃً حرکتِ قلب بند ہونے سے لڑکا سو نارہ گیا تو اب یہ خاک اڑاتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے میری امیدوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اگر اس کو معرفت ہوتی تو اس غم سے پار ہو کر اس بہار میں لگ جاتا جو اس کے اندر موجود ہے:۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر و سمن در آ
تو ز غنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن در آ

ارے تم کو اس تجویز کا کیا حق ہے کہ یہ لڑکا سو سال تک زندہ رہے گا اور اس طرح روپیہ جمع کرے گا۔ یوں گھر کو چلا جائے گا۔ عارف سب سے اوّل اس تجویز ہی کو قطع کرتا ہے۔ اسی لیے وہ کسی مصیبت سے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے ہر تصرّف کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ وہ بچّہ کی دوا دارو اس کا علاج سمجھ کر کرتا ہے۔ مگر دل سے اس پر راضی رہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ وہ جب چاہیں لے لیں ان کو اختیار ہے۔ اس کو بچّہ کے مرنے سے رنج بھی ہوتا ہے مگر محض طبعی رنج ہوتا ہے عقلی رنج نہیں ہوتا۔ آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفائی دیکھیے کہ حضور نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات کے وقت صاف فرما دیا: انا بفراقك یا ابراھیم لمحزونون حضور کو غم بھی ہوا۔ پھر اس کو ظاہر بھی فرما دیا تاکہ کوئی معتقد اس غم کو کسی باطنی حال پر محمول نہ کرے۔ آپ نے صاف فرما دیا کہ بچہ کی مفارقت کا غم ہے۔ اب جو چاہے معتقد رہے اور جس کا جی چاہے معتقد نہ رہے۔

رنج و غم کی حکمتیں

حضرت بنا ہوا آدمی اس موقع پر ہرگز غم کو ظاہر نہ کرتا کہ معتقدین یوں کہیں گے کہ یہ کیسے نبی ہیں کہ بچّہ کے غم میں رو رہے ہیں مگر حضور نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ عملاً بھی آپ نے رنج کو ظاہر کیا اور قولاً بھی تاکہ اُمّت کو معلوم ہو جائے کہ طبعی غم کا مضائقہ نہیں بلکہ یہ تو ہونا چاہیے ورنہ غموم و ہموم میں

جو حکمتیں ہیں۔ مثلاً رفع درجات و اظہار عجز عبد و اظہار اختیار حق ــ وہ باطل ہو جائیں گی۔ اسی لیے محققین نے کہا ہے کہ جو لوگ اولاد کے مرنے کے وقت ہنس دیے ہیں وہ ناقص تھے اور جو رودئے ہیں وہ کامل تھے کیونکہ اس نے اولاد کا بھی حق ادا کیا اور خالق کا بھی۔ اولاد کا یہ بھی حق ہے کہ ان کی مفارقت کا رنج کیا جائے اور خالق کا یہ حق ہے کہ عقلاً اس کے تصرف سے راضی رہے۔

اتباعِ رسول ؐ کے کرشمے

فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام ایسے کامل العقل اور کامل الدین بھیجے گئے کہ ارسطو، افلاطون، جالینوس بھی ان کے سامنے گردن جھکا کر بیٹھ جائیں۔ اگر مسلمانوں میں تدین راسخ ہو جائے تو ان کی عقل کھل جائے اور پھر تمام پر یہی غالب ہو جائیں مگر اس طرف تو آتے ہی نہیں ایک نیا دین تراش رکھا ہے۔ (ملفوظات ج۲ صہ ۱۷۹)

وہ تو بہت رحیم و کریم ذات ہے جس کو تم بھلا رہے ہو۔ کوئی انگریزوں کی بغل میں جا کر گھستا ہے کہ ان کے پاس ہماری فلاح و بہبود کے اسباب ہیں۔ ان کی سی بول چال، ان کا سا لباس، ان کی سی معاشرت اختیار کرتا ہے۔ کوئی ہندوؤں کی بغل میں جا کر گھستا ہے کہ ان کے ساتھ رہنے میں ہماری فلاح اور بہبود ہے۔ ان کے ساتھ شریک ہو کر احکام اسلام تک کو پامال کر لینے کو تیار ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ایمان تک ان کی نذر کر دیا مگر رہے کورے کے کورے، نہ انگریزوں سے کچھ ملا اور نہ ہندوؤں نے کچھ دیا۔

بہت دنوں تک بتوں کی پرستش کر کے تجربہ کر لیا۔ اب ذرا خدا کو بھی پوج کر دیکھ لو۔

سالہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

حق تعالےٰ مسلمانوں کو فہم سلیم اور عقل کامل عطا فرمائیں۔

(الافاضات ج۵ صہ ۱۴۶)

ایمان جس قدر کامل عقل اسی قدر زیادہ فرمایا کہ ایمان جس قدر اور جتنا کامل ہوتا ہے، اتنی ہی فراست قوی ہوتی ہے۔ سلاطین اور شاہانِ سلف ہی میں دیکھ لیجیے جو سلاطین جس قدر متبع سنت ہوئے ہیں ان کی حکومت کے کارنامے موجود ہیں دیکھ لیجیے کس درجہ کے ہیں۔ منجملہ ایسے بادشاہوں کے عالمگیرؒ کے کارناموں کو دیکھ لیا جائے کہ ان کی شجاعت، بہادری، دلیری، سیاست، فراست کی کیا انتہا ہے۔ یہ سب قوتِ ایمان کی برکت اور اتباعِ سنت کے کرشمے ہیں۔ انہی چیزوں کو تو مسلمانوں نے چھوڑ دیا اس لیے ذلیل و خوار ہیں۔ دوسروں کے یہاں گداگری کرتے پھرتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرتے ہیں۔ اسلام کے اندر تو ہر طبقہ کی ضرورت کی چیز موجود ہے خواہ امیر ہو یا غریب بادشاہ ہو یا فقیر۔ اپنے گھر میں سب کچھ دولت بھری ہے اور دوسروں کی طرف دیکھ دیکھ کر منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے۔ (الافاضات ع۵ ص۵۹)

...... ایک انگریز کا قول یاد آیا اس کے پاس ایک صاحب سررشتہ دار تھے۔ ان سے اس انگریز نے کہا تھا کہ "ہماری جماعت میں بڑے اور متعدد بیدار مغز کام کر رہے ہیں اور تقریباً ڈیڑھ سو برس حکومت کرتے ہو گئے مگر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) تیرہ برس میں انتظام کی جس حد تک پہنچے، ہماری جماعت نہیں پہنچی"۔ انہوں نے کہا کہ اب تو آپ قائل ہوں گے کہ ان کے ساتھ یہ تائید غیبی تھی"۔ اس نے کہا کہ "یہ تو آپ کا عقیدہ ہے مگر ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عاقل اعلیٰ درجہ کے تھے"۔ انہوں نے کہا "ہمارے یہاں عقل کے ایسے ہی درجہ کا نام تائید حق ہے"۔

اسی عقل کے متعلق سفیر اسلامی نے ہرقل کے دربار میں جب اس نے حضرت عمرؓ کی حالت کے متعلق پوچھا دو چھوٹے چھوٹے جملے حضرت عمرؓ کی تعریف میں کہے تھے: "لایخدع ولا یُخدع" کہ نہ دھوکہ دیتے ہیں اور نہ دھوکہ میں آتے ہیں۔ ان سے بڑا

جو کچھ سمجھا وہ بھی قابلِ تعریف ہے چنانچہ اس نے اہلِ دربار سے کہا کہ تم کچھ سمجھے "لا ینخدع" خلیفہ کے دین کے کامل ہونے کی دلیل ہے اور "لا یخدع" ان کی فراست اور عقل کے کامل ہونے کی دلیل ہے اور جس شخص میں دین اور عقل جمع ہوں گے وہ سارے عالم پر غالب آ کر رہے گا۔ (ملفوظات ج۳ ص۱۸۱)

اطاعتِ امیر اور جانثاری کی ایک مثال

حکومت کے لیے اطاعتِ امیر لابدی ہے مسلمانوں میں اس وقت بڑی کمی اسی اطاعت کی ہے۔ حضرت ابومحجن ثقفی اس جرم میں کہ انہوں نے شراب کی تعریف میں اشعار لکھے تھے، عین کارزار میں زنجیر سے باندھ دیے گئے تھے۔ کفار میں ایک شخص رستم نامی تھا جس نے کئی مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔ حضرت ابومحجن کو یہ دیکھ کر جوش اٹھا کہ میں جا کر اس کا مقابلہ کروں مگر مجبور تھے کیونکہ زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ بالآخر ان سے نہ رہا گیا اور امیرِ لشکر کی بیوی سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ مجھ کو اس وقت چھوڑ دیا جائے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر صحیح سلامت واپس آ گیا تو پھر آ کر اپنے آپ کو اسی زنجیر سے بندھوا دوں گا اور اگر شہید ہو گیا......... تب بھی امیرِ لشکر کا کچھ حرج نہ ہوگا کیونکہ وہ مجھ سے ناراض ہیں ہی مجھ سے ان کو چھٹکارا مل جائے گا۔ جب بہت منت سماجت کی تو وہ اس پر راضی ہو گئیں۔ پھر انہوں نے عرض کیا کہ مجھے کچھ سامان بھی تو لڑنے کا چاہیے۔ اس وقت سوائے امیرِ لشکر کے گھوڑے اور تلوار کے اور کچھ سامان فارغ نہ تھا چنانچہ انہوں نے انھیں بیوی سے کوشش کر کے اجازت لے لی اور وہی گھوڑا

سمجھے کہ کوئی غیبی فرشتہ تھا جب معرکہ سر کرکے لشکر واپس آیا تب سب کو یہ واقعہ معلوم ہُوا۔

دیکھیے اطاعت اور جاں نثاری اس کو کہتے ہیں کہ باوجود مقید کر دیے جانے کے برابر مانا اور یہ کارِ نمایاں کر آئے۔ اور پھر آکر اپنے آپ کو مقید کرا دیا۔ اُدھر امیر لشکر نے بھی حکمِ شریعت کے جاری کرنے میں عین موقع کارزار میں بھی پس و پیش نہ کیا اور چوں کہ شرعی حکم تھا اس لیے ایسے کار آمد شخص کو بھی قید کر دیا اور اس کے ساتھ کچھ رعایت نہ کی۔ بات یہ ہے کہ وہاں "اصل مقصود حکم کی تعمیل" اور "تحصیل رضائے الٰہی تھا اس کے مقابلہ میں اور کسی مصلحت کی پروانہ کرتے تھے۔ ان حضرات کا تو بس یہ مسلک تھا۔ ؎

مصلحت دیدِ من آنست کہ یاران ہمہ کار
بگذارند خمِ طرۂ یارے گیرند

(الافاضات ج۲ ص ۴۷۹، ۴۸۰ ملفوظ ۲۰۰)

کام کی دُھن

جن کاموں کا وقت آگیا ہو ان کو استقلال اور پابندی سے ادا کیا جائے اور جن کا وقت نہیں آیا ان کے لیے تیار و مستعد رہے۔ کسی وقت بیفکر ہو کر نہ بیٹھیے۔ بس دین یہ ہے کہ آدمی کو ہر دم ایک دُھن لگی رہے، یا تو کسی کام میں لگا ہُوا ہو یا کسی کام کی تیاری میں مشغول ہو۔ (سبیل النجاح ص ۴۶)

دل برداشتہ نہ ہو

بہت سے لوگ ادنیٰ درجہ کے کام کے لیے تمام عمر برباد کرتے ہیں اور ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوتے اور تمام عمر اسی دُھن اور طلب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور افسوس ہے کہ ہم مطلوبِ اعلیٰ اور اشرف کی طلب میں چند ہی روز میں گھبرا جاتے ہیں۔ (اعانۃ النافع ص ۲۶)

ہمّت نہ ہاریے

حضرت خواجہ (عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ) ڈپٹی کلکٹری کے امتحان کی مصیبت میں تھے۔ چونکہ دلچسپی نہ تھی اس لیے کامیابی

نہایت دشوار تھی۔ ایک عریضہ میں پریشانی کا اظہار کیا تو تحریر فرمایا۔ ہمت نہ ہاریے
دلجمعی کے ساتھ گو ناگوار ہو کوشش کیجیے! ؎

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

امتحان کو ضرور پاس کر لینا چاہیے، تارک الدنیا ہونا چاہیے نہ کہ متروک الدنیا۔

(کمالات اشرفیہ ص۲۲۳)

عقیدۂ آخرت اور فضولیات کا ترک

بے کار باتوں میں کیا رکھا ہے کام میں لگو اور اپنے وقت کو خدا کی نعمت سمجھ کر اس کی قدر کرو۔ آنکھ بند کرتے ہی وقت ضائع کرنے کا پتہ چل جائے گا، تمام تحقیقات تدقیقات دھری رہ جائیں گی۔

(الافاضات ج۶ ص۲۲)

فضولیات اور ضروریات

جو شخص فضولیات میں مبتلا ہوگا وہ کبھی ضروریات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تجربہ کی بات ہے

(الافاضات ج۳ ص۴۶ ملفوظ ۸۸)

آخرت سے غفلت

جس کو مقصود حضرتِ حق ہوں اس کو اور فضول خرافات اور قصوں جھگڑوں کی کہاں فرصت۔ یہ تو انہیں کا کام ہے جو آخرت سے بے فکر ہیں۔

(الافاضات ج۳ ص۲۶۸ ملفوظ ۴۶۹)

دُنیا اور آخرت کی بھلائی

جس بات میں کوئی فائدہ نہ ہو اس کو ترک کر دینا چاہیے جس کا عمل اس پر ہوگا اس کی زندگی بڑی حلاوت کی ہوگی۔ خیرِ دنیا، خیرِ عقبیٰ دونوں اس کو حاصل ہوں گی۔ لایعنی باتوں میں بڑا وقت برباد ہوتا ہے۔

(کمالات اشرفیہ ص۱۲۶)

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو

کسی نے بذریعہ خط معلوم کیا تھا کہ جو لوگ حرام مال کھاتے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ فرمایا کہ مجھ کو

فضول سوال سے سخت گرانی ہوتی ہے۔ جو بات دُوسروں کے متعلق دریافت کی ہے اس کا جواب یہ ہے۔ ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو

(کمالات اشرفیہ ص۳۲)

دُنیوی لذّتیں چھُوٹ جانے کا خوف اگر کسی کو یہ ڈر ہو کہ ہم متقی بن جائیں گے تو دنیا کے مزے جاتے رہیں گے تو میں کہتا ہوں کہ تم یہ نیّت کر لو کہ متقی نہ بنیں گے۔ مگر خدا کے لیے علماء اور مشائخ کی صحبت میں رہ کر ایک دفعہ دین کو سمجھ تو لو۔ اس کا یہ اثر ہو گا کہ تمہیں متقی بننے کے لیے کوئی دِقت پیش نہ آئیگی بلکہ تم خود بخود عمل کے مشتاق ہو جاؤ گے اور تم کو اس وقت اعمال دینیہ میں وہ حظ اور لذّت آئے گی کہ دنیا کی تمام لذّتوں کو بھول جاؤ گے۔

(الجبر بالصبر ص۴۴)

فصل (۴)

النفیہ

اختیاری و غیر اختیاری

حضرت مولانا کی دلی تمنا کس طرح دل میں دل ڈال دوں۔ جی چاہتا ہے کہ سب اس طرح راہ پر آجائیں کہ ان کی ہر ادا سے اسلام کی شان ظاہر ہو جیسے صحابۂ کرام کو لوگ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے یہ ان کا نمونہ بن جائیں۔ دنیا و دین کی بہبود اسی میں مضمر ہے۔

یہ امر واقعی ہے کہ اگر مسلمان اپنی اصلاح کرلیں اور دین ان میں راسخ ہوجائے تو دین تو وہ ہے ہی، لیکن دنیوی مصائب کا بھی جو کچھ آج کل ان پر ہجوم ہے انشاءاللہ چندروز میں کایا پلٹ ہوجائے۔ اور گو اس پر دلائل بھی ہیں مگر اس کا جو حصہ ذوقی ہے چاہتا ہوں کہ اس کو ظاہر کردوں مگر اس کے اظہار پر قدرت نہیں۔

جیسے ایک مادر زاد اندھے حافظ کی حکایت ہے جو حقیقت سمجھ میں آنے کی وجہ سے کھیر کو ٹیڑھی سمجھ بیٹھے۔ ایسے ہی اس طریق میں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ وہ بیان میں نہیں آسکتیں حقیقت معلوم ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ ہے کہ کام کرنا شروع کرو خود بخود سب معلوم ہوجائے گا مگر اس طریق میں اول ہی قدم میں اس کی ضرورت ہے کہ اس کا مصداق بن جائے۔ ؎

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

Scanned with CamScanner

تقریروں سے یا قیل وقال سے کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یہ تو کام کرنے سے معلوم ہوتا ہے اس میں عقل کی بھی رسائی نہیں ۔ صاحبو! عقل سے جو کام لینے کا ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ پر اعتماد و انقیاد کا اپنے کو مکلف سمجھ لے۔ آگے طرقِ جزئیہ انقیاد کے، اس میں عقل کا کام ہے کہ وحی کا اتباع کرے۔ (ملفوظات ۱۰ ص ۳۷)

خدا پرستی اور بندہ کی شان

ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر ایک کافر معرکۂ جہاد میں میرا ایک ہاتھ کاٹ دے پھر جب مجھے اس پر قابو ملے اور میں اس کو مارنا چاہوں تو وہ کلمۂ اسلام زبان سے پڑھ دے تو میں کیا کروں؟

حضورؐ نے فرمایا: ہاتھ روک لو۔

صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس حالت میں تو وہ محض جان بچانے کو کلمہ پڑھتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ہاتھ روک لو، اگر تم نے اس کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کیا تو اس کی وہ حالت ہوگی جو کلمۂ اسلام کے بعد تمہاری حالت ہوئی تھی۔ اور تمہاری وہ حالت ہوگی جو کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی حالت تھی۔ تم کو کسی کے دل کی کیا خبر۔

یہ ہے خدا پرستی کہ تمام مصالح پر خاک ڈال دی اور حکم کا اتباع کیا چنانچہ حضراتِ صحابہ کے کارناموں سے معلوم ہوگا کہ انہوں نے ان احکام کی کس قدر پابندی کی۔

عبدیت اسی کا نام ہے۔ بندہ کی شان تو یہ ہے کہ احکام کا اتباع کرے۔ مصالح کی پروا نہ کرے۔ انجن کو کیا حق ہے کہ راستہ میں ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد نہ ٹھہرے بلکہ اس کو ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد فوراً ٹھہر جانا چاہیے، خواہ اس کے نزدیک ٹھہرنے کی جگہ ہو یا نہ ہو۔ (اصل العباد ص ۱۱)

تعمیل حکم کی ایک نظیر

حضرتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے اور بعض لوگ پریشان پھر رہے تھے۔

آپ نے ان کو بٹھلانے کے لیے ارشاد فرمایا: اِجْلِسُوْا (بیٹھ جاؤ) اس وقت ایک صحابی دروازہ پر تھے جس وقت آپ کی مبارک زبان سے اجلسوا کا لفظ ان کے کان میں پہنچا اسی وقت دروازہ ہی پر بیٹھ گئے۔ ہرچند یہ حکم ان کے لیے نہ تھا، لیکن شدتِ اطاعت غالب آگئی اور گوارا نہ ہوا کہ آپ ایک حکم فرمائیں خواہ کسی کو بھی اور اس کی تعمیل نہ کی جائے۔ مسلمانو! تم میں ذوق اور محبت نہیں، طلب صادق تم میں نہیں پائی جاتی۔ اگر محبت اور طلب ہوتی تو ہرگز شبہات اور اعتراضات پیش نہ آتے۔ (دنیا و آخرت: تذکیر الآخرت ص ۱۱۵)

عقل کے حدود انسانی عقل بہت محدود چیز ہے اور مخلوق ہے وہ خالق کے اسرار میں کیسے حکم کر سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل نکمی چیز ہے اور سب اس کو چھوڑ کر بے عقل اور پاگل دیوانے بن جائیں۔ یہ تعلیم کسی نے نہیں دی بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی کے اسرار دریافت کرنے میں عقل کافی نہیں، جہاں تک اس کی رسائی ہے وہاں تک بڑے کام کی چیز ہے اس سے ضرور کام لینا چاہیے اور جہاں تک اس کی رسائی نہیں وہاں اس کے بھروسہ پر رہنا غلطی ہے۔ اس کی رسائی اور طاقت کی حد یہ ہے کہ احکامِ الٰہی سمجھ لے اور اس کی تعمیل کرے اور یہ اس کی طاقت سے باہر ہے کہ ان کی لم کو سمجھ لے۔

انقیاد کامل کی مثال مسلمان ہر حال میں منقاد و فرمانبردار رہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے آنکھ نہ اٹھائیے، سر جھکا کر مان لے۔ وجہ اور علت کیا چیز ہوتی ہے اور حکمت کس کو کہتے ہیں! ان کا حکم ہی ہر چیز کی علت ہے اور وہی حکمت ہے۔ (ملخص از وعظ الاسلام الحقیقی)

ایسے افعال کا بجالانا جن میں عقل کو دخل نہ ہو یا کم ہو اور شانِ تعبدی (عبدیت) زیادہ ہو۔ موجبِ اطاعتِ زائدہ اور علامتِ عبدیت کاملہ ہے اور جس قدر ہماری

عبدیت کا ظہور ہو گا۔ حق تعالیٰ کی عظمت کا انکشاف زیادہ ہو گا، ہم پر بھی دوسروں پر بھی۔ اسلامی شان وشوکت کثرتِ افواج اور قوت اسلحہ سے نہیں بلکہ عبدیت کے اظہار سے ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں گردن بہ طاعت نہادن۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کی شان وشوکت تو یہی ہے کہ کمال عبدیت اور انتہائی فناء کا ظہور ہوا اور یہ معنی حج و قربانی دونوں میں مشترک ہیں اسی لیے یہ دونوں شعائرِ اسلام کہلاتے ہیں۔

مسلمان کا یہی بڑا کمال ہے کہ باوجودیکہ ذبح کے وقت اس کے دل میں رقت ہے اور جانور کی صورت دیکھ کر دل پسیج رہا ہے۔ پھر بھی وہ خاموش کھڑا ہو کر حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مشغول ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۸۹-۲۸۸)

(۱) اختیاری انقیاد

انسانی اختیار اور اس کی حکمت انسان احکامِ شرعیہ میں کسی عمل پر مجبور نہیں جیسا کہ تکوینیات میں ہے کہ کوئی واقعہ تکوینی انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اعمال شرعیہ میں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کیونکہ امتحان مقصود ہے۔ اسی لیے اس کو خیر و شر بتلا دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اختیار بھی دے دیا گیا کہ چاہے وہ خیر کو اختیار کرے چاہے شر کو۔ یہاں صرف انقیاد اختیاری ہو سکتا ہے انقیاد اضطراری یہاں نہیں۔

اختیاری انقیاد کی وضاحت انقیادِ اختیاری تشریعات میں یہ ہے کہ احکام کو بے چون و چرا بجالاؤ۔ اطاعت اور بندگی کے یہ معنی نہیں کہ جس کے ساتھ اس بندگی کا دعویٰ کیا جائے اس کے حکم کے سامنے اپنی رائے بھی باقی رہے۔ صاحبو! مسلمان کے لیے رائے کیا چیز ہے۔ اپنی رائے کو فنا کر کے حکم الٰہی کے پیچھے پیچھے چلنا چاہیے۔ اپنی غرض اور رائے کو آگے رکھ لینے کے

بعد انکشافِ حقیقت نہیں ہو سکتا اور حق کا پتہ نہیں چل سکتا۔ اس وقت جس چیز کا پتہ چلے گا وہ شریعت نہیں ہو گی بلکہ نفس اور شیطان کا حکم ہو گا۔ شریعت یہ ہے کہ آدمی اس بات پر آمادہ ہو جائے کہ چاہے میرا نفع ہو یا نقصان اور میری مرضی کے موافق ہو یا مخالف وہی کروں گا جو شریعت کا حکم ہو گا۔ حق تعالیٰ نے تمام افعال کے متعلق احکام مقرر کیے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ حق تعالیٰ کو حاکمِ مطلق سمجھے کسی علم میں وجہ نہ پوچھے جیسا کہ آج کل مذاق ہو گیا ہے کہ ہر علم کی وجہ اور فلاسفی پوچھی جاتی ہے۔

مصائب کا سبب

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ سماوی مصائب جو انسان پر آتے ہیں یہ تو غیر اختیاری ہیں۔ اور ارضی جس قدر مضرتیں ہوتی ہیں یہ اکثر اپنی غفلت کے سبب سے۔ حتیٰ کہ زوالِ سلطنت بھی غفلت ہی سے مسبب ہے۔

(الافاضات ج ۲ ص ۲۷ ملفوظ ۵۲)

ہر شے سائل و محتاج ہے

کوئی زبانِ قال سے سوال کرتا ہے کوئی زبانِ حال سے بقصد اور کوئی زبانِ حال سے بلا قصد۔ تلاوت میں مشغول ہونا یہ بھی سوال بزبانِ حال قصداً ہے اور بلا قصد میں سب شامل ہیں۔ جمادات بھی نباتات بھی اور ملحدین و متکبرین بھی۔ کیونکہ سب کی حالتِ حدوث و امکان بتلا رہی ہے کہ یہ کسی بڑی ہستی کے محتاج ہیں جس کے قبضہ میں سب کا وجود و بقا ہے چنانچہ ہر ملحد و متکبر کی حالت دیکھ لی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ احتیاج میں سر سے پیر تک بندھا ہوا ہے۔ بس پورے طور سے یَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍ کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں پر "من" کا لفظ تغلیباً ہے اور اگر اہلِ تحقیق کا قول لیا جائے تو تغلیب کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے نزدیک جمادات و نباتات وغیرہ سب ذوی العقول ہیں، غیر ذوی العقول نہیں، گو ان کی عقل اس درجہ نہ ہو جو تکلیف بالاحکام کے لیے کافی ہو مگر معرفتِ حق کے لیے ضرور کافی ہے چنانچہ حیوانات و

جمادات ونباتات سب کے سب خدا کو پہچانتے ہیں بلکہ انبیاء اور اولیاء تک کو پہچانتے ہیں۔

(انفاس عیسیٰ)

غیر ذی رُوح چیزوں کا انقیاد غیر ذی روح چیزوں میں شعور بھی ہے اور کم وبیش حق تعالیٰ کی معرفت بھی اپنی تسبیح کا شعور بھی لیکن اختیار نہیں۔ ترک تسبیح پر قدرت نہیں۔ (حسن العزیز ج۱ ص۳۱۶)

اسباب و عناصر کا انقیاد ظاہر میں یہ اسباب موثر نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں سوائے حضرتِ حق کے کوئی چیز موثر نہیں۔ یہ اسباب بھی ان کے حکم کے بعد ہی کام کرتے ہیں: ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
بامن وتو مُردہ باحق زندہ اند

آگ بیشک فاعل ہے مگر کب تک؟ جب تک اللہ تعالیٰ اس کو معطل نہ فرما دیں اور جب معطل فرما دیں کسی کام کی نہیں۔ جیسے تحصیل دار حاکم ہے جب تک کہ معطل نہ ہو جب معطل ہو گیا تو جیسے اور رہیں ویسا ہی وہ بھی ہے۔

(تطہیر الاعضاء ص۸)

حق تعالیٰ کا تصرف اور فلسفیوں اور دہریوں کی مثال مسبَّب کا اسباب پر ترتب محض ان کا فضل ہے انعام ہے ورنہ کوئی چیز بھی موثر حقیقی نہیں محض حکم ہے جو کچھ ہے ؎

نبارد ہوا تا نگوئی ببار　　زمیں نا وردتا نگوئی بیار

پانی بالذات پیاس نہیں بجھاتا وہی بجھاتے ہیں ورنہ وہی پانی مستسقی کی پیاس کیوں نہیں بجھاتا۔ اسی طرح آگ خود فعل نہیں کرتی۔ یہ بھی حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ کھانا پکا دیتی ہے آگ کا تلبس محض ظاہری ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اور فرماتے ہیں ؎

عشقِ من پیدا و معشوقم نہاں
یار بیروں فتنہ او در جہاں

اسی طرح تمام عالم میں ان کا تصرّف ہے اور وہ خود نظر نہیں آتے۔ گو یہ سب تصرّفات انہیں کے ہیں۔ رازق نظر نہیں آتا رزق نظر آتا ہے اس سے یہ دہری سمجھے کہ رزاق کوئی ہے ہی نہیں۔ ان فلاسفہ اور دہریوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چیونٹی لکھے ہوئے کاغذ پر چلی اس پر حروف لکھے دیکھ کر کہنے لگی کہ کیسے اچھے حروف بن رہے ہیں۔ دوسری چیونٹی نے کہا یہ خود بخود نہیں بنے بلکہ یہ قلم نے بنائے ہیں تیسری نے کہا کہ قلم کیا بناتا وہ قلم کسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس ہاتھ نے بنائے ہیں۔ چوتھی نے کہا کہ ہاتھ کیا بناتا جس نے ہاتھ کو بنایا یہ سب اس کا کمال ہے۔ غرض ایک حقیقت پر پہنچ گئی باقی سب وسائط میں الجھے ہوئے ہیں اور حقیقت سے بے خبر ہیں۔

(ملفوظات ع۴ صہ ۱۸۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک واقعہ قرآن مجید میں ایک مفصل واقعہ موجود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص مقتول ہو گیا تھا۔ قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے قوم نے دُعا کی استدعا کی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر حکم ہُوا: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً۔ کہ "اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو"۔ جواب میں لوگوں نے کہا: اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا۔ "کہ کیا ہم سے دل لگی کرتے ہو"۔ مطلب یہ کہ ذبحِ بقر میں اور احیاءِ میّت میں کیا جوڑ۔ کوئی ان سے پوچھے کہ احمقو! تمہیں جوڑ کی کیا خبر۔ تبلاؤ پانی میں اور آگ کے

بجھنے میں کیا جوڑ۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ آگ کا پانی سے بجھنے کا یہ سبب ہے کہ آگ میں حرارت اور پانی میں برودت ہے اور پانی اپنی برودت کے سبب آگ کو بجھا دیتا ہے، میں دریافت کروں گا کہ برودت کا حرارت کے بجھانے سے کیا جوڑ بجز مشاہدہ کے۔ اسی طرح کھانے کے پکنے اور آگ میں کیا جوڑ، غرض یہ ہے کہ کسی چیز میں بھی کچھ جوڑ نہیں۔ سب حق تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جن چیزوں میں چاہیں جوڑ لگا دیں اور جن چیزوں میں چاہیں توڑ دیں۔ (عود العبد)

نئے خیال کے لوگوں کی ایک غلطی

نئے خیال کے لوگ اسبابِ عالم پر ایسے جمے ہیں کہ مسبّب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا۔ اسبابِ طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ کر تصرفاتِ حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور غلطی ان کو یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا۔ (دعوات ج۲ ص۲۴۹)

(۲) تکوینی احکام میں انقیاد کے طریقے

مصیبت اور غم کے وقت

مصیبت اور غم کے وقت اس مضمون کو پیش نظر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت اور غم اس لیے دیا ہے کہ بندہ کا عاجز ہونا اور حق تعالیٰ کا مختار و مالک ہونا مشاہد ہو۔

(التیسیر ص۱۴)

علاج حوادث

واقعات و حوادث و تشویشاتِ کونیہ کا علاج صرف توکل اور تفویض اور اپنی خیالی تجویزوں کا ترک کر دینا ہے نہ کہ تدبیروں کا۔

(انفاس عیسیٰ ص۲۶۵)

تجویزِ حق میں کاوش کا نتیجہ

تقدیر تجویزِ حق کا نام ہے جس کا تعلق ذات و صفاتِ حق سے ہے اس میں کاوش کرنے سے بجز حیرت و پریشانی

(النفحات ص۶)

کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

وجہِ اجرائے احکام اگر تم کو اعتماد نہیں نہ ہو، حق تعالیٰ کو تو تم سے محبت ہے اس لیے وہ تمہاری اصلاح و تکمیل کے لیے برابر احکام بیان فرماتے رہیں گے اور بہت سے احکام کی حکمت بھی نہ تبلائیں گے۔

(عصم الصنوف ص۳۶)

اہلِ دین کا طریقہ خدا کی رحمت سے مصیبت میں مایوس نہ ہو بلکہ فضل و کرمِ الٰہی کا امیدوار رہے کیونکہ اسباب سے قوی بھی تو کوئی چیز ہے تو یاس کی بات تو وہ کہے جس کا ایمان تقدیر پر نہ ہو۔ اہلِ دین کا طریقہ تو رضاء بقضاء ہے۔

(کمالاتِ اشرفیہ ص۱۶)

تعلق مع اللہ اور اُس کا طریقہ فرمایا کہ مصائب میں جو حکمتیں ہوتی ہیں وہ حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں اگر بندہ کو معلوم ہوجائیں تو وہ مصائب کی تمنّا کرے اور دعائیں کرے۔ جب اس میں حکمت ہے تو وہ ہر مصیبت میں یہ استحضار کرے کہ اس میں میرے لیے حکمت ہے۔ اب رہا یہ کہ وہ حکمت کیا ہے؟ اس کی کاوش فضول ہے کیونکہ وہ حکمت بھی ایک واقعہ ہوگا تو پھر اس حکمت کی حکمت کے معلوم کرنے کا سوال ہوگا۔ اس کے بعد پھر اس حکمت کی ضرورت سمجھی جائے گی تو اس سلسلہ کا منقطع ہونا محال ہوگا۔ یہ سلسلہ صرف یوں منقطع ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ سے تعلق پیدا کرے تو ان کے کسی تصرّف میں کسی سوال کا وسوسہ ہی نہ ہوگا۔ اب یہ بات رہ گئی کہ اللہ سے کیسے تعلق پیدا ہو؟ اس کا طریق یہ ہے کہ اللہ والوں سے تعلق پیدا کرو اور یہی ایک ذریعہ ہے تعلق مع اللہ کا اور تعلق مع اللہ ہی اس سلسلہ کو منقطع کر سکتا ہے۔

(الملفوظات ج۶ ص۳۰۹)

پریشانی کا سد باب جو شخص خدا تعالیٰ کو حکیم سمجھے گا وہ کسی واقعہ سے کبھی پریشان نہ ہو گا۔

(الدنیا صفحہ ۹۳)

تفویض محض صاحبو! قصر آمال کو اتنا بلند ہی کیوں کرتے ہو کہ اس کے انہدام سے مرجاؤ۔ حق تعالیٰ کی جناب میں تو تفویضِ محض ہونا چاہیے اور جن لوگوں کو یہ دولت حاصل ہے ان سے راحت اور سامانِ راحت کا حال پوچھو۔

(دستور سہارنپور صفحہ ۲۶)

تجویز و توقع جو شخص تجویز اور توقع کو ختم کر دے گا وہ ہر حال میں راحت ہی سے رہے گا بلکہ اگر کوئی دنیادار شخص اہل اللہ سے ناتمام تشبہ بھی حاصل کرلے وہ دوسروں سے راحت میں رہتا ہے۔

(اہم الآخرۃ)

پریشانیوں کی جڑ تجویز تمام پریشانیوں کی جڑ ہے۔ یہ تجویز کرنے والا گویا اس ذاتِ مقدس پر حکومت کرنا چاہتا ہے جو اس کے قبضہ میں نہیں بلکہ یہ تجویز کنندہ خود اس کے قبضہ میں ہے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے اپنے تصرف و اختیار کو قرآن میں صاف صاف بیان کر کے انسان کے اختیار کی صاف صاف نفی کر دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی"۔ "وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ"۔

ماکان لهم الخیرة میں صراحتًہ اختیار عبد کی نفی ہے۔ مگر یہاں اس اختیار کی نفی نہیں جو جبر کے مقابل ہے کیونکہ اس کے تو اختیار کا امر ہے بلکہ اس اختیار کی نفی ہے جس کے استعمال کی اجازت نہیں جس کا عنوان ثانی تجویز ورائے ہے۔ مثلاً بیمار کے متعلق یہ تجویز کرنا کہ یہ اچھا ہی ہو جائے، پھر اس کے ظہور و وقوع کا انتظار کرنا کہ کب اچھا ہو گا، پھر تاخیر صحت سے پریشانی و کلفت کا بڑھنا۔ اس کی تو ممانعت ہے

ام للانسان ما تمنیٰ فللّٰہ الاخرۃ والاولیٰ میں اسی تجویز کی جڑ کاٹی گئی ہے کہ دنیا و آخرت کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں تم کو اس میں تجویز کا کوئی حق نہیں۔ اور تجویز کی علامت یہ ہے کہ اس کے وقوع کا تقاضے کے ساتھ انتظار کیا جائے۔ یعنی ایسا انتظار جس کی جانب مخالف کا تصور ناگوار ہو۔

اور اس سے رجاء کی نفی نہیں ہوتی۔ مثلاً بچہ کی عدم صحت سے ناراض ہو، اس پر اعتراض کرے یہ مذموم ہے اور اگر صحت اور عدم صحت دونوں پر راضی ہو اور یہ سمجھے کہ جو کچھ خدا تعالیٰ کریں گے عین حکمت ہے مگر دل یہ چاہتا ہے کہ اس کو صحت ہو جائے اور عدم صحت کے تصور یا وقوع سے رنج ہوتا ہے تو یہ حزن ہے اور حزن مذموم نہیں۔ حزن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا ہے مگر اس کے ساتھ رضاء بھی ہوتی ہے۔ حزن میں پریشانی اور ناراضی نہیں ہوتی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ڈاکٹر نے کسی شخص کا آپریشن بدون کلوروفارم سنگھائے کیا تو یہ شخص نشتر لگنے سے روئے گا بھی، چلائے گا بھی، ناک منہ بھی چڑھائے گا مگر دل میں اندر سے نہایت خوش ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ لہٰذا کراہت ظاہرہ کے ساتھ رضا مجتمع ہو سکتی ہے۔

میں کراہت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کراہت کی نفی کرتا ہوں جس کے ساتھ رضا مجتمع نہ ہو کہ دل میں بھی ناگواری ہو اور ظاہرہ میں بھی ناگواری ہو۔ یہاں تک کہ اگر اس پر نسبت فعل الی اللہ منکشف ہو جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے بھی شکایت و عداوت ہونے لگے۔ اسی لیے ہمارے حاجی صاحبؒ نے اس زمانہ میں مراقبۂ توحید اصطلاحی سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کے لیے محبت کاملہ کی ضرورت ہے جس سے محبوب کا ہر تصرف محبوب ہو جائے۔ خواہ وہ تصرف ملائم طبع ہو یا ناملائم طبع۔ مگر ایسی محبت آج کل کس میں ہے۔ بہت لوگ اس سے خالی ہیں تو اس حالت میں اگر مراقبہ

توحید اصطلاحی کیا گیا اور ہر فعل کو براہِ راست اور بلا واسطۂ اسباب حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھا گیا اور فعل ہے ناگوار تو فاعل سے بھی ضرور ناگواری ہوگی۔ اسی لیے جس شخص میں محبت حق نہ ہو صرف معرفت ہی ہو اس کا ایمان خطرہ میں ہے۔

(التعرّف بالتصرف)

ناگوار واقعات میں ایک مراقبہ جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے اس وقت اس کو فوراً حاضر فی الذہن کر لیا جائے کہ یہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے۔ یہ مت دیکھو کہ واقعہ چھوٹا ہے یا بڑا بلکہ ہر واقعہ میں استحضار کو لازم کر لو۔ اور گناہ کے وقت اس مراقبہ سے کام نہیں لے سکتے۔ ہاں گناہ ہو جانے کے بعد توبۂ نصوح کر کے بھی جب قلق زائل نہ ہو اور اس قلق سے تعطّل فی الاعمال کا اندیشہ ہو تو اس وقت اس مراقبہ سے کام لو اور زیادہ قلق میں نہ پڑو۔ یہ مراقبہ بڑا ضروری ہے اس پر دوام رکھو انشاء اللہ سب پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا، مگر دوام شرط ہے کسی وقت اس سے غافل نہ ہو سہ

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

اب مسئلہ تفویض پر یہ شبہہ کہ اس سے تو لازم آتا ہے کہ نہ ملازم کو تنبیہ ہو، نہ بیوی سے بازپرس ہو نہ اولاد کو تادیب ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تم اس لازم کو قبیح ثابت کرو کیونکہ اپنے نفس کے لیے تادیب انتقام ضروری نہیں۔ اور اگر یہ لوگ خدا اور رسول کی مخالفت کریں تو اس پر رضا جائز ہی نہیں نہ اس پر سکوت کرنا تفویض کی فرد ہے بلکہ وہاں تو تادیب ہی عینِ تفویض ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جب غلبۂ تفویض ہوگا تو اوّل اوّل حالت یہی ہوگی مگر تمکین کے بعد ہر حالت کے حقوق کو صحیح انداز سے ادا کرے گا جیسے حضرت صدیق کی حالت تھی کہ باوجود کامل صاحب تفویض ہونے

کے سلطنت کا انتظام کرتے تھے اور ایسا انتظام کیا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ تمکین کامل کا نتیجہ تھا اور منافی تفویض اس لیے نہیں کہ یہ سب منجانب اللہ مامور بہا مأذون فیہ ہیں۔ تو امتثالاً للامر ان کو اختیار کرنا عین تفویض ہے۔

(التعرف بالتصرف)

دعا حق تعالیٰ یہ حالت نصیب کریں کہ حقیقت سمجھ میں آجائے اور ہر وقت یہ امر منکشف ہوتا رہے کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہ رب العلمین ہیں۔ ہمارے بدخواہ نہیں ہیں جو کچھ امر تکوینی کرتے ہیں یا تشریعی وہ سب ہمارے لیے خیر ہی خیر ہے۔

(الاسلام الحقیقی ص۱۰۱)

فصل (۵)

اہتمامِ عمل

عمل کا اہتمام | فرمایا کہ جو کام ضروری ہیں ان کو کرنا چاہیے۔ خواہ جی لگے یا نہ لگے۔ یہ تو حالت ہی بری ہے کہ جی لگنے کا انتظار کیا جائے۔ کیا اپنے جی کی پرستش کرتے ہو یا اپنے جی کے بندے ہو۔ (الافاضات ج ۵ ص ۳۸۰)

بہت سے لوگ اس کے منتظر کہ اول دلچسپی پیدا ہو تو کام شروع کریں اور کام اس کا منتظر کہ مجھ کو شروع کریں تو دلچسپی کے آثار پیدا کروں۔

(ملفوظات ج ۲ ص ۱۱۵)

ایک طالب نے خط لکھا کہ نماز کو ضروری سمجھتا ہوں لیکن طبیعت ادھر نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہے تو نماز میں کوئی لطف نہیں آتا۔ جواب تحریر فرمایا۔ طبیعت آنا ضروری ہے یا لانا؟ اور لطف ضروری ہے یا عمل۔ (اشرف السوانح ص ۱۲۶)

فرمایا کہ دین کی باتوں میں تو کہا جاتا ہے کہ جی نہیں لگتا، مزہ نہیں آتا۔ احکام گورنمنٹ میں بھی جو کہ نفس کے خلاف ہوں کبھی کہا ہے کہ جی نہیں لگتا مزہ نہیں آتا۔ مثلاً گورنمنٹ حکم دے کہ ٹیکس داخل کرو اس وقت یہ کہہ کر الگ ہو جائیں کہ ہم داخل نہیں کرتے ہمیں مزہ نہیں آتا، جی نہیں لگتا۔ ایسا کر کے دیکھیں جیل خانہ میں پہنچا دیے جائیں۔ اے صاحبو! خدا کے ساتھ محبت نہ سہی مگر ان کی حکومت تو ہے یہی سمجھ کر احکام بجا لاؤ۔

(ملفوظات ج ۲ ص ۲۵۴)

بندہ کا کام تو ہر حال میں بندگی ہے

بندہ کا کام تو ہر حال میں بندگی ہے کتنی ہی بے مزگی ہو اور کسی قدر بے لطفی ہو پریشان مت ہو۔ برابر کام کیے جاؤ۔ دھن لگائے رکھو۔ اور یہ اس بہ تو سمجھو کہ کیا خدا کا تم پر اتنا بھی حق نہیں کہ وہ تم کو آزمائے کہ دیکھوں "میرا بندہ" ہے یا "طالب لذت" ہے۔ بندہ کو چاہیے کہ طالب مولیٰ ہو۔

(عمل الذرہ۔ ص ۳۴)

اگر عمل میں اخلاص نہ ہو تاہم عمل نہ چھوڑو کہ کبھی عمل کرتے کرتے اس کی برکت سے بھی اخلاص پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ان دونوں میں تجاذب ہے۔

(دین و دنیا۔ الدین الخالص ص ۵۴)

دین یہ ہے کہ ہر وقت تعمیل حکم کی دُھن لگی رہے

جن کاموں کا وقت آگیا ہو ان کو استقلال اور پابندی سے ادا کیا جائے اور جن کا وقت نہیں آیا ان کے لیے تیار و مستعد رہے۔ کسی وقت بے فکر ہو کر نہ بیٹھے بس دین یہ ہے کہ آدمی کو ہر دم ایک دھن لگی رہے یا تو کسی کام میں لگا ہوا ہو یا کسی کام کی تیاری میں مشغول ہو۔

(سبیل النجاح ص ۴۵)

مسلمان کے لیے ایک یہی چیز ہے کہ وہ خدا کو راضی کرنے کی سعی میں لگا رہے اگر وہ راضی ہیں تو اس نے سب کچھ پالیا اور حاصل کر لیا اور اگر یہ نہیں تو اگر اس کو تمام دنیا و مافیہا بھی مل جائے تو "مچھر" کے پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔

(الافاضات ۴ ملفوظ ۴۳ ص ۲۴)

مقصود احکام کی پابندی ہے نہ کہ لذت

اصل مقصود احکام کی پابندی ہے، لذت مقصود نہیں۔ پس اگر کوئی شخص احکام کو پابندی سے بجا لاتا ہو گو "لذت" اور مزہ نہ آتا ہو تو وہ مقصود سے کامیاب ہے اگر ناگواری مطلوب نہ ہوتی تو حق تعالیٰ "اصبروا" نہ فرماتے۔ جا بجا اہتمام کے ساتھ

"صبر وا" فرمانا بتلا رہا ہے کہ لذّت مقصود نہیں بلکہ صبر و استقلال مطلوب ہے۔ اور اگر مزہ مطلوب ہوتا تو پھر دنیا ہی میں کیوں آتے۔ مزہ تو جنّت میں تھا۔ وہاں سے جو آپ دنیا میں آئے ہیں تو مزہ کے لیے تھوڑا ہی آئے ہیں بلکہ بدمزگی اور کلفت کے لیے آئے ہیں۔ خوب کہا ہے۔ ؎

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا، نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شورِ ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ کہ ہم نے انسان کو مشقّت میں مبتلا کر کے پیدا کیا ہے۔ (سبیل النجاح ص۲۷)

مقصود اعمال کے ساتھ اُنس ہے

مقصود اعمال کے ساتھ اُنس ہے چاہے مستی ہو یا نہ ہو۔ اور یہ اُنس اس طرح ہوتا ہے کہ اعمال کی پابندی ہر حال میں کی جائے، چاہے مزہ آئے یا نہ آئے، دل لگے یا نہ لگے۔ اس میں آج کل بڑی کوتاہی ہو رہی ہے۔ لوگ اعمال کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ لذّت کو مطلوب سمجھتے ہیں۔

(عمل الشکر ص۱۱)

تعمیل حکم کی خاصیّت

حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ لگا رہے جو کچھ ہو سکے کرتا رہے۔ وہ طلب کو دیکھتے ہیں۔ اگر ادھر سے طلب ہے تو اُدھر علم بھی ہے، قدرت بھی ہے اس لیے سب کچھ عطا ہو رہے گا۔ (الافاضات ۳ ص۲۵)

اپنی طرف سے تو یہی چاہیئے کہ اللہ و رسول کی رضا حاصل کرنے میں اگر ساری دنیا بھی ناراض ہو جائے تو کچھ پروا نہ کرے۔ مگر اس کی خود خاصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری دنیا کو اس کے سامنے جھکا دیتے ہیں۔ بس وہ رنگ ہو جاتا ہے۔ فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ۔

Scanned with CamScanner

خصوص متکبروں کا ناز تو توڑ ہی دینا چاہیے۔

(الافاضات ۸۰ صہ ۲۹۴ ملفوظ ۲۱۴)

محنت کا نتیجہ راحت عادۃ اللہ یہی ہے کہ محنت کا نتیجہ راحت ہے اور مشقت کا ثمرہ سہولت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا

(کمالات اشرفیہ صہ ۱۱)

کام چلنے کی ترکیب نرے زبانی جمع خرچ سے نہ کچھ حاصل ہوگا اور نہ کچھ ہاتھ لگے گا، اس سے کام نہیں چلتا۔ کام چلتا ہے کام کرنے سے۔ کام کرو سب دشواریاں آسان ہو جائیں گی۔ (ملفوظات ۲۴ صہ ۲)

کام کا ثمرہ بھائی! بلا کام کیے بھی کہیں کامیابی ہوتی ہے نری آرزوؤں سے اور تمناؤں سے! کام تو کام کرنے ہی سے ہوتا ہے۔ اور کام بھی ایسا جس میں کام ہی کو ثمرہ سمجھا جائے گو اور کوئی ثمرہ نہ ملے۔ جب کام اور ثمرہ ایک ہی چیز ہے تو بدون کام کیے ثمرہ کا حصول چہ معنی؟ جب کام نہیں تو ثمرہ بھی نہیں کیونکہ ثمرہ تو وہی کام تھا۔

(النفحات صہ ۔)

کام اور حکمتیں کام کرتے رہو، کام خود برکات کو نمایاں کر دے گا جس کام پر مداومت مع اس کی شرائط کے کی جاتی ہے خود وہ عمل ہی اپنی حقیقت بتلا دیتا ہے جب تم پر کام کرتے کرتے برکات منکشف ہوں گے تو کام لینے والوں کو دُعا دو گے۔ بس کام کرنا حکمتوں کے معلوم ہونے پر موقوف نہیں بلکہ حکمتیں معلوم کرنا عمل پر موقوف ہے۔ حکمتیں تو مداومت سے خود معلوم ہو جائیں گی۔

(شعبان فی شعبان صہ ۱۱)

اُمید و رجا اعمالِ صالحہ سے ثواب کے ساتھ ساتھ بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ اُمید بھی قائم ہو جاتی ہے کہ انشاء اللہ وہ ہم سے راضی ہیں اور یہ

اُمید بڑی چیز ہے۔ اس کی قدر عشّاق سے پوچھنا چاہیے۔ عشاق تو اسی اُمید کے بھروسہ جیتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

اگرچہ دُور افتادم بدیں اُمید خرسندم
کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

اور یہ اُمید ہوسنا کی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ رجا ہے جس سے روح تازہ اور زندہ ہوتی ہے۔ جیسے ایک عاشق کا قصّہ ہے کہ نزع کے وقت اسے محبوب کے آنے کی خبر ملی تو فرطِ شوق میں اُٹھ بیٹھا۔ تو یہ رجا وہ چیز ہے کہ مرتے مرتے کو بھی ایک دفعہ حیات جدیدہ حاصل ہو جاتی ہے، مگر اس عاشق کا محبوب تو مجازی تھا اس لیے اس کی رجا ادھوری رہی اور جن کو حق تعالیٰ سے رجا ہو جو لم یزل ولا یزال ہیں اور رحیم وکریم وعاشق نواز ہیں ان کا کیا پوچھنا۔ واللہ ان کو تو اس رجا کی بدولت ہر دم تازہ حیات ہے۔ (دین ودنیا: مظاہر الآمال ص ۶۱۴)

انفاق فی سبیل اللہ ایک شخص نے وعظ سنا کہ ایک خرچ کرنے سے دس ملتے ہیں۔ اس نے ایک روپیہ خیرات کر دیا اور گھر میں بیٹھ گیا۔ جب ایک دن گزر گیا اور دس نہ ملے تو میاں کو دست لگ گئے (یعنی دس مع شی زائد مل گئی کیونکہ دست میں "تا" زائد ہے) اسی حالت میں ایک دن استنجے کے لیے کسی کھیت میں بیٹھا تھا۔ ڈھیلا جو اٹھایا تو اس کے نیچے ایک بٹوہ ملا جس کے اندر دس روپے تھے۔ بڑا خوش ہوا اور واعظ سے آکر کہا کہ واقعی تم نے سچ کہا تھا کہ ایک کے دس ملتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ مروڑے بھی بڑے غضب کے لگتے ہیں۔ اب سے وعظ میں یہ بھی کہہ دیا کرو کہ مروڑوں کے بعد دس ملتے ہیں تاکہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔

اس شخص کو مروڑے اس واسطے لگے کہ اس نے انفاق حقیقی نہ کیا تھا۔ اس نے

دس کی نیت سے اتفاق کیا تھا محض رضائے حق کا قصد نہ کیا تھا پس تم تفویض و توکل اس نیت سے اختیار نہ کرو کہ راحت حاصل ہوگی کیونکہ اس سے راحت تو بہرحال ہوگی، مگر اس نیت سے ثواب باطل ہو جائے گا اور ممکن ہے اس نیت کی نحوست سے راحت بھی کم نصیب ہو۔ عارفین نے تو لذتِ تفویض سے بھی پناہ مانگی ہے۔ باقی ہم لوگوں کو تو عدم لذت سے رنج ہوتا ہے اس لیے ہم کو لذت کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں لیکن نیت لذت کی نہ کرے۔ خلاصہ یہ کہ جن امور میں تدبیر کا کچھ تعلق و دخل نہیں ان میں تو ابتدا ہی سے تفویض و تسلیم کرنا چاہیے اور جن میں تدبیر کو بھی کچھ دخل ہے وہاں تدبیر بھی کی جائے مگر نتائج و ثمراتِ تدبیر میں تفویض کی جائے۔ یہ تجویز نہ کرے کہ میری تدبیر کا ثمرہ یہ ہونا چاہیے بلکہ خدا کے حوالہ کریں کہ وہ جو چاہیں ثمرہ مرتب کریں میں اس پر راضی ہوں۔ پھر انشاء اللہ پریشانی اور غم سے ہمیشہ نجات رہے گی۔ (التیسیر للتیسیر ص۴۱)

صفتِ احسان کا طریقِ حصول

ماہیت: دل سے دھیان رکھنا اس شخص کا جو اسے دیکھ بھال رہا ہے۔

طریق تحصیل: یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن پر مطلع ہے اور کوئی بات کسی وقت اس سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی "عظمت" و "قدرت" و "جلال" اور اس کے "عذاب و عقوبت" کو بھی یاد کرے۔ اس کی مواظبت سے وہ دھیان بندھنے لگے گا۔ پھر کوئی کام خلاف مرضی اللہ تعالیٰ کے اس سے نہ ہوگا۔

عذاب سے متنبہ کر دینا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے

عذاب گو فی نفسہٖ نعمت نہ ہو مگر اس سے مطلع کر دینا ضرور نعمت ہے۔ پس : ابب فبای ..... تکذبان کسی جگہ بے موقع نہیں قیامت کے بارے میں — دنیا و آخرت کے بارے میں۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ؛ ہر شخص یہ دیکھتا رہے کہ کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ یعنی اپنے اعمال کا محاسبہ کرو کہ آج دن بھر میں کتنے کام کیے ہیں۔ کتنے نیک کام ہوئے، کتنے گناہ ہوئے۔ جو نیک کام ہوئے ہوں۔ ان پر خدا کا شکر کرو اور جو گناہ ہوئے ہوں ان سے توبہ و استغفار کرو۔ اسی کام کے لیے وقت تو مقرر کرلو۔ اور ہر وقت کے لیے دستور العمل یہ ہے کہ جو بات کہو سوچ کر کہو۔ جو کام کرو سوچ کر کرو۔ بے سوچے کام کرنا اور باتیں بنا دینا، دنیا و آخرت دونوں کو مضر ہے۔ بس ہر کام سے پہلے اس کے انجام کو سوچ لو۔

حدیث: "انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔" یعنی دوست کی دینی حالت کا اثر اس کے دین پر ضرور ہوتا ہے" پس ہر شخص دیکھ لے کہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔" یعنی اس کی دینی حالت کیسی ہے۔ پس دوستی دیندار لوگوں سے کرو۔ بد دینوں کو دوست نہ بناؤ۔

قلندر کے معنی

صوفیہ میں ایک جماعت کا مذاق یہی ہے کہ وہ اعمال ظاہرہ میں اختصار ہی کو پسند کرتے ہیں۔ پہلے مجھے بہت شبہہ تھا کہ ان لوگوں کی ترقی کیسے ہوتی ہوگی کیونکہ ترقی تو اعمال سے ہوتی ہے اور اعمال ان کے پاس کم ہیں۔ پھر الحمد للہ سمجھ میں آگیا کہ ترقی تو اعمال ہی سے ہوتی ہے، مگر اعمال دو قسم کے ہیں: ایک اعمالِ قالبیہ یعنی اعمالِ ظاہرہ۔ دوسرے اعمال قلبیہ۔ تو اس جماعت قلیل الاعمال کے ظاہری اعمال کم ہوتے ہیں مگر اعمال قلبیہ ان کے بہت زیادہ ہیں۔

اور اعمال قلبیہ یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھا جائے قلب کی نگہداشت رکھی جائے کہ غیر حق کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے بلکہ اکثر اوقات قلب کو ذکر میں مشغول رکھا جائے۔

نیز قلب میں کسی مسلمان کی طرف سے غل و حقد نہ ہو سب کے ساتھ خیر خواہی ہو۔ نیز حقوقِ وقت ادا کیے جائیں کہ کوئی وقت ذکر سے خالی نہ جائے۔

نیز خوشی اور غمی کے حقوق ادا کیے جائیں نعمت پر شکر ادا ہوتا رہے۔ حزن و غم میں دل خدا سے راضی رہے اور اس کے سوا اور بہت سے اعمالِ قلبیہ ہیں جن میں یہ جماعت ہر وقت مشغول رہتی ہے۔ اصطلاح میں ان کو قلندر کہتے ہیں۔

(وعظ: دواء الغفلۃ)

نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے

فرمایا یہ تو ضرور سمجھنا چاہیے کہ ہمارے اعمال ناقص ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کرے کہ نہ ہونے سے ہونا اچھا ہے جیسے مالگذاری ادا کرنا ہے اور کل روپیہ پاس نہ ہو تو جو ہو وہی ادا کرو۔ بازار میں جا رہا ہے اور ہاتھ میں کچھ نہیں اس سے یہ زیادہ اچھا ہے کہ کھوٹا ہی روپیہ سہی وہ آٹھ ہی آنہ میں چلے گا مگر چلے گا تو سہی۔ سیر بھر مٹھائی نہ آوے گی۔ آدھ ہی سیر سہی۔

(الافاضات ج ۴ صفحہ ۲۸۸)

رحمت خداوندی اور امید و رجا

فرمایا کہ انسان کو مایوس نہ ہونا چاہیے حق تعالیٰ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ بندہ ان کے ساتھ جو گمان رکھتا ہے۔ ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ فرماتے ہیں۔ بڑی رحیم و کریم ذات ہے۔ مگر یہ شرط ہے کہ طلب ہو۔ کام میں لگا رہے۔ جو بھی ہو سکے کرتا رہے پھر وہ اپنے بندہ کے ساتھ رحمت اور فضل ہی کا معاملہ فرماتے ہیں۔ وہ کسی کی محنت اور طلب کو رائیگاں اور فراموش نہیں فرماتے۔ ایک شخص کا مقولہ مجھ کو بے حد پسند آیا کہ کیے جاؤ اور لیے جاؤ۔ واقعی ایسی ہی ذات ہے۔ کسی حالت میں بھی مایوس نہ ہو۔ وہ تو دربار ہی عجیب ہے۔ کوئی شخص کتنا گنہگار کیوں نہ ہو ایک لمحہ ایک منٹ میں کایا پلٹ جاتی ہے۔ بشرطیکہ خلوص کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو

کر رجوع کرے اور آئندہ کے لیے عزم استقلال کا کرے۔ پھر تو جس نے کبھی ساری عمر اللہ کا نام نہ لیا ہو اور اپنی تمام عمر کا حصہ معاصی اور لہو و لعب میں برباد کیا ہو اس کے لیے بھی رحمت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اسی کو فرماتے ہیں۔ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ۔۔۔ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست ۔۔۔ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جو بندہ کے لیے مشکل ہے وہ خدا کے لیے آسان ہے۔ ایسی ذات سے کون مایوس ہو سکتا ہے۔ ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست

بر کریماں کارہا دشوار نیست

رحمتِ حق ہر وقت اپنے بندوں کے لیے بخشش کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم

بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

اور نجات تو چھوٹی بات پر بھی ہو جاتی ہے مگر چھوٹی بات پر مواخذہ نہیں ہوتا یہ بالکل غلط مشہور ہے کہ مواخذہ بھی چھوٹی بات پر ہو جاتا ہے۔

رحمتِ حق کی تاثیر جب رحمت حق متوجہ ہوتی ہے تو ساری عمر کے میل کچیل دھل جاتے ہیں مگر خود رحمت کے متوجہ ہونے کے لیے طلب شرط ہے اور یہ انسان کا اختیاری فعل ہے۔ یہ اپنے اختیاری کام کو کرے پھر آگے سب کچھ وہی کر لیتے ہیں۔ (الافاضات ۵ ص ۲۹۰ ملفوظ ۴۵۹)

پورا کامل بجز انبیاء کے کوئی نہیں پورا کامل بجز انبیاء کے کوئی نہیں اور وہ کاملین بھی اپنے کو کامل نہیں سمجھتے سب

مغموم بھی ہیں اور مغموم بھی ایسے کہ اگر ہم جلیسوں پر وہ غم پڑ جائے تو کسی طرح جانبر نہیں ہو سکتے۔ کمال کی تو توقع ہی چھوڑنا واجب ہے۔ ہاں سعیٔ کمال کی توقع بلکہ عزم واجب ہے۔ اس کی مثال وہ مریض ہے جس کی تندرستی سے تو مایوسی ہے مگر فکر صحت اور اس کی تدبیر کا ترک جائز نہیں سمجھا جاتا۔ اور نجات بلکہ قرب بھی کمال پر موقوف نہیں بلکہ تکمیل پر موعود ہے واللہ لا یخلف المیعاد۔ بس اسی طرح عمر ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے فارغ بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

سب سے آخر میں، خواہ اس کو اظہار حال کہیے یا آپ کی ہمدردی یا رفع التباس جو چاہے نام رکھیے، یہ کہتا ہوں کہ میں بھی اسی کشمکش میں ہوں مگر اس کو مبارک سمجھتا ہوں جس کا یہ اثر ہے کہ سمجھ نہیں سکتا کہ خوف کو غالب کہوں یا رجاء کو مگر مضطر ہو کر اس دعا کی پناہ لیتا ہوں جس سے کچھ ڈھارس بندھتی ہے۔ اللّٰھم کن لی واجعلنی لک۔ (انفاس عیسیٰ ص۴۴)

حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد

حضرت مولانا گنگوہیؒ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی کو ساری عمر کی محنت و کوشش کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ مجھ کو کچھ حاصل نہیں ہوا تو اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا۔ اگر مقامات طے بھی ہو گئے تو ان کے طے ہونے میں وہ حظ نہیں جو اس سمجھنے میں ہے کہ ہم نے ابھی کچھ بھی راستہ قطع نہیں کیا گویا تیلی کے بیل کی طرح ہیں اور یہ حظ ہے انکسار اور افتقار اور عجز و عبدیت کا۔ (انفاس عیسیٰ ص۴۴)

عمل سے نقص بھی رفع ہو جاتا ہے

کام کیے جاؤ، کامل ہو خواہ ناقص ہو۔ انشاء اللہ ناقص ہی سے کامل

کی ہیم کو دیکھ کر مایوس ہو گیا تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ ابتدا میں انتہا پر نظر نہیں کیا کرتے، جیسا کچھ ہے کیے جاؤ۔ ہوتے ہوتے کام ہوتا ہے، ایک دم سے نہیں ہو جاتا ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

کام کیے جاؤ کسی نہ کسی روز ان شاء اللہ فضل ہو جائے گا ؎

یوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

کوشش کرنا غفلت سے بہتر ہے :

کام کرتے رہو جیسے بھی ہو سسٹم لیسٹم کیے جاؤ۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اوّل اوّل انتظام سے نہیں ہوتا، جی نہیں لگتا تو اس کی پروا مت کرو۔ جیسے ہو کرو جس دن توفیق ہو کرو۔ یہ خیال نہ کرو کہ کل تو کیا نہیں آج کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ جیسے بھی بنے کیے جاؤ ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی
کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

کیا اچھی تعلیم ہے کہ کوشش اگرچہ بے انتظامی سے ہو، کافی ہے۔ دھن ہونا چاہیے۔ اگرچہ عمل میں کوتاہی ہو جائے۔ ناغہ ہو جائے ہونے دو۔ ممکن نہیں کہ راہ پر نہ آؤ۔ یہ جو دھن ہے ضرور کسی نہ کسی وقت مرکز پر لے آئے گی، پھر راہ پر آجاؤ گے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ التزام ہو یا نہ ہو۔ دھن ہونی چاہیے اس سے سب کام بن جائیں گے۔

(رطوبۃ اللسان ص ۲۲)

عشق موانعات کو نظر میں نہیں لاتا

بس عبدیت یہی ہے کہ کام میں لگے رہو اور آگے کو چلتے رہو۔ اگر کوئی شخص چلنے کے وقت ہر قدم پر یہ دیکھے کہ رفتار سریع ہے یا بطئی (سست) تو منزل ختم ہو گئی اور منزل مقصود پر پہنچ لیا۔ ارے تیز ہے یا سست چلا چل منزل سے قرب ہی بڑھے گا اور ایک روز پہنچ رہے گا جب تم خدا کے عشق کا اور محبت کا دعویٰ کرتے ہو پھر انتظار کس بات کا؟ جس طرح بھی ہو اور جیسے بھی ہو تیزی سے سستی سے چل پڑو۔ اور تم تو زبردستی شدہ محب ہو فرماتے ہیں والذین اٰمنوا اشدُّ حباً للہ۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہے۔ اس لیے محبت ہونے سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔ جب تمہاری محبت اور عشق نص سے ثابت ہو گیا تو عشق تو ایسی چیز ہے کہ سوائے محبوب کے کسی کو نہیں چھوڑتا۔ پھر موانع پر نظر کیسی ——؟

(الافاضات الیومیہ ع۴ ص۲۹۴ ملفوظ ۴۵۰)

تاثیراتِ عشق

تمام ان چیزوں کو جو بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہیں عشق آسان کر دیتا ہے۔ قلب میں اس کے آجانے کے بعد سب "قیل و قال" "چون و چرا" ھباءً منشورا ہو جاتے ہیں ؎

عشق آمد عقل او آوارہ شد   صبح آمد شمع او بیچارہ شد

(الافاضات ع۵ ص۷۸ ملفوظ ۱۴۱)

جان و مال سے بے پروا

عشق بھی عجیب چیز ہے کیا کچھ نہیں کرا سکتا۔ اس میں آدمی آبرو، مال، جان سب کچھ دے بیٹھتا ہے۔ کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ ہم میں اسی کی کمی ہے ورنہ جس کے اندر یہ حالت پیدا ہو جائے اس پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

(الافاضات ع۳، ملفوظ ۲۶۷)

محبوب کے حقوق کی ادائیگی

اس سے محبوب کے حقوق بتمامہ اور بکما لہٖ ادا ہوتے ہیں۔ میں اسی لیے کہا کرتا ہوں کہ حق جل علیٰ شانہ کے ساتھ محبت پیدا کرنے کی کوشش کرو اور اس کا سہل طریقہ اہلِ محبت کی صحبت ہے جب اس صحبت کے حقوق ادا کیے جائیں۔ (الافاضات ۶ ص ۲۱)

رسوم کے غلبہ سے طرزِ ادب مشکل ہے اور حقائق پر نظر ہو تو کچھ مشکل بھی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے محبت کی ضرورت ہے۔ اگر سچی محبت ہو تو خود محبت ہی طرزِ خدمت سکھا دیتی ہے۔ (سنت ابراہیم ص ۵)

محبّت اور وضعداری جمع نہیں ہو سکتیں۔ (اشرف المواعظ ۱ ص ۲۶)

صحابہؓ اور ہم میں فرق

کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ صحابہؓ میں اور ہم میں کیا فرق ہے تو انھوں نے فرمایا کہ اگر تم انہیں دیکھتے تو مجنوں سمجھتے اور وہ اگر تمہیں دیکھتے تو تم پر جہاد کا فتویٰ دیتے۔

(الافاضات ۷ ص ۲۹۴)

تاثیر لذّت محبّت

لذّتِ محبّت میں انوار ہوتے ہیں جس سے اخلاق رذیلہ کی ظلمت دُور ہو جاتی ہے، تواضع اور فنا کا مذاق حاصل ہو جاتا ہے۔

(عمل الشکر ص ۲)

انکشافِ حقائق

جب حق تعالیٰ سے تعلق بڑھتا ہے حقیقتیں منکشف ہو جاتی ہیں۔

(حسن العزیز ۱ ص ۲۸۹ ملفوظ ۴۷۳)

رحمت و فضل الٰہی

اس راہ میں محض باتیں بنانے اور تحقیقاتِ علمی سے کچھ کام نہیں چلتا۔ یہاں پر تو کام کرنے سے کام چلتا ہے اور حضرت حق تو بدون کیے ہوئے بہت سی رحمتیں فرماتے رہتے ہیں۔ پس جبکہ باوجود ہماری کوتاہیوں کے یہ رحمت ہے تو اگر ہم پوری طرح اس طرف اپنی قوت اور وسعت کے موافق

متوجہ ہوجائیں اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جائیں۔ گذشتہ گناہوں سے رجوع اور آئندہ کے لیے عزم اعمالِ صالحہ کا کرلیں تو پھر کیسے رحمت نہ ہوگی خوب فرماتے ہیں سعدیؒ

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد؟
ای خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

تھوڑی سی توجہ پر فضل ورحمت ضلع لوہاری میں بوجہ امساکِ باراں مسلمانوں نے نمازِ استسقاء کی تیاری کی۔ وہاں کے ہندو کہنے لگے کہ فضول مسلمان اس امید میں کہ بارش ہوگی کوشش کر رہے ہیں۔ امسال تو بارش ہے ہی نہیں۔ مسلمانوں نے نمازِ استسقاء ادا کی اور یہ دُعاء کی کہ اے اللہ! ہم کو ان کفار کے سامنے ذلیل وخوار نہ کیجیے۔ آپ کو بڑی قوت اور قدرت ہے۔ آپ بڑے غفور رحیم ہیں۔ ابھی مسلمان دعاء کو ختم بھی نہ کرنے پائے تھے کہ بارانِ رحمت کا نزول ہوگیا۔

اچھے خطاکار اب سنیے وہی ہندو کہتے ہیں کہ یہ مُسلے (مسلمان) ہیں پرمیشور کو بڑی ہی جلدی راجی (راضی) کر لیتے ہیں۔ دیکھیے۔

تھوڑی سی توجہ پر اللہ کی رحمت کا شاملِ حال ہونا باوجود ہماری اس حالت کے کہ ہمارا کوئی کام بھی ڈھنگ کا نہیں اور ہم سراسر خطاؤں اور لغزشوں سے بھرے ہوئے ہیں مگر اس پر بھی تھوڑی سی توجہ کر لینے پر ان کی رحمت اور فضل شاملِ حال ہوجاتا ہے تو اعمال کی اصلاح پر کیسے رحمت سے ناامیدی اور مایوسی ہوسکتی ہے۔ حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون" کہ تم سب خطاوار ہو اور تم میں بہتر خطاوار توبہ کرنے والے ہیں۔ (الافاضات ج۲ ص۴۶، ملفوظ ع۹۶)

عشقی اسلام کی ترغیب مسلمانو! عشقی اسلام اختیار کرو۔ قانونی اسلام کام نہیں آسکتا۔ اپنے دل میں خدا کی محبت جماؤ۔ محبت میز

کرسی، کانٹے چھری، کوٹ، پتلون، بوٹ سوٹ سے پیدا نہیں ہوتی یہ اس سے پیدا ہوتی ہے۔ ؎

قال را بگذار مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو
جملہ اوراق و کتب در نار کن　　سینہ را از نور حق گلزار کن

اے صاحبو! وہ کبوتر جسے ہوائی بندوق کے چھرے سے آسانی سے شکار کر لیا بہتر ہے اس سور سے کہ جس کے شکار میں تمام کارتوس خالی ہوگئے اور پھر جب گھر میں آئے تو بال بچے فاقہ سے پڑے ہیں اور وہ اس قابل بھی نہیں کہ اسے بال بچوں کو کھلا سکیں۔

اے صاحب! دین کے علوم کبوتر اور آپ کی یہ تحقیقات سور کا شکار ہیں جس وقت آپ اس بازار میں جائیں گے جہاں دوسرا سکہ چلتا ہے تو اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ افسوس یہ ٹھیکرے ہم ناحق لائے۔ میں ڈگریاں حاصل کرنے اور پاس کو منع نہیں کرتا، پاس کرو مگر خدا سے دور نہ ہو۔ نماز روزہ ہی پر اکتفا نہ کرو اور آگے بڑھو عشق و محبت پیدا کرو۔ ؎

منارۂ قلندر سزد ار بمن نمائی　　کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

جب یہ مذاق ہو جائے گا کہ اسلام عشقی ہو جائے گا تو پھر یہ کیفیت ہوگی کہ

خط کیوں بنوایا؟

حکم۔

حالانکہ مصلحت بھی ظاہر کر دی تھی کہ لبیں بڑھی ہوئی بری معلوم ہوتی ہیں مگر پھر بھی بجائے اس کے بیان کرنے کے یہی کہنا ہے:

حکم، مرضی۔

بس مسلمان کا یہی مذہب ہونا چاہیے کہ

نماز کیوں پڑھتے ہو؟ حکم، مرضی۔

بکری کیوں کھاتے ہو سور کیوں نہیں کھاتے ؟

حکیم، مرضی۔

یہ بڑے درجہ کا شخص ہے، یہی حکیم ہے۔ اور وہ حکیم نہیں۔ جو یہ کہے کہ نماز جماعت سے کیوں پڑھتے ہیں ؟ تاکہ اتفاق ہو۔ کیونکہ ایسا شخص ہر وقت شیطان کے ہاتھ میں ہے، جب جی چاہے وہ اپنی راہ پر لا سکتا ہے۔ مثلاً کسی وقت اس کو یہ سمجھا دیا کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو ذریعہ متروک ہو جاتا ہے تو بہت قریب ہے یہ بات کہ جس روز قوم میں اتفاق پیدا ہو گیا۔ اسی روز سے جماعت کی نماز چھوڑ دیں گے کہ اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ تو یہ لوگ ہر وقت آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہیں شیطان کے ذرا سے دھکے میں گر جائیں گے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ احکام میں مصلحتیں نہیں ہیں مصلحتیں ہیں اور اس قدر کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں مگر وہ سب تابع ہیں اور رضائے حق متبوع ۔

(روح الافطار ص ۲۳)

کُلفت، محبوب کا عطیّہ

راحت کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر آمادہ رہنا چاہیے کہ اگر تمام عمر اس سے بھی زیادہ کلفت ہو تو وہ محبوب کا عطیہ ہے اور عبدیت یہی ہے۔ ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است

یہ نفس کا کید ہے کہ لذت کا طالب ہے۔ اور شیطان بھی اس طرف مشغول رکھ کر توجہ بحق سے غافل رکھنا چاہتا ہے۔ (کمالات اشرفیہ ص ۶۵)

خدا کا نام کیفیات کے لیے لینا تنزّل ہے

دنیا کی نیت سے جو دین کا کام کرو گے تو وہ بھی دنیا ہو جائے گی ...

برکت کہاں، برکت [illegible]
ہیں وہاں دنیا کی نیّت تو کیا ہوگی۔ ثمراتِ باطنیہ کی بھی نیّت نہیں ہوتی۔ نہ کیفیات کا انتظار ہوتا ہے نہ احوال کی توقع ہوتی ہے۔ اور اگر کسی کو ہے تو وہ "عبد الحالی" ہے "عبد الثمرات" ہے "عبد الکیفیات" ہے۔ وہ عبدہٗ نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حال نہ ہوتا وہ عبادت نہ کرتا۔ اور طلبِ حال کی دو صورتیں ہیں ایک تو دعا ہے کہ حال ہو اس کا کچھ ہرج نہیں۔ اور ایک یہ کہ اعمال ہی سے نیّت یہ ہو کہ حال ہو یہ خلافِ طریقت ہے۔ چنانچہ اگر کوئی نماز پڑھ کے دعا کرے کہ سو روپے مل جائیں تو اس میں تو کچھ ہرج نہیں اور واقعی یہ نماز اللہ ہی کے لیے ہے اور اگر خود نماز ہی سے نیّت ہو کہ سو روپے ملیں گے تو یہ نماز اللہ کے لیے نہیں ہے۔ یہ سو روپے کے لیے ہے۔

اسی طرح اگر اللہ کا نام اس نیّت سے لینا ہے کہ لذّت ہو وہ "عبد اللذّات" ہے پس بعض لوگ تو طلبِ لذّت کو مطلقاً بُرا نہیں سمجھتے اور بعضے مطلقاً بُرا سمجھتے ہیں لیکن تحقیق یہ ہے کہ اعمال میں اس کی نیّت رکھنا تو مذموم ہے لیکن مستقل طور پر دعا سے طلب کرنا جائز ہے۔ گو وہ خلافِ مصلحت واقع میں ہو۔ اگر ایسا ہوگا خدا تعالیٰ خود ہی عطا نہ فرمائیں گے۔ جیسے عموماً دعاؤں میں عادت ہے۔ لیکن مانگنے میں کچھ قبح نہیں۔ پس خدا کا نام تو خدا ہی کے لیے لینا ہے۔ ؎

از خدا غیرِ خدا را خواستن   ظنِ افزونی است کلی کاستن

خدا کا نام دوسری چیزوں کے مانگنے کی نیّت سے لینا تنزّل ہے۔ اللہ کا نام تو اس واسطے ہے کہ اللہ راضی ہو۔ خلاصہ یہ کہ جب ذکر و عمل سے قصدِ ثمراتِ باطنہ بھی غیر مقصود ہے تو قصدِ دُنیا تو اس ذکر و عملِ توکل وغیرہ سے کہاں محمود ہوگا۔

(روح الافطار صث ۸)

صحابہؓ کی فضیلت کی وجہ

فقط کتابیں پڑھنے پر کفایت نہ کرنی چاہیے کیونکہ ایک چیز ایسی ہے جو بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوتی۔ وہ دین کی مناسبت ہے۔ دین کے ساتھ تعلق اور مناسبت بدون صحبت کے نہیں ہوتی۔ اہلِ محبت کے پاس رہنے سے خدا کی محبّت اور دین کے ساتھ مناسبت حاصل ہوتی ہے۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت صحبت ہی کی وجہ سے ہوئی کہ آج کوئی امام اور فقیہ اور کوئی بڑے سے بڑا ولی ادنیٰ صحابی کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا حالانکہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے بلکہ بہت سے علوم تو صحابہؓ کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کے زمانہ میں ان علوم کا پتہ بھی نہ تھا جو آج کل کثرت سے موجود ہیں۔ اُن کا یہی کمال تھا کہ وہ ان علوم میں مشغول نہ ہوئے تھے۔ ؎

دلفریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند ۔۔۔ دلبرِ ماست کہ باحسنِ خداداد آمد

پس صحابہ کا بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ آپؐ کی صحبت ان کو نصیب تھی۔ پس یاد رکھو کہ صحبت بدون علم متعارف کے مفید ہو سکتی ہے۔ مگر علمِ متعارف بدون صحبت کے بہت کم مفید ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بہت سے علماء نظر آتے ہیں مگر ان میں کام کے علماء دو چار ہی ہیں جن کو کسی کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہو۔

(علم و عمل تعمیم التعلیم ص۳۰۹)

صحابہؓ کی محبّت کا عالم

صحابہؓ کی یہ کیفیت تھی کہ ان کو اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تھا کہ حضورؐ فلاں بات سے ناراض ہیں خواہ کیسی ہی عزیز ہو وہ فوراً اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر مدینہ طیبّہ کے کسی محلہ میں تشریف لے گئے۔ راستہ میں ایک گنبد دار مکان دیکھا۔ پوچھا کہ کس کا ہے۔ کسی نے کہا کہ فلاں شخص کا ہے۔ آپ سن کر چپ

نہیں بولے۔ جب وہ شخص آئے اور انہوں نے السلام علیکم کہا تو حضورؐ نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے دوسری طرف سے آکر سلام کیا۔ ادھر سے بھی منہ پھیر لیا حضورؐ کا یہ رُخ دیکھتے ہی اُن کی تو گویا جان نکل گئی۔ اس لیے کہ وہ تو ہمیشہ نظر شفقت و رحمت کے دیکھنے والے تھے ؎

ہم نے اُلفت کی نگاہیں دیکھیں
جانیں کیا چشم غضب ناک کو ہم

حاضرین سے آہستہ سے پوچھنے لگے کہ کس بات سے حضورؐ ناخوش ہیں۔ لوگوں نے کہا یقینی بات تو کوئی معلوم نہیں۔ اتنی بات البتہ معلوم ہے کہ حضورؐ کا گزر تمہارے مکان کی طرف ہُوا۔ صرف پوچھا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں فرمایا۔ دیکھیے حالانکہ کسی دلیل سے پُورا یقین نہیں ہُوا کہ وجہ ناراضی کی کیا ہے مگر محض احتمال پر جاتے ہی تمام مکان کو۔ خدا جانے کس قدر لاگت کا ہوگا۔ فوراً مسمار کرا دیا اور کچھ تحقیق نہیں کیا۔ ان حضرات رضؓ کا تو اس پر عمل تھا۔

چو در چشم شاہد نیاید زرت ‏ ‏ ‏ زر و خاک یکساں نماید برت

اور پھر کمال پر کمال یہ ہے کہ آکر جتلایا نہیں، اطلاع نہیں کی، نہ حضورؐ سے نہ کسی اور سے۔ اس لیے کہ جانتے تھے کہ ہم نے جو کچھ کیا حضورؐ پر کونسا احسان ہے ہمارا اپنا ہی نفع ہے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ پھر حضورؐ کا گزر ہُوا تو دیکھا کہ وہ مکان نہیں ہے فرمایا کہ وہ مکان کہاں گیا۔ صحابہ رضؓ نے تمام قصّہ عرض کیا کہ انہوں نے حضورؐ کی ناراضی کے احتمال پر اس کو منہدم کر دیا۔ فرمایا کہ ہاں یہاں تعمیر ضرورت سے زائد وبال ہے۔

(الغضب صـ۱۸)

تعمیل حکم اور تحقیقات میں مذاقِ صحابہ رضؓ

سلف علوم میں محض قیل و قال پر اکتفا نہ کرتے تھے۔ ان سے ضروری نفع

حاصل کرتے تھے اور خلف اکثر زوائد میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ اخیر شب میں نزولِ رب الی السماء کی جو حدیث ہے۔ اُس سے سلف نے تو یہ کام لیا کہ اس سے ان کو رات کو اُٹھ کر نماز پڑھنے کی اور ابتہال الی اللہ کی رغبت ہو گئی اور انہوں نے اس حدیث کے متعلق کبھی یہ تفتیش نہیں کی کہ جب حق تعالیٰ جسم سے منزہ ہیں تو نزول الی السماء کے کیا معنی؟ اور واقعی کام کرنے والوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ وہ قیل و قال کو کہاں پسند کرتے ہیں اور نہ دلائلِ فلسفیہ پر مدار رکھتے ہیں۔ جیسا آجکل دلائلِ فلسفیہ پر مدار سمجھتے ہیں جو بالکل غلط طریق ہے۔ آخر کہاں تک یہ چل سکتے ہیں۔ کہیں تو جا کر انجن فیل ہو گا۔ اس راہ میں یہ سب چیزیں راہ زن ہیں۔ ہاں اگر بضرورت اس میں کلام ہو اور تجاوز نہ ہو تو ایک درجہ میں کار آمد بھی ہے۔ غرض ان پر مدار نہیں۔ مدار وہی ہے جس کو صحابہ نے کر کے دکھلا دیا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا "اتباع" جو حضورؐ کی زبان مبارک سے سُنا اس پر عمل شروع کر دیا۔ نہ دلائل فلسفیہ کی تلاش نہ حِکم اور اَسرار کی جستجو نہ کسی قیل و قال سے مطلب۔ سو اس راہ میں اسی طرح کام بن سکتا ہے کہ سب کو خیرباد کہہ کر کام میں لگ جائے۔ باقی ایسی عقل جو محبوب کی راہ میں رہزن ہو اس کے متعلق اکابر کا فیصلہ ہے ؎

؎ آزمودم عقلِ دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

؎ اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　مرعسس را دید و در خانہ نشد

؎ باز دیوانہ شدم من اے طبیب　　باز سودائی شدم من اے حبیب

؎ ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

اور یہ دولت پیدا ہوتی ہے اہلِ محبت کی صحبت میں رہنے سے اس کی خدمت میں اپنی ہر حالت بیان کرنے سے اور جو وہ تعلیم کرے اس پر عمل سے۔ ؎

؎ قال را بگذار مردِ حال شو　　پیشِ مردِ کاملے پامال شو

؎ یار باید راہ را تنہا مرو　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

(الافاضات ج ۹ ص ۱۷۰)

فصل (۶)

وقت کی قدر و قیمت

عمرِ عزیز لائقِ سوز و گداز نیست شریعت نے جس طور پر انضباطِ اوقات کر دیا ہے۔ اس میں نہ افراط کرو نہ تفریط۔ ضبطِ اوقات میں تجربہ کیا ہوگا کہ قلب میں فرحت زیادہ ہوتی ہے۔ جو لوگ برکاتِ شرعیہ کو محسوس کرتے ہیں ان کا تو کیا کہنا۔ وہ لوگ بھی جو صرف ضابطہ کی پابندی کرتے ہیں اپنے ٹھیک وقت پر نماز سے فراغت کر لینے پر اپنے قلوب میں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ وقت کی قدر کرنا چاہیے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک برف فروش سے مجھ کو بہت عبرت ہوئی۔ وہ کہتا جا رہا تھا کہ اے لوگو! مجھ پر رحم کرو۔ میرے پاس ایسا سرمایہ ہے کہ ہر لمحہ تھوڑا تھوڑا ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کی ہماری بھی حالت ہے کہ ہر لمحہ برف کی طرح تھوڑی تھوڑی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے گھلنے سے پہلے جلدی بیچنے کی فکر کرو۔ کس کے ہاتھ؟ جس نے یہ فرمایا ہے:۔ ان اللہ اشتریٰ..... الخ۔ "کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔" اور اس عمر کو ضائع مت کرو۔ ؎

عمرِ عزیز لائقِ سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

(الوقت صـ۳۲)

کوئی حالت انسان کی ایسی نہیں جو متعلق الوقت نہ ہو اور اس وقت کے لئے کوئی خاص حکم نہ ہو۔ انسان کا نظام الاوقات یہ ہوا کہ اپنے اوقات کو دیکھ کر کہ وقت میں کیا حکم ہے جو وقت آتا ہے اپنے ساتھ ایک حکم لاتا ہے۔

یک چشم زدن غافل ازآں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

انسان کو چاہیے کہ ایک لمحہ غافل نہ رہے۔ (الوقت)

انتظارِ فراغت عبث ہے

فراغت کے وقت کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھو زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو۔ دنیا کے دھندے کبھی ختم نہ ہوں گے۔ ایک کام کے بعد دوسرا کام نکل آئے گا۔ کام شروع کر دینا چاہیے۔ ایک عارف کہتے ہیں۔ ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود، امروز را فردا کنم

یہاں تک کہ ایک دن اسی طرح موت کا وقت قریب آ جائے گا پھر انسان اگر مہلت بھی مانگے گا تو نہیں ملے گی۔ بس دنیا کے جھگڑے تو یوں ہی چلتے رہیں گے ان سے فراغت تو مرنے کے بعد ہی حاصل ہوگی۔

ع کارِ دنیا کسے تمام نکرد

اور

ع ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

اگر کام کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق صرف یہ ہے کہ ان جھگڑوں کو بیچ ہی میں چھوڑ دو اور کام میں لگ جاؤ۔

(المجر ص ۲۲)

کامل یکسوئی کا طریقہ

کامل یکسوئی کا انتظار فضول ہے۔ یہ تو دنیا میں پھنس کر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ اسی پریشانی کی حالت میں تعلق مع اللہ کا سلسلہ بھی شروع کر دو۔ پھر رفتہ رفتہ اطمینان بھی نصیب ہو جائے گا۔ ورنہ عمر یوں ہی ختم ہو جائے گی اور یکسوئی نصیب نہ ہوگی۔

(اصلاح ذات البین صـ ۸)

وقت کھونے کی مذمت

بے کار وقت کا کھونا نہایت برا ہے۔ اگر کچھ بھی کام نہ ہو انسان گھر کے کام میں لگ جائے۔ گھر کے کام میں لگنے سے دل بھی بہلتا ہے اور عبادت بھی ہے۔ یہ مجمعوں میں بیٹھنا خطرہ سے خالی نہیں۔ کسی کی حکایت، کسی کی شکایت بعض مرتبہ غیبت تک نوبت آجاتی ہے۔ اس سے اجتناب کی ضرورت ہے۔

(الافاضات ع ۶ صـ ۲۴)

دوامِ عمل کا اصل سرچشمہ

عادۃ اللہ یہ ہے کہ جب مسلمان کسی عملِ شرعی کا اہتمام کرتا ہے تو حق تعالیٰ چند روز کے بعد اس کو طبعی بنا دیتا ہے کہ دل میں ایک داعیہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو اس سے بالاضطرار کام کراتا رہتا ہے۔ اور میری اس تحقیق سے کہ دوامِ عمل داعیہ جذبِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ عجب و کبر کی بھی جڑ کٹتی ہے۔ پس جو لوگ نماز و ذکر وغیرہ کے پابند ہیں۔ وہ اس کو اپنا کمال نہ سمجھیں بلکہ خدا تعالیٰ کا فضل و انعام سمجھیں۔ کیونکہ بدون اس داعیہ کے ہمارے ارادہ و اختیار میں اتنی قوت نہیں جو دواماً یہ اعمال صادر ہو سکیں۔

(انفاس عیسیٰ صـ ۲۸۳)

یہ ثابت قدمی اور استقلال اور پابندی اوقات اور ضبطِ معمولات محض خدا کا لطف ہے کہ انہوں نے آپ کے دل میں تقاضا پیدا کر دیا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں

ہو سکتا۔ ایک تنکا ہمارے ہاتھ میں ہو اور آندھی میں ثابت قدم رہے اور اس پہ تکیہ پر نازاں ہو تو اس کی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ (انفاس عیسیٰ ص۳۱)

جوانی گئی زندگانی گئی بڑھاپے میں آدمی قریب قریب معطل ہو جاتا ہے۔ پھر اخلاق ذمیمہ جو شباب میں راسخ ہو چکے ہیں وہ بجدا مزاحمت کرتے ہیں۔ کیونکہ جو خصلتیں جوانی میں جم چکتی ہیں وہ بڑھاپے میں بھی نہیں جاتیں مگر پھر بھی لوگ کہا کرتے ہیں کہ جوانی میں کھانے پینے کے دن ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا تو اللہ اللہ کریں گے۔ یہ غلطی ہے دو وجہ سے۔ اول تو جس چیز کی عادت جوانی میں نہ ہو وہ بڑھاپے میں یوں بھی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے بڑھاپے میں تو وہ ہمت نہیں رہتی، کسل بڑھ جاتا ہے۔ مشکل سے ٹھیل ٹھیل کے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔ فرض نماز کے لیے مشکل سے اٹھا جاتا ہے۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ یہ قول کہ ؎

دریغا کہ عمر جوانی گئی جوانی گئی، زندگانی گئی

ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگانی کیونکر گئی۔ کیونکہ بڑھاپا آنے سے اور آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔ لڑکے بالے یا نوکر چاکر پنکھا جھل رہے ہیں، پاؤں دبا رہے ہیں۔ مگر جب بڑھاپا آیا تو واقعی سمجھ میں آگیا کہ ع جوانی گئی زندگانی گئی۔ کیونکہ نہ کھانے کی حلاوت، نہ پینے کا مزہ، نہ سونے کا چین، نہ جاگنے کا لطف۔ اگر دماغ میں یبوست غالب ہے تو سب لوگ سو رہے ہیں۔ یہ رات بھر اختر شماری میں مشغول ہیں۔ نیند ہی نہیں آتی۔ اور اگر رطوبت غالب ہے تو ہر وقت آنکھیں بند ہیں، اونگھ رہے ہیں، اٹھنا چاہتے ہیں مگر اٹھا نہیں جاتا۔ پھر اس کے علاوہ کہیں ناک میں درد ہے، کہیں کان دکھتا ہے، کبھی ٹانگ میں درد ہے، کبھی برسات کی ہوا لگ کر کمر میں درد ہے۔ بہر حال یہ تو زندگانی کا لطف گیا۔ اور وہ جو جوانی میں لوگوں کے دلوں میں وقعت تھی باستثناء اہل اللہ

سے وہ بھی چلی گئی۔ کیونکہ ان کی دوستی سچ مچ کی دوستی ہے۔ کیونکہ وہ محض دین کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب بڑھاپا آیا تو بڑے میاں اپنے ہی اغراض پورے نہیں کر سکتے تو اور کے کیا پورے کریں گے۔ تو جب واسطہ نہیں رہا تو دوستی بھی ختم ہو گئی۔ بلکہ یہ خود غرضی یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے مال میں تصرف کرتا ہے تو ورثہ کو یہ بھی ناگوار ہوتا ہے کہ جتنا کم خرچ ہو اتنا ہی اچھا کہ ہمارے لیے بچ جائے گا۔ بلکہ بعض جگہ جہاں معذور ہو جاتے ہیں مثلاً اندھے ہو گئے تو اس وقت نوکر چاکر بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ پکارتے ہیں اور وہ سنتے ہیں مگر جواب نہیں دیتے۔ غرض بعض اپنے مال سے بھی بڑھاپے میں منتفع نہیں ہو سکتے۔ تو کیا آپ اس بڑھاپے کے منتظر ہیں؟ میاں بڑھاپا آئے گا تم اس وقت کام ہی کے نہیں رہو گے۔

اور جوانی میں طاعات کرنے میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب جوانی میں طاعات کا خوگر ہو جائے گا تو بڑھاپے میں عادت کی وجہ سے آسانی ہو جائے گی۔ اسے تو ہر شخص عقل سے سمجھ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب بڑھاپا اتنا آجائے کہ کچھ نہ کر سکے اس کے لیے حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص صحت کی حالت میں نیک عمل کرتا ہو اور مرض میں نہ کر سکے یا حالتِ اقامت میں کرتا ہو سفر کی وجہ سے نہ کر سکے تو فرشتوں کو حکم کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں بھی عمل پورا لکھنا۔ یہاں تو پنشن آدھی دی جاتی ہے وہاں پوری پنشن دی جاتی ہے۔ بلکہ اور ایک ضمیمہ بھی اس پنشن کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ عمل نہ کرنے کی حسرت کا اجر کہ پڑے سو رہے ہیں اور سبحان اللہ سبحان اللہ کا ثواب لکھا جا رہا ہے۔ یہ جوانی کے عمل کی برکت ہے۔ ورنہ یہ ثواب کیسے ملتا۔ یہ دلیل نقلی سے معلوم ہوا۔ غرض جوانی کے عمل سے بڑھاپے کا تدارک ہو سکتا ہے

تیسری بات یہ کہ اعمال میں ایک برکت خاصہ ہے جس سے قلب میں نور پیدا ہوجاتا ہے اور وہ نور وہی ہے جس کے لیے تہجد کے وقت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی اور حقیقت نور کی یہ ہے کہ خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کردے۔ خود بیّن ہوتا ہے اور دوسرے حقائق کو بیّن کردیتا ہے اور قلب کے اندر اس نور کے پیدا ہونے سے ظلمت دفع ہوتی ہے۔ کونسی ظلمت؟ ظلمت کسل کی، ظلمت کینہ کی، ظلمت حسد کی، ظلمت کبر کی، ظلمت غصہ کی، ظلمت معصیت کی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے اندر نشاط، تازگی، شگفتگی اور فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو ایسا شخص بڑھاپے میں بھی نکمّا نہیں ہوتا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جو شخص دواماً تلاوت قرآن کرتا ہے بڑھاپے میں اس کے حواس خراب نہیں ہوتے۔ "بڑھاپے میں عموماً حواس خراب ہوجاتے ہیں۔ اس سے بچنے کی تدبیر تلاوتِ قرآن ہے۔ اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ باوجود بڑھاپا آجانے کے بھی ان کے حواس قائم رہتے ہیں، جیسے مولانا فضل الرحمن صاحب قدس سرہٗ کہ سو برس سے سن متجاوز تھا مگر حواس ویسے ہی تھے۔ یہ سب تلاوت قرآن کی برکت تھی۔ اسے عقلاء نہیں جانتے، اہل اللہ جانتے ہیں کہ راز اس میں

باب پنجم

معاشرت

فصل (۱) اسلام اور حسنِ معاشرت
فصل (۲) خدمتِ خلق
فصل (۳) زندگی و صحّت
فصل (۴) تشبّہ بالکفار
فصل (۵) رسُومات
فصل (۶) پردہ اور بے پردگی

فصل (۱)

اسلام اور حسن معاشرت

معاشرت کی حقیقت و اہمیت حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ دین کے پانچ اجزا ہیں عقائد[۱] عبادات[۲]، معاملات[۳] اخلاق[۴] باطنی کی اصلاح اور ادب[۵] معاشرت۔ ان میں سے ابتدائی چار اجزاء کی طرف تو عوام، علماء اور مشائخ نے کسی نہ کسی صورت میں توجہ دے رکھی ہے اور ان کو دین قرار دیا ہے، مگر ادب معاشرت کو تو عام طور پر دین کے اجزاء میں سے خارج ہی کر دیا گیا ہے۔ اور موجودہ دور میں الفت و اتفاق میں جو کمی محسوس ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا بڑا سبب یہ سوءِ معاشرت بھی ہے۔ کیونکہ اس سے طبیعتوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ادب معاشرت دین کا اہم جزو ہے، اس پر چند دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

"اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ فراخ کر دو تو جگہ فراخ کر دیا کرو، اور جب تم سے کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جایا کرو۔" (سورہ مجادلہ)

اور ارشاد ہے کہ :۔

"دوسرے کے گھر میں (اگرچہ وہ مردانہ ہو۔ مگر خاص خلوت گاہ ہو) بغیر اجازت لیے مت جایا کرو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-
"ایک ساتھ کھانے کے وقت دو دو چھوارے ایک دم سے نہ لینا چاہیے، تاوقتیکہ اپنے رفیقوں سے اجازت نہ لے لے"۔
دیکھیے اس معمولی سے معاملے کی صرف اس لیے ممانعت کر دی کہ دوسروں کو ناگوار ہوگا۔

حضورؐ ہی کا ارشاد ہے کہ "جو شخص لہسن اور پیاز (کچا) کھائے تو ہم سے (یعنی مجمع سے) علیحدہ رہے"۔ دیکھیے اس خیال سے کہ دُوسروں کو ایک ذرا سی تکلیف ہوگی، منع فرما دیا۔ اور ارشاد ہے کہ مہمان کو حلال نہیں کہ میزبان کے پاس اس قدر قیام کرے کہ تنگ ہو جائے"۔ اس میں ایک ایسی بات سے منع فرما دیا، جس سے دوسروں کے دل کو تنگی ہو۔ اور ارشاد فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ کھانے کے وقت گو پیٹ بھر جائے مگر جب تک کہ دُوسرے لوگ فارغ نہ ہو جائیں، ہاتھ نہ کھینچیے، کیونکہ اس سے دُوسرا کھانے والا شرما کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور شاید اس کو ابھی کھانے کی حاجت باقی ہو"۔ اس سے ہر ایسے کام سے منع فرما دیا جس سے دوسروں کے شرمسار ہونے کا شبہہ ہو۔

ایک مرتبہ حضرت جابرؓ نے درِ دولت پر حاضر ہو کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ نے پوچھا کون ہے۔ انہوں نے عرض کیا میں ہوں۔ آپؐ نے ناپسندیدگی سے فرمایا "میں ہُوں، میں ہُوں"۔ اس سے آپؐ نے ہر مقام پر گول مول بات کرنے سے بچنے اور صاف صاف بات کرنے کی تعلیم فرمائی ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "ایسے دو شخصوں کے درمیان (جو قصداً پاس پاس بیٹھے ہوں) جا کر بیٹھنا حلال نہیں۔ بغیر ان کی اجازت کے"۔ اس میں ہر اس بات سے منع فرمانا مقصود ہے جس سے دُوسروں کو نفرت ہو۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا۔ مگر آپؐ کی تشریف آوری پر کھڑے نہ ہوتے تھے کیونکہ ایسا کرنا آپؐ کو ناگوار تھا۔" اس سے بزرگوں کے ادب اور تعظیم کا اصول معلوم ہوا کہ ان کے مزاج کے خلاف کوئی کام ان کے سامنے نہیں کرنا چاہیے جو ان کو اچھا نہ لگتا ہو۔ اسی طرح دوسروں کو تکلیف سے بچانے کے لیے آپؐ کا طریقہ چھینک آنے کے وقت یہ تھا کہ اپنا منہ ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانپ لیتے۔

حضور کی مجلس میں صحابہ کو جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ آپؐ کے قریب پہنچنے کی بلاوجہ کوشش نہ کرتے۔ مجلس کے ادب کی آپ نے یہی تعلیم دی ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

"بیمار پرسی میں بیمار کے پاس زیادہ نہ بیٹھیے۔ تھوڑا بیٹھ کر جلد اُٹھ کھڑا ہو۔" اس کا مقصد مریض کو پریشانی سے بچانے کی تعلیم دینا ہے۔

جمعہ کے دن غسل ضروری ہونے کا سبب ابن عباسؓ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ "اسلام کے شروع میں اکثر مسلمان غریب، مزدوری پیشہ تھے۔ میلے کپڑوں میں پسینہ نکلنے سے بدبو پھیلتی ہے اس لیے غسل واجب کیا گیا تھا، پھر بعد میں اس کا وجوب منسوخ ہو گیا۔" اس سے بھی معلوم ہوا کہ اس کی کوشش واجب ہے کہ کسی کو کسی سے معمولی تکلیف بھی نہ پہنچے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر سے آہستہ اُٹھے، آہستہ نعلین (جوتے) مبارک پہنے، آہستہ سے کواڑ کھولے، آہستہ سے باہر تشریف لے گئے اور پھر آہستہ سے کواڑ بند کیے۔" اور یہ سب اس خیال سے تھا کہ حضرت عائشہؓ سوتی ہوں گی، بے چین نہ ہوں۔ اس سے سونے والے کی کتنی رعایت کا سبق ملتا ہے۔ ایسے ہی ایک روایت میں مہمانوں کو جو سو رہے تھے آپؐ کا آہستہ آواز سے

سلام کرنا ثابت ہے تاکہ جاگنے والا سُن لے اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو، ایسے مضامین کی بہت ساری حدیثیں موجود ہیں۔ متعدد فقہی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ضروری کام میں مشغول آدمی کو سلام کر کے اس کی توجہ کام سے ہٹانے سے منع کیا گیا ہے۔

اسی طرح مُنہ کی خرابی (پائیریا) کے مرض میں مبتلا شخص کو مسجد میں نہ آنے دینا بھی فقہاء نے نقل کیا ہے۔

ان سب دلائل میں مجموعی طور پر غور کرنے سے صاف اور واضح معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی تکلیف کے اسباب ختم کرنا انتہائی ضروری ہے اور شریعت نے اس کا خاص انتظام کیا ہے کہ کسی کی کوئی حرکت یا حالت دوسروں کو کسی طرح بھی تکلیف یا پریشانی اور نفرت وغیرہ کا سبب نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اپنے قول اور عمل ہی سے اس کی تعلیم نہیں دی بلکہ اپنے ساتھیوں کی کم توجہی پر ان کو ان آداب کے عمل کرنے پر مجبور بھی فرمایا۔ مثلاً ایک صحابی ایک ہدیہ لے کر بغیر سلام کیے اور بغیر آپ سے اجازت لیے داخل ہو گئے۔ آپ نے فرمایا باہر واپس جاؤ اور "السلام علیکم، کیا میں حاضر ہوں" کہہ کر پھر آؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں سے حسن اخلاق کی بنیاد یہی ایک چیز ہے کہ کسی کو کسی سے کلفت و ایذا نہ پہنچے۔ جس کو حضور پُر نُور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔ (رواہ البخاری) (یعنی مسلمان کامل تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے بھی کسی کو تکلیف نہ ہو) اور جس امر سے اذیت ہو گو وہ صُورت مالی یا جانی ہو یا ادب و تعظیم ہو، سوءِ خلق قرار پاتا ہے۔

معاشرت گو شعائر کے مرتبہ کے اعتبار سے عقائد و عبادات واجبہ سے مؤخر

... معاشرت پر دلالت

کرتا ہے صلوٰۃ توحید وغیرہ پر مقدم ذکر فرمایا۔ اسی طرح حدیث میں ان دو عورتوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک نماز و روزہ کثرت سے کرتی تھی اور دوسری کم (یعنی کثرت سے نوافل نہیں پڑھتی تھی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ایک کو پڑوسیوں کو ایذاء دینے کے سبب دوزخی اور دوسری کو ایذاء نہ دینے کے سبب جنتی فرمایا۔

اس کے علاوہ دوسری حیثیت سے بھی معاشرت کی اہمیت زیادہ ہے وہ یہ کہ آج عوام وخواص تو کیا اخص الخواص بھی باب معاشرت کو دین میں داخل نہیں سمجھتے اور عملاً بھی اس کا لحاظ بہت کم کرتے ہیں۔

غرض معاشرت کا سب اجزائے دین سے مقدم و مہتم بالشان ہونا ثابت ہوگیا، مگر باوجود اس کے اخص الخواص تک کا خود بھی عملاً التفات کم ہوگیا ہے اور اپنے متعلقین کی تعلیم واصلاح تو بالکل ہی مفقود ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

(آداب المعاشرت تلخیصاً)

بھلائی اور برائی کا معیار

فرمایا کہ ہر چیز کا حسن و قبح خدا تعالیٰ کے فرمانے پر ہے۔ (رجاء الغیوب ص ۲۷)

مسلمان کے ظاہری و باطنی اعمال کا معیار

ہمارے اعمال کا قبلہ و کعبہ جناب رسول اکرم صلی اللہ

تعلیم کے لیے بعثتِ رسول رحمتِ حق ہے

یہ رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ہمارے واسطے اوامر و نواہی کی کتاب بھی بھیج دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود نمونہ بھی بنا دیا تاکہ احکام کی تعلیم میں کوئی دقت نہ رہے کیونکہ تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی کا طریقہ بتلا دیا جائے اور ایک طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ سے بھی کر کے دکھلایا جائے۔ دوسری صورت تعلیم کی نہایت مکمل ہے اور پہلی صورت تعلیم کے لیے لبسا اوقات کافی نہیں ہوتی۔

(الاسلام الحقیقی ص۳)

دین و دنیا کی عزت

مسلمانوں کے لیے دین و دنیا دونوں کی عزت جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی میں ہے باقی اس کے علاوہ سب اسباب ذلت کے ہیں۔

(ملفوظات ج۲ ص۱۷۱)

ہماری بد اعمالی پر حضور رنجیدہ ہوتے ہوں گے

سابقہ قوموں پر پہلے احکام الٰہی آئے تھے بذریعہ انبیاء علیہ السلام۔ ہمارے پاس بھی احکام آئے ورثۃ الانبیاء کے ذریعہ سے۔ انہوں نے نافرمانی کی ہم نے بھی نافرمانی کی جس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ ع

صورت بیں حالت مپرس

اگر کسی نے حضور کو دیکھا ہو اور ہم کو دیکھے تو ہرگز نہ پہچان سکے کہ ہم آپ کی اُمت ہیں۔ کیا آپ غیبت کیا کرتے تھے؟ کیا آپ کا لباس ایسا ہی تھا؟ آپ کے وقت میں بھی لغو کھیل تماشن گنجفہ تھے؟ کیا نعوذ باللہ ایسا ہی ظلم تھا کہ جس کی چاہی زمین دبالی؟ جس کا چاہا روپیہ مار لیا؟ اگر کوئی معمولی آدمی ہیں سلام

کرے تو ناخوش ہوتے ہیں اور حضورؐ خود سلام کیا کرتے تھے۔ حضورؐ کے صاحبزادہ کا انتقال ہوا تو آپؐ کے صرف دو آنسو نکل گئے اور یہاں آسمان و زمین ایک دل ہو جاتے ہیں۔ غرض ہماری ہر حالت بگڑی ہوئی ہے۔ ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اسی حالت کو دیکھ کر کوئی صاحبِ ذوق کہتا ہے ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(ترجمہ) اے حضورؐ ذرا خواب راحت سے اُٹھیے تو سہی دیکھیے آپ کی اُمّت کس بلا میں گرفتار ہے۔

آپؐ پر دو دفعہ ہفتہ میں ساری اُمّت کے اعمال پیش ہوتے ہیں خیال تو کیجیے کہ آپؐ کو کس قدر تکلیف ہو گی۔ الگ الگ ہر شخص کے اعمال پر نظر فرما کر رنجیدہ ہوتے ہوں گے۔ آپؐ کو تو ہم سے اتنی محبّت کہ ہمارے لیے یہاں تک دُعائیں کیں کہ قدم مبارک سُوج گئے اور ہم نے آپ کو بعد وفات بھی راحت نہ پہنچائی تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ اور پھر برے کام پر ہم لوگ اصرار کرتے ہیں، کہتے ہیں اللہ غفور الرحیم ہے۔ تو پیغمبرؐ پر ایمان نہ لائے ہوتے تب بھی اللہ غفور الرحیم ہے۔ صاحبو جب ہماری یہ حالت ہے تو ہم رسولؐ کے کہاں ہوئے! ہم تو اپنے نفس کے بندے ہیں۔ تو جیسے پہلوں نے رسول کی نافرمانی کی تھی ویسے ہی ہم نے رسول کی نافرمانی کی پیغمبر نے شادی کے طریقے بتلادیے اور ہم ضد کر کے اس کے خلاف کرتے ہیں اور علماء پر الزام لگاتے ہیں۔ (التنبہ ص—)

حُسنِ معاشرت حُسنِ معاملہ سے بھی زیادہ ضروری ہے

معاملات سے زیادہ معاشرت کا اہتمام ضروری ہے کیونکہ معاملات

کی اصلاح میں تو زیادہ لوگوں کے مال کی حفاظت ہے اور حسنِ معاشرت میں مسلمانوں کے قلب کی حفاظت ہے اور ظاہر ہے مال سے دل کا رتبہ بڑھا ہوا ہے۔ نیز معاشرت کی اصلاح میں علاوہ قلوب کے لوگوں کی آبرو کی بھی حفاظت ہے اور آبرو کی حفاظت بعد ایمان کے ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ آبرو بچانے کے لیے انسان ہر چیز کو قربان کر دیتا ہے اور حدیث حقوق میں بھی تینوں کی حفاظت مامور بہ ہے۔ حضورؐ نے حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا ہے "تمہارے خون تمہارے اموال تمہاری عزتیں باہم ایک دوسرے پر قیامت تک حرام ہیں۔

حقوق العباد اور وظائف

فرمایا کہ "حقوق العباد کا ادا کرنا" اوراد و وظائف سے بدرجہا زیادہ ضروری ہے۔ اس کے ترک سے مواخذہ ہوگا اور ترکِ وظائف سے کچھ مواخذہ نہیں، یہ تو مستحب ہے۔ لوگ ضروری کام کو چھوڑ کر غیر ضروری اختیار کرتے ہیں۔

(دعوات عبدیت جلد دوم مقالات حکمت ۱۳۱)

دوسروں کو اذیت نہ پہنچاؤ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہاں پر تو کوئی چھوڑا نہیں جاتا۔ کان ضرور کھول دیئے جاتے ہیں بحمد اللہ یہاں سے کوئی محروم نہیں جاتا کچھ لے کر ہی جاتا ہے چاہے خفا ہی ہو کر جائے مگر جاتا ہے لے کر کورا نہیں جاتا۔ میں نہ تقویٰ سکھاتا ہوں نہ طہارت، نہ مجاہدہ نہ ریاضت۔ ہاں یہ سکھاتا ہوں کہ "دوسرے کو اذیت نہ پہنچاؤ"۔ اگر اللہ کے حقوق میں کمی ہو جائے وہ بڑے کریم ہیں، رحیم ہیں بخش دیں گے۔ مگر ان کے بندوں کو مت ستاؤ۔ یہ سخت بات ہے۔

(الافاضات ع ۶ صـ ۱۹۹)

آدمیت کا حاصل اور انسان کے معنی

عقلی مسئلہ ہے کہ طلب سے پہلے مطلوب کی تعیین کرے اور نیز اگر

ہے مقدم مطلوبیت میں "آدمیت" ہے اور اس آدمیت کا حاصل یہ ہے کہ اپنے سے دوسرے کو اذیت نہ پہنچے۔ (الافاضات ج ۳ ص ۲۵۳)

اگر انسان انسان ہو جائے تو پھر سب ہی کچھ ہے اور انسان کے معنی یہ ہیں کہ "صحیح تعلق" پیدا ہو جائے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ یہی جڑ ہے سب کی۔

(الافاضات ج ۳ ملفوظ ۳)

اعمالِ واجبہ کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے

عمل کو مہتم بالشان سمجھنے کے بعد ایک کوتاہی اور ہے جس میں عوام تو کیا خواص بھی مبتلا ہیں کہ اعمال واجبہ کی وہ عظمت اور وقعت قلوب میں نہیں جو غیر واجبہ کی ہے۔ مثلاً حقوق العباد وغیرہ کی فکر نہیں اور نوافل و ظائف وغیرہ کی کثرت کو زیادہ موجب قربِ حق سمجھتے ہیں اور جو اصل مقصود تھا اسی کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ کتنا بڑا ظلم عظیم ہے اور اعمال واجبہ کے حقیر سمجھنے کا سبب ان اعمال کا عموم ہے کہ اس کو تو سب ہی کرتے ہیں اس میں خصوصیت ہی کیا ہوئی ...... تو کیا نعوذ باللہ انبیاء علیہم السلام ایسے کاموں کے اہتمام کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے جن کو تم حقیر اور فضول سمجھتے ہو۔ توبہ کرنی چاہیے ان فاسد عقائد سے۔ پس اصل مقصود اعمالِ واجبہ ہی ہیں اور عموم ہونا ہی دلیل ہے افضلیت کی۔

(الافاضات ج ۱ صفحہ ۳۶ ملفوظ ۴۳)

حقوق اہل و عیال سے غفلت دین سے غفلت ہے

فرمایا کہ لوگ اہل و عیال کے حقوق کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ حکومت کرنا جانتے ہیں۔ یہ خیال نہیں کرتے کہ جن پر حکومت کرتے ہیں، ان محکوموں کا بھی کوئی حق ہمارے ذمہ ہے یا نہیں۔ معاشرت کو تو دین کی فہرست سے نکال ہی رکھا ہے۔ اس باب میں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے اور ان سب فضولیات

کا سبب دین سے غفلت ہے۔

(ملفوظ نمبر ۴۰ الافاضات الیومیہ ۲ شوال ۱۳۵۰ھ)

بیوی کے حقوق کی اہمیت

فرمایا کہ فتویٰ تو نہیں دیتا لیکن مشورہ دوں گا کہ گھر کا انتظام بیوی کے ہاتھ میں رکھنا چاہیے یا خود اپنے ہاتھ میں۔ اوروں کے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے۔ چاہے وہ بھائی ہو بہن ہو ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سے بیوی کی بڑی دل شکنی ہوتی ہے۔ یا تو خاوند خود اپنے ہاتھ میں خرچ رکھے ورنہ اور رشتہ داروں میں سب سے زیادہ مستحق وہی ہے۔ بیوی کا صرف یہی حق نہیں کہ اس کو صرف کھانا کپڑا دے دیا بلکہ اس کی دلجوئی بھی ضروری ہے۔ دیکھیے فقہا نے بیوی کی دلجوئی کو یہاں تک ضروری سمجھا ہے کہ اس کی دلجوئی کے لیے جھوٹ بولنا بھی جائز فرما دیا۔ اس سے کتنی بڑی تاکید اس امر کی ثابت ہوتی ہے۔ یہاں سے بیوی کے حق کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی دلجوئی کے لیے خدا نے بھی اپنا ایک حق معاف کر دیا۔

(حسن العزیز جلد ۳ ملفوظ ۴۵۵)

اولاد کی تربیت میں حد تادیب

(بعض دفعہ چھوٹوں پر بھی بری طرح غصہ کیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے بس ہوتے ہیں ان کی طرف سے کچھ بھی بدلہ نہیں ہو سکتا)۔ (بچوں پر جو ظلم ماں باپ سے یا میاں جی صاحبان سے ہوتا ہے، وہ اسی قبیل سے ہے) بعضے ماں باپ ایسے قصائی ہوتے ہیں کہ بچوں کو اس طرح مارتے ہیں جیسے کوئی جانوروں کو مارتا ہے بلکہ جیسے کوئی چھت کوٹتا ہو اور جو کوئی کہے تو کہتے ہیں ہمیں اختیار ہے ہم اس کے باپ بھی ہیں۔ یاد رکھیے باپ ہونے سے ملک رقبہ حاصل نہیں ہوتی ورنہ یہ بھی ہوتا کہ باپ بیٹے کو بیچ لیا کرتا۔ باپ کا رتبہ

حق تعالیٰ نے بڑا بنایا ہے نہ اس واسطے کہ چھوٹے اس کی ہلاک ہوں اور اس سے چھوٹوں کو تکلیف پہنچے بلکہ اس واسطے کہ چھوٹوں کی پرورش کرے اور ان کو آرام دے۔ ہاں کبھی اس آرام دینے ہی کی ضرورت سے سزا اور تادیب کی حاجت بھی پڑتی ہے اس کی اجازت ہے اور الضَّرُوْرَۃُ تَتَقَدَّرُ بِقَدْرِ الضَّرُوْرَۃِ (ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہوتا ہے) کے قاعدہ سے اتنی ہی تادیب کی اجازت ہو سکتی ہے جو پرورش اور تربیت میں معین ہو نہ اتنی جو درجۂ ایلام (تکلیف دہی) تک پہنچ جائے اور ماں باپ سے ایسی زیادتی قطع نظر گناہ ہونے کے انسانیت اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔ ماں باپ کو تو حق تعالیٰ نے محض رحمت بنایا ہے ان سے ایسی زیادتی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ شخص انسانیت سے بھی خارج ہے۔ قطع نظر اس سے ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ زیادہ مارنا تعلیم کے لیے بھی مفید نہیں ہوتا بلکہ مضر ہوتا ہے

ظلم کی حقیقت و مذمت یہ خیال کہ ظلم میں تو بڑے ہی لوگ مبتلا ہیں اور چھوٹے بیچارے تو خود ہی دبے ہوئے ہیں۔ وہ کیا کسی پر ظلم کریں گے، صحیح نہیں۔ مبتلا سب ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ غربا کے پاس اس کا اس قدر سامان نہیں جتنا امراء کے پاس ہے۔ اس اعتبار سے غرباء کی حالت بہ نسبت امرا کے اچھی ہے۔

ضلع کانپور میں ایک مقام ہے بارہ اکبر۔ وہاں ایک غریب جولاہا تھا۔ وہ ایک روز اپنی مسکنت کی حالت میں بیٹھا تھا۔ ایک رئیس خاں صاحب کا گزر ہوا۔ تحقیراً پوچھا میاں جی کیا کر رہے ہو؟ وہ جولاہا بھی تھا اُستاد۔ بولا خاں صاحب اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ خاں صاحب نے کہا تجھ پر اللہ تعالیٰ کی کونسی نعمت ہے، جس کا شکر ادا کر رہا ہے۔ کہا اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ

اللہ تعالیٰ نے مجھ کو خاں صاحب نہیں بنایا، ورنہ میں بھی مخلوق پر ظلم کرتا۔
خاں صاحب لاجواب ہو گئے۔ اس نے بالکل سچی بات کہی۔ ؎

ندار ی بحمد اللہ آن دسترس

غرض ایسے سامان کا نہ ہونا بھی اللہ کی نعمت ہے اس لیے کہ جس قدر سامان والے ظلم کریں گے یہ نہ کرے گا۔ سو یہ فرق تو ضرور ہے لیکن ظلم میں سب مبتلا ہیں۔ امرا زیادہ کرتے ہیں اور غربا کم۔ اس لیے غریب ہونا بھی اچھا ہی ہے یہ تو اس تقدیر (اعتبار) پر ہے جبکہ غریب اور امیر کی تعریف ہمارے عرف کے اعتبار سے کی جائے اور اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی اصطلاح لی جائے تو اس زمانہ میں کوئی بھی غریب نہیں۔ کسی شخص نے ایک صحابی رضؓ سے اپنے فقر و فاقہ اور غربت کی شکایت کی۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارے رہنے کے لیے گھر بھی ہے اور بیوی بھی ہے۔ عرض کیا گھر بھی ہے بیوی بھی ہے۔ فرمایا کہ تم غریب کہاں ہوئے تم تو امیر ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ ایک غلام بھی ہے۔ فرمایا کہ پھر تم بادشاہ ہو۔ ان ارشادات کے سننے کے بعد وہاں یہ نہیں تھا جیسے ہم لوگوں کی حالت ہے کہ حدیث و قرآن سب پڑھتے سنتے ہیں، اثر کچھ نہیں چنانچہ یہ سب سُن لیا، مگر پھر بھی سمجھ رہے ہیں اپنے کو غریب ہی۔ وہاں تو یہ حالت تھی کہ جو کچھ سُن لیا نقش کالحجر ہو گیا۔ جس بات کی نسبت ارشاد فرمایا کیا مجال ہے کہ اس کے خلاف ہو۔ چنانچہ انہوں نے امیر کی یہ ماہیت سن لی تو بس پتھر کی لکیر ہو گئی۔ تمام اجزاء شریعت کے ساتھ ان کی یہی حالت تھی کہ ایک ایک جزو حاضر اور نقدِ وقت تھا۔ ان حضرات کی دولت تو بس حضورؐ کے ارشادات تھے اسی کو وہ امیری اور غنا سمجھتے تھے۔

چنانچہ جب ہرقل کے پاس ایک سیاسی امر کے متعلق صحابہؓ تشریف لے

گئے ہیں تو اس نے یہ بات پوچھی کہ آپ لوگ اول اہل فارس پر کیوں نہ گئے۔
ہمارا نمبر تو پیچھے تھا کیونکہ ہم تو دونوں اہل کتاب ہیں جو کام ضروری ہے اول وہ کرنا چاہیے۔ سو اس سوال کے وقت اگر ہم میں سے کوئی عاقل ہوتا تو حیران رہ جاتا اور سوچنا پڑتا کہ کیا جواب دیا جائے مگر وہاں تو ہر عمل بالقرآن تھا۔ اسی وقت بے تکلف آیت پڑھی: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ۔ یعنی اے ایمان والو ان کفار سے قتال کرو، جو تمہارے نزدیک ہیں۔" وہ سُن کر چپ رہ گیا۔ یہی مذاق ہم کو بھی پختہ کرنا چاہیے کہ روایت مذکورہ سے امیری کی ماہیت سُن کر اپنے کو امیر ہی سمجھنا چاہیے۔

غرض اس زمانہ میں کوئی غریب نہیں ہے۔ اس لیے وہ بھی ظلم کر سکتے ہیں، بلکہ بعض اوقات جن کو غربا کہا جاتا ہے ان کا دماغ امرا سے بھی زیادہ بڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ بعض انواع ظلم و ایذا کے ان سے زیادہ صادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض موقع پر یہ امرا کی تحقیر کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ میاں ہم ان سے کس بات میں کم ہیں۔ کوئی مال مست کوئی کھال مست۔ تو یہ کھال مست ان سے بڑھے ہُوئے ہیں۔ اکثر تقریبات کی رسوم میں امرا تو کچھ کمی بھی کر جاتے ہیں مگر غربا کو یہ خیال رہتا ہے کہ اگر ہم کچھ نہ کریں گے تو بڑی بدنامی ہو گی۔ اس بدنامی سے بچنے کے لیے یہ غریب لوگ قرض لیتے ہیں۔ گھر رہن رکھتے ہیں۔ بہر حال غرباء میں بھی دماغ اس قدر ہوتا ہے کہ اگر ان کے پاس سامان ہو تو وہ بھی ظلم میں کسر نہ کریں گے۔

ظلم یہی نہیں کہ کسی کو مارے، کسی کو پیٹے، کسی کا مال چھین لے بیشک یہ بھی ظلم ہے اور ظلم کے اعلیٰ افراد ہیں لیکن ظلم اس میں منحصر نہیں چھوٹے چھوٹے ظلم بھی ظلم ہی ہیں اور اگر یہ خیال ہو کہ خیر چھوٹے ظلم کا کیا حرج ہے تو صاحبو!

Scanned with CamScanner

چھوٹی چنگاری سے کیوں احتیاط کرتے ہو۔ فرق اتنا ہی ہے کہ بڑا انگارہ جلدی
پھونکے گا اور چھوٹی چنگاری دیر میں جلائے گی۔ صاحبو! گناہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا
جب اس سے لاپروائی کی جائے ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے اور گناہ فی نفسہٖ
چھوٹا ہو یا بڑا اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو بڑا ہی ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی نافرمانی
ہے۔ بس کس کا چھوٹا کس کا بڑا سب کو چھوڑ دو۔ بلکہ جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا اس
لیے کہ بڑے گناہ کو تو گناہ سمجھ کر توبہ بھی کرتے ہیں اور چھوٹے سے لاپروائی کی وجہ
سے توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی، اس حیثیت سے چھوٹا زیادہ کھوٹا ہوا۔

اور چونکہ یہ غلط فہمی ظلم کی حقیقت کو نہ جاننے سے ہوئی ہے اس لیے میں
اول ظلم کی حقیقت بیان کیے دیتا ہوں۔ سو ہر چند کہ ظلم ہر گناہ کو عام کرتا
ہے لیکن اس آیت میں (جو کہ وعظ کے شروع میں بیان ہوئی) إِنَّمَا السَّبِيلُ
عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ "یعنی مواخذہ
اور الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ناحق ظلم کرتے ہیں" چونکہ ظلم متعدی
ہے النّاس کی طرف۔ اس لیے ظلم کے معنی یہاں خاص وہی ہیں جس کا تعلق
لوگوں سے ہو یعنی اتلافِ حقوق الغیر (غیر کے حقوق کو ضائع کرنا) اور یہ معنی بقرینہ
مقام ہیں ورنہ ظلم کے معنی لغت میں یہ ہیں "وضع الشی فی غیر محلہٖ" کسی چیز
کو اس کے مصرف کے علاوہ کسی دوسری جگہ استعمال کرنا، جس کا ایک درجہ ایسا
بھی نکلے گا کہ گناہ بھی نہیں لیکن نامناسب ہے۔

غرض ظلم فی نفسہٖ ایک ایسا مفہوم ہے کہ نامناسب اور صغیرہ اور کبیرہ
گناہ اور کفر تک کو شامل ہے۔ مگر یہاں اس آیت میں خاص مراد ہے "غیر کا
حق تلف کرنا" اور وہ غیروں کے حقوق کیا ہیں سو اس کی تفصیل شریعت میں
موجود ہے۔ میں مثال کے طور پر کچھ بیان کرتا ہوں۔ مثلاً بیوی ہی کے بہت

حقوق ہیں۔ بہت سے لوگ ان حقوق کو بھی تلف کرتے ہیں اور وہ حقوق یہ ہیں ، وسعت کے موافق ان کو کھانے پہننے کو دینا اور دین کا راستہ سکھانا بعض تو کھانے پہننے کو نہیں دیتے یا تنگی کرتے ہیں بیوی کو چھوڑ کر کسی کا کنجڑی سے تعلق ہے کسی کا بھنگن پر دل آگیا ہے اس پر مرتے ہیں نہ تمیز ہے کہ اپنی نسل خراب ہوتی ہے۔ نہ یہ خوف کہ بدنامی ہے۔ سب سے پردہ پڑ گیا اور ظلم پر کمر باندھ لی۔

میں ظلم سے بچنے کا ایک قاعدہ۔ بلکہ اس کو مراقبہ کہنا چاہیے۔ بتاتا ہوں: جو شخص کسی پر ظلم کرنے میں مبتلا ہو وہ یہ سوچے کہ اگر میں بجائے اس کے ہوتا اور یہ بجائے میرے، تو کیا میں اپنے ساتھ ایسے معاملہ کو پسند کرتا۔ پس یہ شخص جس معاملہ کی دوسروں سے اپنے لیے خواہش رکھتا ہے وہی معاملہ اس کو اپنے ماتحتوں سے کرنا چاہیے اور سمجھے کہ حق تعالیٰ کو یہ قدرت ہے کہ جس منصب اور مرتبہ کی وجہ سے میں اس پر زیادتی و ظلم کرتا ہوں اس کو مجھ سے چھین لے۔ حق تعالیٰ جس سے چاہیں جب چاہیں، جو نعمت چاہیں سلب کر لیں۔ کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ان کی شان ہے۔ لوگ آج کل اخبار اور تاریخیں دیکھتے ہیں۔ صرف مجلس آرائی کے لیے، واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ حالت بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی اس لیے ڈرے اور سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ مجھ کو ایسا ہی ذلیل بنا دیں، جیسے یہ شخص ہے جس پر ظلم کر رہا ہوں۔

اول تو جب زندہ نظیریں اور سینکڑوں واقعات نظروں کے سامنے ہیں تو اس کو فرض کرنا کیا مشکل ہے۔ نہ سوچ سکنا کیا معنی۔ مگر خیر اس کو بھی جانے دیجئے۔ آپ اس کو سمجھیے کہ خدا تعالیٰ سے تو سب چھوٹے ہیں اور جتنا میرا اس پر

Scanned with CamScanner

زور ہے خدا تعالیٰ کو اس سے زیادہ مجھ پر قدرت ہے اور جتنا یہ میرا مجرم ہے اس سے زیادہ میں خدا کا مجرم ہوں۔ جب حق تعالیٰ باوجود قدرتِ کاملہ اور میرے اُن جرائم کے دیکھنے کے عفو فرما رہے ہیں اور درگزر کرتے ہیں اور فوری سزا نہیں دیتے ہیں تو مجھ کو بھی چاہیے کہ کم از کم اس پر ظلم تو نہ کروں اور بہتر تو یہی ہے کہ بالکل ہی اس سے درگزر کروں۔ اُمید ہے کہ حق تعالےٰ اس کی برکت سے مجھ کو بالکل ہی معاف فرما دیں۔

اپنے اہل کے ساتھ بہت دلجوئی اور اچھے برتاؤ سے رہیں۔ اس سے ہنستا بولتا رہے اور کسی طرح کا اس پر ظلم نہ کرے اور خدا سے ڈرتا رہے۔ خدا تعالیٰ کو اس پر قدرت ہے کہ کسی وبال میں مبتلا فرما دیں۔ کوئی مقدمہ قائم کرا دیں کسی سخت مرض میں مبتلا کر دیں۔ کسی حاکم ظالم کو اس پر مسلّط کر دیں اور ظلم کا اکثر وبال دنیا ہی میں پڑتا ہے۔ اُممِ سابقہ میں تو ہاتھ کے ہاتھ کھلّم کھلّا وبال آجاتا تھا۔ اس اُمت پر حق تعالیٰ کی یہ رحمت ہے کہ کھلّم کھلّا سزا نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس میں رسوائی ہے۔ ہاں درپردہ ہوتی ہے کہ جس سے ظاہر بین اہلِ دنیا یہ نہیں سمجھتے کہ یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے بلکہ اسبابِ ظاہرہ کی طرف اس کو مضاف کرتے ہیں لیکن واقع میں وہ اس کے ظلم کی سزا ہوتی ہے۔ بخصوص جبکہ وہ مظلوم بد دعا بھی کرے۔ کیونکہ مظلوم کی بد دُعا بہت جلدی قبول ہوتی ہے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن　　اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

حتیٰ کہ کافر پر بھی اگر کوئی ظلم کرے اس کی بھی بد دُعا قبول ہوتی ہے۔

ایک ظلم بیوی پر اور بھی ہوتا ہے جس میں دینداری کے مدعی بکثرت مبتلا ہیں وہ یہ کہ جو کچھ کماتے ہیں ماں باپ کی نذر کر دیتے ہیں اور بیوی کو ان کا دستِ نگر رکھتے ہیں اور ماں باپ بھی بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اس کی خبر گیری نہیں کرتے

اور بیوی الگ رہنا چاہے تو الگ نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ گھر کی ہوا نکل جائے گی۔ پرانی بوڑھیوں کے زیادہ تر ایسے ہی خیالات ہیں۔ یاد رکھو حق تعالیٰ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں۔ اگر بیوی الگ رہنا چاہے تو الگ رکھنا اس کا حق اور ضروری ہے بلکہ اس زمانہ میں تو اس میں مصلحت ہے کہ الگ رہیں شامل رہنے میں بہت فساد ہیں۔ یہ پرانی عورتیں اکثر بہوؤں کو بہت ستاتی ہیں اور عجیب بات ہے اگر بیٹا بیوی کی طرف ملتفت ہوتا ہے تو اس سے بھی جلتی ہیں اور اگر ملتفت نہ ہو تو نمک پڑھواتی پھرتی ہیں۔ تعویذ کراتی ہیں۔ الگ رہنے میں ان سب بکھیڑوں سے نجات ہے۔

اور اگر یہ کہو کہ بہوویں آجکل نالائق ہوتی ہیں۔ ساسوں سے لڑتی ہیں، دق کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ ان کو الگ کر دو۔ غرض علیحدہ رہنے میں طرفین کو راحت ہے۔

یہ تو بیوی کے حقوق کا ذکر تھا۔ بعض لوگ ماں باپ کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں اور بیوی کی جانب داری کرتے ہیں۔ اس کی اصلاح بھی میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ الگ رہیں کہ ایسے معاملات ہی نہ ہوں جس میں جانب داری کی نوبت آئے۔

بعضے خاص مظالم ہیں کہ قدرتِ معتد بہا پر موقوف ہیں اور یہ وہ ظلم ہے جس میں رئیس اور زمیندار لوگ زیادہ تر مبتلا ہیں۔ قلی کا حمال کا گاڑی بان کا کچھ عوض مقرر نہیں کرتے۔ جب کام لے لیتے ہیں تو ایک مقدار خاص دے کر کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ بس اس سے زیادہ نہ ملے گا۔ یہ صریح ظلم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بعض الباب زمینداری کے ابوابِ جہنم ہیں۔ اِدھر دروازہ بند ہوگا، اُدھر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا نظر آنے لگے گا اور وہاں نہ کوئی حمایتی ہوگا، نہ وکیل ہوگا، نہ بیرسٹر۔ اور جبکہ

گورنمنٹ کے سامنے رعایا کا زور نہیں چلتا تو خدا تعالیٰ کے سامنے تو کس کا زور چلے گا، آخر یہ دن بھی تو آنے والا ہے اور بہت قریب ہے اور جب سے پاپک صاحب آتے ہیں اس وقت سے تو وہ دن ہر وقت پیش نظر ہے گویا ذہما برزخ ہو رہی ہے۔

بعض امرا اور زمیندار کمینوں اور ملازموں سے بے تکے کام لیتے ہیں کہ جو کہ وہ مشکل سے متحمل ہوتے ہیں۔ یہ بھی ظلم ہے۔ خود آدمی اپنے اُوپر خیال کرے کہ یہ کام مجھ کو کس قدر ثقیل ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ کوئی کام ایسا نہ کرے جس سے کسی کو اذیت ہو یا کسی کے دل پر بوجھ پڑے۔

میں نے ایک رسالہ آداب المعاشرت لکھا ہے۔ اس میں معاشرت کے متعلق جس قدر حقوق کا استقرا ہو سکا ہے ضبط کیا ہے اور ظلم کی سب صورتیں محبت نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت نہیں ہے۔ محبت پیدا کرنے کی کوشش کیجیے اور جس کے ساتھ محبت نہ ہوتی ہو اس کے ساتھ احسان کیجیے اس کو تم سے محبت ہو گی۔ پھر تم کو بھی اس سے محبت ہو جائے گی اور آپس میں اس کا خیال رکھو کہ کسی کو کسی سے کوئی نقصان کوئی تکلیف نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اس حدیث پر عمل ہو کہ مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کے ہاتھ سے اور زبان سے محفوظ رہیں۔ اور اس طرح زندگی بسر کرو گے تو تمہارے بعد بھی تمام عمر تم کو یاد کر کے رویا کریں گے۔ کسی شاعر نے کیا اچھا کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقت زادنِ تو	ہمہ خنداں بدند و تو گریاں
آنچناں زی کہ وقت مردنِ تو	ہمہ گریاں بوند تو خنداں

(الظلم صفحہ ۱۲-۲۴)

استیذان

شریعت میں گرانی یا ایذا رسانی کا سخت انتظام کیا گیا ہے۔ اس لیے استیذان کا حکم ہے کہ بدون اجازت کے گھر میں یا خلوت گاہ میں داخل نہ ہو۔ کیونکہ اس سے گرانی اور کلفت ہوتی ہے اور استیذان کا طریقہ یہ ہے کہ اوّل باہر کھڑا ہو کر سلام کرے، پھر اجازت مانگے۔ اجازت خواہ عربی میں مانگے یا اردو میں، خواہ دلی کی زبان میں یا لکھنؤ کی زبان میں۔ مگر سلام کے الفاظ شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ جیسے بعض جگہ آداب و تسلیمات کا رواج ہے ایک شخص نے لطیفہ کیا کہ ایک مجلس میں جا کر کہا کہ میرا بھی سجدہ قبول ہو۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا واہیات ہے۔ کہا حضور ہر آنے والا شخص مختلف الفاظ سے سلام کر رہا ہے۔ کوئی آداب قبول ہو کہتا ہے، کوئی بندگی، کوئی کورنشات، کوئی کچھ حتیٰ کہ سب صیغے ختم ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اب میں کیا کہوں تو میرے نزدیک سجدہ کے سوا کوئی صیغہ باقی نہ تھا اس لیے میں نے اسی کو اختیار کیا پس سلام میں خلافِ شرع الفاظ استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ہاں اجازت حاصل کرنے کیلئے جو لفظ چاہے کہو اختیار ہے، مگر ایسا لفظ کہو جس سے دوسرے کو معلوم ہو جائے کہ اجازت مانگ رہا ہے۔ (وعظ: الارتباط)

انضباطِ اوقات اور اسلام

انضباطِ اوقات شریعت کا مسئلہ ہے۔ شمائل ترمذی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم اوقات کے متعلق ایک حدیث مشرح مذکور ہے کہ آنحضرتؐ جب گھر میں جاتے تھے تو اپنے وقت کے تین حصّے کرتے تھے۔ ایک حصّہ خدا کی عبادت کے لیے۔ ایک حصّہ گھر والوں کے لیے۔ ایک حصّہ خاص اصحاب کے لیے، اس وقت خاص اصحاب آکر تمام معاملات کی اطلاع حضورؐ کو کرتے تھے۔ کسی کی سفارش پہنچا دی، کسی کی حاجت کی خبر کر دی وعلیٰ ہٰذا۔ مگر اب مسلمان اس طریقہ سے ایسے

غیر ماؤس ہیں کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ مسئلہ اسلام کا ہے

(شعب الایمان صلا)

انضباط اور انتظام اوقات بڑی چیز ہے، یہ نہیں چاہئیے کہ ایک کام کے وقت دوسرا کام، دوسرے کام کے وقت تیسرا کام جس کام کا جو وقت مقرر ہو اس کو اسی وقت کرے، اس سے بڑی برکت وقت میں ہوتی ہے اور راحت ہوتی ہے۔

(حسن العزیز ج۲ ملفوظ ۴۳۴)

جو شخص آج کا کام کل پر ٹالتا ہے اس کو کبھی راحت نہیں ہو سکتی کیونکہ کل کے لیے دوسرا کام ہے، اس میں آج اور کل دونوں کا کام نہیں ہو سکتا۔

(دوا العیوب ص۱۹)

شریعت نے ہر چیز میں انتظام کی تعلیم دی ہے

فرمایا کہ ہماری شریعت مقدسہ نے ہر چیز میں انتظام کی تعلیم دی ہے دینی کاموں ہی میں نہیں بلکہ دنیوی کاموں میں بھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانے کی تعلیم کا ذکر ہے وہاں ان کو ارشاد ہے۔ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ یعنی زرہ کی کڑیاں اندازے سے برابر بناؤ۔ دیکھیے زرہ بنانے میں بھی تناسب کے اہتمام کی تعلیم فرمائی حالانکہ اگر تناسب نہ بھی ہو تب بھی زرہ سے جو مقصود ہے۔ وہ حاصل ہو سکتا تھا یعنی حفاظت۔

(ملفوظات ج۴ ص۵۸)

یہ ایک عام بات ہونی چاہیے کہ اگر کسی کو شاگرد بنائے چاہے علوم میں چاہے صنعت (فنون) میں حتیٰ کہ اگر روٹی ہی پکانا سکھائے۔ سب کو اصول اور قاعدہ سے سکھانا چاہیے۔ اگر بے ڈھنگے پن سے کام لیا تو اس کا اثر فن پر پڑے گا فن بدنام ہوگا۔

(ملفوظات ج۲ ص۱۸۴)

... دل میں مقصود ... سمجھانے پر بھی اثر نہیں ہوتا۔ پھر جب آدمی کو خود اپنی اصلاح کی فکر نہ ہو دوسرا کیا اصلاح کر سکتا ہے؟

(الملفوظات ج ۵ ص ۳)

میں کسی شخص سے جس کا دوسرے کے ساتھ ماتحتی کا تعلق ہو خود اپنے اثر سے کام نہیں لیتا۔ جو جس کا ماتحت ہے اس کی اجازت سے کام لیتا ہوں۔ گو وہ شخص جس کی اجازت حاصل کی جاتی ہے خود میرا ہی ماتحت ہو۔ اس سے انتظام میں گڑبڑ نہیں ہوتی ہے۔ (الملفوظات ج ۲ ص ۱۵۴)

سلیقہ کی کمی کا سبب بے فکری ہے

فرمایا کہ دنیا سے سلیقہ گم ہو گیا۔ نہ عربی خوانوں میں نہ رہا نہ انگریزی خوانوں میں رہا۔ بالکل ہی مفقود ہو گیا۔ اور کچھ نہیں صرف بے فکری کا غلبہ ہو گیا ہے۔ یہ سب اسی کے برکات ہیں۔ اپنی طبیعت پر سوچنے کا بوجھ نہیں ڈالتے کہ دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ (الملفوظات ج ۵ ص ۲۸)

بے فکری اور بد انتظامی کا انجام

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ آپ ... اقوال ... کر

بے فکری اور بد انتظامی کے معنی بے فکری کے معنی ہیں کہ سوچے نہیں کر انجام کیا ہوگا۔ اور بد انتظامی کے معنی ہیں کہ دیکھے نہیں کہ آمدنی کیا ہے اور خرچ کیا ہے۔ بے سوچے خرچ کرے۔

اُصول و قواعد کی برکت ایک مولوی صاحب کے جواب میں فرمایا اصول و قواعد سے ہر کام ہو جاتا ہے اور کوئی گرانی نہیں ہوتی نہ کوئی حرج ہوتا ہے۔ یہ ہے اصول اور قواعد کی برکت اور ضرورت۔ مگر یہ سب باتیں فکر سے ہوتی ہیں۔ ساری خرابی بے فکری سے ہوتی ہے۔ میں لوگوں میں فکر کی عادت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ لوگ بھاگتے ہیں، گھبراتے ہیں۔ مگر کام تو کام ہی کے طریقہ سے ہوتا ہے۔ اب تو عام طور پر حالت اس مقولہ کے مصداق ہو رہی ہے کہ اوت کا اوت نہ آپ چلے نہ اور کو چلنے دے۔ نہ آپ کام کریں اور نہ دوسرے کو کرنے دیں، کوئی کرے تو اس پر طعن کریں۔ (ملفوظات ع۲ صد ۱۸۶)

فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے سب دوست صحیح اصول پر ہوں۔ اگر ان کو اہتمام میں لگا دیکھتا ہوں تو معمولی غلطیوں سے درگزر کرتا ہوں زیادہ ناگواری اس وقت ہوتی ہے جب کسی کو "بے فکر" دیکھتا ہوں۔

(الافاضات۔ ملفوظ ع۵۹۵)

فرمایا کہ مجھ کو ڈاک کا بڑا اہتمام ہے کہ روز کے روز فارغ ہو جاؤں۔ اس میں طرفین کو راحت ہوتی ہے۔ اِدھر تو میں فارغ مجھے راحت۔ اُدھر خط کا جواب پہنچ جائے اُس کو راحت۔ علاوہ اس کے دُور دراز سے خطوط آتے ہیں جن میں نئی نئی ضروریات ہوتی ہیں اس لیے روزانہ ڈاک نمٹا دیتا ہوں۔ اپنی طرف سے اس کا اہتمام رکھتا ہوں کہ دُوسرے کو تکلیف نہ ہو اور انتظار کی تکلیف تو مشہور ہے۔

(ملفوظات ع۱ صد ۱۴۱)

گناہ گار کو ذلیل کرنا یا ذلیل سمجھنا تکبر ہے

فرمایا کہ ایک صاحب کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ ایک عورت ہے جو بے پردہ ہے۔ بھنگی چماروں تک کے سامنے آتی ہے اور آوارہ پھرتی ہے اور خاوند بھی ایسا ہی ہے۔ اس عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا کیسا ہے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ جب کافر کے ہاتھ کا کھانا جائز ہے تو وہ تو مسلمان ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ باعتبار فتوے کے کیا حکم ہے اور باعتبار تقوے کیا حکم ہے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ کسی متقی سے پوچھو۔

اس پر فرمایا کہ خود تو کوئی کام خلافِ شرع کرتے ہی نہیں معلوم ہوتے۔ جُنیدِ وقت معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خنّاس لوگوں کے دماغوں میں بھرا ہے۔ فتویٰ حاصل کرکے دُوسرے مسلمانوں کو ذلیل سمجھنا یا ذلیل کرنا مقصود ہے۔ سو میرے جواب سے بحمداللہ اس قسم کی گنجائش نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ میرے جواب سے خوش نہیں ہوتے بلکہ پچھتاتے ہیں کہ فضول ڈھائی آنے بھی کھوئے۔ ان متکبرین کی یہ حالت ہے کہ دوسروں پر تو اگر مکھی بھی بیٹھ جائے تو اعتراض اور اپنے کیڑے پڑے ہوئے ہیں ان کی خبر نہیں، مگر یہاں پر ایسے متکبروں کا اللہ کے فضل سے خوب دماغ درست ہوتا ہے۔ (الافاضات ج ۶ ص ۲۲۳)

چندہ پر شکریہ بے محل ہے

فرمایا کہ آجکل جو یہ رواج ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مصرفِ خیر میں کچھ روپیہ (بطور چندہ) دیتا ہے تو کھڑے ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ بالکل بے موقع ہے۔ ہم کو ایسے موقع پر اس (دینے والے) کے لیے دُعا سکھلائی گئی ہے۔ شکریہ ایسے موقع پر بالکل بے محل ہے۔ شکریہ تو جب ادا کیا جائے جبکہ اُن کو کوئی کچھ دے۔ شکریہ ادا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے۔ یا یہ شخص (شکریہ ادا

کرنے والا) یہ سمجھتا ہے کہ اسلام میرا ہے، دوسرا مسلمان ہی نہیں۔ یہ اہل یورپ کی تقلید ہے کہ وہ اپنے جلسوں میں شکریہ ادا کرتے ہیں تو ان کی دیکھا دیکھی یہ بھی ایسا ہی کرنے لگے۔

تقریر پر تالیاں بجانا ہماری تہذیب نہیں

اب تو ہر کام انہیں کے طریقہ پر کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کسی کی تقریر میں جب کوئی مضمون پسند آتا ہے تو اس پر تالیاں بجاتے ہیں حالانکہ تالیاں تو اہانت کے موقع پر بجائی جاتی ہیں۔ یہ اچھی تہذیب ہے۔ تہذیب کیا تعذیب ہے۔ ہماری تہذیب اس موقع پر یہ ہے کہ سبحان اللہ کہیں بلکہ سب سے بڑھ کر تہذیب تو یہ ہے کہ کچھ بھی نہ کہیں۔ اس لیے کہ خاموش رہنے میں جو سماں پسندیدگی کا چہروں اور قلب سے اور جوش نہاں سے معلوم ہوتا ہے اظہار میں وہ لطف نہیں ہوتا خصوص جبکہ وہ اظہار بھی تصنّع سے ہو جیسا اب ہوتا ہے کہ زبان سے تو اظہار خوشی کا ہو رہا ہے لیکن دل میں کچھ بھی نہیں تو اس اظہار کا کیا اعتبار بڑی چیز تو دل سے رغبت اور قدر کرنا ہے خواہ زبان سے کچھ بھی نہ کہے متکلم کی بشاشت کے لیے (بھی) بس رغبت سامعین کی کافی ہے زبانی مدح کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً جب غیر مسلم کے طریق پر ہو۔ جیسا شکریہ کا ایک طریق شائع ہو رہا ہے جو محض تقلید ہے یورپ کی۔ ہاں سنّت ایسے مواقع میں یہ ہے کہ دُعا دی جائے۔ (اشرف المواعظ (التخلط ص ۶۴)

کھانے کی قدر کرنا چاہیے

صاحبو! کھانا پینا بھی خدا کی بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر کرنا چاہیے۔ بعض لوگ ناک مار کر

ربنا کے ساتھ یوں بھی فرماتے غَیْرَ مُوَدَّعٍ وَّلَا مَکْفُوْرٍ وَّلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا کہ اے اللہ میں کھانے کو رخصت نہیں کرتا نہ اس کی بے قدری کرتا ہوں اور اے پروردگار میں اس سے مستغنی بھی نہیں ہوں (بلکہ دوسرے وقت پھر اس کا محتاج رہوں گا)

جھوٹے درویش آجکل درویشوں کی یہ حالت ہے کہ مریدوں کے سامنے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں کہ ہم کو جنّت کی کیا پرواہ ہے، دوزخ کی کیا پرواہ ہے۔ ارے تم کو روٹی تک کی تو احتیاج ہے۔ ذرا دو دن کھانے کو نہ ملے تو ساری پیری اور مشیخت رکھی رہ جائے مگر باتیں بنانا سیکھ لی ہیں اس لیے جو منہ میں آیا بک دیا۔

ایک درویش کانپور میں میرے پاس آئے اور دس روپے مانگے۔ اس کے بعد وہ لگے تصوّف کی باتیں کرنے اور اس کے ساتھ ہی دعویٰ بھی کرنے لگے۔ کہ ہم کو نہ جنّت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کی۔ میں نے کہا شاہ صاحب ہوش کی باتیں کرو۔ تم نے جنّت کو دیکھا نہیں ورنہ ایسی بے پروائی ظاہر نہ کرتے۔ تم سے دس روپوں کے بغیر تو صبر نہیں ہوتا جنّت کو دیکھ کر ضرور صبر کر لیتے۔

(وعظ: العشر)

قرض دو تو لکھ لیا کرو آیت مدیونیت (قرض کے لین دین) سے زیادہ کوئی آیت رحمت کی نہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے حفاظت مال کے طریقے بتلائے ہیں کہ جب کسی کو قرض دیا کرو تو لکھ لیا کرو اور دو آدمیوں کو اس پر گواہ کر لیا کرو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو ہمارا نقصان بھی گوارا نہیں۔

میّت کا ورثہ مشترک ہوتا ہے تو سنئیے حکم شرعی یہ ہے کہ میّت کا کل ترکہ مشترک ہے۔ درمیان ورثہ کے اور مشترک مال کو بلا اجازت دیگر شرکاء کے صرف کرنا جائز نہیں پس ترکہ میں ایک کُرتا یا

پاجامہ حتیٰ کہ ٹوپی، کمر بند، رومال بلکہ سوئی تک بھی قبل از تقسیم بلا رضامندی سب ورثاء کے کسی کو دینا جائز نہیں۔

لباس میں بیجا انہماک

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک انگریزی تعلیم یافتہ صاحب یہاں پر آئے تھے چند روز مقیم ہو کر واپس ہو گئے۔ حالت یہ تھی کہ صبح سے شام تک کئی کئی مرتبہ لباس بدلتے تھے۔ وطن پہنچ کر یاد نہیں کسی مضمون کا خط لکھا میں نے اس کا جواب دیا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ آپ یہاں پر زمانہ قیام میں اس شعر کے مصداق تھے ؎

گہے در کسوت لیلیٰ فرو شد

گہے در صورتِ مجنوں بر آمد

پھر خط آیا کہ واقعی یہ میری حرکت قابلِ تعزیر تھی۔ اب میں نے اس طرز سے توبہ کر لی ہے۔ (۲۶ محرم الحرام ۱۳۵۱ھ)

خوش لباسی سبب معصیت ہے

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ سب تجربہ کی باتیں ہیں۔ ایک تجربہ کار کا قول ہے کہ جب کوئی اچھے کپڑے پہنے گا تو یہ خیال ضرور ہوگا کہ کوئی اچھا آدمی مجھے دیکھے، مطلب یہ کہ کوئی حسین عورت وغیرہ مجھ کو دیکھے تو یہ خوش لباسی صاحبِ نفس کے لیے محرک ہے معصیت کا۔

(الافاضات ج۲، ص۳۲، ملفوظ ۹۸)

تعظیم کمال کی ہوتی ہے نہ کہ لباس کی

علی حزیں شاعر کے پاس ایک شخص آیا لباس سے شان و شوکت ٹپکتی تھی۔ علی حزیں سمجھا کہ شاید کوئی تعلیم یافتہ مہذب شخص ہے۔ یہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کی خاطر سے پاؤں سمیٹ لیے جب بات چیت شروع ہوئی علی

حزیں نے اس سے نام پوچھا۔ کہا ایسف (بجائے یوسف) ملی حزیں نے یہ سنتے ہی پاؤں پھیلا دیے اور کہا کہ بابا اگر تو ایسف ہستی من پائے خود را چرا کشم کہ اگر تم ایسف ہو تو میں اپنے پیر کیوں سمیٹوں۔ غرض وہ ایک ہی لفظ سے سمجھ گیا کہ طالب محض جاہل ہے اور اسی وقت سے تعظیم قطع کر دی۔ کیونکہ تعظیم تو کمال کی ہوتی ہے۔ لباس کی تعظیم نہیں ہوا کرتی۔ اور اہلِ دنیا کی جو تعظیم لباس کی وجہ سے کی جاتی ہے اس کا منشا عظمت نہیں بلکہ خوف ہے جیسے سانپ کو دیکھ کر لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لباس یا وضع سے یا اہلِ دنیا کے طرزِ گفتگو سے عزت کا طلب کرنا انسان کا کام نہیں اور یہ تو نہایت ہی بھدا پن ہے کہ لباس سے کسی کی قدر و قیمت پر استدلال کیا جائے۔

(وعظ: الرحیل ع۱)

سادہ معاشرت نہ رکھنے کی وجہ فرمایا کہ سادگی میں بڑی حلاوت ہے۔ جی سب کا چاہتا ہے کہ سادہ معاشرت رکھیں مگر تکبر کی وجہ سے اور ذلت کے خیال سے نہیں رکھ سکتے۔

(حسن العزیز ع۱ ص۳۷)

وضعداری میں غلو کبر ہے وضعداری میں غلو بھی کبر ہے۔ وضع کیا چیز ہے قطع کیا چیز ہے اور آن کیا چیز ہے؟ یہ سب شیطانی دھندے ہیں۔ اپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لیے خاص وضع مقرر ہو۔ بندے کا حق تو ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اسی میں رہے، ان کے سامنے اپنی رائے اور ارادہ کو بالکل فنا کر دے (انفاس عیسیٰ ص۱۵۲)

مسلمان کی وضع تو اتباعِ احکام ہے۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص۶۳)

سادگی غلو اور عظمت کی دلیل اور بناؤ سنگھار پست خیالی سلاطین کی خوبیوں سے اس کو تو شمار

کیا گیا ہے کہ وہ سادہ لباس پہنتے تھے، مگر مورخین نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ سو روپیہ گز کا کپڑا پہنتے تھے۔ یہ سادگی، علو اور عظمت کی دلیل ہے (میں جب کسی کو بنا ٹھنا دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ نہایت پست خیال شخص ہے۔ اگر بلند ہمت ہوتا تو اس کی اس کو فرصت ہی نہ ملتی۔) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں (ہرقل اپنی جگہ ٹھہرا رہا ہے اور کسریٰ اپنی جگہ) ہرقل کا بھیجا ہوا سفیر مدینہ آتا ہے اور اہلِ مدینہ سے دریافت فرماتا ہے کہ قصرِ خلیفہ کہاں ہے؟ وہ نہ قصر تھا نہ کچھ۔ حضرت ان کی شان اور شوکت بدون بنے ٹھنے ہی ہوتی ہے۔

هیبتِ حق است ایں از خلق نیست

هیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

(الافاضات ج۲ ص۷۰-۱۶۹ ملفوظ ۲۹۲)

شوہر کے مال میں تصرف

بعض عورتیں رقمیں جوڑ جوڑ کر خاوند سے چھپا کر اپنے گھروں کو بھرا کرتی ہیں۔ کسی بہانہ سے باپ کو دے دیا یا کسی بہانہ سے ماں کو دے دیا۔ یہ سخت گناہ ہے۔ مرد کے مال میں عورت کے عزیزوں کا شرعاً کوئی حق نہیں۔ اگر دینا ہے تو مرد سے پوچھ کر دینا چاہیے..... خاوند جو مال عورت کو بالکل بطور ملک کے دے ڈالے اس میں سے تو بلا اجازت عورت کو صرف کرنا جائز ہے اور جو مال اس کو ہبہ نہ کرے بلکہ گھر کے خرچ کے واسطے دے یا جمع رکھنے کے لیے اس میں بلا اجازت صرف کرنا ہرگز جائز نہیں حتیٰ کہ سائل کو دینا بھی جائز نہیں۔

افعال و اقوال کا حسن و قبح

ہر فعلِ اختیاری کسی نہ کسی غایت کے لیے

معلوم نہ ہو وہ فضول ہے اور غایت معلوم ہو مگر مفید نہ ہو وہ بھی فضول ہے اور اگر وہ غایت کوئی ضرر ہو۔ لازم یا متعدی تو وہ کام مضر ہے۔ اس قاعدہ سے آپ کو اپنے افعال و اقوال کا حسن و قبح اور لغو یا مفید ہونا آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔

(جمال الجلیل ص۲۵)

ہر کام کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ یہ دین اور دنیا میں مضر تو نہیں۔ دیکھیے کتنی جلدی اصلاح ہوتی ہے۔

(کمالات اشرفیہ ص۳۰)

ادب کی تعریف

آجکل ادب نام رہ گیا ہے تعظیم کا۔ حالانکہ ادب ہے راحت کا اہتمام۔ اور جس چیز سے دوسرے کو تکلیف پہنچے اس کا نام ادب نہیں۔ یہ سب رسموں کی خرابیاں ہیں۔ ہمارے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سختی کے ساتھ منع فرمایا کرتے تھے کہ اپنی جگہ سے بیٹھے ہوئے میری تعظیم کے لیے مت اٹھا کرو۔ اس حالت میں یہی ادب تھا کہ نہ اٹھا جائے۔

(الافاضات ج۱۱ ص۱۹ ملفوظ ۱۶)

چھوٹے اور بڑوں میں بے لطفی کا سبب

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بڑے لطف کی بات ہے کہ چھوٹے تو یہ سمجھیں کہ ہم چھوٹے ہیں اور بڑے یہ سمجھیں کہ یہ چھوٹے نہیں کیسے لطف کی بات ہے اگر ایسا کریں تو بہت ہی راحت رہے۔

اب جو بے لطفی اور بے مزگی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ چھوٹے تو اپنے کو چھوٹا نہیں سمجھتے اور بڑے ان کو چھوٹا سمجھتے ہیں، پھر لطف کہاں، بے لطفی ہی ہو گی۔

(الافاضات ج۱ ص۸۰)

دوسرے خاندان کی طرف نسبت کرنے والا جنت کی خوشبو نہ پائے گا

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اپنے خاندان کو چھوڑ کر دوسرے خاندان کی طرف اپنی نسبت کرے گا وہ جنت کی

خوشبو نہ پائے گا۔ آج کل شہروں میں یہ مرض بہت شائع ہو گیا ہے۔ شہروں میں جا کر جولاہے بھی سید ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کابل سے ایک جولاہا ہندوستان آیا اور یہاں آکر پٹھان بن گیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک پٹھان آیا اس نے جو دیکھا کہ جولاہے نے اپنے کو پٹھان بنا رکھا ہے تو وہ سید بن گئے۔ اس کے بعد ایک سید صاحب آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہاں پٹھان نے اپنے کو سید بنا رکھا ہے تو آپ نے یہ کہنا شروع کیا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں (نعوذ باللہ) لوگوں نے اس پر ہنسنا شروع کیا تو سید نے کہا کہ جس ملک میں جولاہا پٹھان اور پٹھان سید بن جاتا ہے وہاں سید اگر خدا بن جائے تو کیا تعجب ہے۔ اس نے سب کی قلعی کھول دی۔ (وعظ الارتباط)

معاملات اور معاشرت دین سے خارج نہیں

معاملات اور معاشرت کو علی العموم لوگوں نے دین سے خارج سمجھ رکھا ہے، لیکن تعجب ہے کہ قانونِ خداوندی سے تو اپنے معاملات اور معاشرت کو مستثنیٰ سمجھ لیا اور گورنمنٹ کے قانون سے مستثنیٰ نہ سمجھا۔ کبھی کسی نے گورنمنٹ سے نہ کہا ہوگا کہ تجارت وغیرہ میں آپ کو کیا دخل ہے؟ آپ صرف امورِ انتظامِ سلطنت میں ہم سے باز پرس کیجیے۔ باقی یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔ ہم کو لائسنس وغیرہ کا مقید کیوں کیا ہے؟ کیا کوئی شخص ایسا کہہ سکتا ہے؟

(مضار المعصیۃ ص۱)

معاشرت جزوِ دین ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اصلاح معاشرت پر بھی آخرت کے ثمرے ملتے ہیں جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ احکام شرعیہ دین سے ہیں اور گو تم بالکل دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی تم کو اجر ملے گا وجہ دلالت ظاہر ہے کہ نسخت او ایسا امر پر جو کہ معاشرت میں سے ہیں، اجر آخرت کا وعدہ فرمایا۔ اس کے متعلق بعض اہل زیغ نے لکھا ہے کہ مولویوں نے شریعت کو طومار بنا دیا ہے کہ روٹی توڑنا بھی شریعت میں داخل، پانی پینا بھی شریعت میں داخل۔ اس پر مجھے ایک دردناک قصہ یاد آیا۔

ایک شخص نے ایک کتاب شعبِ ایمانیہ میں لکھی ہے۔ انہوں نے وہ کتاب میرے پاس اصلاح کے لیے بھیجی اور لکھا کہ میں نے یہ کتاب ایک عزیز کو بھی جو کہ وکالت کرتا ہے دکھلانے کے لیے بھیجی تھی اس نے لکھا کہ اگر یہ سب باتیں ایمان میں داخل ہیں تو ایمان (نعوذ باللہ) شیطان کی آنت ہوا۔ اور اس کلمہ کو نقل کر کے سخت افسوس اور رنج کا اظہار کیا تھا اور اس کے جواب میں اس مؤلف نے اس وکیل کو جو خط بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ بھی میرے پاس اصلاح کے لیے بھیج دیا تھا میں نے لکھا اختیار ہے جواب بھیج دو لیکن یہ شخص بالکل مسخ ہو چکا ہے اس لیے نفع کی ہرگز اُمید نہیں۔ یہ مخاطبت سے رو براہ ہونے والا نہیں ہے اس کا اصلی جواب یہی ہے کہ اس کو خدا کے حوالہ کیا جائے۔ اگر کمبخت کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ ایمان کے شعبے ہیں تو اس مضمون کو کسی مہذب پیرایہ میں لکھ سکتا تھا لیکن خبیث رُوح کی خباثت تہذیب کی کیسے اجازت دیتی؟ اصل یہ ہے کہ جب تک علم یا اہل اللہ کی صحبت نہ ہو ایمان کا بھی بھروسہ نہیں۔ دیکھیے جہل سے کیا کلمہ کفر بک دیا۔ کیوں صاحب! بتلائیے اگر اس شخص کی تکفیر جائز نہیں تو اسلام میں کفر داخل ہے! لوگ کہتے ہیں کہ مولوی کافر بنا دیتے ہیں۔ صاحبو! انصاف شرط ہے۔ یہ کافر بنانے کی نسبت تو مولویوں کی طرف اس وقت ہو سکتی تھی جب کہ وہ کسی کلمۂ کفر یا عمل کفر کی تلقین

کرتے اور جبکہ یہ لوگ خود ہی اپنی جہالت اور خباثت سے کفر کرتے ہوں تو مولوی
نے کب بنایا یہ تو خود بنے۔ البتہ مولوی اس کو بتا دیتے ہیں بس ایک نقطہ کا
فرق ہے۔

غرض اس قسم کے لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ معاشرت دین کا جزو نہیں
اور ان کے رد کے لیے یہ آیت بالکل کافی ہے دو طور پر۔ ایک تو یہ کہ ان دونوں
حکموں میں امر کا صیغہ آیا ہے جو کہ اصل میں وجوب کے لیے ہوتا ہے اور یہاں
کوئی صراحت اصل سے نہیں۔ دوسرے اس طرح کہ اس پر ثواب کا وعدہ کیا
اور ثواب ہوتا ہے دین کے کام پر پس اس میں اشارہ اس طرف ہوا کہ جس امر
کو تم دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی اگر امتثالِ امر کرو گے تو اس پر بھی ثواب کا ثمرہ مرتب
ہوگا اور اس سے اطاعت کی فضیلت بھی معلوم ہو گئی کہ اگر ادنیٰ امر میں بھی اطاعت
ہو تب بھی ثمرے سے خالی نہیں۔ (وعظ فضل العلم والعمل)

○

خدمتِ خلق

خدمتِ خلق کی اہمیت جہاں اور کام دین کے ضروری ہیں یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچایا جائے جس قدر اپنے سے ہو سکے بے پروائی نہ کریں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، ولا تنسوا الفضل بینکم کہ آپس میں احسان کو مت چھوڑو۔ اور جن لوگوں کو دوسروں کی فکر نہیں وہ جانور ہیں۔ یہ جانور کا خاصہ ہے کہ ایک کو مرا ہوا دیکھ کر بھی بے فکری سے کھیت کھاتا رہتا ہے۔

(مواساۃ المضامین ص۔)

خدمتِ خلق کا مفہوم خدمتِ خلق سے مراد ہے بغیر کسی اجرت یا صلہ کے مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا۔

خدمتِ خلق کا جذبہ اور تمام جذبات کی طرح خدمت خلق کا جذبہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے۔ یہ جذبہ کم و بیش سب انسانوں میں ہوتا ہے۔ کسی میں بہت وسیع پیمانہ پر کہ وہ تمام قوم کی خدمت کو بلکہ تمام دُنیا کی خدمت کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور کسی میں محدود پیمانے پر کہ وہ صرف اپنے خاندان کی خدمت کرتا ہے یا خاندان کے چند افراد کی خدمت کو اپنا لیتا ہے۔

خدمت خلق بہت عظیم اخلاق اور ایثار طلب ہے خدمتِ خلق کا جذبہ انسان سے بہت ایثار کا طالب ہوتا ہے۔ انسان اپنے آرام کو چھوڑ کر اور قیمتی وقت سے صرف نظر کر کے کسی کی خدمت

میں مصروف ہو، یہ بہت بڑی قربانی ہے۔ اس کی توقع اسی انسان سے ہو سکتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بہت عظیم اخلاق عطا کیا ہو۔

خدمت خلق کے حدود

اسلام نے اس جذبہ کی حدود بھی مقرر کی ہیں اور حد یہ ہے کہ خدمتِ خلق میں اپنے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچے یعنی ایسی خدمتِ خلق جو جس میں حدود سے تجاوز ہو۔ اسلام مذموم قرار دیتا ہے فرمایا کہ ایسی خدمتِ خلق جس میں اپنے دین کا ضرر ہو مذموم ہے۔ اپنی ذاتی احتیاج پر دوسروں کے نفع کو مقدم کرنا محمود اس وقت ہے جبکہ اپنے دین کا ضرر نہ ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص۳۷)

قوم کا ہمدرد

لوگ اس میں بھی سخت غلطی کرتے ہیں کہ قوم کے افراد امراء کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ غرباء شمار میں زیادہ ہیں تو قوم غرباء کا نام ہوگا، قومی ہمدرد وہی ہو سکتا ہے جو غرباء کے ساتھ ہمدردی کرے۔ (دین و دنیا ص۳۶)

قرض دینے کا ثواب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور قرض دینے سے اٹھارہ۔ آپ نے حضرت جبریل سے وجہ پوچھی تو انھوں نے فرمایا قرض وہی مانگتا ہے جسے سخت حاجت ہوتی ہے (کیونکہ اسے واپس کرنا پڑتا ہے) بخلاف صدقہ کے (کہ واپس نہیں کرنا پڑتا اس لیے بے ضرورت بھی لوگوں سے مانگ سکتے ہیں) غرض قرض دینے کا اتنا بڑا ثواب ہے (کہ خیر خیرات کا نہیں)

پرانے مال کا صدقہ کرنا

پرانے کپڑے اور جوتے کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے نہ دیا جائے بلکہ اعانت غریب کی نیت سے

صدقہ دیا جائے تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نہ کرو چاہے اللہ تعالےٰ ثواب بھی دے دیں۔ خوب سمجھ لو۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (حدیث میں) مراد اس سے وہ پرانا (کپڑے جوتے وغیرہ) ہو جو ردی کے درجہ تک پہنچا ہو (یعنی بالکل نکمانہ ہو گیا ہو)

امر بالمعروف | خوب یاد رکھو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بھلائی (معروف) کا حکم اور برائی (منکر) کی ممانعت (آپس میں ایک دوسرے کو) ضرور ضرور کرتے رہو اور ظالم (کو ظلم کرتے دیکھو تو اس) کا ہاتھ (جہاں تک ہو سکے) ضرور پکڑ لو اور اس کو ظلم سے روک کر) حق کی طرف پھیر کر اس کا پابند کر دو ورنہ تمہارے دلوں کو بھی اللہ تعالےٰ ایک دوسرے پر مار دے گا (یعنی سب ہی کے دلوں میں ظلم وجور معاصی ومنکرات کے ارتکاب کی یکساں قساوت پیدا کر دے گا) پھر تم کو بھی اسی طرح لعنت زدہ یا راندۂ درگاہ کر دے گا جس طرح بنی اسرائیل کو کر دیا۔

(حدیث شریف)

Scanned with CamScanner

زندگی و صحّت

زندگی و صحّت کی اہمیت حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ آیا آپ کو یہ پسند ہے کہ آپ بچپن میں انتقال کر جاتے اور جنّت یقینی ملتی۔ یا یہ پسند ہے کہ بالغ ہو کر خطرہ میں پڑے۔ فرمایا کہ بالغ ہو کر خطرہ میں پڑنا پسند ہے۔ اگر بچپن میں انتقال ہو جاتا تو اس وقت معرفت تو حق تعالیٰ کی نہ ہوتی۔ اب گو خطرہ میں ہیں لیکن معرفت تو حق تعالیٰ کی نصیب ہوئی۔ آگے جو محبوب کی مرضی ہو۔ واقعی زندگی بڑی قدر کی چیز ہے ؎

عمر عزیز لائق سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چنداں دراز نیست

اسی واسطے میرے نزدیک صحّت کی حفاظت ضروری ہے۔ چاہے توفیق اعمالِ نافلہ کی بھی نہ ہو لیکن جب راحت اور آرام میں رہے گا تو محبت تو حق تعالیٰ کے ساتھ پیدا ہوگی۔ اور انسان عبدِ احسان ہے جب مشاہدہ کرے گا کہ مجھے چین دیا، آرام دیا، ضرور کشش پیدا ہوگی۔ (کمالات اشرفیہ صـ ۲۱۴)

زندگی بڑی قدر کی چیز ہے ؎ بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت
کنارِ آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ را

اعمال جن سے درجات بڑھتے ہیں جنّت میں کہاں میسّر ہوں گے۔ یہ اس زندگی میں میسّر ہو سکتے ہیں۔ واقعی یہ زندگی بڑی قدر کی چیز ہے ؎

عمر عزیز لائق سوز و گداز نیست
این رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

(حسن العزیز ج ۱ صفحہ ۱۵۰)

صحت و حیات کی حفاظت

جس آرام کی اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہیے۔ صرف یہ خیال رکھے کہ انہماک نہ پہنچنے پائے باقی اپنے اوپر سختی نہ ڈالے۔ مثلاً غلبہ نیند کا ہے سو رہے اس کے خلاف کرنے سے بعضے لوگ مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بعضے لوگ مجنون ہو گئے۔ بعضے مر گئے۔ صحت و حیات کی بڑی حفاظت رکھنی چاہیے۔ یہ وہ چیز ہے کہ پھر کہاں میسر؟

(کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۱۴)

حفظ صحت کی تحصیل مستحب سے مقدم ہے

حفظِ صحت کی مصلحت کسی مستحب کی تحصیل سے مقدم ہے مثلاً صبح کی ہوا خوری کے لیے جنگل کی طرف جانا مسجد میں اشراق کی نماز کے لیے تا طلوعِ آفتاب بیٹھے رہنے سے افضل ہے۔

(کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۲۶۴)

حفاظتِ صحّت موجب اجر ہے

سر میں تیل ڈالنا اس نیّت سے کہ یہ سرکاری کلیں ہیں ان کو تیل دے کر ان سے کام لیا جائے گا "موجبِ اجر" ہے۔ اُمید ہے کہ حق تعالیٰ اس پر اجر عطا فرمائیں گے۔

(دعواتِ عبدیت ج ۱۲ مقالاتِ حکمت ج ۲ صفحہ ۲۴۷)

ایک مریض کو ایک حکیم صاحب نے زیادہ سونے کی رائے دی۔ اس پر انہوں نے معمولات میں کمی کی شکایت حضرت والا کو لکھی۔ اس پر فرمایا کہ جتنا حکیم صاحب سونے کو بتلاتے ہیں اس سے زیادہ سوؤ۔ صحتِ کاملہ تک معمولات میں تخفیف

(کمالاتِ اشرفیہ صـ۳۰۴)

کردو ثواب پورا ملے گا۔

رنج کو قلب پر مت طرح طرح کے سوہان بچار میں مت رہو۔

جمعیتِ قلب آنے دو بلکہ جسم پر، اور بعض لوگوں کے قلب کو مہلت ہی نہیں ہوتی، واہیات خرافات میں وقت صرف ہو جاتا ہے۔

(کمالاتِ اشرفیہ صـ۱۷۸)

حرام چیزوں میں شفا نہیں جن چیزوں کو شریعت نے حرام کیا ہے ان میں ضرر ہی غالب ہے۔ گو کسی خاص وقت میں ضرر کا ظہور نہ ہو۔ پس حرام میں جو شفا ہوتی ہے وہ حقیقت میں شفا ہی نہیں بلکہ وہ ایک مرض کو دفع کرتی ہے اور دوسرے امراض جسم میں پیدا کرتی ہے۔

(انفاس عیسیٰ صـ۳۱۹)

فصل (۴۰)

تشبّہ بالکفار

(غیروں کی بے جا تقلید اور فیشن پرستی)

تشبّہ بالکفار کی مذمّت کا راز یہی راز ہے تشبّہ بالکفار کے مذموم ہونے کا کہ وہ علامت ہے کفار اور کفار کی عظمت کی کیونکہ بغیر اعتقادِ عظمت کے تشبّہ نہیں ہو سکتا اور کفار کی عظمت کا اعتقاد ہے حرام۔

(الملفوظات ج ۳ ص ۱۷)

تشبّہ بالکفار کی تفصیل تشبّہ بالکفار امورِ مذہبیہ میں تو حرام ہے اور شعارِ قومی میں مکروہ تحریمی ہے۔ باقی ایجادات اور انتظامات میں جائز ہے وہ حقیقت میں تشبّہ ہی نہیں۔ (المحدود ص ۱۹)

صاحبو! کیا یہ حیرت نہیں ہے کہ برطانوی جرنیل کو تو یہ حق ہو کہ جرمنی وردی کو جرم قرار دے دے کیونکہ وہ برطانیہ کا دشمن ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق نہ ہو کہ آپ دشمنانِ خدا کی وضع کو جرم قرار دیں؟

مگر اسلام میں تعصب نہیں چنانچہ تشبّہ بالکفار کے مسئلہ میں شریعت نے تفصیل کی ہے کہ جو چیز کفار ہی کے پاس ہو اور مسلمانوں کے یہاں اس کا بدل نہ ہو اور وہ شئے کفار کا شعارِ قومی یا مذہبی نہ ہو تو اس کا اختیار کرنا جائز ہے جیسے بندوق ہوائی جہاز وغیرہ۔

اور جو ایجاد ایسی ہو جس کا بدل مسلمانوں کے یہاں بھی موجود ہے اس میں تشبّہ مکروہ ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فارسی کمان سے منع فرمایا ہے اور

فرمایا: علیکم بالقوس العربی بھا یفتح اللہ علیکم (کہ عربی کمان استعمال کیا کرو اللہ تعالیٰ تم کو اسی کے ذریعہ سے فتوحات دیں گے) چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عربی اسلحہ ہی سے صحابہؓ کو فتوحات عطا فرمائیں۔

تو آپؐ نے فارسی کمان سے اس لیے منع فرمایا کہ اس کا بدل عربی کمان موجود تھی اور دونوں کی منفعت برابر تھی صرف ساخت کا فرق تھا۔ غرض اسلام میں تعصب نہیں ہاں اسلام میں غیرت ہے کہ جو چیز مسلمانوں کے پاس بھی ہے اور کفار کے پاس بھی ہے صرف وضع قطع کا فرق ہے اس میں اسلام نے تشبہ بالکفار سے منع کیا ہے کہ اس میں علاوہ گناہ کے ایک بے عزتی بھی تو ہے کہ بلا وجہ اپنے کو دوسری قوموں کا محتاج ظاہر کیا جائے۔

تعصّب و تصلب میں فرق

تعصّب کے معنی ہیں بیجا حمایت کے اور تصلب کے معنی ہیں پختگی کے ساتھ مذہب پر جما رہنا اول ممنوع ہے ثانی مامور بہ ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص۳۷۷)

تشبہ کا مسئلہ نقلی ہی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے

یہ مسئلہ تشبہ کا صرف نقلی ہی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے۔ اگر کوئی جنٹلمین اپنی بیگم صاحبہ کا زنانہ رنگین جوڑا پہن کر اجلاس میں کرسی پر آبیٹھے۔ کیا خود اس کو یا دوسرے دیکھنے والوں کو ناگوار نہ ہوگا تو آخر ناگواری کی وجہ بجز تشبہ کے کیا ہے۔ سو ایک عورت مسلمان جو دینداری میں شاید تم سے بھی بڑھی ہوئی ہو اس کی تشبہ سے ناگواری ہوتی ہے اور کفار فجار کے تشبہ سے ناگواری کیوں نہ ہو۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ جب ہم نے ترکی ٹوپی پہن لی تو سب لباس میں تشبہ نہ ہوا۔ میں نے کہا کہ ترکی ٹوپی پہن کر باقی لباس زنانہ پہن لو اور کہہ دو کہ ٹوپی تو ترکی ہے تو تشبہ کہاں؟ بات یہ ہے کہ تشبہ کبھی ناقص ہوتا ہے کبھی کامل اور دونوں مذموم ہیں۔ گو دونوں کے درجہ

میں تفاوت ہو۔ (الافاضات ملد صث ملفوظ ع۱۱۲۴)

فیشن کے نقصانات

فیشن ایک عجیب بلا ہے جو آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہے بعض لوگوں کو تو اس میں ایسا شغف ہے کہ دن بھر اور رات بھر ان کو فیشن بنانے سے فرصت نہیں۔ ایک صاحب کو دیکھا کہ دن بھر فیشن ہی بناتے۔ پاخانہ جانے کے کپڑے الگ تھے اور ملاقات کے کپڑے الگ تھے اور گھر میں بیٹھنے کے کپڑے الگ تھے۔ ہر وقت کپڑے ہی بدلتے میں رہتے۔ پاخانہ جانے کی تو وردی عجیب تھی۔ ان کو دیکھ کر مجھے بڑا رحم آتا کہ کس بیگار میں پڑے ہوئے ہیں ..... صاحبو! یہ کیا تہذیب ہے؟ اور یہ کیسی زندگی ہے؟ تقلید نے ایسا اندھا کیوں کر دیا! ہمارے پاس کیا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سب کچھ سکھا دیا۔ افسوس ہے کہ اس کو چھوڑ کر ان خرافات میں پڑ گئے

(اوج قنوج صث)

میں کہتا ہوں کہ غیر قوم کا طرز اختیار کرنے میں قطع نظر اس کے کہ کفار کے ساتھ تشبہ ہے جو کہ حرام ہے۔ دُنیا کا بھی کتنا بڑا نقصان ہے۔ اس فیشن کی بدولت حالت یہ ہو رہی ہے کہ دو سو کی آمدنی ہو وہ خرچ کو کافی نہیں، پانسو کی آمدنی ہو وہ کافی نہیں۔ اس فیشن میں بُری طرح روپیہ برباد ہوتا ہے۔ کیا یہ اسراف نہیں؟ ہم نے بہت سے لوگ دیکھے کہ پانسو روپیہ کے ملازم ہیں، مگر اس فیشن کی وجہ سے مقروض ہیں۔ اہلِ یورپ کی تقلید میں انہوں نے اپنے دین کا بھی ناس کیا ہے اور دنیا کا بھی۔ اخلاق پر بھی اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لباس کو پہن کر جی یُوں چاہتا ہے کہ دوسروں کو دکھائیں۔ اگر عورتیں اس لباس کو پہنیں گی تو لازمی بات ہے کہ پردہ کم ہو جائے گا کیونکہ وہ چاہیں گی کہ دُوسروں کو دکھائیں اور عورتوں کو دکھا کر ان کو حظ نہیں ہو سکتا اس لیے لامحالہ مردوں کو دکھانا چاہیں گی اور

بے پردگی اختیار کریں گی۔ (احکام المال ص۶۴)

تشبہ میں خاصیت ہے

لوگ کہتے ہیں کہ تشبہ میں کیا رکھا ہے۔ اگر کچھ نہیں رکھا تو آج سے زنانہ لباس پہن کر کرسیوں پر بیٹھنے کو معلوم ہو جائے گا کہ تشبہ میں کیا رکھا ہے۔ حضرت اس میں خاصیت ہے محض زبانی رد کر دینے سے وہ خاصیت زائل نہیں ہوتی۔ اس سے اجتناب کی سخت ضرورت ہے۔

بھلائی میں نقل نہیں کرتے

ایک اور عجیب بات ہے کہ یہ لوگ لباس وغیرہ میں تو غیر قوم کی تقلید کرتے ہیں اور بعض باتیں جو غیر قوموں میں خوبی کی ہیں ان سے کوسوں دور ہیں۔ مثلاً ہمدردی قوم کی یا خرچ کا ایک حد سے باہر نہ ہونا "معاملہ کا صاف ہونا" آج اس پر فخر ہوتا ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ چار روپیہ کا تو کوٹ کا کپڑا ہے اور سولہ روپیہ اس کی سلائی دی، ایک یورپین نے اس کو سیا ہے۔ "خواہ تکلیف ہی ہو اور سراسر مال کا نقصان ہو مگر انہیں نقل کرنے سے کام۔ (احکام المال ص۵۹)

اسلامی معاشرت بے نظیر ہے

حضور والا اسلام میں تو معاشرت ایسی ہے کہ کہیں بھی اس کی نظیر نہیں مگر معاشرت اس کو نہیں کہتے کہ باجا بھی ہو اور تکلفات بھی ہوں اور تکبر کا سامان بھی ہو کیونکہ تکبر اور تکلف تو معاشرت کی جڑیں اکھاڑتا ہے اسلئے کہ متکبر دوسروں سے کڑا بن کر رہتا ہے۔ پھر دوسروں کے ساتھ مساوات اور ہمدردی کہاں رہی۔ اسلام میں معاشرت کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے جس سے انسان میں تواضع پیدا ہو اور تجربہ کر لیا جائے کہ بدون تواضع کے ہمدردی اور اتفاق پیدا نہیں ہو سکتا اور یہی معاشرت کی جڑ ہے۔ اصل معاشرت اسلام ہی میں ہے۔ مثلاً کھانے پینے میں اسلامی معاشرت سنیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے بھی فرمایا اور کر کے بھی دکھایا

ہے۔ "آکل کما یاکل العبد" کہ میں تو اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتا ہے۔ آپ کی عادت تھی کہ جھک کر اور رغبت کے ساتھ جلدی جلدی کھاتے تھے مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ نہایت ہی ناز و انداز سے کھاتے ہیں۔ حضرت یہ ساری باتیں اس وقت تک ہیں جب تک حقیقت منکشف نہیں ہوئی اور اگر حقیقت کھل جائے اور معلوم ہو جائے کہ احکم الحاکمین کے دربار سے ہم کو یہ چیز کھانے کو ملی ہے اور وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو پھر خود بخود وہی طرز اختیار کرنا پڑے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔ حضرت سارے مرحلے طے ہو جاتے ہیں جبکہ قلب میں کسی کی عظمت ہو۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم لوگ یہ بات نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھتے تھے۔ اگر ہماری بھی آنکھیں کھل جائیں تو وہی کرنے لگیں جو حضورؐ نے کیا ہے اور جہاں جا کر یہ آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہاں اب بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے۔ تو جب اسلام میں معاشرت علیٰ وجہ اتم موجود ہے تو پھر دوسروں سے کیوں لیتے ہو۔

غیرت اور حمیت اور دعویٰ قومیت کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اسلامی معاشرت ناتمام بھی ہوتی جب بھی آپ دوسروں کی معاشرت اختیار نہ کرتے۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن ۔۔۔ بہ از جامۂ عاریت خواستن

اپنا تو پرانا کمبل بھی دوسروں کی شال سے زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے۔ نہ یہ کہ اپنے پاس دوشالہ موجود ہو اور تم اس کو اتار کر دوسروں کا پھٹا ہوا کمبل اوڑھتے ہو۔

اسلامی اور غیر اسلامی معاشرت کا تقابل

اسی طرح لباس میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کی معاشرت اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ اسلامی معاشرت کے برابر لباس میں بھی کوئی معاشرت نہیں ہو سکتی

کتنی کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام میں لباس کے متعلق ماذونات (جن چیزوں کی اجازت ہے) کی فہرست بڑی اور ممنوعات کی چھوٹی ہے اور ہمارے بھائیوں کی معاشرت میں ماذونات کی فہرست تنگ اور ممنوعات کی بڑی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ آپ رات دن وسعت وسعت پکارتے ہیں اور علماء کو رائے دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ معاشرت میں تنگی نہ ہونی چاہیے اور طرزِ عمل یہ ہے کہ آپ نے ایسی معاشرت اختیار کر رکھی ہے جس میں سراسر تنگی ہے۔ بھلا جس میں ماذونات کم اور ممنوعات زیادہ ہوں وہاں وسعت کہاں۔ آپ خود ہی تو ایک قاعدہ بناتے ہیں کہ وسعت ہونی چاہیے اور خود ہی اس کو توڑتے ہیں اور یہاں سے معلوم ہُوا ہو گا کہ درحقیقت آزادی شریعت ہی کی معاشرت میں ہے کیونکہ اس میں ماذونات زیادہ اور ممنوعات و قیود کم ہیں۔ برخلاف جدید معاشرت کے کہ اس میں سراسر تنگی ہی تنگی ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک کھا نہیں سکتے جب تک کرسی اور میز نہ ہو اور ہم لوگ پلنگ پر کھالیں، بستر پر کھالیں، بوریے پر کھالیں، بلکہ زمین پر بھی کھالیں۔ ہمارے لیے کوئی قید نہیں۔ بتلایئے آزادی کی حالت میں کون ہے؟

واللہ اس لباس سے زیادہ کیا جیل خانہ ہو گا جس میں کرسی کے آنے تک انسان کو مجرموں کی طرح کھڑا رہنا پڑے۔ میں اس وقت جائز و ناجائز سے بحث نہیں کرتا۔ یہ تو دوسری بات ہے ان سب سے قطع نظر کر کے میں کہتا ہوں کہ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کر کے وہ امتیازِ قومی کہاں رہا جس کے یہ لوگ بڑے مدعی ہیں اور اسلام کی وقعت کہاں رہی جس کے حامی بنتے[1] ہیں۔

اور خادم ہونے کا ان کو دعویٰ ہے۔ کیا اسلام کی یہی وقعت ہے کہ تم

---

[1] مگر اب کھڑے ہو کر بھی کھا سکتے ہیں۔ اس کی بھی اجازت ہو گئی۔

دوسروں کی معاشرت اختیار کر کے زبانِ حال سے اسلامی معاشرت کا ناکافی ہونا ظاہر کرو۔ نیز اس میں یہ خرابی الگ ہے کہ جس معاشرت کو آپ لے رہے ہیں اس میں تنگی اور قید بہت زیادہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری لازم اور اس کو تیسری چیز لازم ان قیود کی پابندی میں وہ آزادی کہاں رہی جس کا آپ سبق پڑھاتے ہیں۔

(تفصیل الدین ص ۶۲-۶۳)

یورپ کے تمدّن کا ایک کارنامہ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ متمدن و مہذب قوم کے کارنامے دیکھو یورپ کے ایک شہر میں ایک اسکول کھلا ہے جس میں چوری کرنا سکھائی جاتی ہے۔ حکومت نے مداخلت کرنا چاہا۔ کہا کہ یہ بھی ایک فن ہے جیسے تلوار سکھائی جاتی ہے۔ اگر چوری کریں گے سزا دینا۔ حکومت مغلوب ہوگئی۔ یہ تہذیب اور تمدّن ہے یورپ کا۔

(الافاضات ج ۶ ص ۲۱۶ ملفوظ ۳۴۱)

تمدّن کی ترقی کا نتیجہ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ تمدّن کی ترقی سے عالم میں فساد ہوگیا۔ تمدّن سے تشویش بڑھ گئی۔

(الافاضات الیومیہ ملفوظ ۳۴ ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ)

بعض وضع و لباس کا منشا تکبّر ہے

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ متکبرین کی سی وضع اختیار کرنا، ان کا سا لباس پہننا اس میں خاصیت ہے کبر کی جس سے ایک ظلمت پیدا ہوتی ہے اور قلب بگڑتا ہے۔ اسی طرح اپنی حیثیت سے زیادہ قیمتی کپڑا پہننا، اپنی وسعت سے زیادہ سامان جمع کرنا یہ سب کبر کی فرع ہیں بخصوص جب فجّار یا کفار کے ساتھ تشبہ بھی ہو تو "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کا مصداق ہوگا۔

(الافاضات ج ۵ ص ۲۴۴ ملفوظ ۴۷۹)

ان میں بالیاں تک نہیں۔ جو طرز مغربی عورتوں کا ہے وہ اختیار کیا ہے۔ بینا پیش نکلا ہے عورتوں میں میں کہتا ہوں کہ قطع نظر اس کے کہ تشبہ ناجائز ہے اخلاق پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

ایک حکمت انگریزی لباس سے منع کرنے میں یہ ہے کہ اس کو پہن کر جی یوں چاہتا ہے کہ دوسروں کو دکھائیں۔ اگر عورتیں اس لباس کو پہنیں گی تو لازمی بات ہے کہ پردہ کم ہو جائے گا کیونکہ وہ چاہیں گی کہ دوسروں کو دکھائیں اور عورتوں کو دکھا کر ان کو حظ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ عیب سمجھتی ہیں اس لیے لامحالہ مردوں کو دکھانا چاہیں گی اور بے پردگی اختیار کریں گی۔

(احکام المال صـ ۶۴-۶۰)

مساواتِ النساء آجکل کے نوجوانوں کا یہ دعویٰ مساواتِ نساء محض زبان سے ہے عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے۔ ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا کہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں۔ ایسے لوگوں کی تقلید پابندِ مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے۔ پھر ان کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر نہ کی کہ اس مساوات کا اثر ان کے حق میں مفید ہوا یا مضر۔ غرض بالکل کورانہ تقلید کر کے مساواتِ نساء کے قائل ہونے لگے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ متمدن قوم جس کی تقلید آج کل ہمارے نوجوان کر رہے ہیں خود اس مساوات کو نباہ نہ سکی۔

(شعب الایمان صـ ۳)

مساوات النساء اور اہل یورپ

اہل یورپ عورتوں کی مساوات سے خود تنگ ہو گئے ہیں۔ وہ تو اب اس کوشش میں ہیں کہ عورتوں کو پھر اصلی حالت پر لے آئیں تم خواہ مخواہ ان کی تقلید کر کے یورپین بننا چاہتے ہو۔

(التبلیغ للتفسیر صہ ۳۰)

متشبہ بالصوفی کی بھی قدر کرو

بزرگوں نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ متشبہ بالصوفی کی بھی قدر کرو کیونکہ اس نے طریق کو معظم تو سمجھا تب ہی تو تشبہ اختیار کیا اور یہی راز ہے تشبہ بالکفار کے مذموم ہونے کا کہ وہ علامت ہے کفر اور کفار کی عظمت کی۔ اسی لیے حدیث میں جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من تشبہ بقوم فھو منھم۔ کیونکہ بغیر اعتقادِ عظمت کے تشبہ نہیں ہو سکتا اور کفار کی عظمت کا اعتقاد ہے حرام

اسی طرح صوفیہ کا یہ فرمانا کہ متشبہ بالصوفی کی بھی قدر کرو۔ اس کی بنا یہی ہے کہ اس متشبہ کے قلب میں اس جماعت کی عظمت ہے اس لیے اس کی بھی قدر کرو۔ کیا ٹھکانہ ہے ان حضرات کی عمیق نظر کا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مقبول بندوں کی وضع اختیار کرو، شکل بناؤ۔

کیا حضورؐ کا جی نہ چاہے گا کہ میری اُمّت میرے طرز پہ رہے

دوسری ایک اور بات اس وقت ذہن میں آئی، کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جی نہیں چاہے گا کہ میری امت میرے طرز پر رہے۔ اہلِ محبت کے لیے تو یہی کافی ہے، خواہ کچھ بھی فائدہ نہ ہو۔ لیکن اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو اور فائدہ ہی مطلوب ہو تو اسی نیت سے اختیار کر لو۔ تب معلوم ہوگا کہ کیا برکت ہوتی ہے۔ قبل عمل محض عقل سے حقیقت کا ذہن میں آجانا مشکل ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شرائع کی مصلحتیں عمل کرنے کے

تم کو سکھلایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا اور وہاں کا پادری کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھ لیں گے اگر ان کا وہی حلیہ ہوا جو اس کتاب میں ہے تو ہم بدون لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے۔ ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المومنین یہاں تشریف لے آئیں شاید قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہو جائے۔

امیر المومنین نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا۔ اب غور فرمائیے کہ یہ ایک ایسے شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسریٰ و ہرقل بھی تھراتے تھے، مگر حالت یہ تھی کہ جس قمیص میں آپ نے سفر کیا ہے اس میں چند در چند پیوند تھے اور سواری کے لیے صرف ایک اونٹ تھا اس سے زیادہ کچھ نہ تھا جس پر کبھی آپ سوار ہوتے، کبھی آپ کا غلام۔

آجکل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورہ میں بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ اعظم کے دورہ میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آج ادنیٰ حاکم کے دورہ میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ رعایا کو ان کے دورہ کے لیے رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں

قریب پہنچے تو لشکرِ اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ آپ نے ممانعت کر دی۔ خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیرالمؤمنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے۔ اس لیے مناسب ہے کہ اپنا یہ قمیص اتار کر دوسرا قمیص عمدہ سا پہن لیجیے۔ اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے تاکہ ان کی نظر میں عزت ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام" کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے۔ ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے۔ مگر صحابہ کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لیے درخواست منظور کر لی۔ چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا کہ میرے دوستو تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا۔ واللہ میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے۔ تم میرا وہی پیوند لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ۔ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا۔

اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑتا ہے تو کیا ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑے گا؟ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں اور ہم کو کس چیز نے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لیے کوئی لباس مضر نہیں۔ اور یہ جو حضرت عمرؓ نے فرمایا نحن قوم الخ (واقعی بات یہی ہے کہ) اگر ہم خدا کے مطیع اور فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں۔ ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی۔

زعشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

خوبصورت چہرے کو زیب و زینت کی حاجت نہیں وہ تو ہر لباس میں

حسین ہے۔

تشبہ کا منشاء عظمت ہے پھر اتباعِ رسول کیوں نہیں

صاحبو! اس کا کوئی شافی جواب دیجئے کر اطمینان ہو ورنہ اپنی حالت درست کیجئے۔ کیا جواب ہے اس کا کہ حضور کی عظمت و محبت سے تو ذرا بھی رنگ نہ بدلے اور ایک بے دین (قوم یا فرد) کی ایسی عظمت ہو کہ اس کی تقلید میں حلال و حرام کی بھی تمیز نہ رہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عذاب بھی نہ ہو صرف خدا تعالیٰ اپنے روبرو کھڑا کر کے یہ پوچھ لیں کہ حضور کی عظمت تمہارے دلوں میں زیادہ تھی یا بادشاہانِ دنیا کی تو کیا جواب دو گے؟

(ضرورۃ الاعتنا بالدین)

اصلاحِ احوال کے لیے کیا کرنا چاہیئے

صاحبو! اپنے بزرگوں کی سی وضع قطع اختیار کرو، خدا کو راضی کرو، اعمالِ صالحہ اختیار کرو، دوست و دشمن کو پہچانو، اسلام اور احکامِ اسلام کی پابندی اور ان کی وقعت و احترام کرو اور خصوصیت سے اس حکمِ اسلامی کا خاص اہتمام کرو کہ ایک کو اپنا بڑا بنا لو اس کے مطیع اور منقاد ہو کر رہو۔ کام کی باتیں کرو، بیکار باتوں میں کیا رکھا ہے۔ (الافاضات ۵ ص ۱۲)

○

فصل (۵)

رسومات

رسم کی تعریف

ہمارے زمانہ میں تفاخر، تکبر اور تکلف ہر چیز کا جزو ہو گیا ہے کھانا پینا، لباس اور بود و باش کوئی چیز بھی ان سے خالی نہیں۔ حتیٰ کہ اس کا احساس تک بھی نہیں رہا کہ یہ قبائح موجود ہیں یا نہیں۔ رسم کچھ اسی بات کو نہیں کہتے جو نکاح اور تقریبات میں کی جاتی ہیں بلکہ "ہر غیر لازم چیز کو لازم کر لینے کا نام رسم ہے۔" خواہ تقریبات میں ہو یا روزمرہ کے معمولات میں۔

(وعظ: تفصیل الذکر)

فی زمانہ رسوم مبنی علی الکبر ہیں

یہ سمجھنا کہ آجکل کی رسمیں کچھ رسمیں ہی نہیں اور زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ جس گناہ کو آدمی گناہ نہ سمجھے اس سے توبہ کی کیا اُمید ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ نام پشیمانی کا ہے اور پشیمانی اسی چیز سے ہوا کرتی ہے جس کی کچھ بُرائی دل میں ہو جب ان رسموں کی برائی ہی دل میں نہیں ہے تو پشیمانی کیوں ہو گی اور جب پشیمانی نہیں تو ان سے توبہ کیسی؟ یاد رکھو یہ سب رسمیں ہی ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ رسم وہی ہو جو کفر و شرک ہو۔ اگلے زمانہ کی رسمیں بڑی رسمیں تھیں۔ یہ ان کے مقابلہ میں چھوٹی سہی مگر ہیں تو رسمیں ہی اور یہ چھوٹا بھی تنزلاً کہتا ہوں۔ ورنہ درحقیقت ان سے کچھ کم نہیں، بلکہ من وجہ زیادہ ہی ہیں کیونکہ رسوم متروکہ مبنی علی الکفر تھیں اور یہ مبنی علی الکبر ہیں اور کبر کفر کی بھی جڑ ہے۔

رسوم جاہلوں کی تقلید کے سوا کچھ نہیں

غرض موجودہ رواج بھی سارے کے سارے رسوم ہی ہیں۔ تغافل کی وجہ سے ذہنوں سے ان کا قبح جاتا رہا۔ رسمیں سب چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ان میں جتنی مصلحتیں بتائی جاتی ہیں سب من سمجھوتی ہیں حقیقت میں سب الزام ہے۔ اچھے اچھے سمجھدار ان میں بے وقوف بن جاتے ہیں اور پیروی کیے جاتے ہیں۔

بہت سی رسموں کی مصلحت اور وجہ ایجاد معلوم بھی نہیں مگر اسی ہیئت کے ساتھ ادا برابر ہوتی ہیں۔ جب کوئی وجہ بھی ان کی ذہن میں نہیں تو تقلید محض ہوئی یا نہیں؟ اور کس کی تقلید۔ شریعت کی تو درکنار، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی عقلمند کی بھی تقلید ہے؟ حاشا و کلا بس سوائے اس کے نہیں کہ جہلا کی تقلید ہے اور اسم محض ہے مصلحت کا نام بھی لینا غلط ہے۔ انہیں رسموں کی نسبت جن کی بنا تقلید جہلاء پر ہے۔ قرآن شریف میں ہے فَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ اور أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ۔ ازواج مطہرات کو حکم ہے کہ جیسا جاہلیت میں بے دھڑک نکلتی ہیں اب نہ نکلو اور بطور انکار فرماتے ہیں، کیا جاہلیت کا حکم پسند کرتے ہو؟

یہ رسمیں اسلامی رسمیں نہیں

بعض رسموں کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ میں کہتا ہوں مسلمانو!

رسمیں سب کفار کی رسمیں ہیں۔

رسموں کو رسم ہی نہ سمجھنا جہل مرکب اور قلب کی موت ہے

مسلمانو! رسمیں سب کفار کی رسمیں ہیں۔ مزید برآں مل گیا ہے ان میں تفاخر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور بدعات۔ ظلمات بعضها فوق بعض۔ شر کے اندر شر گھسا ہوا ہے۔ مگر یہ ترکیب غضب کی ایجاد ہے کہ مفاسد کو مفاسد ہی نہ کہو،

Scanned with CamScanner

موجودہ رسموں کو رسم ہی نہ کہو کہ ان پر منع وارد ہو یہ جہل مرکب اور قلب کی موت ہے۔ کرنے کو جو چاہو کر گزرو۔ مگر یہ یاد رکھو کہ گناہ کا گناہ ہونا تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے پر موقوف نہیں۔ واقع میں جو اثر گناہ کا ہے وہ ضرور ظاہر ہوگا۔ اگر کوئی زہر کھالے اور اپنے دل میں یہ خیال کرے کہ زہر نہیں شکر ہے تو کیا وہ شکر ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ تھوڑی دیر میں مزہ دکھادے گا۔

رسوم بدعت ہیں اور شرک تک پہنچ جاتی ہیں اگر پہلے لوگوں کی رسمیں شرک تک پہنچی ہوئی تھیں تو آجکل کی رسمیں بھی بدعت تک پہنچی ہوئی ضرور ہیں اور بدعت جب راسخ فی القلب ہو جاتی ہے تو وہ بھی شرک تک پہنچ جاتی ہے تو مآل دونوں قسم کی رسموں کا واحد ہے عقل کی بات یہ ہے کہ سب کو چھوڑ دو۔

(وعظ: تفصیل الذکر)

حضورؐ نے نام و نمود اور ریا سے منع فرمایا ہے اگر ان رسومات میں اور بھی کچھ خرابی نہ ہو تو یہ کیا کم خرابی ہے کہ ان میں لوگوں کی نیت درست نہیں ہوتی اور اگر کسی کو خود ان کی برائی محسوس نہ ہو تو ہمارے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام و نمود اور ریا کے لیے کوئی کام کرنے سے منع فرمایا ہے۔

(دین و دنیا: اسباب الغفلۃ صفحہ ۵۳۷)

نحس حقیقی کی ساعت اگر کوئی مجمع نماز پڑھنے کو مانع ہوتا ہے تو شریعت اس مجمع کو بھی جائز نہیں رکھتی۔ اگر ایک نماز بھی ان تقریبات میں چھوٹ گئی تو ان کے قبیح ہونے کے لیے کافی وجہ ہے۔ مگر ہم کو حسن و قبح کی خبر ہی نہیں۔ ان تقریبات کو خوشی کے مواقع سمجھتے ہیں۔ ان کے

واسطے دن اچھے تلاش کیے جاتے ہیں ساعت سعید دیکھی جاتی ہے اس کا بد میں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ جائز ہے یا ناجائز نجومیوں سے ساعت پوچھ کر بیاہ رکھا جاتا ہے کہ ایسا نہ ہو کوئی ساعت نحس آن پڑے اور یہ پتہ نہیں کہ نحس حقیقی کی ساعت کون سی ہے۔ نحس حقیقی وہ ساعت ہے جس میں حق تعالے سے غفلت ہو، جس وقت میں آپ نے نماز چھوڑی اس سے زیادہ نحس کون وقت ہو سکتا ہے اور جو اشغال نماز چھوڑنے کے باعث بنے ان سے زیادہ منحوس شغل کونسا ہو سکتا ہے۔ (وعظ: منازعة الهوىٰ)

اکثر رسوم جوئے اور شراب کے حکم میں آتی ہیں

انما یرید الشیطٰن... منتہون
"شیطان کی جوئے اور شراب سے یہ غرض ہے کہ تمہارے آپس میں دشمنی ڈال دے اور نماز سے روک دے"۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں جوئے اور شراب کے دو نقصان تبلائے۔ ایک یہ کہ شیطان اس کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں نفاق ڈال دے گا۔ دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے روک دے گا۔

اس سے اپنی رسموں کا حکم نکال لیجیے حدیث کے الفاظ صاف کہتے ہیں کہ ان کا حکم بھی شراب اور جوئے کا سا ہے کیونکہ نماز سے غافل ہونے کا سبب ہو گئیں۔ اگر اور دلیلوں سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو بھی دلیل ہی ایسی پیش کی ہے کہ اس کے سامنے کسی دلیل کی حاجت نہیں اور اس کا جواب آپ کبھی نہیں دے سکتے جب چاہے مشاہدہ کر لیجئے کہ جہاں یہ رسمیں روا ہوتی ہیں وہاں نماز کی (وقعت) نہیں ہوتی تو بموجب ارشاد حضورؐ کے میسر یعنی جوئے کے حکم میں ہوئیں اور میسر کو قرآن شریف میں رجس اور عمل شیطان فرمایا گیا ہے۔ تو میں نہیں کہتا بلکہ قرآن ان کو عملِ شیطان کہتا ہے۔ بس اور دلیلوں کو جانے دیجئے۔ یہی کیا کم خرابی ہے کہ اس کا نام عمل شیطان ہوا۔ حکم شرعی تو یہی ہے جس کے لیے ایسی دلیل بتلائی گئی کہ موٹی سے موٹی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے لیکن سمجھے تو وہ جس کی طبیعت میں یہ کچھ کھٹکیں۔ انہوں نے رواج ایسا پایا ہے جیسے سالن میں مصالحہ بغیر ان کے سالن بنتا ہی نہیں حتیٰ کہ جو لوگ مرچ زیادہ کھاتے ہیں ان سے کوئی حاذق طبیب بھی کہے کہ مرچ میں یہ نقصان ہیں تو کبھی ان کا دل قبول نہ کرے گا اور یہی جواب دیں گے کہ میاں طب کو رہنے دو تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ساری عمر کھاتے ہو گئی کوئی بھی نقصان نہیں ہوا اور بے مرچ کے لطف ہی کیا۔ اسی طرح مسلمان غیر قوموں کی صحبت سے رسموں کے ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ بلا ان کے کسی تقریب میں لطف ہی نہیں آتا ہے۔ چاہے خانہ ویرانہ بھی ہو جائے لیکن یہ قضا نہ ہوں۔ آجکل کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی غریبانہ معیشت کو پسند نہیں کرتا۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عیب سمجھتے ہیں۔ بول چال میں اور اُٹھنے بیٹھنے میں سب میں تکبر اور تکلف بھرا ہوا ہے گویا ہر وقت کسی نہ کسی رسم کے پابند ہیں اور تکلف میں علاوہ گناہ کے ایک دنیوی خرابی یہ بھی ہے کہ کوئی شخص بناوٹ کرنے

والے کی بات پر اعتماد نہیں کرتا۔ اس خوف سے کہ شاید یہ بات بھی بناوٹی ہو۔ غرض تفاخر کی رسمیں بڑھ گئی ہیں کیونکہ تعلیم جدید کی ترقی ہے تو آجکل کی رسموں میں شرک نہ سہی لیکن تفاخر تو ضرور ہے۔

مرتے مرتے بھی چہلم کی وصیت

اصل یہ ہے کہ اعتقاد میں ان کا معصیت ہونا بھی نہیں رہا حتیٰ کہ اگر کوئی رسم رہ جاتی ہے تو مرتے مرتے وصیت کر جاتے ہیں کہ ہمارا چہلم دھوم دھام سے کرنا اور بعض کو اس وصیت پر بھی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس چہلم کو قبل از وقت اپنی زندگی میں کر جاتے ہیں۔ کیسا حس باطل ہوا ہے، کہ نماز قضا ہو تو پروا نہیں جس کا وقت آگیا اور خطاب اللہ متوجہ ہو چکا اور چہلم کا وہ اہتمام ہو کہ وقت آنے سے بھی پہلے ادا کیا جائے امر اللہ کی وہ بے وقعتی اور امر شیطان کی یہ وقعت ڈوب مرنے کی بات ہے۔ افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے جاتے وقت بھی وہ معصیت ذہن میں بھری ہوتی ہے۔ اس وقت تو شرمانے کا وقت تھا مگر بطلانِ حس کا کیا علاج ؟

(وعظ منازعۃ الھویٰ)

حق واضح ہو اور رسم مٹ جائے

اصلاح و تعمیر کے لیے دو باتیں چاہتا ہوں: (۱) ایک یہ کہ ضروری اور غیر ضروری میں لوگوں کو فرق معلوم ہو جائے۔

(۲) دوسرے یہ چاہتا ہوں کہ حق واضح ہو جائے اور رسم مٹ جائے مگر اکثر لوگ اس سے گھبراتے ہیں، بھاگتے ہیں۔ اسی رسم پرستی کی ظلمت اور کج راہی پر رہنا پسند کرتے ہیں، اصلاح کو برداشت نہیں کرتے۔

(ملفوظات ج۵ ص۵۴)

حق کو اختیار کر و یا باطل کو حق کو اختیار کر لو یا باطل کو ایک طرف کا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ غلطی میں پڑے رہو اور اس کو غلطی نہ سمجھو۔ جو شخص غلطی میں مبتلا ہو مگر اس کو غلطی سمجھتا ہے تو کبھی نہ کبھی یہ امید ہے کہ اس کو چھوڑ دے گا اور جو شخص غلطی کو غلطی ہی نہیں سمجھتا اس سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ خود تو شنبہ کیوں ہونے لگا۔ اگر کوئی اور بھی خبردار کرے تو جواب میں کہے گا واہ اس میں بھی کچھ برائی ہے جو میں چھوڑ دوں۔ ایسا شخص ہمیشہ گناہ میں مبتلا رہے گا۔ موت کے وقت بھی توبہ نصیب ہونے کی کیا اُمّید ہے۔ غرض یہ خیال باطل غلط سمجھو کہ موجودہ رسمیں رسمیں نہیں ہیں اور ساتھ ہی ان کے چھوڑنے کی بھی ہمت کرو اور ان کو ملکامت سمجھو۔

(دعوات عبدیت ۲، ص ۵۴-۵۵)

(علاج الکبر ص ۱۰-۱۲)

ایصال ثواب کا ایک احسن طریقہ میں دیکھتا ہوں کہ آجکل کسی کے مرنے پر اس کا بڑا حق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی یادگار منانی شروع کر دی، جلوس نکالا، اس کا یوم وفات منایا، ریزولوشن پاس کر دیا، اخباروں میں چھاپ دیا کہ فلاں فلاں شریک ہوا۔ بھلا اس بیچارے کو کیا فائدہ پہنچا؟

میری چھوٹی ہمشیرہ کا جب انتقال ہوا تو میں اس زمانہ میں جامع العلوم کانپور میں مدرس تھا جس وقت اس خبر کی اطلاع کا خط آیا میں درس دے رہا تھا۔ گو میں نے درس موقوف نہیں کیا، نہ طلبہ کو اس کی خبر ہونے دی۔ لیکن پھر بھی آخر بہن تھیں چہرے سے غم کے آثار سب پر ظاہر ہو گئے۔ یہاں تک کہ طلباء نے پوچھا کہ کیا خط میں کوئی رنج کی بات لکھی ہے؟ اس وقت میں نے ظاہر کر دیا کہ ہاں میری بہن کا

انتقال ہو گیا۔ اس پر سب نے کہا کہ ہم آج سبق نہیں پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ میاں پڑھو بھی۔ اس کو ثواب ہوگا، فائدہ ہوگا لیکن انہوں نے کہا نہیں آج تو جی نہیں چاہتا۔ پھر میں نے اصرار نہیں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ ہم سب قرآن شریف پڑھ کر مرحومہ کو ایصال ثواب کریں۔ میں نے کہا کہ بھائی تمہاری خوشی ہے۔ میں تو اپنے دوستوں کو اس کی بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یوں بطور خود اپنی محبت سے ایصالِ ثواب کریں تو اختیار ہے۔ ایصالِ ثواب کی فضیلت بھی بہت ہے اس لیے میری طرف سے اجازت ہے مگر ایک طریق سے وہ یہ کہ مجتمع ہو کے نہیں بلکہ اپنے اپنے حجروں میں بیٹھ کر تاکہ جس کا جتنا جی چاہے پڑھے جس کا جی چاہے نہ پڑھے۔ پھر میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے اطلاع مت کرنا کہ کس نے کتنا بخشا، ورنہ اطلاع کی ضرورت سے ہر شخص یہ چاہے گا کہ کم از کم پانچ پارے تو پڑھوں۔ حالانکہ اگر میری اطلاع کے لیے پانچ پارے پڑھے تو ان کا ایک حرف بھی مقبول نہیں بخلاف اس کے اگر کسی نے خلوص سے صرف ایک بار قل ھو اللہ پڑھ کر بخشا تو یہ قل ھو اللہ مقبول ہے اور مرحومہ کے حق میں نافع اور وہ پانچ پارے مقبول اور نافع نہیں۔ چنانچہ جس کو جتنی توفیق ہوئی اس نے بطور خود بلا مجھے اطلاع کیے ہوئے آزادی اور خوش دلی کے ساتھ پڑھ کر بخش دیا تو کسی کے مرنے پر کرنے کے کام تو یہ ہیں۔

اب میں جلسہ کرتا، مرحومہ کی تعریفیں کرتا، اظہارِ غم کا ریزرولوشن پاس کرتا اخباروں میں شائع کرا دیتا۔ مدرسہ میں تعطیل کر دیتا تو اس سے مرحومہ کو کیا فائدہ ہوتا؟ بلکہ جو مدح سمجھی جاتی ہے اس کے بارے میں تو بصورتِ خلاف واقع ہونے کے حدیث میں آیا ہے کہ مُردہ سے سوال ہوتا ہے "ھٰکذا کنت"۔ کیا تو ایسا ہی تھا۔ لیجیے تعریفوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ باز پرس ہو رہی ہے اور ملامت کی جا رہی ہے۔ لیجیے یہ انعام ملا

محبین اور معتقدین کی محبت اور اعتقاد کی بدولت کہ باز پرس میں ڈال دیا۔ گو اس کا کوئی جرم نہیں مگر باز پرس پر آخر اس کو تو خطرہ کا احتمال ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کے دن یہ سوال ہو گا حالانکہ وہ الزام سے بالکل بری ہیں: یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یعنی کیا آپ نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو" جس کا وہ جواب دیں گے: سبحٰنک ما یکون لی ان اقول مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ۔ لیکن پھر بھی باز پرس سے شرمندگی تو ہوگی۔ یہ کس کی بدولت؟ ان غالی محبین ہی کی تو بدولت بس یہ ان کے اعتقاد کا ثمرہ ہے۔

(ملفوظات ج ۷ ص ۳۰۰، ملفوظ ۲۲۰)

○

فصل (۶)

پردہ اور بے پردگی

بے پردگی اور بے حیائی کے نتائج

آجکل بے پردگی کی زہریلی ہوا چل رہی ہے۔ بڑی ہی خطرناک چیز کی طرف مخلوق جا رہی ہے۔ اس کے نتائج نہایت ہی خراب نکلیں گے۔ بے حیائی کا بازار تو پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا۔ اب بے باکی بھی شروع ہو گئی اور غضب یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے اس پر استدلال کرتے ہیں جو سراسر دین کی تحریف ہے۔ یہ سب بے حیائی کے کرشمے ہیں۔ بڑے ہی فسق و فجور اور الحاد کا زمانہ ہے۔ چہار طرف سے دین پر حملے ہو رہے ہیں ہر شخص الا ماشاء اللہ نفسانیت پر اترا ہوا ہے۔ جانوروں کی طرح آزاد ہیں۔ اگر حکومت اسلامی ہوتی اور بادشاہ عادل اور دیندار ہوتا تو پتہ چل جاتا کہ ایسی باتیں کیسے کیا کرتے ہیں؟ اب خود اہل حکومت ہی کا یہ مذاق ہے جس سے ہر قسم کی بے حیائیوں کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ اگر حدودِ شرعیہ جاری ہوتیں تو ان جرائم کی کسی کو ہمت بھی نہ ہوتی۔ چوری پر قطع ید ہوتا، زنا پر رجم ہوتا۔ پھر اس کی کیا ہمت ہو سکتی تھی اور اب کیا ہے، بے مہار ہیں، جو چاہیں کریں، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں، معائب محاسن ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا سے خیر و برکت رخصت ہو گئی۔ آئے دن ارضی و سماوی بلاؤں کا ظہور ہو رہا ہے۔ لیکن عبرت پھر بھی نہیں۔ حق تعالیٰ سب کو ہدایت فرمائیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔

(الافاضات ج ۶ ص ۱۷)

آیتِ پردہ کے مخاطب

پردہ کی آیت کے متعلق کسی صاحب نے ذکر کیا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی مخاطب تو ازواجِ مطہرات ہیں۔ فرمایا کہ لوگوں میں بڑی کجی ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان محفوظ رکھے۔ اس قدر فتنے ہیں۔ حالانکہ یہ موٹی بات ہے کہ اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ وہاں تو احتمال فتنہ کا کم تھا۔ جب وہاں انسداد کیا گیا یہاں تو بدرجہ اولیٰ اور زیادہ ضروری ہے۔ پھر اس کا ذکر آیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ پاجامہ، کرتہ، اچکن بھی تو حضور کے زمانہ میں نہ تھا اسے کیوں پہنتے ہو یہ بھی بدعت ہے۔ فرمایا کہ ایک شخص نے اس کے جواب میں خوب کہا کہ تم بھی تو اس زمانہ میں نہ تھے تم بھی بدعت ہو۔ پھر فرمایا کہ عجب نہیں کچھ زمانہ میں یہ کجی پیدا ہو کہ کلام مجید کے ہم مخاطب ہی نہیں کیونکہ ہم موجود ہی نہیں تھے۔ پھر نہایت افسوس کے لہجہ میں یہ شعر پڑھا۔

؎ اے بسرا پردۂ یثرب بخواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

بہت ہی آفت برپا ہو رہی ہے۔ خدا رحم کرے۔ مصیبت ہے خود بینی بیحد پھیل گئی ہے۔ لوگ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں۔

(حسن العزیز ج۱ ص ۱۶۳، ملفوظ ۲۶۱)

بے پردگی کے حامیوں کی چند خصوصیات

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک صاحب نے خوب کہا کہ جتنے لوگ بے پردگی کے حامی ہیں سب میں دو چیزیں مشترک ہیں۔ "بے حیائی" اور "عیاشی"۔ واقعی ایسے ہی لوگ بے پردگی کے حامی بنے ہوئے ہیں جن کو "دین سے بے تعلقی" ہے۔ لیکن اگر ان میں دین نہیں تب بھی آخر غیرت بھی تو کوئی چیز ہے!؟

(النور بابت ماہ جمادی الاول ۵۳ھ)

(الافاضات۔ ملفوظ ۲۸۷)

بے پردگی کے حامی نتائج سے بے خبر ہیں

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ کم عقل اور بدفہم لوگ جو بے پردگی کے حامی ہیں ان کی اس کے نتائج پر نظر نہیں۔ یورپ میں اس بے پردگی کی بدولت عورتیں اس قدر خراب اور برباد ہو رہی ہیں کہ مرد عاجز اور پریشان ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ (الافاضات ج۵ ص۱۷۲، ملفوظ ۲۰۲)

پردہ اور علمی ترقی

ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علمی سے رکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں اسی وجہ سے تو چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کو عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ تعلیم کے لیے یکسوئی اور "اجتماعِ خیال" کی ضرورت ہے اور وہ گوشۂ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اسی واسطے مرد بھی مطالعہ کے لیے گوشۂ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں، جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لیے معین ہے نہ کہ مانع۔ نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں؟ (مظاہر الآمال)

نقائص پردہ اور بے پردگی میں فرق

پردہ کی وجہ سے جو نقائص رہ جاتے ہیں ان کی اصلاح آسان ہے اور بے پردگی میں جو مفاسد ہیں ان کی اصلاح بہت دشوار ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص۳۰۹)

پردہ میں بے پردگی

یہ جو کہا جاتا ہے کہ صاحب پردہ میں بھی فتنہ ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بھی پردہ میں کوتاہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی پردہ میں کچھ بے پردگی ہوتی ہے تب فتنہ ہوتا ہے اور اگر پردہ میں ذرا بے پردگی نہ ہو تو کوئی وجہ فتنہ کی نہیں۔

(الابقاء بابت ماہ مارچ ۱۹۴۹ء صہ ۲۶)

احساس بعد از خرابی بسیار

بے پردگی کے بہت بُرے نتائج ہو رہے ہیں اور یہ کم عقل اور بد فہم لوگ اس وقت سمجھیں گے جب بات ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اس وقت تو دماغ کو چڑھ رہی ہے، بدحواس ہو رہے ہیں۔ مگر یہ نشہ بہت ہی قریب اُتر جانے والا ہے۔ (الافاضات ع۵ ص۱۷۸)

دین کو نفس و خواہش کے تابع بنا رکھا ہے

ایک صاحب کے جواب میں فرمایا کہ جن لوگوں نے پردہ اٹھا دیا اور بے پردگی کے حامی ہیں۔ یہ بے غیرت ہیں۔ علاوہ احکام شرعیہ کے طبعی غیرت بھی تو اس سے مانع ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بے غیرت بے حیا پہلے ہی سے تھے اسی لیے انہوں نے دین کو دُنیا کی خواہشات اور نفسانیت کا تابع بنا دیا۔ کیا یہ اسلام ہے؟

(الافاضات ع۵ ص۴۳۲، ملفوظ ع۷۵۴)

کیا رشتہ داروں کے باہمی تعلقات بے پردگی پر موقوف ہیں؟

بعضی عورتیں جو متشرع ہیں وہ سب نامحرموں سے پردہ کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ چچا زاد بھائی سے بھی ان کے اُوپر بڑے طعن ہوتے ہیں کہ بھلا بھائی سے بھی کہیں پردہ ہوتا ہے۔ عورتوں کے نزدیک چچا کا لڑکا ایسا ہے جیسا سگا بھائی۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سگا بھائی ہے۔ لیکن ایسا بھائی ہے جو سگ سے ماخوذ ہے اور الف جو آخر میں لگا ہوا ہے وہ ایسا ہے جیسے کسی

بڑی ہانڈی کو ہنڈا کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سنگا کے معنی ہیں بڑا سنگ عورتیں تو عورتیں ایسے پردہ سے مرد بھی خفا ہیں۔ کسی نے ہمت کر کے اپنے قریبی نامحرم رشتہ داروں سے بھی پردہ کرنا شروع کیا تو اب چاروں طرف سے اعتراض کی بھرمار ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ میاں کچھ نہیں۔ اب عزیزوں آپس میں محبت ہی نہیں رہی۔ دوسرے صاحب بھی اینٹھ گئے کہ ان کے گھ جائیں تو کیا دیواروں سے بولیں۔ اب ہم ان کے یہاں جانا ہی بند کر دیں گے۔ سبحان اللہ! کیا عزیزوں کے تعلقات اور آپس کا میل جول بے پردگی ہی پر موقوف ہے۔ اگر یہ معنی ہیں تو نعوذ باللہ۔ اللہ میاں پر اعتراض ہے کہ ایسے قریبی رشتہ داروں کو بھی نامحرم قرار دے دیا۔ استغفر اللہ۔ مگر اسی میں بعضی ایسی ہمت والیاں بھی ہیں کہ چاہے کوئی ہو وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آتیں۔ چاہے کوئی بُرا مانے یا بھلا مانے۔ اور اکثر جگہ تو پردہ کی ایسی کمی ہے کہ محرمیت نہیں کچھ نہیں، دُور دُور کے رشتہ داروں کو بے تکلف گھر میں بلا لیتی ہیں اور بے محابا ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ بالکل ناجائز ہے اور گناہ ہے۔ مردوں کو چاہیے کہ وہ انہیں تنبیہ کریں۔ اور سب نامحرموں سے پردہ کرائیں۔ اگر کسی کو ناگوار ہو تو بلا سے ہو۔ کچھ پرواہ مت کرو۔ ہرگز ڈھیلا پن نہ برتو۔ بلکہ مردوں کو چاہیے کہ اگر کوئی نامحرم رشتہ دار عورت ان سے پردہ نہ کرے تو وہ خود اس سے چھپا کریں۔

اگر کوئی بُرا مانتا ہے مانا کرے۔ کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ بُرا مان کر کوئی کرے گا کیا؟ اچھا تو ہے سب چھوڑ دیں۔ کوئی اپنا نہ رہے۔ یوں ہی تعلق خلق سے گھٹے جب کوئی اپنا نہ رہے گا اور سب توقع منقطع ہو جائے گی تب تو سوچے گا کہ بس جی اب تو اللہ میاں ہی سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ بقول کسے ؎

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

اب سمجھے گا کہ اعزہ، اقربا، یار دوست یہ سب حجاب تھے، اب کوئی حجاب نہ رہا (بقول جامع

اب تو میں ہوں اور شغل یاد دوست
سارے جھگڑوں سے فراغت ہو گئی)

اب خدا کے بنو، جتنے تعلقات کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے اور بھائی یہ تو سوچو کہ کیسے کیسے راضی کرو گے، راضی تو ایک ہی ہوتا ہے۔ کئی تو راضی ہوا نہیں کرتے۔ تو حضرت یہ کیجئے کہ صرف ایک اللہ کو راضی رکھیے۔ بہت سے آدمیوں کو کہاں تک راضی رکھیے گا۔

(وعظ طریق القلندر)

O

معیشت

فصل (۱)

اسلام اور ترقی

اسلام میں ترقی کی اہمیت

لوگ کہتے ہیں کہ علماء اسلام ترقی سے روکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ الزام صحیح نہیں۔ بلکہ عام طور پر لوگ تو عقلی طریقہ سے ترقی کو ضروری ثابت کرتے ہیں اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ یعنی ہر قوم کے لیے قبلہ کی ایک جہت مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے تو تم ایک دوسرے سے بھلائیوں میں آگے بڑھو۔ ہم کو تو استباق یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا حکم ہے اور یہی ترقی ہے تو ترقی کی ضرورت قرآن شریف سے ثابت ہے بلکہ فاستبقوا امر کا لفظ ہے جو فرض ہونے کا تقاضا کرتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اسلام میں ترقی کرنا فرض ہے۔ اب کس کی مجال ہے کہ ترقی سے روک سکے۔ لہٰذا علماء پر یہ الزام بالکل تہمت ہے قرآنی فرض سے کوئی کسے روک سکتا ہے۔ بس فرق اس قدر ہے کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ دوسری قوموں کے قدم بقدم چل کر ترقی کرو۔ اور علماء یہ کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے اس طرح ترقی کرو۔

(العبرہ بذبح البقرہ ص ۴۵)

تجارت و زراعت کی اہمیت

باقی رہی کسبِ دنیا تو وہ خاص قیود کے ساتھ ضروری ہی نہیں بلکہ آپ سن کر تعجب کریں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرض کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی فرض کفایہ

ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات معاش کی تحصیل فرض کفایہ ہے۔ اور فرض کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بقیہ لوگوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال بالکل غلط ہے کہ علماء کسب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ بھلا فرض کفایہ سے کون منع کر سکتا ہے؟

(خیر المال للرجال)

حصول مال و عزّت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین یعنی اللہ ہی کے لیے ہے عزّت اور اس کے رسول کے لیے اور مسلمانوں کے لیے جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہوگا وہ عزّت حاصل کرنے سے کیسے روکے گا۔ علماء صرف طریق ترقی پر اعتراض کرتے ہیں کہ کلکتہ کا ٹکٹ لے کر پشاور نہیں پہنچ سکتے۔ صحیح طریق وہ ہے جو اللہ و رسول نے بتایا ہے۔ مگر اس طریق کی تحقیق کے لیے یہ سمجھیے کہ عزّت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے۔ لوگ جو ترقی و عزّت چاہتے ہیں اس کی غرض محض بڑا بننا ہے، مگر اس کی اصلی وجہ بیان کرتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ عقلی طریقہ پر انسان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ نفع حاصل کرنا — اور ضرر سے بچنا — آدمی جو کچھ کرتا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ یا نفع حاصل کرتا ہے یا ضرر سے بچتا ہے

دوسری بات یہ سمجھیے کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں اور اس کا طریقہ مال اور عزّت کا حاصل کرنا ہے کہ مال تو فائدہ کے حاصل کرنے کے واسطے اور عزّت ضرر سے بچانے کے لیے۔

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ عزّت اور مال دونوں پسندیدہ ہیں اور حاصل کرنے کے قابل ہیں بشرطیکہ طریقہ سے ہوں۔ شریعت کی حد میں رہ کر ہوں اور جو لوگ مال اور عزّت حاصل کرنے کی برائی کہتے ہیں۔ ان کا مطلب مال

کی محبت اور عزت کی محبت سے منع کرنا ہے۔ اور محبت بھی ایسی جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کہ ان کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا جائے۔ (العبرۃ)

مال کی محبت کا صحیح مصرف

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس راز پر مبنی عجیب ارشاد ہے۔ آپ کے زمانے میں کسی غزوہ سے بے شمار مال و دولت لایا گیا تو آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ کا ارشاد ہے: زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ کہ لوگوں کی نظر میں اپنی شہوتوں (یا خواہش) کی محبت مستحسن کر دی گئی ہے یعنی عورتوں، اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیروں کی محبت لوگوں کے قلوب میں آراستہ کر دی گئی ہے"۔

اور اے پروردگار جب آپ نے خود ہی کسی مصلحت سے اس کی محبت کو مزین کر دیا ہے تو یہ درخواست کرنا کہ ہمارے دل میں اس کی محبت ہی نہ رہے خلافِ ادب ہے اس لیے ہم یہ درخواست نہیں کرتے بلکہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی رضا کا ذریعہ بنا دیجئے۔

مقصود ترقی بھلائی کی ہے یا برائی کی

ترقی اچھی باتوں میں بھی ہوتی ہے اور بری باتوں میں بھی، مگر بھلائیوں میں تو ترقی کوشش کر کے حاصل کرنے کے قابل ہے اور برائیوں میں نہیں۔ ورنہ ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ میں تو ترقی کرنا چاہتا ہوں، بلکہ اسی طرح ہر دھوکہ باز کو، چور کو، گرہ کٹ کو، کفن چور کو، رشوت لینے والے کو، سُود خوار کو، سٹہ باز کو، غرض ہر بد معاش کو یہ کہنے کا حق حاصل ہو گا۔ اس لیے بھلائی میں تو ترقی ترقی ہے اور برائی میں ترقی بُری ہے تو اب جس ترقی کو اور لوگ

کہتے ہیں یا تو وہ اس کا بھلا ہونا ثابت کردیں یا جس ترقی کو علماء اسلام کہتے ہیں ہم اس کا بھلا ہونا ثابت کردیں۔ خود ترقی کرنا تو ضروری اور فرض ہے مگر ان طریقوں نے ترقی کو برائی میں ترقی کرنا بنادیا ہے۔ (العبرہ ص۴۵)

حقیقت ترقی آجکل جس چیز کا نام ترقی رکھ لیا گیا ہے اس کی حقیقت ہے۔ حرص طول امل، خود غرضی۔ اور قطع نظر شریعت سے یہ چیزیں تو عقلاً بھی ناجائز ہیں۔ مگر لوگوں نے حرص وغیرہ کا ایک خوبصورت نام ترقی رکھ لیا، مگر صرف نام رکھ لینے سے حقیقت تو نہ بدلے گی۔ میں اس کو مفصل بیان کرتا مگر یہ موقع اس کے لیے کافی نہیں۔ مگر میں اجمالاً ایک مختصر بات کہتا ہوں وہ یہ کہ عقلاً اول اس بات کا فیصلہ کرلیں کہ ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ پس خوب سمجھ لو کہ ترقی کی حقیقت وہی ہے جس کی قرآن شریف اجازت دیتا ہے، یعنی حلال طریقہ سے بڑھنا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ جائز ترقی محدود ہے یا غیر محدود ہے۔ اگر محدود ہے تو اس کی حد بیان کیجیے اور انشاء اللہ شریعت سے بہتر اس کی حدود کوئی بھی نہ بیان کرسکے گا۔ اور اگر غیر محدود ہے یعنی اس میں کوئی قید نہیں۔ اگر اس میں مضرتیں بھی ہوں تو اس کی بھی اجازت دی جاوے تو کیا خدا تعالیٰ سے جو کہ بوجہ علیم و خبیر و رحیم و علیم ہونے کے سب سے زیادہ مصالح عباد کی رعایت فرماتے ہیں۔ اس ترقی غیر محدود کی اباحت کی توقع رکھ سکتے ہو؟ حالانکہ گورنمنٹ سے بھی جس کی نظر مصالح کو اس قدر محیط نہیں تم اس کی توقع نہیں کرسکتے۔ دنیا کی ہر گورنمنٹ صرف محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے اور آپ کو مقید بناتی ہے۔ ترقی غیر محدود کی کوئی گورنمنٹ اجازت نہیں دے سکتی۔ تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ حق نہیں کہ وہ آپ کو مقید کریں اور اگر کوئی عدم احاطۂ واقعات کے سبب یہ کہے کہ گورنمنٹ تو غیر محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ بہت

سے ذرائع غیر مشروع کی قانون میں اجازت ہے تو چاہیئے آج سے ڈکیتی کیجئے۔ دوسروں کے مال چھین چھین کے خوب اپنا مال بڑھائیے۔ اس کے بعد اگر آپ عدالت میں پکڑے ہوئے جاویں تو صاف کہہ دیں کہ ہم تو ترقی کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا عدالت اس کو قبول کرے گی ؟ اگر نہیں قبول کرے گی تو معلوم ثابت ہو گیا کہ گورنمنٹ نے ترقی کی یہ حد قائم کی ہے کہ ڈکیتی نہ ہو، چوری نہ ہو، غصب نہ ہو پس جب گورنمنٹ ترقی کے لیے حدود قائم کر سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ حدود قائم نہیں کر سکتے ؟ افسوس ہے کہ گورنمنٹ سے تو غیر محدود ترقی کی امید نہ رکھیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اُمید ہو کہ ترقی غیر محدود کی اجازت دیں۔ اور اگر ترقی غیر محدود مطلوب ہے تو اجازت دیجئے کہ میں آپ کا کرتہ اتار لوں اور آپ کا مکان اور جائیداد چھین لوں۔ کیونکہ آپ کے نزدیک ترقی کی کوئی حد تو ہے ہی نہیں۔ اگر آپ کو یہ گوارا ہو تو میں ادب سے عرض کروں گا کہ آپ میرے خطاب کے قابل نہیں ایسا شخص تو مجنون ہے جس کو ڈاکٹر سے جنون کا سرٹیفکیٹ لینا چاہیے۔ غرض یہ کہ ترقی و تمدّن کی حقیقت اتنی ہی ہے جتنی شریعت نے اجازت دی ہے اور اس میں شریعت نے تنگی نہیں کی۔ شریعت نے اجازت دی ہے ترقی کی مگر اس کے حدود ہیں۔ (وعظ احکام الجاہ)

اسلاف کی ترقی اور موجودہ ترقی

موجودہ ترقی کا حاصل تو حرص ہے اور شریعت نے حرص کی جڑ کاٹ دی ہے۔

صحابہ کرام نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ تھے کبھی ایسے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کی تعلیم فرمائی۔ نہ حضورؐ ہی کی سیرت میں کوئی ایسا واقعہ ہے۔ ان سب کی ترقی تو دین کی ترقی تھی۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی دُنیا کی بھی وہ ترقی ملی کہ آج لوگوں کو خواب میں نصیب نہیں لیکن

مقصود صرف دینی ترقی تھی۔ چنانچہ ان کی اس شان کو خود خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ۔ الخ ! یہ وہ لوگ ہیں اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دے دیں تو یہ نماز ادا کرتے رہا کریں۔ زکوٰۃ دیتے رہا کریں اور بھلائیوں کا حکم اور برائیوں سے روک ٹوک کرتے رہا کریں — یہ ہے ترقی کے بعد ان کے خیالات کا نقشہ جس میں کسی شک و شبہہ کی بھی گنجائش نہیں۔ (تجارت آخرت حصہ دوم)

دوسری قوموں کے سامانِ عیش کو دیکھ کر مسلمانوں کی رال ٹپکتی ہے، مگر یہ نہیں جانتے کہ بھلائی اور سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو دُنیا زیادہ نہ ملے۔ اگر ہم کو زیادہ مال دیا جاتا تو رات دن دنیا ہی کی فکر میں رہتے۔ آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خُوب نیک کام کریں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خُوب خرچ کریں تو یاد رکھیئے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ کو کیا خبر ہے کہ اس وقت آپ کے جو ارادے ہیں زیادہ مال ملنے کے بعد بھی یہ باقی رہیں گے یا نہیں۔ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

حضراتِ صحابۂ کرامؓ سے بڑھ کر کون نیک نیّت ہو گا مگر حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہو گی جبکہ میرے بعد سلطنتیں اور شہر فتح ہوں گے اور تمہارے پاس زیادتی کے ساتھ مال و سامان اور غلام و نوکر ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس وقت ہم اللہ کی عبادت کرنے کے واسطے فارغ ہو جائیں گے۔ نتفرغ للعبادۃ ونکفی المؤنۃ (ہم عبادت کے لیے فارغ ہو جائیں گے اور مشقت سے بچ جائیں گے) حضورؐ نے فرمایا "تمہاری وہ حالت اچھی ہے جو آج کل ہے" جب حضورؐ نے صحابہؓ کے لیے زیادہ پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادت

بیں پہلے سے زیادہ ترقی کی ہے اور دنیا میں نہیں گھسے تو اوروں کے لیے کب پسند فرمائیں گے۔ اس لیے مسلمانوں کو دوسری قوموں کا مال دیکھ کر رال نہ ٹپکانا چاہیے۔ ادلئک عجلت طیباتھم فی حیاتھم الدنیا ، یہ لوگ تو وہی ہیں جن کو ان کی نعمتیں دنیاوی زندگی ہی میں دے دی گئی ہیں، اور آخرت میں تو کافروں کے لیے عذاب ہی ہے۔ (منظاہر الاحوال ص۱۸)

حکومت سے مقصود اسلامی نظریات و اعمال میں فرق

لوگ علماء کو کہتے ہیں کہ تم کو سیاسیات کی کچھ خبر نہیں۔ یہ وقت جائز و ناجائز کے سوال کا نہیں۔ اب تو جس طرح ہو حکومت کی ترقی ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس ان لوگوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ شریعت میں خود حکومت مقصود ہی نہیں بلکہ "ملاّ پن" چاہا جاتا ہے اور سلطنت و حکومت سے بھی مقصود ملاّ پن ہی پھیلانا ہے کہ جو ایمان سے محروم ہیں ان کو ایمان کی دولت سے مالا مال کیا جائے یا اپنے میں ملا کر رکھا جائے کہ وہ ایمان اور شریعت کے نُور کو دیکھیں اور اپنی آنکھیں کھولیں۔ حکومت سے تو صحابہؓ میں بھی یہ ملاّ پن پسند فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے: الذین ان مکنّٰھم الخ یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دے دیں تو یہ نماز پڑھتے رہا کریں، زکوٰۃ دیتے رہا کریں اور بھلائی کا حکم اور برائی سے روک ٹوک کرتے رہا کریں۔ (علاج الحرص ص۱۷)

حاصل یہ ہے کہ مال، عزّت، حکومت، تینوں کی ترقی میں خود ان کی ترقی تو زیادہ پسند نہیں۔ ہاں اگر دینداری کی ترقی مقصود ہو تو یہ سلف کی ترقی کے موافق ہوگی اور اسی سے تینوں ترقیاں خود بخود حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن اگر یہ تینوں ترقیاں شریعت کی حد میں رکھ کر ہوں جن سے کسی حکم کا خلاف نہ لازم آئے تب تو بھلائی میں ترقی ہے ورنہ برائی کی ترقی ہے اور بہت بُری اور خالص

حرص ہے تو یہ سمجھیے کہ لوگوں نے حرص کا نام ترقی رکھ لیا ہے تاکہ یہ عیب چھپا رہے اور پھر کبھی اس کی اصلاح بھی نہ ہو سکے۔ (تسہیل)

اور اگر روپیہ کا نہ ہونا دین کے ضعف کا سبب ہے تو امراء میں دین زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ سو آپ مشاہدہ کر لیں کہ روپیہ والوں میں دین زیادہ ہے یا غریبوں میں۔ دراصل اگر قلب سلیم ہے تو روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں مضر نہیں اور اگر قلب سلیم نہیں ہے تو روپیہ کا نہ ہونا تو کم مضر اور روپیہ کا ہونا زیادہ مضر۔

(دین و دنیا: طریق النجاۃ ص۳۱)

ہم نے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جن کو فراغت نصیب ہو۔ پھر بھی توجہ الی اللہ کی فکر ہو الا ماشاء اللہ۔ مال کے ساتھ تو زیادہ تر خدا سے غفلت، بے پروائی، غرباء کی تحقیر، بے رحمی اور ظلم ہی کی زیادت ہوتی ہے۔ (الامتحان ص۹)

زمانہ بدلنے کی حقیقت اب لوگ کہتے ہیں زمانہ بدل گیا، تم بھی بدل جاؤ۔ بھائی ہم سے تو اب بدلا نہیں جاتا۔ تمہیں اختیار ہے۔ کسی نے کہا ہے:

ع زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں:

ع زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ مساز

اور زمانہ کیا بدلتا اگر درحقیقت دیکھا جائے تو زمانہ ہمارا تابع ہے۔ ہم ہی تو زمانہ کو بدلتے ہیں، زمانہ بیچارہ ہمیں کیا بدلے گا۔ جب ہم اپنے آپ کو بدل دیتے ہیں۔ تب ہی تو زمانہ بدلتا ہے۔ زمانہ ہم سے علیحدہ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے۔ تو جب زمانہ کو ہم خود بدل سکتے ہیں تو ہم اس کو محفوظ بھی رکھ سکتے ہیں۔ یہ اکبر حسین جج کا نکتہ ہے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ کہتے تھے کہ لوگ زمانہ کی برائی کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

کہ بھائی کیا کریں زمانہ ہی بدل گیا۔ حالانکہ زمانہ کیا آپ سے آپ بدل جاتا ہے؟ ارے تم خود بدلے ہو تو زمانہ بدلا ہے۔ جب تم سب بدل گئے تو یہی زمانہ کا بدلنا ہو گیا۔ زمانہ کوئی مستقل چیز تھوڑا ہی ہے۔ زمانہ تم خود ہو۔ واقعی سچ کہا ہے زمانہ کی حقیقت تو ہم خود ہی ہیں۔ ہم اگر نہ بدلیں، زمانہ بھی نہ بدلے۔ کیا اچھی بات کہی بڑا حکیمانہ دماغ تھا۔ (ملفوظات ع۶ ملفوظ ۶۱)

مسلمانوں کی ترقی کا معیار

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آج کل تو ایسی گڑبڑ ہو رہی ہے کہ اہل علم تک غلط مسائل بتانے لگے اور احکام شرعیہ میں تحریف کرنے لگے۔ فرمایا کہ جی ہاں بے سری فوج ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ ہر شخص آزاد ہے کوئی سر پر تو ہے نہیں۔ جو جس کے جی میں آتا ہے کرتا ہے۔ احکامِ شریعت کو اپنے اغراض و مقاصد کا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ یہ سب خرابیاں قلب میں خدا کی خشیت نہ ہونے سے ہو رہی ہیں۔ عرض کیا کہ بتلانے اور سمجھانے پر یہ جواب دیتے ہیں کہ تم پرانے خیال کے ہو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب زمانہ ترقی کا ہے۔ فرمایا کہ پرانی تو بہت سی چیزیں ہیں ان کو بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ زمین بھی پرانی ہے، آسمان بھی پرانا ہے اور اس میں جو ستارے ہیں مثلاً چاند ہے، سورج ہے یہ بھی پرانے ہیں۔ ان سے بھی انتفاع نہیں کرنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ یہ ترقی کا زمانہ ہے۔ تو گویا سلف سے اس وقت تک تنزل ہی رہا۔ نالائقوں کو خبر نہیں کہ اگر ملک و مال جاہ و ثروت ہی ترقی کا معیار ہیں تو پھر شداد و نمرود و فرعون، ہامان، قارون تو انبیاء علیہم السلام سے بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے۔

ارے مسلمانوں کی ترقی کا معیار ہے دین۔ اگر دین درست ہے اور اللہ راضی ہے یہ ان کی ترقی ہے اور دین درست نہیں اور اللہ ناراض ہے تو تنزّل ہے۔ آخر

کفر و اسلام میں فرق ہی کیا ہوا۔ ہاں اگر دین کے ہوتے ہوئے دنیا بھی تمہارے پاس ہو تو کون منع کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے اشاعتِ دین اور تبلیغ دین میں اور مدد ملے گی۔ پھر وہ دنیا دنیا ہی نہ ہوگی بلکہ عین دین ہوگا۔

(الافاضات ع ۲ ملفوظ ۱۰۱، ۱۴ شوال ۱۳۵۰ھ)

مسلمان مسلمان ہوں۔ پھر اگر امیر کبیر بھی ہوں بلکہ سلاطین بھی ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ ہاں عیسائی نہ ہوں، نیچری نہ ہوں، ہندو نہ ہوں، ملحد نہ ہوں۔ مگر لوگ مولویوں کے متعلق نہ معلوم کیا کیا خیال پکائے بیٹھے ہیں کہ یہ مسلمانوں کو پستی سکھلاتے ہیں۔ (الافاضات ع ۲ ص ۲۴۷ ملفوظ ۳۷۸)

اگر مال کے ساتھ دین پوری طرح محفوظ رہے تو تم کو ترقی دنیا سے کون روکتا ہے جتنی چاہے ترقی کرو۔ خواہ بادشاہ ہو جاؤ، خواہ وزیر بن جاؤ، خواہ ہفت اقلیم کو فتح کر لو، مگر حدود کے اندر رہو۔ (الجبر بالصبر ص ۴۳)

وہ شخص دنیا دار نہیں جس کے قلب میں تو محبت ہو خدا اور رسول کی اور ہاتھ میں مال رکھتا ہو جس کی علامت یہ ہے کہ اگر لاکھ روپے ملتے ہوں اور دین کا نقصان ہوتا ہو تو دین کے مقابلہ میں لاکھ روپے پر لات مار دے۔ (الحیٰوۃ ص ۲۸)

آج کل بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ دنیا کو دین پر مقدم کر کے دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طریقہ سراسر گمراہی ہے کہ دنیا کو مقدم رکھ کر دین کو اس کا تابع بنائیں۔ اگر دین کو مقدم رکھیں اور پھر حصول دنیا کی فکر کریں۔ بشرطیکہ حدودِ شرعیہ سے تجاوز نہ ہو تو پھر کامیابی بھی بہت قریب ہے۔

(الافاضات ع ۵ ص ۲۸۹ ملفوظ ۴۵۶)

کیا ترقی سود کو حلال سمجھنے پر موقوف ہے

اس زمانہ میں یہ مذاق بہت غالب ہو گیا ہے کہ حرام کو حرام نہیں سمجھتے۔

لاہور میں بعض لوگوں کا خیال معلوم ہوا کہ سود کو حلال کرنے کی فکر میں ہیں تاکہ مسلمانوں کی ترقی ہو۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آپ کے زعم کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سود ترقی کا ذریعہ ہے۔ تو یہ سوچیے کہ ترقی کا مدار سود لینے پر ہے یا اس کو حلال سمجھنے پر۔ کیا آپ کے پاس ایسی کوئی دلیل ہے کہ ترقی سود کو حلال سمجھنے پر موقوف ہے؟ تو پھر اس اعتقادِ حلّت میں کیوں کوشش کی جاتی ہے۔ اگر سود پیتے ہو تو گناہ تو سمجھو۔ یوں تو سمجھو کہ برا کر رہے ہیں۔

(العاقلات الغافلات، ۲۱ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ)

قابلِ قدر نصیحت

آپ لوگ اگر اپنی پوری اصلاح نہ کر سکیں تو کم از کم دو باتوں کا تو اہتمام کر لیں:

۱۔ ایک یہ کہ اپنے عقائد صحیح کر لیں۔

۲۔ دوسرے جو ناجائز اعمال آپ کرتے ہیں ان کو حرام سمجھ کر کریں کھینچ تان کر ان کے جائز کرنے کی کوشش نہ کریں۔

کیونکہ آپ کی لغو تاویل سے حرام فعل حلال تو ہو نہیں سکتا، مگر اس تاویل سے یہ مفسدہ لازم آئے گا کہ آپ حرام کو حلال سمجھیں گے اور حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے قطعی یا ظنی۔ تو یہ حالت سخت خطرناک ہے اور اگر حرام سمجھ کر کریں گے تو کفر کا خطرہ نہ رہے گا۔ صرف معصیت رہ جائے گی۔ یہ کفر سے اہون ہے۔ دوسرے جب آپ اس کو حرام سمجھتے رہیں گے تو کیا عجب ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جائے۔ اور اگر مان لیا کہ آپ عمر بھر ان افعال کو نہ چھوڑ سکیں گے تو کفر سے تو بچاؤ رہے گا۔

(علم و عمل صـ ۱۲۷)

ترقی کے متعلق چند غلط تصورات

مسلمانوں کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے مگر اب تک

حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ لوگ سُود لیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو ترقی ہورہی ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اگر سُود میں ترقی کا اثر ہوتا تو چاہیے کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ سُود کے گناہ میں مبتلا ہیں ان کو بھی ترقی ہوتی، حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ ترقی پائے ہوئے نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شریعت میں چونکہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز کہا ہے۔ اس لیے مسلمان ترقی نہیں کرسکتے، مگر یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ معاملوں میں شریعت کی حدود کے پابند کتنے تاجر ہیں۔ غالباً دو چار کے سوا کوئی نہ ملے گا تو پھر ان تاجروں کو ایسی ترقی کیوں نہ ہوئی۔ یہ کونسے ناجائز معاملے چھوڑ دیتے ہیں کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھا دینا چاہتے ہیں کہ یہی پردہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم اور صنعت وحرفت سیکھیں گی خود بھی ترقی کریں گی، اولاد کو بھی ترقی کرائیں گی۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں میں بعض قوموں کی عورتیں پردہ نشین نہیں ہیں اور زیادہ تعداد ایسی غریب قوموں کی ہے جن میں ہمیشہ سے پردہ کا رواج نہیں۔ تو اگر بے پردگی ہی سے ترقی ہوتی ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ کرلی۔ تو معلوم ہوا کہ ایسی ایسی باتیں غیر قوموں کی ترقی کا سبب نہیں۔ (العبرہ ص ۴۴-۴۵)

غیر مُسلموں کی ترقی کا راز

غیر قوموں کی ترقی کا اصل سبب جو باتیں ہیں وہ دوسری ہیں۔ وہ ان کی ایسی صفتیں ہیں جو انہوں نے آپ ہی کے گھر سے لے لی ہیں جیسے منتظم ہونا، مستقل مزاج ہونا، وقت کا پابند ہونا، بُردبار رہنا، انجام سوچ کر کام کرنا، صرف جوش سے کام نہ کرنا ہوش سے کام لینا، آپس میں اتفاق واتحاد کرنا۔ اور یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور ان سب حکموں کا خاصہ ہے کہ ان کو اختیار کرنے سے ترقی

ہوتی ہے اور چھوڑ دینے سے ترقی والوں کی ترقی بھی خاک میں مل جاتی ہے چاہے کوئی اختیار کرے چاہے کوئی چھوڑے۔

(العبرۃ بذبح البقرہ)

اسلامی اصول کی خاصیت

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اصول اسلامیہ کی خاصیت کی بالکل ایسی مثال ہے کہ جیسے گل بنفشہ میں خاصیت ہے۔ زکام کے دفع کی خواہ مسلمان پیئے یا کافر پیئے۔ اسی طرح جو شخص اصول صحیحہ پر عمل کرتا ہے چاہے مسلمان ہو یا کافر، وہ راحت پاتا ہے۔ اصولِ صحیحہ میں فطرۃً یہ خاصیّت ہے کہ وہ پریشانی اور کلفت کو دُور کرتے ہیں۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کچھ قید نہیں۔ جیسے شاہراہ سے جو گزرے گا وہ راحت سے سفر کرے گا۔ درختوں کا سایہ اس کو ملے گا۔ اب چاہے مسافر مسلم ہو یا غیر مسلم۔ شیخ، سیّد، مغل، پٹھان ہو یا بھنگی اور چمار ہو اس میں کسی کی کوئی قید نہیں۔ البتہ آخرت میں ترتب آثار کے لیے اسلام بھی شرط ہے۔

(ملفوظات ع۲، ملفوظ ع۲۴۳)

غیر قوموں کی تدابیر مسلمانوں کو مفید نہیں

میں یہ نہیں کہتا کہ جو تدبیریں یورپ اور غیر قوموں نے اختیار کی ہیں اُن کا دنیوی کامیابی میں کوئی اثر نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ مسلمانوں کو ان تدبیروں سے فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مسلمانوں کے لیے ان تدبیروں کے اثر کرنے میں ایک رکاوٹ ہے اور وہ رکاوٹ ان کا گناہ اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنا ہے اور یہ رکاوٹ کافروں میں نہیں ہے کیونکہ ان پر جزئی عملوں کی ذمہ داری نہیں۔ ان پر تو ایمان لانے کی ذمہ داری ہے اور ایمان نہ لانے پر اور کفر کرنے سے پر ایسا سخت عذاب ہو گا جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ باقی عملوں کی ان سے پوچھ نہ ہو گی اور جب مسلمان ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے

حکم کے خلاف ہیں تو ان کو کامیابی ہوا نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ ان تدبیروں میں سے اثر کو دور کر دیتے ہیں تاکہ اس مخالفت کی سزا دنیا ہی میں بھگت لیں۔ اور ہر قوم کی ترقی اور کامیابی کا طریقہ الگ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو فائدہ دے وہ سب کو ہی فائدہ دے اور اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ تدبیریں ہمیں بھی فائدہ دیں گی تب بھی خداوندی احکام کی پابندی فرض ہے اور ان ناجائز تدبیروں کا اختیار کرنا ہرگز روا نہ ہوگا۔

دیکھیے شراب جوئے اور سود میں بھی نفع ہے۔ خود ارشاد عز وجل ہے: قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (کہہ دیجئے شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو کچھ فائدے بھی ہیں) لیکن ایسے فائدہ کو لے کر کیا کریں جس میں خدا تعالیٰ کا غضب بھی ملا ہوا ہو۔ لوگ کہتے تو ہیں شریعت کے خلاف اور پھر چاہتے ہیں یہ کہ علماء ساتھ دیں۔ (المرابطہ ص ۴۵)

یہ حبِّ دنیا پکارنے والے سب سر سیّد احمد خاں کے چیلے چانٹے ہیں۔ وہ بے چارے یہی گیت گاتے گاتے مر گئے اور اب ان کی باری ہے۔ عمر گزر گئی۔ ان لوگوں کی "صدا سنتے ہوئے ترقی ترقی" لیکن اس معمّہ کا حل ہی نہ ہوا کہ آخر ان کا منشا ہے کیا؟ نصوص کا انکار ہے۔ صاف تو کہتے نہیں۔ مگر قرآن و حدیث میں کتر بیونت تحریف کرنا یہ ان لوگوں کا شغل غالب ہے جس سے انکارِ نصوص کا شبہہ ہوتا ہے۔ پھر طرفہ یہ کہ اس ترقی کے باب میں لوگوں نے جس قدر تدابیر غیر مشروع اختیار کیں روز بروز اجتماعی طور پر مسلمانوں کا تنزل ہی تنزل دیکھا اور ذلّت ہی گلوگیر دیکھی۔

تعلیمِ جدید و غیر مشروع ترقی

خیالات اور آراء اس وقت نہایت منتشر ہیں اور طلبِ مال اور طلبِ جاہ کا بہت چرچا اس وقت ہو رہا ہے جس کو دیکھیے اس میں منہمک ہے۔ نیز ان کے لیے کچھ تدابیر

بھی اپنی طرف سے تراش رکھی ہیں اور ان میں یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ کون سی تدبیر حلال ہے اور کونسی حرام ہے۔ بکثرت خیال ادھر متوجہ ہیں کہ اصل چیز مال اور جاہ ہے اور اسی کو ترقی کہا جاتا ہے اور اسی کے لیے سعی کی جاتی ہے۔ خواہ وہ سعی شریعت کے موافق ہو یا مخالف ۔ چنانچہ ذرائع تحصیلِ مال وہ ہیں جن کی بدولت شریعت سے بُعد ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ تعلیمِ جدید کمال کے ساتھ حاصل کرنا چاہیے اور اس میں بڑے بڑے درجے حاصل کرنا چاہئیں۔ گو اس پر کیسے ہی آثار و مفاسد مرتب ہوں۔ آجکل تعلیم جدید کے متعلق علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تعلیم جدید سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں۔ حالانکہ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہو رہے ہیں تو علماء ہرگز اس سے منع نہ کرتے۔ لیکن اب دیکھ لیجئے کہ کیا حالت ہو رہی ہے۔ جس قدر جدید تعلیم یافتہ ہیں۔ باستثناء شاذ و نادر ان کو نہ نماز سے غرض ہے، نہ روزے سے، نہ شریعت کے کسی دوسرے حکم سے۔ بلکہ ہر ہر بات میں شریعت کے خلاف ہی چلتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس سے اسلام کی ترقی ہوتی ہے۔

چنانچہ بعض نے تو تصریحاً یہ کہہ دیا کہ یہ وقت حلال و حرام دیکھنے کا نہیں ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جس طرح ہو سکے روپیہ سمیٹ لو۔ غور کیجئے جب مسلمان ایسی رائے دینے لگے تو علما کا کیا قصور ہے اگر وہ تعلیم جدید سے روکیں ؟ علیٰ ہذا ترقی جاہ کہ اس میں بھی یہ تمیز نہیں کہ ذریعہ اس کی تحصیل کا حلال ہے یا حرام۔ اکثر ایسے ذرائع سے جاہ حاصل کی جاتی ہے جو کہ شریعت کے بالکل ہی خلاف ہیں اور پھر اس پر طرہ یہ کہ جاہ سے کام بھی ناپاک ہی لیا جاتا ہے۔ کبھی اس کو آلہ ظلم و ستم بناتے ہیں اور اسی کو اپنی شانِ ریاست

سمجھتے ہیں۔

ترقی اسلام کی حقیقت ماجو اموٹی بات ہے کہ جب اس میں اسلام کی کوئی بات نہ رہی تو وہ اسلام کی ترقی کہاں ہوئی۔

البتہ مال وجاہ کی ترقی ہوئی۔ سو اسلام روپیہ اور جاہ کو نہیں کہتے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محتاج تفسیر نہیں چھوڑا اور خدا تعالیٰ نے بھی اس کی تفسیر کا خاص اہتمام فرمایا اور عجب نہیں کہ اسی زمانہ کے لیے اہتمام کیا ہو۔

خدا تعالیٰ نے ایک بار جبرئیل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بشکل انسان بھیجا۔ وہ ایک مجلس عام کے وقت تشریف لائے اور حضورؐ سے دوسروں کے سنانے کو چند سوال کیے۔ چنانچہ ان سوالوں میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ اسلام کیا چیز ہے؟

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ان تشہد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد الرسول واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وصوم رمضان وان تحج البیت۔ یعنی شہادتوں کا اقرار کرو دل سے بھی اور زبان سے بھی ظاہر ہو اور نماز وزکوٰۃ وصوم وحج کا ادا کرنا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر سے اسلام کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اسلام کی ترقی تو یہ ہوگی کہ ان احکام کے امتثال میں ترقی ہو، نماز میں ترقی ہو روزے میں ہو، نہ یہ کہ ٹھم ٹھم ہو، عالیشان محل ہو۔ اس کو اسلام کی ترقی نہ کہا جائے گا۔

غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی تفسیر فرما چکے ہیں تو آج کون ہے کہ وہ بڑے بڑے عہدوں کو اور مال وجاہ کی ترقی کو اسلام کی ترقی بتلائے۔ مسلمان

اگر اپنی حالتِ دینیہ پر پورے قائم بھی رہتے تب بھی ان چیزوں کو اسلام کی ترقی نہ کہتے۔ البتہ ترقی لاہل الاسلام کہتے مگر جب کہ وہ دین پر باقی بھی نہیں ہیں تو اس حالت میں یہ ترقی مال لاہل الاسلام نہ ہوئی بلکہ ترقی مال لاہل الکفر ہوئی۔ یعنی جب نماز روزہ، عقائد اسلام سب رخصت ہو گئے۔ اب تو اگر مال اور جاہ کو ترقی بھی ہوئی تو یہ اہلِ اسلام کی ترقی بھی نہ کہلائے گی بلکہ اہلِ کفر کی ترقی کہلائے گی۔ (علم وعمل ص۵۵۶)

اساسِ ترقی تعلیماتِ اسلامیہ ہی ہیں

حضرات! آپ کو اس عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ جم جانا چاہیے کہ مسلمان جب ترقی کرے گا احکامِ شرعیہ کی پابندی ہی سے کرے گا۔ اور یہ خیال دل سے بالکل نکال دینا چاہیے کہ بغیر اتباعِ شریعت کے بھی مسلمان ترقی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ بعض کا خیال ہے کہ دیندار ہونے اور نماز روزہ کی پابندی کو ترقی میں کیا دخل بلکہ اس کے لیے صرف تدابیرِ سیاسی کافی سمجھتے ہیں۔ سو یہ خیال سراسر باطل اور یورپ کی دہریت کے اثر سے ناشی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان تمام احکام شرعیہ پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہوں گے ان کو محض تدابیر سے دنیوی ترقی بھی نصیب نہ ہو گی کیونکہ احکامِ شرعیہ اور اخلاقِ اسلامیہ کے دو ثمرے ہیں:

۱۔ ایک قبول عند اللہ۔

۲۔ دوسری دنیوی ترقی۔

قبولِ عند اللہ کے لیے تو ایمان و اسلام شرط ہے جو مسلمان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا ثمرہ ہر شخص کو حاصل ہو جاتا ہے جو اخلاقِ اسلامیہ پر عمل کرنے لگے چنانچہ اس وقت تک جن اقوام نے بھی ترقی کی ہے تعلیماتِ اسلامیہ کو اختیار کر کے ہی

ترقی کی ہے۔ تنظیم، دیانت، اتحاد، ایثار، عدل، وفائے عہد، سادگی، کفایت شعاری، محنت، خدمتِ قوم اور قومی نشان کی حفاظت وغیرہ وغیرہ کس کے گھر کی چیزیں ہیں؟ کیا اسلام اور مسلمانوں سے پہلے کسی نے ان کا نام بھی سُنا تھا؟ یہ صرف مسلمانوں کے گھر کی دولت تھی، جس سے آج وہ کوسوں دُور ہیں اور دوسری قومیں مضبوطی کے ساتھ اس کو تھامے ہوئے ہیں۔ افسوس اس وقت مسلمان ہی ایک ایسی قوم رہ گئی جس کو جس شکل اور وضع میں چاہو ڈھال لو، کبھی عیسائیوں کی شکل میں ان کو دیکھ لو کبھی ہندوؤں کی وضع میں۔

ترقی مسلم کا صحیح اور آزمودہ طریقہ و تدابیر اور بالفرض محال اگر احکامِ اسلام اور شریعت مقدسہ کو پامال کر کے ترقی ہو بھی گئی تو یہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کہلائے جانے کی قابل تو ہو گی نہیں تو پھر اپنے کو مسلمانوں میں شمار کر کے کیوں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرتے ہو؟ جو دل میں ہے صاف ہی کہہ دو! اور جو قوم پہلے سے ترقی یافتہ ہے اس میں کھلم کھلا ہی کیوں نہیں مدغم ہو جاتے۔ باقی اس کتر بیونت سے کیا فائدہ کہ کہیں قرآن کے معنی بدلتے ہیں کہیں حدیث کو جھٹلاتے ہیں۔ خدا جانے تدابیرِ مشروع اور منصوصہ پر عمل کرتے ہوئے کیوں سر کٹتا ہے! ارے بطور امتحان ہی ان پر عمل کر کے دیکھ لو، کوئی زہر تو نہیں ہے کہ گلے سے اترتے ہی ہلاکت ہو جائے گی یا کوئی سانپ تو نہیں کہ ہاتھ لگاتے ہی تم کو ڈس لے گا۔ آخر تم ہی سمجھو کہ ساری عمریں تمہاری بھی کھپ گئیں، اب تو تجربہ بھی ہو گیا پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ مشاہدات اور واقعات کے بعد تو رائے بدل جاتی ہے۔ آخر کیا اب تک دوسروں کی گداگری نہیں کر چکے ہو؟ اب ذرا ان کے سامنے بھی سر رکھ کر دیکھ لو اور یہ سر رکھ کر دیکھنا، اگر اخلاص سے نہیں تو بہ نیتِ تدابیر ہی سہی۔ بہت کچھ بتوں کی پرستش کر کے دیکھ

لیا۔اب ذرا خدا کو بھی سجدہ کر کے دیکھ لو۔ (ملفوظات ع۵ ص۱۴۲)

اے مسلمانو! تم ترقی کے لیے ہیشہ یہ دیکھو کہ مسلمانوں کو کیونکر ترقی ہوئی اور یہ ہرگز نہ دیکھو کہ کفار کو ترقی کیونکر ہوئی۔ کیونکہ ہر قوم کا مزاج باطنی الگ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو مفید ہو وہ سب کو مفید ہو۔ بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو صورت ایک قوم کے کسی فرد کو مفید ہو وہ سب افراد کو مفید ہو۔ لطیف المزاج کو وہ چیزیں نافع نہیں ہوتیں، جو ایک گنوار کو نافع ہیں۔ تم اسلام کے بعد لطیف المزاج ہو گئے ہو، تمہارا مزاج شاہانہ ہو گیا ہے۔ تم کو وہ صورت مفید نہ ہو گی جو کفار کو مفید ہے۔

نیز تم ایسے ہو جیسے سر کی ٹوپی کہ جہاں اس میں ذراسی ناپاکی لگی فوراً اتار کر پھینک دی جاتی ہے اور جوتے پر اگر ناپاکی لگ جائے تو اس کو نہیں پھینکتے۔ اسی طرح حق تعالیٰ تم کو ناپاکی اور گندگی میں ملوّث نہیں دیکھنا چاہتے۔ اگر تم ملوّث ہو گئے تو فوراً پٹرے پر کوٹے پیٹے جاؤ گے اور کفار چاہے جتنے ملوّث ہو جائیں گوارا کیا جائے گا۔

پس اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو تو یہ دیکھو کہ پہلے مسلمانوں کو ترقی کیونکر ہوئی تھی چنانچہ جن لوگوں نے صحابہؓ کی ترقی کا حال تاریخ میں دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات کو محض دین کے اتباع کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ وہ دین میں پختہ تھے۔ ان کے معاملات و معاشرت و اخلاق بالکل اسلامی تعلیم کے مطابق تھے۔ اس لیے دوسری قوموں کو خواہ مخواہ اسلام کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اور کسی نے مقابلہ کیا تو چونکہ انہوں نے خدا کو راضی کر رکھا تھا اس لیے خدا تعالیٰ ان کی مدد کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بے سروسامانی اور قلتِ عدد کے۔ عدو کی بڑی بڑی سلطنتوں کو ان کے مقابلہ کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص۲۲)

مومن کا اصل مال

وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ یعنی اللہ میاں جس کو چاہیں بے حساب روزی دیں ان کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل و مشیت سے جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب نہیں ...... یہ ہے مومن کا اصل مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں جو مآل میں کام آوے (یعنی اعمال صالحہ) وہ ہے مال حقیقی۔ واللہ مال سے وہ راحت نہیں جو اعمال سے اس کو فرماتے ہیں: وَمَنْ یَّعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی الخ اور یہ کہ نیک کام کرنے والوں کو جو مومن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی دل کو سکون و اطمینان ہوگا...... دوسری جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی۔ یعنی جس نے منہ موڑا میری یاد سے اس کو ملتی ہے تنگی کی روزی اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ یہ نتیجہ ہے خدا سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت میں رہا اور وہاں بھی مصیبت۔ مشاہدہ ہے کہ دنیا داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہی ہے۔ مال و دولت ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ میسّر نہیں بعض اوقات تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ سے اس مال کا عیش بھی اور مآل کا عیش بھی دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی اصل مال اس کو کہنا چاہیے۔

حرصِ دُنیا کا علاج

توبہ کی حقیقت اور اس کے معنی ہیں توجہ الی اللہ.... اور ظاہر ہے کہ حرص کی حقیقت دنیا کی طرف توجہ اور میلان ہے۔ اب اس توجہ کو دوسری طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا باقی نہ رہے گی۔ پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیر دیا جائے۔ اگر وہ بھی محبوب ہو تو اس کی

طرف توجہ اشد ہوگی اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہوگا۔

اب سمجھو کہ حق تعالیٰ سے ہر شخص کو فطری تعلق ہے اور اُسی ذات کی طرف ہر ایک کو طبعی میلان ہے۔ فقط مسلمان ہی کو نہیں کافر کو بھی کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے تو کسی سبب سے ہوتی ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں حسن و جمال جود و نوال (سخاوت و بخشش) یا فضل و کمال اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے۔ اس سے محبت بھی قوی ہوگی اور معلوم ہے کہ یہ اسباب بالذات حق تعالیٰ ہی میں ہیں۔ دوسری اشیاء میں بالعرض ہیں بس یوں کہنا چاہیے کہ محبت و میلان حقیقت میں خدا تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان میں صفات حق کا ظل ظاہر ہو رہا ہے۔

توجہ الی اللہ کی حقیقت

جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ توجہ الی اللہ یا خدا طلبی، بس یہ ہے کہ نماز پڑھیے، روزہ رکھیے اور احکام شرعیہ بجا لائیے۔ ان لوگوں نے محض ظاہری اعمال پر اکتفا کیا۔ یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں۔ پھر بھی اس میں برکت و نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی۔ معصیت کا تقاضا مضمحل کیوں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہوں میں مبتلا پائیں گے۔ اسی طرح دوسری طرف بہت سے لوگ اس غلطی میں گرفتار ہیں کہ ظاہری اعمال کو غیر ضروری سمجھ لیا ہے۔ ان کے نزدیک توجہ الی اللہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو۔ یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے۔ نماز، روزہ، تلاوت اور نظرِ بد وغیرہ گناہوں سے بچنا چھوڑ دیا مگر ان کو بھی برکت و نورانیت (یعنی قلبی ایمان کی کیفیت) حاصل نہ ہوئی کیونکہ ایسے لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہوتے اور دل میں گناہوں کا شدید تقاضا پاتے ہیں۔

توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل متوجہ ہو۔ مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صحیح صورت وہی ہے (جو خود اللہ یا) شریعت نے بتلائی۔ پس دونوں کو جمع کرنا چاہیے کہ دل سے حق تعالےٰ کی طرف توجہ ہو۔ ظاہری اعمال شرعیہ کے پابند رہو۔ طاعات کو بجالاؤ۔ معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو۔ نگاہ کو روکو اور نامحرموں کی باتیں بھی نہ سنو۔ اس کے بعد بھی قلب کی نورانیت نہ حاصل ہو تو ہم پر ہنسنا۔ میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق (عارف رومی) نے کہا کہ

چشم بند ولب بہ بند وگوش بند
گر نہ بینی نورِ حق برما بخند

○

فصل (۲)

انفاقِ مال کے حدُود

مال اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہے ناجائز طور پر جو مال حاصل کیا جاتا ہے اکثر اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ خرچ اس قدر بڑھا لیتے ہیں کہ حلال آمدنی اس کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ حدیث میں ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کھڑا کر کے دریافت فرمائیں گے کہ جوانی کا ہے میں خرچ کی اور مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور راز اس کا یہ ہے کہ مال اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہے۔ کسی نوکر کو اگر آپ خزانہ سپرد کر دیں تو کیا وہ مالک اور خود مختار ہو گیا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے جب تک کہ اجازتِ شرعی نہ ہو آپ کو دینے کا اختیار نہیں۔ خدا تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی فہرست بھی دی ہے کہ اس موقع پر خرچ کرنے کی اجازت ہے اس موقع پر نہیں۔ یہ نہیں کہ جس کو چاہا دے دیا اور جہاں چاہا خرچ کر دیا۔ حد سے زیادہ خرچ کا کچھ اختیار نہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ آدمی اپنا خرچ شرع کے موافق منضبط کرے۔

خرچ کے بھی حدود مقرر ہیں شادی بیاہ میں لوگ آنکھیں بند کر لیتے ہیں، کچھ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس موقع پر خرچ کرنا چاہیے یا نہیں۔ سو سمجھ لو کہ خرچ کرنے کے بھی حدود ہیں جیسے نماز روزہ کے حدود ہیں۔ اگر کوئی نماز بجائے چار رکعت کے چھ پڑھنے لگے یا کوئی روزہ عشاء تک رکھنے لگے تو گنہگار ہو گا۔ اسی طرح مال کو حد سے زیادہ خرچ کرنے سے بھی گنہگار ہو گا۔

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے حدود مقرر کیے ہیں۔ پس ایک تو حدود کو معلوم کرنا چاہیے اور دوسرے جو کام کرو سوچ کر کرو۔ ان دونوں باتوں پر عمل کروگے تو حقوق ضائع نہ ہوں گے۔

مسلمانوں کے حال پر بڑا افسوس ہے کہ کچھ آگے پیچھے کا خیال نہیں کرتے۔ بے طرح فضول خرچی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تباہ ہو جاتے ہیں بعضوں کے لنگوٹی بندھ جاتی ہے۔ یہ نوبت مسلمانوں کی اسی وجہ سے ہوئی کہ آہنی قلعہ کا پھاٹک خود کھول دیا ورنہ اسلامی اصولوں پر چلنے سے کبھی ذلّت نہیں ہو سکتی۔

(احکام المال صفحہ ۶۸-۶۴)

تنعّم و تفاخر کا انجام ذلّت

خرچ میں بے احتیاطی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو کھلے معاصی میں خرچ کیا جائے دوسری صورت یہ ہے کہ کھلی معصیت میں تو مال خرچ نہ کیا جائے، مگر خرچ حد سے زیادہ کیا جائے شہوات میں منہمک ہو گئے تنعّم و تفاخر میں اڑانا شروع کر دیا۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ تنعّم و تفاخر کا انجام ذلّت ہے کیونکہ اموال غیر متناہی تو ہیں نہیں کہ کتنا ہی خرچ کرو اور وہ کم نہ ہوں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ مکان تک بکنے کی نوبت آجاتی ہے میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمان دوسری قوم کے ہاتھ سے کبھی تباہ نہیں ہوتے، جب تباہ ہوتے ہیں اپنے ہاتھ سے ہوتے ہیں۔ اسلام ایک قلعہ ہے، آہنی دیوار ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بسایا ہے۔ اس دیوار کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اب اس کا کیا علاج کہ کوئی خود ہی دشمن کے لیے پھاٹک کھول دے۔ اگر یہ طریقہ سے رہیں تو کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتے، جن کے بارہ میں ہے فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ یہ تو غالب ہی رہیں گے، مگر خود ہی اپنا ناس کر لیں تو اور بات ہے مسلمان پر جب تباہی آئی ہے اپنے ہاتھوں آئی ہے کسی دوسرے کے ہاتھوں نہیں آئی چنانچہ

رؤسا کی عموماً یہ حالت ہے کہ نشہ کی چیزوں میں اور عیاشی میں اپنی جائدادوں کو ختم کر دیتے ہیں اور پھر فقیر ہو جاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس جائداد ہو اور اس کو کسی مصلحت سے بیچ دے تو فوراً دوسری خرید لے کیونکہ روپیہ میں برکت نہیں ہوتی — اور واقعی ہے بھی یہی کہ روپیہ رہتا نہیں۔

میں اگر کسی مسلمان کی زمین کسی کافر کے پاس دیکھتا ہوں تو میرا بہت دل دکھتا ہے۔ کسی کے مکان کو دیکھتا ہوں تو پوچھتا ہوں کہ کس کا ہے۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا ہے تو خوش ہوتا ہوں۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا نہیں تو قلق ہوتا ہے۔ میں اگرچہ مسلمانوں کے لیے فی نفسہٖ مالدار ہونا پسند نہیں کرتا مگر اوروں کے مقابلہ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ احتیاط کریں۔ اسی لیے جس کو بھی مال اڑاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یوں کہتا ہوں کہ اس کو کیا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو علاوہ معصیت ہونے کے دنیا کی مصلحت سے بھی اسراف کو پسند نہیں کرتا۔ دنیا کے مصالح بھی تو اسی میں ہیں کہ اس کو بیجا صرف نہ کیا جائے۔

بعض جگہ اس قدر تکلّف ہے کہ ایک جگہ دعوت ہوئی، صبح کو چائے پلائی۔ اس میں اس قدر تکلّف کیا کہ بیس روپے لگ گئے۔ پھر کھانے میں اتنا بکھیڑا کیا کہ عصر کے وقت کھانا ملا۔ بھلا کیا نفع ان باتوں سے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ دین کے چھوڑنے سے دُنیا کی بھی تکلیف ہوتی ہے اور عقل بھی مسخ ہو جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خدا دے تو بُرا کھاؤ بُرا پہنو۔ نہیں اچھا کھاؤ، اچھا پہنو، مگر حد کے اندر رہو۔ حضرت اب تو ہر چیز میں تفاخر ہے۔ کپڑا تفاخر کے لیے پہنتے ہیں۔ کھانا ہے تو تفاخر کے لیے۔ مکان ہے تفاخر کے واسطے۔ بعض کو کپڑے بھی نوکر ہی پہناتا ہے۔ بٹن تک اپنے ہاتھ سے نہیں لگتے۔ روزمرّہ ان کے قیمتی وقت کا ایک بڑا حصّہ فیشن ہی میں

گزرتا ہے۔ ایک شخص ہر وقت جوڑے ہی بدلا کرتے تھے۔ ہر وقت کے لیے ایک جوڑا الگ کر رکھا تھا۔ سواری کے وقت کا جوڑا اور دوستوں سے ملنے کا اور حتی کہ پاخانہ میں جانے کا جوڑا اور تھا۔ ایک مرتبہ میں بھائی کے پاس گیا اتفاق سے وہ شخص بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں انہیں ہر وقت اسی مشغلہ میں لگا ہوا دیکھتا۔ ایک روز مجھ سے ملنے آئے اور عذر کرنے لگے کہ مجھ کو فرصت نہیں ملی تھی اس وجہ سے آپ سے نہ مل سکا۔ میں نے کہا جی ہاں میں خود دیکھتا ہوں کہ آپ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس پر بہت شرمندہ ہوئے۔ آج کل یہ حالت ہے کہ لباس بھی دوسری قوم کا۔ کھانا بھی دوسرے ہی لوگوں کا ہر بات میں دوسری قوموں کی تقلید کرتے ہیں۔

اے مسلمانو! آپ کے گھر میں سب کچھ ہے۔ دوسرے کے گھر سے لینے کی آپ کو مطلق ضرورت نہیں۔ ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔ ؎

یک سبد پُر نان ترا بر فرق سر تو ہمی جوئی لب نان در بدر

یہ ساری خرابیاں تفاخر اور فضول خرچی سے پیدا ہوئی ہیں پس تفاخر اور فضول خرچی کے چھوڑ دینے سے ساری خرابیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔

عزت اسلامی سادگی ہی میں ہے

ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیے۔ اگر کسی مہمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے۔ مبالغہ نہ کیا جائے اسی میں ہماری عزّت ہے۔ مگر آجکل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزّت سمجھتے ہیں۔ ان کا لباس ان کا طرز معاشرت، ان کا طریق تمدّن اور تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں مسلمانوں کی اس میں عزّت نہیں۔ (مظاہر الاموال ص۲۹)

حضرت سفیان ثوریؒ کی ایک نصیحت

میں سفیان ثوریؒ کا قول عرض کرتا ہوں جو انھوں نے مال کے بارے میں فرمایا ہے اور یہ وہ بزرگ ہیں جو دنیا اور دنیا داروں سے انتہا درجہ نفرت رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس پیسہ ہو تو اسے چاہیے کہ اس کی قدر کرے۔ اڑائے نہیں۔ یہ حضرات مربی تھے، حدود کے سمجھنے والے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "مالِ حلال میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کو فضول خرچ کیا جائے۔" اور آپ اس کی مصلحت بھی بیان کرتے ہیں کہ "اگر دراہم ہمارے پاس نہ ہوتے تو یہ حکام ہم کو رومال بنا لیتے اور پامال کر دیتے۔" واقعی جس کے پاس مال ہوتا ہے اس پر دست اندازی نہیں کر سکتے۔ مال والا آن بان سے رہتا ہے اس کی وہ عزت ہوتی ہے جو بے پیسے والے کی نہیں ہو سکتی۔ اس کو سر نیچا نہیں کرنا پڑتا۔ بھائی! اسی واسطے مال بڑی قدر کی چیز ہے۔ کیا یہ نصیحت نہیں خدا تعالیٰ کی؟ جیسے غریب پر امراء دست اندازی کر سکتے ہیں۔ مال والے پر نہیں کر سکتے۔ تموّل ہی تو اس کا سبب ہے۔ پس ایسی چیز کو برباد کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ اسی واسطے فرماتے ہیں۔ ع

اے بسا امساک کز انفاق بہ — مالِ حق را جز بامرِ حق مدہ

خوب سمجھ لو کہ یہ مال تمہارا نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کا ہے پس ان کا مال جب دو ان کی اجازت سے دو جب تک کہ ان کی اجازت نہ ہو ہرگز نہ دو، نہ کسی مصاحب کو نہ اور کسی کو۔ اگر فضول خرچی کرنے سے تباہی آگئی تو کیا اس وقت کوئی تمہارا ساتھ دیگا، جو آج حضور حضور کہتے ہیں وہی اس وقت گالیاں دیں گے۔ پس اس کو بہت حفاظت سے رکھنا چاہیے۔ ہاں جو واقعی موقعہ ہو خرچ کرنے کا وہاں خرچ بھی کرنا چاہیے۔

برکت کی حقیقت ہر چیز ایک خاص کام کے لیے موضوع ہوتی ہے اس کا اس کام میں آنا تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ آئے تو بے برکتی ہے۔ مثلاً روپیہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ سے کھائیں پہنیں۔ دُنیا کی راحت حاصل ہو تو اگر وہ کھانے پہننے کے کام آئے اور اپنے تن کو لگے تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ لگے بلکہ فضول اڑا یا جائے تو بے برکتی ہے۔

(انفاس عیسٰی ص۳۰۲)

نام و نمود کی خاطر اسراف و تباہی کی ایک مثال فضول خرچیوں اور اسراف کی بدولت مسلمان تباہ اور برباد ہو گئے مگر اس پر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ایک کو ایک دیکھ کر عبرت حاصل کر سکتا ہے، مگر نہیں کرتے۔ ایک مولوی صاحب کے دادا کا گاؤں تھا فضول خرچیوں کی بدولت جاتا رہا۔ بیٹے کی شادی میں اس قدر روپیہ صرف کیا جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بعد شادی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے پاس تشریف لے گئے اور جا کر کہا کہ بھائی صاحب روپیہ سے کوئی جائداد خریدتا ہے، کوئی زیور خریدتا ہے اس میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر وقت پر کل قیمت نہ ملے تو آدھی تہائی کچھ تو قیمت اُٹھ آئے مگر آپ نے جو چیز خریدی ہے یعنی نام اس کی قیمت پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکتی۔ ان کی یہ حالت تھی کہ پہلوانوں کو دعوت دے دی۔ دُور دُور سے پہلوان آرہے ہیں۔ دنگل ہو رہے ہیں۔ ان کو کھلایا پلایا جا رہا ہے۔ غرض تباہ ہو گئے اور نتیجہ کچھ بھی نہیں

(ملفوظات ج۴ ص۱۷۲)

بدانتظامی اور بے فکری تباہی و بربادی کا سبب ہے مسلمان اگر تباہ اور برباد نہ ہوں تو اور کیا ہوں۔ اس تباہی و بربادی کی وجہ زیادہ تر "بدانتظامی" ہے جو دلیل ہے "بے فکری" کی۔ اسی بے فکری

کی بدولت ہزاروں زمیندار، رئیس اور نواب بھیک مانگتے پھرتے ہیں حتیٰ کہ اسی کی وجہ سے سلطنتیں دے بیٹھے۔ اس کی بدولت دنیا تو دنیا دین تک تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔

کانپور میں ایک صاحب نے بنیے سے سات سو روپیہ قرض لیے پھر بے فکر ہو گئے۔ وہ بھی خاموش رہا۔ ایک مدت کے بعد چالیس ہزار روپیہ ہو گیا۔ اس پر بھی اس بنیے نے کہا کہ فلاں دُکان مجھ کو دے دو اور بیباقی قرض کی رسید لے لو مگر ایک ملازم نے اپنی بعض اغراض کے سبب بہکایا اور دُکان نہیں دینے دی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تمام جائداد مع گھر دُکان سب ہاتھ سے نکل گئیں۔

کانپور ہی کے ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کے باپ کا انتقال ہُوا صاحب ثروت آدمی تھے۔ بیٹے نے روپیہ اُڑانا شروع کر دیا۔ ان کے باپ کے ......

...... ایک دوست تھے۔ ان کو یہ سن کر کہ اس طرح مال اُڑا رہا ہے رنج ہُوا۔ آئے اور اس کے سامنے مال کے اُڑانے پر جو مصائب اور تکالیف ہو سکتی ہیں۔ ان پر بڑی لمبی چوڑی تقریر کی کہ اس "فضول خرچی" کے یہ نتائج ہوں گے۔ اس نے سب سن کر طاق میں سے ایک لنگوٹی اتار کر دکھلائی کہ مال اُڑانے کے یہاں تک کے نتیجہ کے لیے تو میں پہلے سے تیار ہوں۔ اگر افلاس کا کوئی درجہ اس سے بڑھ کر ہو تو فرمایئے تاکہ اس میں غور کر سکوں۔

ایک شخص کانپور کی جامع مسجد میں سقاوہ میں پانی بھرا کرتے تھے۔ لوگ ان کو نواب صاحب کہتے تھے۔ تحقیق پر معلوم ہُوا کہ فی الحقیقت نواب تھے "عیاشی" اور فضول خرچی کی بدولت تباہ اور برباد ہو گئے۔ یہ سب بے فکری "اور غفلت" کے نتائج ہیں جن کی بدولت مسلمان تباہ ہُوئے اور ہو رہے ہیں۔ دین اور دنیا دونوں اس کی بدولت ہاتھ سے جاتے رہے اور پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ رات دن یہ تباہی

اور بردباری دیکھ رہے ہیں مگر پتھر پر جونک نہیں لگتی۔ دیکھیے آئندہ اور کیا حشر ہوتا ہے۔ سن سن کر بہت ہی قلب میں قلق اور رنج ہوتا ہے۔ اور اگر کچھ فکر بھی کی تو آمدنی کی فکر کرتے ہیں، مگر خرچ کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ میرٹھ میں ایک رئیس تھے انہوں نے ایک بڑے کام کی بات کہی مجھ کو تو بڑی پسند آئی۔ یہ کہتے تھے کہ "لوگ آمدنی بڑھانے کی تو فکر کرتے ہیں جو غیر اختیاری ہے اور خرچ گھٹانے کا انتظام نہیں کرتے جو اختیاری ہے۔" خوب ہی بات کہی۔

نظامِ خرچ

غرض اس زمانہ میں خصوصاً سخت ضرورت ہے کہ مسلمان فکر سے کام لیں اور خرچ سوچ سمجھ کر کیا کریں جس کا نظام میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ خرچ کرنے سے قبل کم از کم تین مرتبہ سوچ لیا کریں کہ جو ہم خرچ کرنا چاہتے ہیں کیا یہ خرچ ایسا ضروری ہے کہ بدون اس کے کوئی ضرر ہوگا؟ جہاں یہ تحقیق ہو جائے اس کو ضروری سمجھیں۔

پھر یہ سوچیں کہ کیا اتنا ہی خرچ ہونا چاہیے یا اس سے کم میں بھی کام چل سکتا ہے؟ ایسا کرنے سے چند روز تو تعب ہوگا کیونکہ طبیعتیں اس کی عادی اور خوگر نہیں اس کے بعد سہولت سے مداومت کے ساتھ اس پر عمل ہونے لگے گا۔ خلاصہ یہ کہ فکر اور انتظام بڑی ضروری چیزیں ہیں اور بے فکری اور بدانتظامی نہایت مضر۔ (الافاضات ج۶ ص۴۳، ملفوظ ۵۷)

بخل و اسراف کی حقیقت

فرمایا کہ بدون تھوڑے سے بخل کے انتظام ہو ہی نہیں سکتا اور اس میں مجھ کو چاہے کوئی کچھ ہی کہے مگر حقیقت یہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ بخل مطلقاً مذموم نہیں بلکہ کوئی ملکہ بھی برا نہیں مثلاً بخل ہے، طمع ہے، حرص ہے حتیٰ کہ شہوت تک بھی جب تک یہ سب اپنی حد پر ہیں مذموم نہیں۔ فرماتے ہیں ۔

اے بسا امساک کز انفاق بہ — مالِ حق را جز بامرِ حق مدہ

اور آجکل جس کا نام سخاوت رکھا ہے وہ کھلا اسراف ہے اور یہ سخی نہیں مسرف ہیں اور اسراف مثلہ نہیں کہ اس میں دو درجے ہوں۔ فعل ہے۔ یعنی معصیت میں خرچ کرنا۔ اس کی محمودیت کا کون دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس لیے اسراف میں تقسیم نہیں کہ اس کی دو قسمیں ہوں کہ ایک محمود ہے اور ایک مذموم جیسے بخل کی تقسیم ہوسکتی ہے ایک محمود ایک مذموم۔ بخل کے معنی ہیں قلب کی تنگی سو تنگی کی تقسیم ہوسکتی ہے۔ مثلاً کسی نے روپیہ جمع کیا اور خرچ اس لیے نہیں کیا کہ اس سے مقصود بیوی بچوں کی راحت ہے، آسائش ہے، فراغت ہے۔ اس کے محمود ہونے کا دعویٰ غلط نہیں ہوسکتا۔ مگر مُسرف جب معصیت میں صرف کرے گا تو اس میں کیا مصلحت اور کونسا اچھا مقصود سمجھا جائے گا۔ نفس نے مکر و فریب سے مُسرف کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ یہ استغناء ہے۔ یہ نفس بُری بلا ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں، ہر چیز میں دین کا رنگ ظاہر کر دیتا ہے۔ بلکہ بخل کا جو درجہ بُرا ہے اسراف اس سے زیادہ بُرا ہے۔ باقی محمود درجہ میں تو بڑے مصالح ہیں۔ خصوص آجکل تو سخت ضرورت ہے کہ نفس کو بہلانے کے لیے انسان اپنے پاس کچھ ضرور رکھے اس میں بڑی مصلحتیں ہیں۔ بہت ہی نازک وقت ہے۔ مولوی غوث علی شاہ صاحب بڑے حکیم اور ظریف تھے ان کے سامنے کسی نے دوسرے کو دعا دی کہ ایمان کی سلامتی اور عاقبت بخیر ہو۔ مولوی صاحب نے پوچھا بھائی اس کی حقیقت معلوم ہے۔ اس نے عرض کیا آپ ہی فرمائیے۔ اس پر فرمایا کہ ایمان کی سلامتی تو یہ ہے کہ پیٹ بھر کر روٹی مل جائے اور عاقبت بخیر یہ ہے کہ کھل کر پاخانہ ہو جایا کرے۔ بس یہی بڑی نعمت ہے۔ (ملفوظات ج ۴ ص ۲۸۳)

اسراف بخل سے زیادہ مذموم اور تباہ کن ہے

فرمایا کہ باعتبار آثار کے اسراف زیادہ مذموم ہے۔ بخل کا نتیجہ صرف دوسرے کو نفع

نہ پہنچاتا ہے اور اسراف کا دوسروں کو ضرر پہنچاتا ہے۔ کیونکہ جب اپنے پاس نہیں تو دوسروں کا مال ان کو دھوکے دے کر قرض وغیرہ کے نام سے لے کر اڑاتا ہے۔ پھر ادا بھی نہیں کرتا۔ نیز ہم نے مسرفین کو مرتد ہوتے ہوئے دیکھا ہے مگر بخیلوں کو نہیں۔ (ملفوظات ج۴ ص۲۶۵)

اگر آدمی فضول خرچی سے بچے تو بڑی برکت ہوتی ہے۔ فضول خرچی بڑی ہی مضر چیز ہے۔ اس کی بدولت مسلمانوں کی جڑ ہی کھوکھلی ہو گئی ہیں یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ بدون تھوڑے سے بخل کے انتظام نہیں ہو سکتا اور وہ صورۃً بخل ہے حقیقی بخل نہیں اور اگر حقیقی بھی ہو وہ بھی اسراف کی طرح برا ہے مگر اسراف اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ جس چیز کا انجام پریشانی ہو وہ اس سے بری ہے جس سے پریشانی نہ ہو۔

فضول خرچی دین فروشی اور کفر تک پہنچا دیتی ہے

ایسے واقعات کثرت سے موجود ہیں کہ اسراف کا نتیجہ کفر ہو گیا۔ وجہ یہ کہ مسرف کو حاجات میں اضطرار ہوتا ہے اور مال ہوتا نہیں اس لیے دین فروشی بھی کر لیتا ہے اور بخیل کو یہ اضطرار نہیں ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں ہر وقت پیسہ ہے گو وہ خرچ نہ کرے اور بڑا فرق ہے اضطرار اور عدم اضطرار میں۔

(الافاضات ملفوظ ع۱۰۵، ۲ شوال ۱۳۵۰ھ)

آجکل پیسہ کی قدر کرنا چاہیے اس کے نہ ہونے کی وجہ سے بھی انسان بہت سی آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ دین فروشی بھی اسی آفت کی ایک فرد ہے۔

حفاظتِ دین و ایمان

دین کی حفاظت کے لیے آجکل یہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنے پاس کچھ رقم جمع رکھے۔

(انفاس عیسیٰ ص۳۰۸)

بعض طبائع کے لیے (بلکہ اکثروں کے لیے خصوصاً اس زمانے میں) بقدر

ضرورت مال جمع کرنا ضروری ہے۔ ان کا تقویٰ مال ہی تک رہتا ہے۔ اگر مال ہے تو نماز روزہ بھی ہے ورنہ کچھ نہیں۔ اس لیے ہمارے حضرات بعض لوگوں کو ترک ملازمت سے منع فرماتے ہیں بلکہ بعض کو ناجائز ملازمت کے ترک سے بھی منع فرمایا کہ جب تک حلال ملازمت (یا کوئی دوسرا ذریعہ معاش) نہ ملے اس وقت تک اس کو کیے جاؤ اور استغفار و توبہ کرتے رہو کیونکہ گو یہ ملازمت حرام ہے مگر ایمان کی وقایہ (محافظ) ہے۔ ایسا نہ ہو کہ افلاس کی پریشانی میں ایمان ہی جاتا رہے۔

مسلمانوں کی کمزوری کا سبب افلاس بھی ہے

اس وقت جو مسلمان کمزور نظر آتے ہیں اور دب گئے ہیں۔ اس کا ایک قوی سبب افلاس بھی ہے جس نے سب کے سامنے جھکا دیا اور پہلے بزرگوں پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ ان میں قوتِ ایمانیہ تھی۔ وہ افلاس سے پریشان نہ ہوتے تھے۔ اور اس وقت دین کی قوت تو مسلمانوں میں ہے نہیں۔ اگر مال کی بھی نہ ہو تو سوائے ذلّت کے اور کیا ہوگا۔

قناعت کا طریقہ

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ قناعت بھی جب ہی ہو سکتی ہے جبکہ اپنے حوائج کو محدود رکھے اور حدود میں آگے بڑھ جانے میں قناعت بھی مشکل ہے۔ (الافاضات ج۵ ص۳۰۵)

فضول خرچی سبب بنتی ہے ناجائز ذریعہ آمدنی کا

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگر سود اور رشوت نہ لیں تو خرچ کہاں سے چلے؟ میں کہتا ہوں کہ خرچ افزوں چہ ضرور۔ آپ نے اپنی ضرورتوں کو بڑھا لیا۔ پھر کہتے ہو کہ بلا رشوت کے گزارا کیسے ہو؟ ایسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے جس کے لیے سود اور رشوت لینے کی ضرورت پڑے۔

(البلغ بابت ماہ شعبان ۱۳۶۱ھ)

رشوت کا پیسہ رہتا نہیں

رشوت والے ہزاروں جمع کر لیتے ہیں مگر ایک دو پشت کے بعد کچھ بھی نہیں رہتا۔

(انفاس عیسیٰ ص۳۰۲)

فضول خرچی کا نام بلند حوصلگی

انتظام کے معنی یہ ہیں کہ یہ سوچے کہ اگر میں خرچ نہ کروں گا تو اس میں کوئی ضرر ہے دینی یا دنیوی۔ اگر ضرر ہے تب تو خرچ کرے ورنہ نہیں۔

آجکل "فضول خرچی" کا نام رکھا ہے "بلند حوصلگی"۔ اس بلند حوصلگی کے نتائج سنیے کہ اپنے مال سے گزر کر دوسروں کے مال پر نظر ہوتی ہے۔ قرض لیتے پھرتے ہیں۔ پھر نوبت یہاں تک آتی ہے کہ عادت ہو جانے کی وجہ سے اگر ویسے قرض نہیں ملتا سودی قرض لینا پڑتا ہے۔ اس کا جو انجام ہے ہر شخص پر ظاہر ہے کہ دنیا اور دین دونوں کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ (الافاضات ج۶ ص۲۴۵)

ترکِ گناہ سے موت میں آسانی

ایک مضمون عجیب و غریب نظر سے گزرا گناہ کم کرو یعنی نہ کرو موت آسان ہو جاوے گی اور کسی سے قرض مت لو دنیا میں آزاد رہ کر زندگی بسر ہو گی۔ ترکِ ذنوب میں یہ خاصہ ہے کہ موت کے وقت آسانی ہوتی ہے کیونکہ مرنے کے وقت آسانی نصیب ہو گی جس سے موت سہل ہو جائے گی۔

ایک صاحب کے جواب میں فرمایا کہ قرض لینا ضرورتِ شدیدہ میں جائز ہے جیسے جہاد کے لیے یا کفن کے لیے، یا کپڑے پھٹ گئے ہوں۔ چھپا ہوا بدن ظاہر ہونے لگا۔ اس کے چھپانے کے لیے و مثل ذالک ایسے شخص کے حق تعالیٰ قرض ادا ہو جانے کے کفیل ہیں۔ (الافاضات ج۲ ص۲۲۲، ملفوظ ۴۰۶)

رسم و رواج کی خاطر مقروض ہونا

ایک دوست نے مجھے لکھا کہ تیس روپیہ میری تنخواہ ہے اور مہمان بکثرت آتے ہیں، تنخواہ میں خرچ پورا نہیں ہوتا میں بہت پریشان ہوں۔ میں نے لکھا کہ عُرف کو تو طاق میں رکھو جو تمہارا کھانا ہے وہ سب کے سامنے رکھ دیا کرو اور کہہ دیا کرو کہ بس یہی کھانا ہے سب مل کر کھالو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا بس سب نے آنا چھوڑ دیا اور میں نے لکھا کہ اہل اللہ کا مذہب رکھو، وضع دار لوگوں کا مت رکھو ان کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

اہل اللہ بالکل آزاد ہیں، رسم و رواج کے ذرا مقیّد نہیں۔ ان کا بڑا اچھا مشرب ہے، ہر ادا ان کی محبوب ہے۔ بس میں نے لکھ دیا کہ اپنا کھانا سب کے سامنے رکھ دیا کرو۔ پیٹ بھرے چاہے نہ بھرے۔ آدمی ارادہ کرلے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس پر عمل کیا۔ اس کے بعد لکھا کہ خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ نے بڑی اچھی تدبیر بتلائی۔ میرا پیچھا چھوٹ گیا۔ ہم تو یہی تعلیم کریں گے کہ بلا ضرورت مقروض مت ہو۔ گو رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے۔ مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے۔ اہلِ اللہ کا یہی مذہب ہے اس میں بڑی راحت ہے ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہیے جو اہل اللہ کا ہے۔

اسراف سے نجات اور انتظام کی درستی کے لیے چند مشورے

تباہی اور بربادی کی وجہ زیادہ تر بدانتظامی ہے جو دلیل ہے بے فکری کی۔ اسی بے فکری کی بدولت ہزاروں زمیندار، رئیس اور نواب بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسی وجہ سے سلطنتیں دے بیٹھے۔ اس کی بدولت دنیا

نو دنیا، دین تک تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ اور کچھ فکر بھی کی تو آمدنی کی فکر کرتے ہیں، مگر خرچ کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ اس زمانہ میں خصوصاً سخت ضرورت ہے کہ مسلمان فکر سے کام لیں اور خرچ سوچ سمجھ کر کیا کریں جس کا نظام میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ خرچ کرنے سے قبل کم از کم تین مرتبہ سوچیں کہ ہم جو خرچ کرنا چاہتے ہیں کیا یہ خرچ ایسا ضروری ہے کہ بدون اس کے کوئی ضرر ہوگا؟ جہاں یہ تحقیق ہو جائے اس کو ضروری سمجھیں۔ پھر یہ سوچیں کہ کیا اتنا ہی خرچ ہونا چاہیے یا اس سے کم میں بھی کام چل سکتا ہے؟ ایسا کرنے سے چند روز تو تعب ہوگا کیونکہ طبیعتیں اس کی عادی اور خوگر نہیں اس کے بعد سہولت سے مداومت کے ساتھ اس پر عمل ہونے لگے گا۔ خلاصہ یہ کہ فکر اور انتظام بڑی ضروری چیزیں ہیں اور بے فکری اور بدانتظامی نہایت مضر۔ (الافاضات ج ۶ ص ۴۳)

ضروری اور غیر ضروری سامان کا انتخاب

امراء کو ایک بات یہ چاہیے جس سے اسراف سے نجات ہو اور انتظام درست ہو۔ اول اپنے اسباب کا انتخاب کریں کہ کونسا ضروری ہے اور کون سا فضول ہے۔ اُمراء میں یہ آفت ہے کہ جو چیز پسند آئی خرید لی اس سے بحث نہیں کہ اس کی حاجت بھی ہے یا نہیں۔ ہر چیز کے خریدار ہو جاتے ہیں جب کسی دکان پر جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور خریدتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ عار کی بات ہے کہ کوئی یوں کہے کہ دکان پر آئے اور لیا کچھ بھی نہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بے کار رکھی رہتی ہیں۔ عمر بھر بھی کسی کام میں نہیں آتیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسبابِ جہاں
آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

پس سب سے پہلے انتخاب گھر کا کرو جتنی چیزیں کام میں آتی ہوں رہنے دو اور جتنی کام میں نہ آئیں خارج کر دو یا بیچ دو یا مساکین کو دے دو۔ نفلی صدقہ دینے کی

ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی ہیں دے دو۔

میں ایک اور مفید ترکیب تبلاتا ہوں فضول خرچی نہ ہونے کی۔ وہ یہ کہ گھر کا معائنہ کیا کرو۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی دیکھو گے جو سڑ رہی ہیں کسی کو دیمک لگ رہی ہے۔ پس ایسی چیزوں کو اپنی مِلک سے الگ کرو تاکہ گھر میں رونق ہو۔ ایک دفعہ ایسا کر گزرو گے تو آیندہ ایسی چیزیں کبھی نہ خریدو گے۔

احسان کا احسن طریقہ

ایک یہ بات بھی قابلِ عمل ہے کہ اگر مسلمانوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو اس کی یہ صورت نہیں کہ دسترخوان بڑا وسیع ہو۔ آج بریانی پک رہی ہے کل پلاؤ اور قورمہ تیار ہو رہے ہیں۔ ذرا سے کھانے میں ایک بڑی رقم لگ گئی۔ اس سے تو چار غریب مسلمانوں کا بھلا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ کیا کہ بے حاجت قورمہ بریانی پکائے جا رہے ہیں۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو بس روپیہ نقد دے دیا یہ نہیں کہ جوڑے عمدہ عمدہ دو۔

کام سوچ کر کرو کسی کے کہنے سے کوئی کام مت کرو

ایک بات یہ ہے کہ روزمرّہ کی معاشرت میں یہ مقرر کر لو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو۔ بے تامل مت کر ڈالو۔ اور ایک بات یہ کہ کسی کے کہنے سے کوئی کام مت کرو۔ بس اپنی رائے پر عمل کرو۔ قرآن شریف میں مشورہ کی تاکید ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کرنا وہی جو سمجھ میں آجائے۔

باب ہفتم

سیاست

فصل (۱)

قومی امتیاز

تشبہ کی حکمت و تفسیر حدیث شریف میں جو آیا ہے فمن تشبہ بقوم فھو منھم۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اہل باطل سے امتیاز ہو۔ مگر تشابہ جائز ہے تشبہ جائز نہیں۔ تشابہ وہ ہے جو فطری ہو۔ اور تشبہ وہ ہے جو قصد سے ہو۔ (ملفوظات ج۳ ص۱۹۸)

(یہی راز ہے) تشبہ بالکفار (کے مذموم ہونے کا کہ وہ) علامت ہے کفر اور کفار کی عظمت کی۔ کیونکہ بغیر اعتقادِ عظمت کے تشبہ نہیں ہو سکتا اور کفار کی عظمت کا اعتقاد ہے حرام۔ (ملفوظات ج۳ ص۱۷)

امتیازِ قومی کے باطل ہونے سے خود قومیت ہی ختم ہو جاتی ہے بعض نے تہذیب قدیم کو چھوڑ کر تہذیب جدید کو لے لیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں جواز و ناجواز کی بحث تو الگ رہی۔ اس سے قطع نظر کر کے ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ رات دن جس قومیت کا سبق رٹا کرتے ہیں کہ ہر تقریر و تحریر میں ان کی زبان و قلم پر قوم قوم کا لفظ چڑھا ہوا ہے تہذیبِ جدید کے اختیار کرنے میں اس قومیت کا ابطال ہے کیونکہ ہر قوم کا ایک خاص امتیاز ہوتا ہے اور اس امتیاز کو باطل کرنا قومیت کا ابطال ہے۔ تو عجیب بات ہے کہ زبان سے تو یہ اپنے کو حامی قوم اور ہمدردِ قوم ثابت کرتے ہیں۔ اور طرزِ عمل سے قومیت کی جڑیں اکھاڑتے ہیں کہ ان کی صورت سے اور کسی بات

سے ________ کوئی اسلامی امتیاز ظاہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوم سے جدا معلوم ہوتے ہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے ؎

یکے بر سرِ شاخ و بُن می برید | خداوند بستاں نگہ کرد و دید

علاوہ ازیں دوسری قوم کی معاشرت اختیار کرنا گویا اس بات کا اقرار ہے کہ نعوذ باللہ اسلام میں معاشرت نہیں ہے یا ہے تو عمدہ اور کافی نہیں ہے۔ ورنہ پھر یہ لوگ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کیوں کرتے ہیں۔

غیرت و حمیّت کا تقاضا

غیرت اور حمیت اور دعویٰ قومی کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اگر اسلامی معاشرت ناتمام بھی ہوتی جب بھی آپ دوسروں کی معاشرت اختیار نہ کرتے ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن | بہ از جامۂ عاریت خواستن

اپنا تو پرانا کمبل بھی دوسروں کی شال سے زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ اپنے پاس دوشالہ موجود ہے اور تم اس کو اتار کر دوسروں کا پھٹا ہوا کمبل اوڑھتے ہو۔ میں اس وقت جائز و ناجائز سے بحث نہیں کرتا۔ یہ تو دوسری بات ہے۔ ان سب سے قطع نظر کر کے میں کہتا ہوں کہ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کر کے وہ امتیازِ قومی کہاں رہا جس کے یہ لوگ بڑے مدعی ہیں اور اسلام کی وقعت کہاں رہی جس کے حامی اور خادم ہونے کا ان کو دعویٰ ہے۔ کیا اسلام کی یہی وقعت ہے کہ تم دوسروں کی معاشرت اختیار کر کے زبانِ حال سے اسلامی معاشرت کا ناکافی ہونا ظاہر کرو۔ نیز اس میں یہ خرابی الگ ہے کہ جس معاشرت کو آپ لے رہے ہیں اس میں تنگی اور قید بہت زیادہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز لازم اور اس کو تیسری چیز لازم۔ ان قیود کی پابندی میں وہ آزادی کہاں رہی جس کا آپ سبق پڑھا کرتے ہیں۔

(تفصیل الدین ص۶۱-۶۲)

ہندو قومی وضع اور قومی نشان کے بھی پابند اور مسلمان مذہبی شعائر تک پامال کرنے پر آمادہ

مجھے حیرت ہے کہ (ہندوستان میں) ہمارے کانگریسی مسلمان ہر بات میں تو ہندوؤں کی تقلید کے لیے تیار رہتے ہیں. مگر اس بات میں ان کی تقلید نہیں کرتے کہ وہ اپنی قومی وضع، قومی نشان کے کس درجہ پابند ہیں۔ وہ اپنے خانگی مذہب کے معمولی شعائر کو بھی کسی کی خاطر نہیں چھوڑتے اور مسلمان اپنے آسمانی مذہب کے بڑے سے بڑے شعار کو ان کی خاطر پامال کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا منشاء بجز اس کے کیا ہے کہ مسلمان دوسروں کی تقلید کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں مسلمان بن کر ترقی نہیں کرنا چاہتے۔

غیر قوم کی وضع اور سلامتی ایمان

شعار اسلام کو کسی مخالف اسلام کے خوش کرنے کو چھوڑ دینا بڑے سے بڑا گناہ ہے۔ (سنت ابراہیم ص۳۱)

آجکل لوگوں کو اس مسئلہ میں بھی شبہہ ہے. غیر قوم کی وضع اختیار کرنے کے متعلق کہتے ہیں کہ اس سے ایمان جاتا رہتا ہے؟

اس باب میں دو مثالیں عرض کرتا ہوں: (میں نے صرف ایک پر اکتفا کیا. جامع) اس وقت سلاطین میں جنگ ہو رہی ہے۔ اگر کوئی شخص جو برطانیہ کی فوج میں ہو وہ جرمنی کے سپاہی کی وردی پہن لے اور منصبی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کرے تو کیا اس کا یہ فعل موجب ناخوشیٔ افسران نہ ہوگا —؟

(العاقلات الغافلات)

۲۱ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ

ظاہری اتحاد کا باطنی اتحاد پر اثر

یاد رکھیے ظاہری اتحاد کا باطنی اتحاد پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے جو قوم ظاہر میں یگانگت

نہیں رکھتی وہ باطن میں بھی متحد نہیں ہوسکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشبہ بالکفار سے اس لیے بھی مسلمانوں کو منع فرمایا ہے اور اسلامی وضع کے پابند رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ میں اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ خطاب کرتا ہوں کہ سب سے پہلے آپ حضرات اس تعلیم اسلامی پر عمل کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا بنایا ہے تو آپ کو دیکھ کر عوام کو بھی اپنی اصلاح آسان ہوجائے گی میں بقسم عرض کرتا ہوں کہ جب تک تم سب کے سب ان لوگوں جیسے نہ بن جاؤ گے جن کو تم نے "مذہبی دیوانے" کا لقب دے رکھا ہے اس وقت تک ترقی حاصل نہ کرسکو گے۔

عزت مسلم اتباع شریعت میں ہے تم شریعت پر چل کر دیکھو انشاءاللہ سب تمہاری عزت کریں گے جس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ جو پکے مسلمان ہیں، انگریز ہندو پارسی وغیرہ سب ان کی عزت کرتے ہیں تم دین پر قائم رہو۔ ساری قومیں تمہاری مسخر ہوجائے گی۔

(کمالات اشرفیہ ص۲۶)

حمیّت دین حمیّتِ دین کو دنیوی مقصد پر ترجیح دینے کی ایک حکایت یاد آئی شاہ محمد اسحاق صاحب کی تنخواہ بادشاہ کی طرف سے مقرر تھی جب انگریزوں کا دور دورہ ہوا تو بجائے عربی مہینوں کے انگریزی مہینوں سے تنخواہ ملنی شروع ہوئی جب شاہ صاحب کی تنخواہ آئی تو رسید پر دستخط کرنے اور انگریزی تاریخ لکھنے کے لیے کہا گیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں انگریزی تاریخ نہیں لکھوں گا۔ لانے والے نے عرض کیا کہ اب انگریزی تاریخ ہی لکھنے کا حکم ہے۔ انگریزی تاریخ ہی لکھ دیجیے ورنہ تنخواہ بند ہوجائے گی۔ آپ نے فرمایا کہ میں کافروں کی عادت پر عمل نہیں کروں گا۔ چاہے تنخواہ بند ہوجائے۔ خدا رازق ہے، انگریز رازق نہیں۔

نماز قومی امتیاز

آجکل نئی روشنی والوں کو قومی امتیاز کا بڑا اہتمام ہے میں ان سے کہتا ہوں کہ وہ نماز کو قومی امتیاز ہی سمجھ کر اختیار کر لیں۔ اس سے بڑھ کر قومی امتیاز کیا ہوگا جو حضورؐ کے زمانہ سے لے کر قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا خاص امتیاز ہے کہ امیر و غریب، شریف و دنی سب میں مشترک ہے جس سے کفار کو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب لوگ ایک قوم کے ہیں، ایک مذہب کے ہیں۔ پس میں اخیر درجہ مجبور ہو کر کہتا ہوں کہ اگر نماز کو دین اور عبادت سمجھ کر نہیں پڑھتے تو امتیاز قومی سمجھ کر پڑھ لیا کرو۔ افسوس ہم نے زمانہ ہی ایسا پایا ہے جس میں یہ بات زبان پر آگئی۔ حالانکہ نماز کے متعلق مسلمانوں سے ایسی بات کہتے ہوئے اس قدر شرم آتی ہے کہ زمین میں گڑ جانا اس سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ (الصبر والصلوٰۃ صفحہ ۳۰)

فصل (۲)

اتفاق و اختلاف

نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ بتلایا ہے۔ فرماتے ہیں: ایاکم و فساد ذات البین فانها هی الحالقه۔ یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ کیونکہ باہمی فساد مونڈنے والی چیز ہے۔ اس میں ابہام و تفسیر کی بلاغت ہے۔ کیونکہ حضورؐ نے اول تو حالقہ فرمایا جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ فساد کی وجہ سے سر کے بال مونڈ جائیں گے پھر سامع کو اس کے مطلب کا انتظار ہوا، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ہم نے بارہا نا اتفاقی کی ہے مگر سر کے بال کبھی نہیں گرے تو ابہام سے سامع کو تفسیر کا مشتاق بنا کر آگے فرماتے ہیں لا اقول تحلق الشعر بل تحلق الدین۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے سر کے بال مونڈ جاتے ہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین مونڈ جاتا ہے اور مونڈنا کسے کہتے ہیں۔ مونڈنا یہ ہے کہ خربوزہ سا سر نکل آئے بال کا نشان تک نہ رہے، تو حاصل یہ ہوا کہ باہمی فساد سے دین کا بالکل صفایا ہو جاتا ہے۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اتفاقی اور فساد باہمی کے ضرر کا درجہ بتلا دیا ہے اور واقعی اس سے زیادہ کیا ضرر ہو گا کہ اس سے دین کا صفایا ہی ہو جاتا ہے۔

مگر قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت ہے۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

گو اس مقام پر حضورؐ نے فساد باہمی پر بہت بڑی وعید فرمائی ہے مگر ساتھ ساتھ اس میں اُمید کی بھی جھلک ہے۔ بالکل ہی نااُمید نہیں کیا کیونکہ آپ نے فساد کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ دین کو مونڈ دینا ہے اور مونڈنے سے اس وقت تو اوپر سے صفایا ہوجاتا ہے مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر روز اُسترا پھیرا جائے تو اگلے دن کھونٹی نکل آتی ہے تو اس میں اس طرف اشارہ فرما دیا کہ اگر کوئی روزانہ مونڈنے کا شغل نہ کرے تو چند روز میں کھونٹی نکل آئے گی۔ اس کے بعد بال اور بڑھیں گے پھر زلفیں ایسی ہوں گی کہ لوگ اس میں پھنسا کریں گے اور وہ حال ہوگا ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے ۔۔۔ اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک زبان والے نے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا تھا کہ ہم اور تم اور میر صاحب اس کی زلفوں میں پھنس کر سب جیل خانہ چلا گیا۔ یہ تو ایک لطیفہ تھا غرض کیا رحمت ہے کہ ایک ہی لفظ میں غضب بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔ آپ نے "تحلق الدّین" فرما کر ڈرایا دھمکایا بھی ہے اور یہ بھی تبلا دیا کہ نااُمید نہ ہونا۔ فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی۔ اگر کوشش کرو گے تو جڑ سے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آئیں گے۔

اتفاق و اتحاد کی بنیاد حضرت حاجی فرماتے تھے کہ لوگ آجکل اتفاق اتفاق تو پکارتے ہیں، مگر اس کی جڑ کی ان کو خبر نہیں۔ اتفاق کی جڑ تواضع ہے۔ بدون اس کے اتفاق نہیں ہوسکتا۔ اور آجکل تعلیم اتفاق کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے سے متفق اور اپنی رائے کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ اگر وہ دوسرا بھی ایسا ہی چاہے گا تو اتفاق کیسے ہوگا بس کبر کے ہوتے ہوئے اتفاق ممکن نہیں)۔ اتفاق محض تواضع سے ہوگا۔ ہر شخص دوسرے کی موافقت و تقلید کے لیے تیار ہو۔ ورنہ اتفاق دشوار ہے اور اگر ہُوا بھی تو محض زبانی اور کا[illegible] ہوگا۔ ا[illegible]

نظیر امام ابو حنیفہؒ کی ایک وصیت ہے جو اپنے صاحبزادہ حمادؒ کو کی تھی کہ تم مناظرہ نہ کرنا۔ صاحبزادہ نے عرض کیا کہ حضرت میں نے تو آپ کو مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے پھر مجھے کیوں منع فرماتے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ ہمارے مناظرہ میں اور تمہارے مناظرہ میں فرق ہے۔ ہم تو مناظرہ کے وقت یہ خواہش کرتے تھے کہ ہمارے مقابل کی زبان سے حق ظاہر ہو جائے اور ہم اس کا اتباع کرلیں۔ اس کی بات کو مان لیں تاکہ ہمارے بھائی کو غلبہ و عزّت حاصل ہو۔ اور تم یہ تمنا کرتے ہو کہ مخالف کی زبان سے حق ظاہر نہ ہو بلکہ باطل ہی ظاہر ہو تاکہ ہم اس کو مغلوب کر دیں اور خود غالب ہو جائیں۔ پس ہم تو ہدایت مخالف کے طالب تھے اور تم ضلالت مخالف کے طالب ہو۔

دیکھیے امام صاحب اور حضرت حماد کے زمانہ میں اتنا فرق ہو گیا کتنی جلدی زمانہ بدل گیا۔ اور اب تو یہ قصد ہوتا ہے کہ مخالف کی زبان سے جو بات بھی نکلے گی اس کا رّد ہی کریں گے۔ خواہ حق نکلے یا باطل۔ (وعظ: الارتباط)

سببِ مخالفت مخالفت کا اصل راز یہ ہے کہ مقصود نام ہوتا ہے۔ کام مقصود نہیں ہوتا۔ پھر اس میں طرفین سے کشاکشی ہوتی ہے۔ جھگڑے قصّے فساد ہوتے ہیں۔ (الافاضات ج۵ ص۲۸۳)

وقت غفلت کا نہیں یہ وقت مسلمانوں کی غفلت کا نہیں مگر مشکل تو یہ ہے کہ اگر مسلمان غفلت سے بیدار ہوتے بھی ہیں تو اس کے مصداق ہو جاتے ہیں:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اس بیداری میں نہ اتباعِ احکام ہوتا ہے نہ باہمی اتفاق ہوتا ہے۔ (ملفوظات ج۲ ص۲۱۲)

انجمنیں ناکام کیوں رہتی ہیں؟

آجکل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ناکام رہتی ہیں اس کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ آجکل ہر کس و ناکس دوسروں سے اپنی رائے کا اتباع چاہتا ہے اور جہاں بظاہر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار ہے۔ جس سے شبہہ ہو سکتا ہے کہ یہ نفع اختلاط کا ایسا ہے جو خلوت و جلوت میں نہیں ـــ وہ کثرت بھی حقیقت میں وحدت ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں ایک ہی شخص اپنے اثر ت اپنی تائید کے لیے پہلے سے ایسے لوگوں کو سبق پڑھا پڑھا کر لاتا ہے جن کو اس معاملہ کی سمجھ تو کیا ہوتی لفظ بولنا بھی نہیں آتا۔ پس کثرت برائے نام ہی ہوتی ہے۔ پھر اس کثرت کا مدار بھی کسی لیاقت پر نہیں ہوتا۔ محض تموّل پر ہوتا ہے یعنی اپنے مقاصد و آراء کی تائید بھی ایسے لوگوں سے کرائی جاتی ہے جو زیادہ مالدار ہوں۔ حالانکہ اس کے لیے اصل ضرورت فہم کی ہے۔ اسی طرح آجکل صدارت بھی مالداروں ہی کو دی جاتی ہے۔ چاہے وہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ صدر کہتے کس کو ہیں؟

کانپور میں ایک جلسہ تھا۔ ایک صاحب کو اس میں اپنی رائے کو قوت دینا تھا تو وہ اپنی تائید کے لیے ایک سیٹھ کو اپنے ساتھ لائے اور ان کو راستہ میں خوب پڑھایا کہ جب میں تقریر کر چکوں تو تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ وہ بیچارہ بالکل جاہل تھا۔ اتنا لفظ بھی اسے نہ آتا تھا۔ اس کو رٹتا اور یاد کرتا رہا کہ ذہن سے نکل نہ جائے اور دل میں دعا کرتا ہو گا کہ تقریر جلدی ختم ہو تو میں اس کو ادا کر کے چین سے بیٹھوں۔ چنانچہ خدا خدا کر کے تقریر ختم ہوئی تو سیٹھ صاحب کھڑے ہو کر فرماتے ہیں کہ میں بھی اس کی تردید کرتا ہوں۔ غریب کو بجائے تائید کے تردید یاد رہ گیا۔ اس پر مقرر نے چپکے سے کہا کہ نہیں تائید

تو آپ نے کہا میں اس کی تارید کرتا ہوں - یہ بالکل ہی مہمل لفظ تھا مقرر نے پھر لقمہ دیا کہ تائید کہو تائید تو آپ نے تیسری دفعہ تاکید کہا - خیر اس کو لوگوں نے غنیمت سمجھا کیونکہ تائید کے قریب ہی تھا۔

شریعت میں کثرتِ رائے کوئی چیز نہیں صاحبو! اول تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہو گی۔ پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوا لی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہہ دینا۔ جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں۔ اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی وہ تو ایک ہی شخص کی رائے ہوئی جس کے سب لوگ مقلّد ہوتے ہیں۔ باقی شریعت میں تو کثرت رائے کوئی چیز نہیں۔

بد اخلاق اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں تو آج کل ہر شخص اپنی رائے کا اتباع دوسروں سے کرانا چاہتا ہے۔ اسی لیے انجمنوں کا کام نہیں چلتا کیونکہ اراکینِ انجمن جو اوروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح تک بھی نہیں ہوتی۔ ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بن کر رہنا گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے بہت جلد اس میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ پھر ہر ایک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہو سکے تو کام تنہا کرو جماعت ہو تو دینداروں کی اس لیے میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہو سکے وہ مجمع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو۔ اکثر دیکھا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا ہے۔ دنیوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی کچھ دنیا مل بھی گئی تو دین کا ستیا ناس ہی ہو جاتا

ہے اور جو کام تنہا نہ ہو سکے مجمع کے ساتھ ہی ہو سکے۔ اس کے لیے اگر دینداروں کا مجمع میسّر ہو جائے تو کرو بشرطیکہ سب دیندار ہوں یا دینداروں کو غلبہ ہو۔

جماعت میں دنیاداروں کا غلبہ ہو تو کام کرنا واجب نہیں

اور اگر غلبہ دنیاداروں کو ہو اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے مجمع کے ساتھ مل کر کام کرنا واجب نہیں اس وقت آپ اس کام کے مکلّف ہی نہ رہیں گے۔ کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے اور حقیقت میں یہاں تشتّت ہے۔ وہی حال ہو گا تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ مجمع میّسر ہی نہیں۔ پھر جو کام اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیونکر ہو گا۔

شرائطِ اتفاق

میں سچ کہتا ہوں کہ آج کل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو، اتفاق کرو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ اتفاق کریں۔ ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہو سکتا بلکہ قیامِ اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کے لیے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میرا اتباع نہ کرے گا تو میں اس کا اتباع کر لوں گا۔

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر بہت زور دیتے ہیں مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے۔ اتفاق کی جڑ ہے تواضع۔ یہ ایک حجرہ نشین صوفی کی تحقیق ہے جس کے سامنے تمام تحقیقاتِ فلسفیہ گرد ہیں اور تواضع حاصل کرنے کے لیے کسی کامل کے قدموں میں پامال ہونے کی ضرورت ہے ؎

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

پس اتفاق کا مدار تواضع پر ہے اور تواضع موقوف ہے اصلاحِ نفس پر

اور اصلاح نفس موقوف ہے شیخ کامل کی صحبت پر یا کم از کم عدم انکار بھی ہو کہ ان کی غیبت و شکایت تو نہ کیا کریں۔

حدودِ اتفاق نیز اتفاق میں علاوہ ان شرائط کے اس کی بھی ضرورت ہے کہ اتنا اختلاط بھی نہ ہو کہ اپنے خاص اسرار دوسروں سے ظاہر کر دے۔ کیونکہ ممکن ہے کسی وقت یہ تعلق نہ رہے تو پھر ان اسرار کے اظہار پر پچھتانا پڑے گا۔ حدیث میں آتا ہے۔ احبب حبیبك ھونا ماعسٰی ان یکون بغیضك یوما ما۔ وابغض بغیضك ھونا ما عسٰی ان یکون حبیبك یوما ما۔

یعنی دوست سے سنبھل کر دوستی کرو زیادہ میل جول نہ کرو شاید کسی دن دشمن ہو جائے تو گھر کے بھیدی کی دشمنی بہت ضرر دیتی ہے۔ اور اگر کسی کو اپنے دوست کے متعلق عداوت کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنی ہی نسبت یہ احتمال رکھے کہ شاید کسی دن میں ہی بدل جاؤں۔ اس لیے اتفاق میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔

حدودِ عداوت اسی طرح اگر کسی سے عداوت کرو تو وہاں بھی حد کے اندر عداوت کرنا چاہیے۔ حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا خبر ہے کسی وقت پھر دوستی کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت آنکھیں سامنے کرنے سے حیا دامن گیر ہو۔

اور جس کی دوستی اور دشمنی اعتدال سے ہو گی اس کو کسی وقت بھی پریشانی نہ ہو گی۔ یہ تو اتفاق کے حدود و اسباب تھے۔

ایک درجہ نا اتفاقی کا بھی مطلوب ہے اور وہ یہ کہ کسی جماعت نے معصیت پر اتفاق کیا ہو تو ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب ہے یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ معاصی

اختیار کرنے لگے تو اس وقت دینداروں کو ان سے الگ ہو جانا چاہیے۔

مگر افسوس ہے کہ آج کل جہاں دیندار اور بے دین لوگ کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں اور نہ معلوم دیندار کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں؟ بے دین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مذاق کے موافق ہو اور ان کے مذہب کے موافق ہو اور ان کی رائے میں مفید ہو۔ اور دیندار باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے مذہب میں ناجائز یا حرام ہے۔ یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک مضر ہے مفید نہیں۔ یا یہ کام ہماری جماعت کے مذاق کے خلاف ہے۔ پھر بھی بے دینوں کی ہاں میں ملائے جاتے ہیں تاکہ اتفاق میں فتور نہ آئے۔

سبحان اللہ! صاحبو! اتفاق طرفین سے ہُوا کرتا ہے۔ جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت نہیں کرتی تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا۔ بس یوں کہو کہ تم ان کی محض خوشامد کر رہے ہو۔ اگر اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تو تمہاری کچھ رعایت کرتے۔ مگر لوگوں نے آجکل خوشامد کا نام اتفاق رکھ لیا ہے اس لیے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعن کرے گی کہ انہوں نے اتفاق میں کھوٹ ڈال دی۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس طعن سے کیوں ڈرتے ہو۔ صاف کہہ دو کہ ہاں ہم نے اتفاق کو توڑ دیا۔ اس لیے کہ اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب نہیں بلکہ بعض دفعہ نااتفاقی بھی مطلوب ہے جبکہ اتفاق سے دین کو ضرر پہنچ رہا ہو۔ (وعظ: الانسداد)

حق و باطل کے اتحاد کا اثر

حق و باطل کے اتحاد کا اثر اکثر یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ حق صاحبِ باطل میں مدغم ہو جاتا ہے۔ صاحبِ باطل اہلِ حق میں مدغم نہیں ہوتا۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ حق دشوار ہے کیونکہ نفس کے خلاف ہے۔ اور باطل سہل ہے اس لیے کہ وہ نفس کے موافق ہے۔ اور اتفاق اس طرح ہوتا ہے کہ ایک اپنے مسلک کو کسی قدر چھوڑے تو صاحبِ

باطل سہل کو چھوڑ کر دشوار کو کیوں اختیار کرے اس لیے اتحاد کا یہی انجام ہوتا ہے کہ صاحبِ حق کو کسی قدر اپنے مسلک کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

(النفحات ۔ ۲۴ شوال ۱۳۴۴ھ)

کام دین کا اور طریقہ دنیا کا افسوس ہم دین کا کام سمجھ کر بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اس کو بھی دنیا کے طریقہ پر کرتے ہیں ۔

اے بسا پردۂ یثرب بخواب　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

اس وقت دردمندانِ شریعت کی حالت یہ ہے کہ وہ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود کو یاد کرکے روتے ہیں کہ ہائے اُمت میں کیسا انقلاب ہوگیا۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ ان کا کوئی کام بھی تو ڈھنگ کا نہیں رہا۔

(السوال ص ۲۸-۲۷)

○

فصل (۳)

دوست و دشمن

دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست سمجھ بیٹھے

مسلمانوں کی حالت روز بروز ابتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر وقت دل کڑھتا ہے۔ بڑی خرابی جو پیدا ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست خیال کر بیٹھے ہیں۔ اگر حق کا اتباع کریں تو انشاء اللہ چند روز میں کایا پلٹ ہو جائے، مگر سنتا کون ہے معاملہ بالکل اس کا مصداق ہو رہا ہے:

کون سنتا ہے کہانی میری ۔۔۔ اور پھر وہ بھی زبانی میری

ڈھیلے کرتے، ڈھلڈھلے پائجامہ والوں کی کیا سنیں اور مجھ میں ذرا کہہ دینے کا مرض ہے تو میری شکایت ہوتی ہے۔ میں اکثر یہ پڑھ دیتا ہوں:

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

اور کبھی یہ پڑھ دیتا ہوں:

خود گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

(الملفوظات ج۲ ص۲۹۷)

ہم کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گئے

مسلمانوں کو تو صرف ایک ذات کے راضی کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ راضی ہو جائیں تو پھر کسی کی ناراضی سے کچھ ضرر نہیں اور وہ حق تعالیٰ کی ذات ہے اور اب تو مسلمان اس کا مصداق ہو گئے۔

؂ اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
ہم کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گئے

(الافاضات ع۳ ص۳۴۰ ملفوظ ع۲۲۶)

مسلمانوں کے دوست

تمام پریشانیوں کی جڑ خدا تعالیٰ سے صحیح تعلق کا نہ رکھنا ہے اور یہ مسلمانوں کی انتہائی بدفہمی ہے کہ غیر قوموں کی بغلوں میں جا کر گھستے ہیں۔ ان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا۔ حصر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تمہارا کوئی بھی دوست نہیں۔ سوائے اللہ اور رسول اور مومنین کے۔

(الافاضات ع۴ ص۱۴۹ ملفوظ ع۲۲۴)

مسلمانوں کے دشمن

جب تک ہم کلمہ پڑھتے ہیں تمام غیر مسلم ہمارے دشمن ہیں۔ اس میں کالے گوروں کی کچھ قید نہیں۔ مسلمانوں میں جو بڑے بڑے خوشامدی ہیں وہ ان کو بھی اپنا دوست نہیں سمجھتے۔

(الافاضات ع۵ ص۱۷۰ ملفوظ ع۲۸۸)

بعض لوگ کفار کی ایک جماعت کو بُرا کہتے ہیں اور بعض دوسری جماعت کو، میں کہتا ہوں دونوں بُرے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نجاست مرئیہ ہے ایک نجاست غیر مرئیہ۔ اور ہیں دونوں نجاست۔

(الافاضات ع۲ ص۳۰۲ ملفوظ ع۴۸۹)

گورے کالے سانپ

کافر جتنے ہیں سب اسلام کے دشمن ہیں، کوئی گورا ہو یا کالا، دونوں سانپ ہی ہیں۔ بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ اگر گورے سانپ کو گھر سے نکال بھی دیا، کالا ڈسنے کو موجود ہے جس کا ڈسا ہوا زندہ ہی رہنا مشکل ہے

(الافاضات ع ۶ ص ۱۹۷، ۲۳ رجب ۱۳۵۱ھ)

انگریز مسلمانوں کو اپنا اصلی مخالف سمجھتے ہیں

گو کفار کسی اپنی مصلحت سے مسلمانوں کی کچھ رعایت کریں — مگر یہ یقینی بات ہے کہ وہ اسلام کو اپنے لیے مضر سمجھتے ہیں اور اس واسطے اس کے مٹانے کی فکر میں ہیں..... اور ایک بات یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کا ان کے ساتھ اختلاف محض مطالباتِ سیاسی کے لیے ہے اگر وہ پورے کر دیے جائیں اختلاف ختم ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں کا اختلاف مذہبی ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو اصلی مخالف سمجھتے ہیں۔

(الافاضات ع ص ۲۵ محرم الحرام ۱۳۵۱ھ)

جان بوجھ کر فریب کھانا

مسلمانوں کی سمجھ میں اگر اور بھی کچھ نہیں آتا مگر دوسری قوموں کی ان سے عداوت یہ تو کھلم کھلا نظر آتی ہے مگر یہ جان بوجھ کر بھی دھوکہ میں آجاتے ہیں اور اس سے بھی بڑا سبب مسلمانوں کے نقصان کا یہ ہے کہ ان میں نظم نہیں۔ (ملفوظات ع ۲ ص ۲۱۶)

غیر قوم کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں

اسلام کو اپنی طرف منجذب کرنے کے لیے غیر قوم کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ دشمن کو دشمن کہہ کر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی رعایت کی ہے۔ وہی حقوق اور

وہی رعایت سب کے جذب کے لیے کافی ہے

(کمالات اشرفیہ صک)

کانگریس میں شرکت کا انجام

مسلمانوں نے جو اس (گاندھی) کا ساتھ دیا اس کا اخیر نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے سوختہ ہنڈیا کو تو پکا دیتا ہے اور خود فنا ہو جاتا ہے۔ یہی حشر مسلمانوں کا ہوا اور ہوگا کہ سالہا سال کی مُردہ کانگریس کو تو زندہ کر دیا اور خود ختم ہو گئے۔ اس پر اگر کوئی خیر خواہی کی غرض سے مسلمانوں کو سمجھائے تو کوئی نہیں سنتا۔ (ملفوظات ع۵ ص۲۷۱)

کانگریس کا مقصد

کانگریس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو تباہ اور برباد کرنا ہے اور مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دینا اس کا ایک خاص فرض منصبی ہے۔ یہ سب بالشویک خیال کے لوگ ہیں۔ بالشویک نے جیسا کچھ اسلام اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا۔ مدارس دینیہ و مساجد کو خراب کیا وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ یہ سب اسلام کے مقابلہ پر سازش ہے۔

(ملفوظات ع۱ ص۱۹۲)

لاکھوں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اگر مسلمان ایسا کرتے تو تمام غیر مسلم باشندے چیخ اٹھتے۔ کہا جاتا وحشیانہ حرکت ہے اور دوسرے کریں تو یہ فعل مدبرانہ اور عاقلانہ ہے مگر مسلمان اس گئے گزرے زمانہ میں بھی بلند حوصلہ ہیں اور باوجود ان سب باتوں کے خدا پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں۔ صبر و استقلال سے کام لے رہے ہیں اور یہ حدود سے گزر کر اب بھی ظلم نہیں کرنا چاہتے۔ ایسی ظلم کی باتیں کفر کے ساتھ تو جمع ہو سکتی ہیں، ایمان کے ساتھ ان کا جمع ہونا مشکل ہے۔

(ملفوظات ع۵ ص۱۸۷-۸۸)

دشمن بھی ہو اور نادان بھی تب تو کیا کہنا

بعض بدفہم اور کم سمجھ مسلمان ان (ہندوؤں) کو اپنا دوست سمجھ کر ان کی بغلوں میں جا گھستے ہیں۔ ان ناعاقبت اندیشوں کو معلوم بھی ہے کہ بزرگوں کا مقولہ ہے۔ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے اور جو نادان بھی ہو اور دشمن بھی تب تو کیا کہنا۔

(ملفوظات ج۵ ص۱۸۱)

دشمن کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے

جو شخص حکومت یا سلطنت کے باغیوں سے میل جول رکھتا ہے یا ان کو امداد دیتا ہے۔ وہ شخص بھی باغیوں ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہم جس کے وفادار ہیں، وفاداری اسی وقت تک ہے کہ ہم اس کے دشمنوں سے نہ ملیں ورنہ ایسے شخص کو وفادار ہی نہ کہیں گے جو دشمنوں سے ملے۔ یہ تو اجتماعِ ضدین ہے۔

(ملفوظات ج۲ ص۴۹)

بدترین دشمنوں کا اتباع کرتے ہیں

ایسوں کا اتباع کرتے ہیں جن کی عداوت کی یہ حالت ہے: اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (الآیۃ) (اگر تم کو بھلائی حاصل ہوتی ہے تو ان کو افسردہ کر دیتی ہے اور اگر تم کسی مشکل میں مبتلا ہوتے ہو وہ اس پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے)۔ مگر باوجود اس کے ان کی عداوت کا علاج ان کے اتباع سے کرتے ہیں اور حقیقی علاج نہیں کرتے وہ علاج یہ ہے: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (الآیۃ)

جس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کی وقعت خود ان مذہب والوں کے دل میں نہیں۔ بلکہ مذہبی لوگوں کی نسبت کہتے ہیں کہ تاریک دماغ ہیں پست خیال ہیں۔ سو مسلمانوں کی اس بدنصیبی اور بدبختی کا کسی کے پاس کیا علاج۔

(الافاضات ج۵ ص۹۰ ملفوظ ۱۵۸)

آزموں را یک زمانے خاک باش

افسوس تو مسلمانوں کی حالت پر ہے کہ ان کو اپنے دوست اور دشمن کی پہچان نہیں بدنیت، بددین، بداخلاق لوگوں کے اتباع میں فلاح ڈھونڈتے ہیں۔ اے مسلمانو! یاد رکھو تمہاری فلاح اور بہبودی صرف حق تعالیٰ کے اتباع اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہے۔ کیوں در بدر کی گداگری کرتے پھرتے ہو۔ تمہارے گھر میں خزانہ مدفون ہے تم کو خبر نہیں۔ تمہارے پاس ایک اتنی بڑی دولت ہے کہ تمام عالم کے غیر مسلم، اگرچہ وہ ہفت اقلیم کی سلطنت اور خزائن کے بھی مالک ہوں، مگر اس دولت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے جس سے تم کو خداوند جل جلالہٗ نے نوازا ہے۔ وہ دولت' دولتِ ایمان ہے۔ اس کی قدر کرو۔ اس کی قوت کے جو ذرائع اور نسخے ہیں ان کو اختیار اور استعمال کرو اور وہ اعمالِ صالحہ ہیں۔ پھر دیکھو چند روز میں کیا سے کیا ہوتا ہے اور اعتقاد سے نہ سہی بطورِ امتحان ہی کر کے دیکھ لو ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

ملفوظات ج ۵ ص ۲۰۶

فصل (۴)

تحریکات و شورشیں

قیام امن کی تدبیر اوامرِ شرعیہ پر عمل کرنا اور نواہیٔ شرع سے بچنا یہ جڑ ہے امن کی اور یہی دافع ہے فساد کا۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اوامرِ الٰہیہ کی پابندی کرو، نواہی سے بچتے رہو۔ بس یہی صورتِ اصلاح ہے، زمین میں امن اسی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو صورت ہے وہ فساد کی صورت ہے۔ مگر افسوس لوگ خدا کی تعلیم کو چھوڑ کر اپنی طرف سے نئی صورتیں امن کی گھڑ رہے ہیں۔ (التعرف بالتصرف ص۳۸)

تحریکات کے مفاسد تحریکاتِ حاضرہ میں مصالح سے زیادہ مفاسد ہیں اور مسئلہ یہ ہے کہ ایک مفسدہ ہو اور پچاس مصلحت ہوں وہاں مفسدہ غالب سمجھا جائے گا، نہ کہ جہاں مفاسد غالب ہوں وہاں جواز کا حکم کیسے ہو سکتا ہے۔ طیّب اور خبیث کا مجموعہ خبیث ہی ہو گا۔

(ملفوظات ج۵ ص۱۵۹)

جلوس اور ہڑتالیں جب کوئی تدبیر، تدبیرِ منصوصہ کے خلاف اختیار کی جائے گی اس کو تو ممنوع ہی کہا جائے گا بخصوص جبکہ وہ فعل عبث یا مضر بھی ہو۔ اس کی حرمت میں پھر کیا شبہہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہڑتال ہے جلوس ہے، ان میں وقت کا ضائع ہونا، روپیہ کا صرف ہونا، حاجت مند لوگوں کو تکلیف ہونا، نمازوں کا ضائع ہونا کھلے مفاسد ہیں تو یہ افعال کیسے جائز ہو

سکتے ہیں ؟ ایک صاحب نے عرض کیا اگر نیت امدادِ حق کی ہو ؟
فرمایا کہ ان باتوں سے حق کو کوئی امداد نہیں پہنچتی۔ دوسرے نامشروع فعل حسنِ نیت سے مشروع نہیں ہو جاتا۔ یہ تو محض جاہ طلبی ہے کہ جلسے ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، گلوں میں ہار پڑ رہے ہیں اور یہ سب بد دینوں ہی سے سبق حاصل کیے ہیں اور سب یورپ ہی کی تقلید ہے۔ (ملفوظات ۵ ص ۱۲۲)

مار کھانا، جیل جانا
عدمِ قوت کی حالت میں قصداً ایسی صورت اختیار کرنے کی کہ خود ضرب و حبس میں مبتلا ہو شریعت اجازت نہیں دیتی۔ بلکہ بجائے ایسے مخترع مقابلہ کے ناگوار امور پر صبر سے کام لینا چاہیئے۔ خیر القرون میں دو صورتیں تھیں کہ قوت کے وقت مقابلہ اور عدمِ قوت کے وقت صبر۔ اس کے سوا سب من گھڑت تدابیر ہیں اس لیے ان میں خیر و برکت نہیں ہو سکتی۔ (ملفوظات ۵ ص ۱۵۵)

ستیہ گرہ
اگر کسی ظالم کے مقابلہ میں قدرت ہو تو "ضرب یضرب" پر عمل ہو اگر قدرت نہ ہو تو "صبر یصبر" پر عمل ہو۔ یہ بیچ کی صورت جس کو ستیہ گرہ کہا جاتا ہے اس کا کوئی ماخذ سمجھ میں نہیں آتا۔ (ملفوظات ۵ ص ۲۶۳)

سلاطین اسلام کی اہانت
سلاطین اسلام کی علی الاعلان اہانت میں ضرر ہے جمہور کا۔ ہیبت نکلنے سے فتن پھیلتے ہیں اس لیے سلاطین اسلام کا احترام کرنا چاہیے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۲۷۵)

حکامِ وقت کو برا کہنا
بعض لوگ بعض مصائب سے تنگ ہو کر حکامِ وقت کو برا بھلا کہتے ہیں۔ یہ بھی علامت ہے بے صبری کی اور پسندیدہ تدبیر نہیں اور حدیث شریف میں اس سے ممانعت بھی آئی ہے فرماتے ہیں: لاتسبوا الملوک۔ الخ یعنی "بادشاہوں کو برا مت کہو ان کے قلوب

میرے قبضے میں ہیں۔ میری اطاعت کرو۔ میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کردوں گا۔"

یاد رکھو جو مصیبت آتی ہے منجانب اللہ ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ یعنی کوئی مصیبت نہیں آتی۔ مگر اللہ کے حکم سے" و جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ اُدھر رجوع کرے اور پھر جو پیش آوے خیر سمجھے اس لیے کہ ع

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

اور شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

از خدا داں خلافِ دشمن و دوست

کہ دلِ ہر دو در تصرف اوست

تدابیر بغیر اذن شرعی کے جائز نہیں

ہاں اذن شرعی سے تدبیر کرنا جائز ہے
اپنی رائے سے تدبیر کرنا بھی خلاف شریعت ہے

آجکل میں دیکھتا ہوں کہ بعض نوجوانوں کے اندر ولولے ہیں بعض واقعات کی تدبیر اس کو سمجھتے ہیں کہ کوئی شورش ہو گرما گرم ہو۔ خدانخواستہ اگر کوئی شورش ہو گی بھی تو سب سے پہلے ہٹنے والے یہی ہوں گے۔ صاحبو! عافیت اور امن کو غنیمت سمجھو اور عافیت اور امن ہی مانگو۔ ہاں اگر کوئی واقعہ یا کوئی مصیبت خود بخود ہی پیش آجائے تو اس میں صبر و استقلال سے کام لو۔ یہی سنّت ہے حضورؐ کی عادت شریف یہی تھی کہ خود کسی حادثہ کی تمنّا نہ فرماتے تھے اور اگر کوئی واقعہ ہوتا تھا تو تدبیر سے کام لیتے تھے۔ بیماری ہوتی تھی دوا فرماتے تھے۔ حرب کا موقعہ ہوتا تھا تو جو اس کے مناسب تدبیریں ہیں وہ کرتے تھے۔

(الصبر ص ۳۶)

اسلامی اور غیر اسلامی تحریک میں امتیاز یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو کام خالص مذہبی ہوگا اس کی طرف اولاً اہلِ دنیا کو رغبت نہ ہوگی پس جس کام کی طرف اولاً اہلِ دنیا متوجہ ہوں وہ خالص مذہبی نہیں اور جس کی طرف اولاً اہلِ دین اور اہلِ تقویٰ متوجہ ہوں، وہ خالص مذہبی اور خالص دین ہوگا —— اور جو تحریک مرکب ہو اسلامی اور غیر اسلامی سے وہ کبھی خالص اسلامی تحریک نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو فرض و واجب کہا جا سکتا ہے۔ (ملفوظات ج ۵ ص ۹۴)

فتنِ دنیا اور فکرِ آخرت ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ زمانۂ تحریک میں لوگوں نے ستانے میں کونسی کسر اٹھا رکھی تھی۔ جو کچھ نہ کہنا تھا کہا، جو کچھ نہ کرنا تھا کیا۔ میں تو خدا کے سپرد کر کے بالکل مطمئن ہو چکا تھا۔ ایک روز مسلمانوں کی موجودہ حالت کا مجھ پر اس قدر اثر ہوا کہ کھانا تک تلخ معلوم ہونے لگا۔ اسی روز اپنی ایک حالت کا غلبہ ہوا؛ کہ تمام دنیا ایک طرف جا رہی ہے اور اس میں علماء بھی بکثرت شریک ہیں، کہیں میں ہی تو غلطی پر نہیں۔ اس حالت کا اس قدر سخت غلبہ تھا کہ اس روز کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر مکان پر پہنچا، چارپائی پر بیٹھ کر لیٹنے کا ارادہ تھا کہ دفعتاً زبان پر یہ جاری ہو گیا۔ اب چاہے اس کو وارد سے تعبیر کر لیا جائے: آمنت باللّٰہ وملٰئکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والیوم الآخر والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللّٰہ تعالیٰ والبعث بعد الموت بعد الموت پر قلب میں ڈالا گیا کہ تم تو بعد الموت کے لیے تیاری کر رہے ہو، ان دنیا کے ذرا ذرا سے فتنوں سے کیوں ڈرتے ہو اور مشوش ہوتے ہو۔ بعد الموت جو واقعات پیش آنے والے ہیں۔ ان کے سامنے ان کی حقیقت ہی کیا۔ مثلاً جان کندنی ہے، قبر ہے، میدانِ محشر ہے، میزان عدل ہے، پلصراط ہے بس اسی وقت قلب کو سکون

ہو گیا۔ پھر تو چین سے کھاتا تھا چین سے سوتا تھا۔

یہاں تک لوگوں نے ستانے اور ایذا پہنچانے کی کوشش کی کہ بھنگن تک سے کہا گیا کہ تو اس گھر کو کمانا چھوڑ دے۔ اس نے جواب دیا کہ چاہے تمام قصبہ چھوٹ جائے مگر یہ گھر نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ سب خدا کی طرف سے فضل تھا۔ ورنہ عنایت فرماؤں کی عنایتوں کا کوئی حد و حساب ہی نہ تھا۔ اب کیا کہا جائے۔ وہ قصہ ہی ختم ہو چکا۔ غالبؔ نے خوب کہا ہے ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

ایک بات ہو تو عرض کی جائے۔ قتل کی دھمکیاں الگ تھیں، خانقاہ خالی کرانے پر زور دینے کے الگ منصوبے ہو رہے تھے۔ نماز پیچھے نہ پڑھنے کا اعلان الگ تھا، سی۔آئی۔ڈی سے تنخواہ پانے کی شہرت الگ دی جا رہی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھ کو کسی کے دروازہ پر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انہیں لوگوں کو یہاں پر بھیج دیا اور قریب قریب سب نے معافی کی درخواستیں کیں۔ میں نے اس نیت سے سب کو معاف کر دیا کہ میں بھی اللہ کا قصوروار ہوں۔ شاید وہ بھی مجھ کو معاف کر دیں۔ (الافاضات ج ۴ ص ۱۲۴، ملفوظ ۱۷۹)

تحریکات میں شریک نہ ہونے کی وجہ

فرمایا کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، احسان ہے کہ شریعت ایک درجہ میری فطرت اور طبیعت بن گئی ہے، میں اس کے خلاف پر عادۃً قادر نہیں۔ اگر دوسرے خاص جذبات سے مجبور رہیں تو میں اس جذبہ سے مجبور ہوں۔ اب اس پر اگر کوئی خوش رہے تو فبہا اور ناخوش رہے تو فبہا۔ مان لو کہ میں نکما ہوں، بے کار ہوں، نہ ملک کے کام آیا نہ قوم کے تو مجھ کو چھوڑ دو۔ (ملفوظات ج ۵ ص ۱۶۲)

فصل (۵)

لیڈرانِ قوم

رسمِ زمانہ ہر زمانہ کی ایک رسم ہوتی ہے کہ اہلِ زمانہ اسی رسم پر چلنے لگتے ہیں۔ آجکل یہ رسم ہے کہ ہر مشہور اور غیر مشہور تحصیل شہرت یا تکمیل شہرت کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ (تجارت آخرت صہ ۶)

عقل سے کورے آجکل کے لیڈر اکثر عقل سے کورے ہیں۔ جب عقل صحیح نہیں پھر ایسی عقل میں احکام اسلام کیسے آئیں۔ عقل ہو تو بقدر ضرورت آئیں بھی اجمالاً یا تفصیلاً۔ پھر نماز نہیں، روزہ نہیں، زہد نہیں تقویٰ نہیں۔ ان اعمال سے بھی عقل میں نور پیدا ہوتا ہے۔ اس پر احکام شرعیہ پر شبہہ کہ ہماری عقل میں نہیں آتے۔ پھر دعویٰ ہے کہ ہم قوم کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ ایسوں ہی کی بدولت مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہر روز ایک نیا لباس بدل کر پلیٹ فارموں پر آکھڑے ہوتے ہیں۔ (ملفوظات ع ۵ صہ ۸۴)

دین کے دشمن مگر دین کے پکّے دشمن ہیں۔ دوستی کے پردہ میں دشمنی کر رہے ہیں، احکامِ اسلام کو مٹانے پر تلے ہوتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے حرمتِ سُود کا مسئلہ مانع ترقی ہے۔ کوئی کہتا ہے پردہ مانع ترقی ہے۔ کوئی کہتا ہے صرف توحیدِ خداوندی کی ضرورت ہے اعتقادِ رسالت مانع ترقی ہے غرضکہ ہاتھ دھو کر اسلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور پھر مسلمان کے مسلمان، قوم کے

خیر خواہ، راہبر، مقتداء بنے ہوئے ہیں۔ ان کی سازشوں کو دیکھ کر اسلام بزبان حال یہ کہتا ہے:

قتلِ ایں خستہ بہ شمشیر تو تقدیر نبود
ورنہ ہیچ از دلِ بے رحمِ تو تقصیر نبود

اسلام کو غیروں کی شکایت نہیں اس کو تو مسلمانوں ہی سے شکایت ہے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

(ملفوظات ع ۲ ص ۱۰۳)

ظاہر ٹھیک نہ باطن اگر کہا جاتا ہے کہ تم خود عمل کر کے دکھلاؤ، پہلے اپنی اصلاح کرو کیونکہ تمہارا نہ ظاہر ٹھیک ہے نہ باطن، نہ صورت، نہ سیرت اور مسلمانوں کے رہبر اور مقتداء بنتے ہو تو جواب میں کہتے ہیں کہ آپ ذاتیات پر حملہ کرتے ہیں۔ ارے بھلے مانسو! تم اللہ اور رسول کے احکام پر حملہ کرو، بجائے احکامِ الٰہیہ کے اپنے دماغ سے تراشی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کے لیے دنیا کو مجبور کرو، اسلام اور احکام اسلام کی پائمالی کرو، مگر دوسرا تمہاری کسی حالت پر بھی نوٹس نہ لے۔ اس حالت میں تمہیں دوسروں ہی کے کہنے کا کیا حق ہے؟ دوسرا ہی تمہاری کیوں ماننے لگا۔ وہ بھی یہی کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میری ذاتیات سے آپ کو کیا بحث۔ چلو چھٹی ہوئی۔ آدمی کچھ تو عقل سے کام لے۔ ان کی بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے کہ کوئی جلسہ کر لیا۔ دو چار ریزولوشن پاس کر لیے۔

(ملفوظات ع ۵ ص ۱۷۶)

طلباء کا ابتلاء اس پر غضب یہ ہے کہ خود تو مبتلا ہوئے ہی تھے۔ بے چارے طالب علموں کو جو پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے۔ ان کو بھی اس بلا میں مبتلا کر دیا اور میدان میں لا کھڑا کیا۔ یہ ایسا چٹیل میدان ہے کہ دانہ ہے نہ پانی۔ نہ دنیا ہے نہ دین۔ اس بدنظمی اور بے ڈھنگے پن کی کوئی حد ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ کسی تحریک میں بھی طالب علموں کو شرکت کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ اس میں سخت مضرت ہے آئندہ کے لیے۔ (ملفوظات ع۱ ص۸)

دل دُکھتا ہے کیا ان کاموں کے لیے طلباء ہی رہ گئے ہیں اور مسلمان کچھ کم ہیں ان سے کام لو۔ اگر کام کرنا ہی ہے، مگر سنتا کون ہے؟ جو دماغوں میں سما گئی ہے اس کے سامنے کسی خیر خواہ کا کہنا اور نفع اور ضرر کسی کی کچھ خبر نہیں کہ آخر اس کا انجام ہے کیا۔ بے حد دل دکھتا ہے مگر سوائے دعا کے اور کیا چارہ ہے۔ حق تعالیٰ عقل اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔

(ملفوظات ع۱ ص۶۹)

علما اور لیڈروں کا کام ہر قوم کے لیے تقسیم خدمات ضروری ہے۔ بدون اس کے کام نہیں چل سکتا پس مطالب قرآن و حدیث اور احکام لیڈروں کو علماء سے پوچھنا چاہیے اور ترقی قومی کے اسباب و وسائل لیڈروں کو سوچنا چاہیے۔ (انفاس عیسیٰ ص۳۶)

تقسیم کار سب کو مل کر کام کرنے کے یہ معنی نہیں کہ سب ایک ہی کام میں لگ جائیں یا ایک کا کام دوسرا کرنے لگے۔ یہ علاوہ دین کے عقل کے بھی خلاف ہے۔ ہر شخص کو اپنا اپنا کام انجام دینا چاہیے۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے۔ ورنہ گڑبڑ کرنے سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ (ملفوظات ع۱ ص۸)

مذہبی راہبر کی امیری قوم کی گمراہی

جس قوم کے مذہبی راہبر امیر ہوں گے وہ مذہب اور قوم گمراہ ہو جائے گی۔ اس لیے کہ ان کو تو ضرورت قوم سے واسطہ رکھنے کی رہے گی نہیں اور جب واسطہ نہ رہا تو گمراہ ہونا قریب ہی ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ اب واسطہ مال کے سبب ہے بلکہ امارت میں خاصہ ہے تبعید مساکین کا

(الافاضات ص ۵ ص ۱۸۱
ملفوظ ۱۸۳)

امداد الٰہی کی شرط

حضرات! جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمان کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں اور امداد الٰہی کی شرط احکامِ الٰہی کی پابندی ہے جس کا سیکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے۔ جب تک مسلمان سچ مچ مذہبی دیوانے بنے رہے دُنیا ان کی جوتیوں سے لگی رہی اور جوں جوں اس میں کمی آتی گئی مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔

فتح اسکندریہ کا واقعہ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مصر و اسکندریہ کی فتح کے لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیرِ لشکر بنا کر بھیجا تو جس طرف یہ خدائی لشکر رُخ کرتا فتح و نصرت ان کے قدموں پر گرتی تھی مگر اسکندریہ کی فتح میں معمول سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی یعنی تین مہینہ تک مسلمانوں کو اس کا محاصرہ کرنا پڑا۔ حضرت عمرؓ کو یہ تاخیر بارِ خاطر ہوئی اور آپ نے حضرت عمرو بن العاص کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

"حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ مجھے حیرت ہے کہ آپ کو فتح اسکندریہ میں اتنی دیر کیوں لگی! آپ تو ہمیشہ سے جہاد میں رہتے ہیں اور ہر کام میں تجربہ کار ہیں۔ پھر اس تاخیر کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں

کہ تمہاری نیت میں تغیّر آگیا ہے اور تم دنیا سے اسی طرح محبت کرنے لگے۔ جیسے تمہارے مخالف اس میں مبتلا ہیں۔ حق تعالیٰ خلوصِ نیّت کے بغیر فتح نہیں دیتا۔ پس جس وقت میرا یہ خط پہنچے فوراً لوگوں کو جمع کر کے جہاد کی ترغیب دیجئے اور مسلمانوں کو سمجھا دیجئے کہ ہر مسلمان اپنی ہر حرکت و سکون میں صرف ربّ الارباب کی خوشنودی اور کلمہ حق کی تبلیغ کا قصد کرے۔"

حضرت عمرو بن العاص کے پاس یہ والانامہ پہنچا تو آپ نے لشکر کو جمع کر کے خلیفۃ المسلمین کا خط پڑھ کر سنایا اور سب کو حکم دیا کہ غسل و طہارت کے بعد دو رکعتیں پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی دعا کریں۔ سارے لشکر نے اس حکم کی تعمیل کی اور نماز و دُعا کے بعد اللہ تعالیٰ کی امداد کے بھروسہ پر ایک حملہ کیا تو میدان ان کے ہاتھ تھا اور دشمن کی وہ زبردست طاقت جس نے تین مہینہ کی مدافعت سے شہر کا داخلہ ناممکن کر دیا تھا۔ چشم زدن میں ایسی درہم برہم تھی کہ اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ تھا۔

درسِ عبرت اور تائید غیبی یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کو عام مورخین نے لکھا ہے اس میں ہمارے لیے درسِ عبرت ہے کہ مسلمانوں کی ناکامیابی کا سبب حبِّ دنیا اور قلّتِ تعلق مع اللہ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری ہے کہ مسلمان ہر حکمِ الٰہی کی پابندی کو اپنے ذمہ لازم اور دوسروں کو نرمی سے سمجھانا اور بتلانا اپنا فرضِ منصبی سمجھے۔ خدا کی نافرمانی اور گناہوں کو چھوڑ دو اپنی صورتیں ایسی بنا لو کہ دُور سے دیکھنے والا پہچان لے کہ یہ مسلمان ہیں اور اپنے اخلاق اسلامی اخلاق بنا لو کہ ہر مخالف کے نزدیک بھی آپ کی اخلاقی شان ممتاز ہو۔ آج سے خدا کے فرمانبردار بندے بن جاؤ۔ پھر دیکھو تائید غیبی کیسے تمہارا

ساتھ دیتی ہے اور دوسری قوموں پر تمہارے رعب کا سکہ بیٹھتا ہے۔

مسلم لیگ سے خطاب

۲۹ محرم الحرام ۱۳۵۷ھ کو مسلم لیگ کے جلسہ میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی یہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی کسی عذر کی وجہ سے مولانا خود تشریف نہیں لا سکے تھے اور رسالہ النور بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ میں حضرت مولانا کا یہ خطبہ شائع ہوا۔

گو میں اس وقت بظاہر جلسہ میں شریک نہیں ہوں کیونکہ علاوہ ضعف فطری کے اپنے خاص مشاغل ضروریہ دینیہ کی وجہ سے اتنی فرصت نہیں پاتا کہ مجالس و اجتماعات میں شرکت کر سکوں۔ اور یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ میں بوجہ ضعف قوائے جسمانیہ کے بھی مسلم لیگ میں عملی شرکت سے معذور ہوں۔ مگر دل سے میں آپ کے ساتھ ہوں اور مسلم لیگ کے مقاصدِ حسنہ سے متفق اور اس کی ترقی و بہبود کے لیے دعا گو ہوں اور تمام مسلمانوں کو عموماً مشورہ دیتا ہوں کہ ہر شخص اپنی ہمت کے موافق مسلم لیگ کی ترقی اور شرعی حیثیت سے اس میں جو کوتاہی ہے اس کی اصلاح اور مسلمانوں کی تنظیم کے لیے پوری کوشش کرے اور اس کے ممبروں کی توسیع میں برابر کوشش کرتا رہے ...... اور جو حضرات اس وقت مسلم لیگ میں شریک ہیں یا آئندہ شریک ہوں ان کی خدمت میں خصوصیت کے ساتھ چند معروضات پیش کرتا ہوں

حضرات آپ کو اس عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ جم جانا چاہیے کہ مسلمان جب ترقی کرے گا، احکام شرعیہ کی پابندی ہی سے کرے گا اور یہ خیال دل سے بالکل نکال دینا چاہیے کہ بغیر اتباعِ شریعت کے بھی مسلمان ترقی کر سکتے ہیں۔ جیسا بعض کا خیال ہے کہ دیندار ہونے اور نماز روزہ کی پابندی کو ترقی میں کیا دخل بلکہ اس کے لیے صرف تدابیر سیاسیہ کافی ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب میں وہ معروضات پیش کرتا ہوں:

(۱) ہر شخص اپنا اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ و تحفظِ اسلام و تنظیم مسلمین کو سمجھے۔ دنیوی مقاصد کو بھی ان مقاصد کا تابع بنائے اصل مقصود نہ بنائے۔ تبلیغ اسلام میں ہر شخص مشغول و سرگرم ہو جائے۔

(۲) سب مسلمان اپنی صورت و وضع شریعت کے موافق بنائیں۔ کفار و فساق کی وضع سے کلی احتراز کریں۔

(۳) نماز کی پابندی ہر مسلمان پر تمام فرائضِ منصبی سے زیادہ ضروری اور لازمی ہے لہٰذا ممبرانِ مسلم لیگ خود بھی نماز کے پابند رہیں اور دوسروں کو بھی نرمی سے بار بار تاکید کر کے پابند بنائیں۔

(۴) میرے مضمون تنظیم المسلمین اور تفہیم المسلمین میں جو طریقِ عمل بتایا گیا ہے مسلم لیگ اس کو بھی اپنے مقاصد کی طرح ضروری سمجھے بلکہ اگر ممکن ہو تو مقاصد میں داخل کر کے تمام ممبروں کو اس کے موافق عمل کرنے کی تاکید کرے کہ ان مضامین میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بنیاد ہے اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کی جیسا کہ نصوص قرآنیہ و حدیثیہ اور تجربہ اس پر شاہد ہے۔ اب میں دعا پر اس معروض کو ختم کرتا ہوں۔

O

حکومت

خالص مذہبی سیاست مذہب اسلام میں جو ایک حصّہ سیاسیات کا ہے وہ مدوّن ہے۔ اس تدوین کے موافق اس کو اختیار کرو۔ وہ بہت کافی ہے اور وہ خالص مذہبی سیاست ہے۔ اس میں گڑبڑ اور کتر بیونت کرنا......... جائز نہیں جیسا کہ آجکل کے طبائع میں یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ ہر جگہ اپنی رائے کو دخل دینا چاہتے ہیں۔

(ملفوظات ۵ ص ۹۵)

جمہوریت ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا...... آخر یہ جمہوریت معلوم نہیں کہاں سے نکالی ہے۔ اس کے نتائج بھی بھگت رہے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، مگر جو زبان سے ایک دفعہ نکل گیا، قیامت آجائے، اس سے نہ ہٹیں گے۔ اس قدر نفس پروری کا زمانہ ہے کہ تجربہ ہوگیا، مشاہدہ ہوگیا مگر اڑے ہوئے ہیں۔

(الافاضات ۵ ص ۵۴، ملفوظ ۹۰)

شخصی رائے اور کثرت رائے آجکل اکثر امور میں مطلق کثرت رائے کے لیے ایک قاعدہ نکلا ہے کہ کثرت کی طرف فیصلہ کیا جائے مگر اس میں اوّل تو یہ کلام ہے کہ جس کو آپ کثرت سمجھتے ہیں وہ

حقیقت میں کثرت نہیں۔ کیونکہ تم نے دس پندرہ یا چالیس پچاس آدمیوں کو جمع کر کے ان سے رائے لے لی اور کثرت پر فیصلہ کر دیا حالانکہ کروڑوں آدمی ابھی ایسے باقی ہیں جن سے رائے نہیں لی گئی۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم کو عوام سے رائے لینے کی ضرورت نہیں بلکہ عقلاء کو انتخاب کریں گے اور ان کی کثرت پر فیصلہ کا مدار رکھیں گے تو میں پوچھوں گا کہ عقلاء کس معیار سے منتخب کیے جائیں گے؟ اور اس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل؟ اگر انتخابِ عقلاء کا معیار تم نے اپنی ذاتی رائے سے قائم کیا تو تمہاری رائے کے غلط نہ ہونے کی کیا وجہ؟

حقیقت میں فیصلہ ہمیشہ شخصی رائے سے ہوتا ہے کیونکہ کثرت رائے کے حاصل کرنے کا جو معیار تجویز کیا جاتا ہے وہ شخصی رائے سے تجویز ہوتا ہے۔ اس میں خوب غور کرو یقیناً انتہا شخصی رائے پر ہوگی۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اس کثرت رائے کے فیصلہ میں بھی وہ خرابی موجود ہے جو شخصی رائے میں بیان کی جاتی ہے کیونکہ کثرت رائے کے فیصلہ سے بھی رعایا کی حریت باطل ہوتی ہے جس کا آج کل بہت چرچا ہے کہ مساوات اور حریت ہونا چاہیے یہاں تک کہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کیا پارلیمنٹ کے سب قوانین رعایا کی رائے کے موافق ہوتے ہیں؟ بلکہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی رائے کے خلاف ہوتے ہیں تو کیا اس صورت میں کثرت رائے سے حرّیت باطل نہیں ہوئی؟ جب کثرت رائے سے بھی حرّیت کا ابطال ہوتا ہے اور وہی صبر و استقلال اس میں بھی ہے جو شخصی رائے میں ہے تو اب بتلائیے کہ ایک شخص کی غلامی اور استبداد سے پارلیمنٹ کی غلامی اور اس کا استبداد کیوں افضل ہے؟ یقیناً بیس تیس آدمیوں کی

غلامی سے ایک کی غلامی بہتر ہوگی۔

پس اپنی اپنی رائے کا یا کثرت رائے کا اتباع نہ کرو بلکہ حکم واحد کا اتباع کرو۔ اور وہ حکم واحد "وحی" ہے اس میں خود رائی کے فضولیات کو مت داخل کرو کیونکہ رائے کی صحت پر کسی طرح اطمینان نہیں ہو سکتا۔ جو شخص وحی میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے وہ جاہل ہے، مجنون ہے، مگر آجکل بڑی حماقت یہ ہو رہی ہے کہ مجنون اپنے کو مجنوں نہیں سمجھتا اور یہ بھی آثار جنوں سے ہے (غایۃ النجاح فی آثار الفلاح ۲۴۔ ربیع الثانی)

شخصی حکومت

اہل حلّ وعقد اور رائے جماعت عقلاء آ بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو بس ہم شخصی سلطنت کے اس لیے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لیے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے، صائب العقل رزین سمجھتے ہو تو پھر کثرتِ رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام صد ۱۸ (اشرف الجواب صد ۱۲ (صد ۶)

اسلام کی قوت کا مدار

اسلام کی قوّت کا مدار لوگوں کی شخصیتوں پر سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام کی قوّت کا مدار حق پر ہے نہ کہ کسی مخلوق پر۔ اسلام کی قوت خارج سے نہیں داخل سے ہے۔ حق میں وہ قوت ہے کہ اگر ایک شخص حق پر ہو اور سارا عالم اس کا مخالف ہو تو وہ ضعیف نہیں۔ اور اگر یہ شخص حق پر نہیں سارا عالم اس کا معتقد ہو وہ شخص ضعیف ہے اس میں کچھ بھی قوّت نہیں۔ (الافاضات ۳ صد ۱۲۔ ملفوظ ۱۲)

قانون شریعت مصلحت عامّہ کے خلاف نہیں

کوئی قانون مصالح خاصّہ کی حفاظت کا ذمہ دار

غلامی سے ایک کی غلامی بہتر ہوگی۔

پس اپنی اپنی رائے کا یا کثرت رائے کا اتباع نہ کرو بلکہ حکم واحد کا اتباع کرو۔ اور وہ حکم واحد وحی ہے اس میں خود رائی کے فضولیات کو مت داخل کرو کیونکہ رائے کی صحت پر کسی طرح اطمینان نہیں ہو سکتا۔ جو شخص وحی میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے وہ جاہل ہے، مجنون ہے، مگر آجکل بڑی حماقت یہ ہو رہی ہے کہ مجنون اپنے کو مجنون نہیں سمجھتا اور یہ بھی آثار جنوں سے ہے (غایۃ النجاح فی آثار الفلاح ۲۳- ربیع الثانی)

شخصی حکومت

اہل حل و عقد اور اہل رائے جماعت عقلاء یا بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو بس ہم شخصی سلطنت کے اس لیے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لیے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نا اہل سمجھتے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے، صائب العقل زرین سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام ص۱۸ (اشرف الجواب ص۲۲ (ص۹)

اسلام کی قوت کا مدار

اسلام کی قوت کا مدار لوگوں کی شخصیتوں پر سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام کی قوت کا مدار حق پر ہے نہ کہ کسی مخلوق پر۔ اسلام کی قوت خارج سے نہیں داخل سے ہے۔ حق میں وہ قوت ہے کہ اگر ایک شخص حق پر ہو اور سارا عالم اس کا مخالف ہو تو وہ ضعیف نہیں۔ اور اگر یہ شخص حق پر نہیں سارا عالم اس کا معتقد ہو وہ شخص ضعیف ہے اس میں کچھ بھی قوت نہیں۔ (الافاضات ۳ ص۱۲، ملفوظ ۱۲)

قانون شریعت مصلحت عامہ کے خلاف نہیں

کوئی قانون مصالح خاصہ کی حفاظت کا ذمہ دار

نہیں ہوتا نہ ہو سکتا ہے کیونکہ مصالح خاصّہ آپس میں متناقض ہوتے ہیں جن کا جمع ہو سکنا بھی محال ہے بلکہ قانون مصالح عامّہ کی حفاظت کرتا ہے سو بحمد اللہ قانون شریعت مصلحت عامّہ کے خلاف نہیں۔ (دین و دنیا۔ طریق النجاۃ ص۲۶)

علماء اور سلاطینِ اسلام میں مفاہمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں: شان نبوت اور شان سلطنت۔ اس کے بعد خلفائے راشدین بھی دونوں کے جامع تھے۔ مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہ پر تقسیم ہو گئیں: شانِ نبوت کے مظہر علماء ہیں اور شان سلطنت کے مظہر سلاطین اسلام۔ اب اگر یہ سلاطین علماء سے استغناء کرتے ہیں تو حضور ہی کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے۔ اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں تو اس سے بھی حضور ہی کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے۔ اب صورت دونوں کے جمع کرنے کی یہ ہے کہ سلاطین سے تو میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنی حدود میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک علماء اہلِ حق سے استفتاء نہ کرلیں۔ اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کاربند ہوں۔ اگر یہ دونوں شانیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہیں اس طرح جمع ہو جائیں تو مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی صورت نکل آئے اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحل پر جا لگے ورنہ اللہ ہی حافظ ہے۔ (ملفوظات ج۳ ص۲۲۱)

جزوی امور میں غفلت

سلطنتیں جو گئی ہیں میرے نزدیک چھوٹی چیزوں کے اہتمام کی غفلت ہی سے گئی ہیں کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف سے جو غفلتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب مل کر ایک بہت بڑا مجموعہ غفلتوں کا ہو جاتا ہے جو آخر میں رنگ لاتا ہے اور زوال سلطنت کا موجب ہوتا ہے۔

نیز جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام نہیں ہوتا تو غفلت کی عادت پڑ جاتی ہے۔ پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے اور وہ براہ راست مخل ہیں سلطنت کی۔

پھر چھوٹے امور میں کوتاہی کرنے سے باہمی معاملات میں بھی یہی عمل ہوتا ہے جس سے باہم کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں باہم الفت نہیں رہتی اور مدار سلطنت کا باہمی اتفاق پر ہے۔

(الافاضات ع۳ ملفوظات ع۲۵۹)

ہر کمالے را زوالے کا راز

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ حکومت ہی کی کیا تخصیص ہے ایک خاص حالت میں ہر چیز کو زوال ہے چاہے وہ حکومت ہو یا قوت اور شجاعت ہو، مال ہو عزت ہو، جاہ ہو، علم ہو، فضل ہو، کمال ہو — اور وہ خاص حالت یہ ہے کہ یہ شخص اس کو اپنا کمال سمجھنے لگے عطیہ خداوندی نہ سمجھے اور راز اس کا یہ ہے کہ اس کو اپنا کمال سمجھ کر اس میں حقوق کی طرف نظر نہیں رہتی اس لیے اس امانت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔

(الافاضات ع۵ ص۲۲۷)

بنی اسرائیل کی تاریخ سے سبق

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ عارف کے لیے (بنی اسرائیل کے) اس قصہ میں بڑا سبق ہے ان لوگوں کے حال سے عبرت پکڑنا چاہیے جنہوں نے نہ بلا پر صبر کیا، نہ نعمت پر شکر ادا کیا اور نہ قضائے الٰہی پر راضی رہے۔ ایسوں پر ذلت طغیان لگا دی گئی جب دنیا ان کے قلب میں جما دی گئی اور انہیں درجاتِ عالیہ سے گرا دیا گیا۔

(تفسیر ماجدی حاشیہ ع۲۱۲)

سلطنت کا زوال عالمگیرؒ سے نہیں ہوا

مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب

بلکہ اکبر نے اس کو زائل کیا ہے۔ اس نے غیر قوموں کو سلطنت میں دخیل کار بنا کر ان کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ دے دی۔

(انفاس عیسیٰ صـ۲۹۸)

سیاست میں کافر کی اقتداء

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اگر ایک شخص سیاست کا ماہر ہے مگر ہے کافر اگر اس میں اس کی اقتداء کر لی جائے کیا حرج ہے؟ فرمایا اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر کافر نماز خوب جانتا ہو اور مسلمان نہ جانتا ہو تو اس کافر کی اقتدا جائز ہے؟ شبہہ کا منشا یہ ہے کہ سیاست کو لوگ دین نہیں سمجھتے خود یہی سخت غلطی اور جہل اعظم ہے۔ سیاست بھی تو دین ہی ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں کی سو یہ کتنی بڑی تحریف ہے۔ پھر دین میں کافر کی اقتدا کرنا کیا معنی؟ نیز کیا اس میں اسلام اور مسلمانوں کی اہانت نہیں ہے؟ اور کیا کوئی شخص کہیں یہ بات دکھلا سکتا ہے کہ اس طرح سے اسلام اور مسلمانوں کی اہانت کرانا اور ان کو ذلیل کرانا جائز ہے؟ اور کیا مسلمانوں میں ایسا کوئی نہیں جو سیاست جانتا ہو؟ البتہ اس طریق سے ان کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں کہ کافر تابع ہوں اور مسلمان متبوع۔

(الافاضات ج۲ صـ۱۵۲، ملفوظ ۲۴۵، ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۱ھ)

کامیابی کی اصلی تدبیر

مسلمانوں کا سوائے خدا کی ذات کے کوئی حامی اور مددگار نہیں اور ان کو اور کسی کی ضرورت بھی نہیں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں نظم ہو اور دین ہو تو تمام دنیا کی غیر مسلم اقوام اس ضعف کی حالت میں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

لیکن مسلمان ویسے تو بہت کچھ گڑبڑ کرتے ہیں مگر جو اصل تدبیر ہے اور کام کی تدبیر ہے جس سے پہلوں کو کامیابی میسّر ہو چکی ہے وہ نہیں کرتے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ اپنے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں۔ اب تو بڑی تدبیر ان کی مشرکوں کی تعلیم پر عمل کرنا ہے ان کو لوگ عاقل سمجھتے ہیں۔ بھلا ایسا شخص کیا عاقل ہوگا جس کو انجام کی خبر نہیں۔ اگر ایسے لوگ عاقل ہوتے تو آخرت کی فکر کرتے۔ پہلے ایمان لاتے یہاں آجکل ہیں روپیہ اور ملک کی فکر ہے سو ایسے پہلے بھی بڑے بڑے گزر چکے ہیں جو خدائی تک کا دعویٰ کر گئے۔ شداد، نمرود، فرعون، قارون میں وہ کون سی چیز ہے جو نہ تھی جس کے نہ ہونے سے یہ بدعقل اور بدفہم کہلائے۔ بس یہی دین نہ تھا تو ان لوگوں کو تو دنیا میں بھی اتنی ثروت اور جاہ نصیب نہیں جیسی پہلوں کو نصیب ہو چکی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ولقد مکناھم فیما الخ (اور ہم نے اُن لوگوں کو ان باتوں میں قدرت دی تھی کہ تم کو ان باتوں میں قدرت نہیں دی) مگر ان کا جو انجام ہوا خسر الدنیا والاخرہ وہ اظہر من الشمس ہے۔

(الافاضات الیومیہ ع۱ ص۲۵۸، ملفوظ ع۴۱۸)

ہماری محکومی کا سبب

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ سمجھنا ہی غلط ہے کہ کفار جو ہم پر (ہندوستان میں) سلطنت کر رہے ہیں۔ ان میں کوئی لیاقت ہے نہیں۔ بلکہ ہمارے اندر نالائقی ہے اس وجہ سے مسلّط کر دیے گئے۔ اگر وہ نالائقی دُور ہو جائے تو پھر وہی معاملہ ہے

(الافاضات ع۵ ص۵۳)

حکومت کو فروغ دین سہل ہے

فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم فرمایا تھا کہ بازار میں وہ بیٹھے جو فقیہہ ہو مطلب یہ تھا جتنے آکر اس سے خریدیں گے چونکہ ان سب کو خرید و فروخت کے معاملات

ایسے لوگوں سے پڑیں گے تو وہ سب کے سب بھی فقیہہ ہو جائیں گے۔ اس تدبیر سے سارے ملک کو درسگاہ اور خانقاہ بنا دیا تھا۔ بڑی لطیف تدبیر تھی حکومت سے سب کام سہولت سے بن سکتے ہیں۔ اس کی تائید میں حکایت بیان فرمائی کہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے طلبا کو پریشان دیکھ کر قصد کیا ان کا کہیں ٹھکانہ کریں اور بیت المال پر بار نہ ہو۔ ایک روز بیٹھے ہوئے حوض پر وضو کر رہے تھے۔ ایک رئیس بھی وہاں پر موجود تھے۔ اُن سے امتحاناً ایک مسئلہ دریافت کیا۔ وہ بے چارے مسئلہ کیا بتا سکتے۔ وہ کیا جانیں مسئلہ کیا چیز ہے۔ نہ بتا سکے۔ عالمگیر بہت خفا ہوئے کہ شہر میں اس قدر اہلِ علم اور طلبہ موجود ہیں۔ تم سے یہ نہیں ہوتا کہ ان سے مسائل پوچھ پوچھ کر یاد کر لیا کرو۔ اسی روز تمام امرا میں کھلبلی مچ گئی۔ اہلِ علم اور طلبا کی قدر ہو گئی۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایک ایک کو اپنے یہاں رکھ لیا۔ حکومت کا یہ اثر ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا یہ جو مشہور ہے کہ وزیر عاقل ہونا چاہیے۔ گو بادشاہ بے وقوف ہو محض غلط ہے۔ بادشاہ ہی کا عاقل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ بادشاہ کو وزیر کا تابع ہو کر رہنا پڑے گا تو اس صورت میں وزیر بادشاہ اور بادشاہ وزیر ہو گا۔

(الافاضات الیومیہ ملفوظ ۳۶ یکم شوال ۱۳۵۰ھ)

○

مُسلمانوں کی آزادی و غلامی کا مفہوم

مطلق آزادی کی مذمّت

فرمایا کہ اب تو اس خیال کے لوگ رہ گئے ہیں: ایک عالم کہتے تھے کہ بڑی خوشی کی بات ہے حرّیّت پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے کہا یہ حرّیّت اور آزادی بدمعاشوں میں بھی پیدا ہو رہی ہے۔ اپنی بھی خیر منائیو۔ پھر کچھ نہیں بولے۔

(ملفوظات ج۶ ص۲۱۷)

حقیقی آزادی

حرّیّت کس آزادی کو کہتے ہیں؟ آیا حق سے آزاد ہونے کو یا غیرِ حق سے؟ اس لیے کہ ایمان والے کے لیے تو حق کی غلامی ہی باعثِ فخر اور باعثِ فلاح و بہبود ہے اور یہ آزادی بھی اللہ والوں ہی کو میسّر ہے۔ اور جو مدعی ہیں آزادی کے ہزاروں طوق اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں حقیقی آزادی صاحبانِ حق ہی کو حاصل ہے۔ ان کی یہ حالت ہے کہ وہ دُنیا سے آزاد اور حق کے پابند اور غلام ہیں۔ اس غلامی پر لاکھوں کروڑوں آزادیاں قربان ہیں۔

(ملفوظات ج۴ ص۲۸)

قابلِ فخر غلامی

صاحبو! خدا کی غلامی اختیار کرو۔ اس غلامی میں تمہیں دوسرے ہم جنسوں کی غلامی سے آزادی ہو جائے گی اور فطری طور پر تم غلامی سے تو کسی حال میں بچ نہیں سکتے اور جب بچ نہیں سکتے تو انہیں کی غلامی

کیوں نہ قبول کرو جن کی غلامی پر بادشاہوں کو بھی فخر ہے۔ ان کی غلامی کے یہ معنی ہیں کہ شریعت سے آزاد نہ ہو۔ (اشرف العلوم ص۴۹)

جو آزادی قانونِ شریعت پر عمل کرنے میں فوت ہوتی ہے۔ وہ گورنمنٹ کے قانون پر عمل کرنے میں بھی فوت ہوتی ہے تو سب سے بڑی آزادی تو اس میں ہے کہ کسی قانون پر بھی عمل نہ کیا جائے پھر کیا کوئی عاقل اس کو آزادی کہے گا، حیرت کی بات ہے کہ ساری حکومتوں کے قانون پر تو عمل کرو مگر خدا کے قانون پر عمل نہ کرو۔ (طریق النجاۃ)

کیا اپنے جی کے بندے ہو؟ جو کام ضروری ہیں ان کو کرنا چاہیے۔ خواہ جی لگے یا نہ لگے۔ یہ تو حالت ہی بری ہے کہ جی لگنے کا انتظار کیا جائے کیا اپنے جی کی پرستش کرتے ہو یا اپنے جی کے بندے ہو؟

(ملفوظات ج۵ ص۳۸۰)

بہت سے لوگ اس کے منتظر کہ اول دلچسپی پیدا ہو تو کام شروع کریں اور کام اس کا منتظر کہ مجھ کو شروع کریں تو دلچسپی کے آثار پیدا کروں۔

(ملفوظات ج۲ ص۱۱۵)

ایک طالب علم نے خط لکھا کہ نماز کو ضروری سمجھتا ہوں لیکن طبیعت ادھر نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہے تو نماز میں کوئی لطف نہیں آتا۔ جواب تحریر فرمایا: طبیعت آنا ضروری ہے یا لانا؟ اور لطف ضروری ہے یا عمل؟

(اشرف السوانح ج۲ ص۱۲۶)

فرمایا کہ دین کی باتوں میں تو کہا جاتا ہے کہ جی نہیں لگتا، مزہ نہیں آتا۔ احکام گورنمنٹ میں بھی جو کہ نفس کے خلاف ہوں کبھی کہا ہے کہ جی نہیں لگتا۔ مثلاً گورنمنٹ حکم دے کہ ٹیکس داخل کرو۔ اس وقت یہ کہہ کر الگ ہو جائیں کہ ہم داخل نہیں

کرتے، ہمیں مزہ نہیں آتا، جی نہیں لگتا۔ ایسا کر کے دیکھیں جیل خانہ میں پہنچا دیے جائیں۔ اے صاحبو! خدا کے ساتھ محبت نہ سہی، مگر ان کی حکومت تو ہے یہی سمجھ کر احکام بجالاؤ۔

(الملفوظات ج ۲ ص ۲۵۴)

آزادی کے دم بھرنے والوں کے لیے عبرت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر میں سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے۔ آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لے گئے۔ حضرت عمرؓ کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ خلافِ شریعت حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا اس لیے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کیے۔ ایک تو یہ آپ بغیر اجازت گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن میں صاف حکم ہے لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا

دوسرے یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن میں تجسس کی ممانعت ہے:

لَا تَجَسَّسُوْا۔ تیسرے یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے۔ حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں۔ تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو — آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیانِ آزادی میں؟ کہ بہائم کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے۔ کھا لیا اور ہوا پرستی میں عمر گزار دی۔

صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا اور مطلق العنانی ہے اور یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا جدھر

چاہا چل دیا، جو چاہا کر لیا۔ تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب نعم ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے یہی لقب لیجئے۔ اور اگر لا میں جواب ہے تو پھر ذرا مہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق تبلائیے۔ (وعظ: نسیان النفس)

دنیا میں بے قید کوئی نہیں بے قید کوئی نہیں، کوئی خدا کی قید میں ہے کوئی شیطان کی قید میں۔ قید سے خالی کوئی نہیں۔ اب اس کا فیصلہ خود کر لو کہ کونسی قید پسند کے قابل ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند
شکارش نجوید خلاص از کمند

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار مقبلم

(طریق القلندر ص ۱۳)

○

باب ہشتم

دُنیا و آخرت

فصل (۱)

دُنیا کی مذمّت

اعلانِ قربِ آخرت

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ

اللہ میاں نے شکایت کی ہے بندوں کی غفلت کی کہ ان کا حساب بہت قریب آن لگا اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اور شکایت محب کی ہی ہُوا کرتی ہے اس غرض سے کہ وہ اس کی اصلاح کر لے۔ شکایت سے قطعِ تعلق منظور نہیں ہُوا کرتا جب قطعِ تعلق منظور ہوتا ہے تو شکایت نہیں کیا کرتے۔ دشمن کی شکایت کیا! وہ تو دشمن ہی ہے جو کچھ کرے تھوڑا ہے۔

(اشرف المواعظ ع۱ ص۵)

خود اپنی فنا سے غفلت

دنیا کا فانی ہونا ظاہر ہے۔ کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن ہم بھی ختم ہوں گے جس کی دلیل یہ ہے کہ آخرت کے لیے سامان سے بے پروائی ہے۔ ساری دنیا لایعنی مشغلہ میں مبتلا ہے یہ کسی کو خیال نہیں کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے۔ (ص۲۵۱)

دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کہ خواب کی مثال بیداری کے مقابلہ میں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

حالِ دنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ — گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانۂ

باز گفتم حالِ آنکس گو کہ دل دروے ببست — گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانۂ

واقعی دنیا کی مثال خواب ہی کی سی ہے۔ اگر دنیا میں عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے ساتھ ہی پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا؟

(علم و عمل، تعلیم البیان صہ ۵۶۸)

امور آخرت میں عملاً بھی کوتاہی ہے اور حالاً تو بہت ہی کوتاہی ہے۔ کیوں کہ جب عمل ہی نہیں تو حال کہاں سے آئے۔ حال اُسے کہتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف ایسا خیال جم جائے کہ وہی ہر دم خیال میں رہے۔ خدا نے عمل میں یہ برکت رکھی ہے کہ اس سے آخرت کا شوق ہو جاتا ہے جس سے ہر وقت اسی کا خیال رہتا ہے۔ نیز نیک اعمال میں یہ اثر ہے کہ اس سے معاصی سے نفرت اور آخرت کی رغبت ہو جاتی ہے۔ خاص کر اگر کسی بزرگ کی نظر بھی اس پر پڑ جائے تو پھر وہ حال اور قوی ہو جاتا ہے اور جلدی کام بن جاتا ہے۔ مگر ٹھنڈے رہ کر حال حاصل کرنا چاہو تو محال ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ ہر کام میں آخرت کا دھیان رہے اور یہ خیال رہے کہ ایک دن وہ بھی ہو گا کہ ہم یہاں نہ ہوں گے۔

(دنیا و آخرت صہ ۲۶۷)

آخرت سے اعراض کا سبب دنیا ہے

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ۔

حاصل یہ ہوا کہ دنیا میں دو صفتیں ہیں۔ ایک صفت عبث ہونے کی۔ دوسری موجب غفلت ہونے کی۔ اول کو لعب فرمایا ہے اور دوسری کو لہو۔

لیکن اس پر یہ شبہہ پڑتا ہے کہ جب کہ دنیا بجمیع اجزائہا لغو و عبث ہو گئی تو لازم آیا کہ جمیع مخلوقات خداوندی بے فائدہ اور مہمل محض رہ جائیں حالاں کہ خداوند تعالیٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ وہ حکیم ذات ایسی مخلوق کو پیدا کرے جو مہمل محض ہو سخت گستاخی ہے۔ علاوہ ازیں خود دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

"اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ" یعنی کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو عبث اور لغو محض پیدا کیا ہے بالکل غلط ہے۔ نیز ایک آیت میں ارشاد ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔

جواب شبہہ کا یہ ہے کہ فی الواقع کوئی شئے مخلوقات خداوندی سے عبث اور بیکار نہیں۔ البتہ تعیین فوائد ایک امر اہم ہے اور اس میں غلطی ہو سکتی ہے یعنی دنیا کی ہر چیز فی نفسہ حکم و مصالح و منافع سے لبریز ہے۔ عبث و فضول کوئی نہیں۔ مگر جب وہ مقصود اصلی سے مانع ہو جائے تو اس وقت یہی فائدہ جس کو ہم نے منافع دنیویہ کا اصل اصول سمجھ رکھا ہے اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں انہیں کو لہو و لعب سے تعبیر کیا جائے گا۔

(بالفاظ دیگر) جن منافع کے لیے یہ اشیاء وضع کی گئی ہیں ان کے اعتبار سے اس سے عبثیت و باطلیت کی نفی کی گئی ہے اور جو منافع اہل ہوا نے خود تراشے ہیں جو کہ واقع میں مضار ہیں ان کے اعتبار سے اس کو لہو و لعب فرمایا ہے۔ بہرحال یہ دنیا اگر آخرت سے اعراض کا سبب بن جائے تو یہ لغو و عبث ہے۔

(الدنیا والآخرۃ)

مال بیچارہ تو مفت میں بدنام ہے، دنیا کے معنی؟

دنیا اس مال کا نام نہیں۔ مال بیچارہ تو مفت میں بدنام ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ بعض مال اچھا ہے جیسے حلال مال اور بعض مال بُرا ہے جیسے رشوت، چوری کا مال۔ پس اگر دنیا نفس مال کا نام ہوتا تو اس کی دو قسمیں کیسے ہوتیں؟ دنیا نام "تعلق بغیر اللہ" کا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے تعلق بڑھا کر، بکھیڑوں میں پڑ کر، معاملات میں گھس کر اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانا۔ پس یہ تعلق بغیر اللہ سب کے لیے بُرا ہے۔ بخلاف مال کے کہ کسی کے لیے اچھا کسی کے لیے بُرا۔ ایسے ہی اولاد بھی دنیا نہیں۔ ہاں قلب کا اس

کے ساتھ اتنا تعلق جو غافل کر دے، یہ دنیا ہے۔

(دنیا و آخرت۔ "الدنیا" ص۵۵)

حُبِّ دنیا کفر کی اصل ہے یاد رکھو حبِّ دنیا کفر کی اصل ہے اس کو معمولی مت سمجھو اور یہ بات کہ جڑ کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ بزرگوں کے اقوال میری تائید کر رہے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

علّتِ ابلیس انا خیر بد است
ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

اس میں تصریح ہے کہ ابلیس کے مردود ہونے کا اصلی سبب تکبر تھا اور یہ مرض ہر شخص کے اندر موجود ہے گو اس درجہ کا نہ ہو مگر جب شہر میں آگ لگتی ہے اس کی ابتدا ہمیشہ معمولی سی بات سے ہوتی ہے۔ (ہم الآخرہ ص۲۱)

حبّ دنیا اور انہماک فی الدنیا سبب ہوا ہے۔ اہلِ کفر کے کفر کا۔ یہود اسی واسطے ایمان نہ لا سکے کہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اب تو ہم پیر بنے ہوئے ہیں مسلمان ہو کر مرید ہو جائیں گے اور یہ ہدایا اور نذرانے جواب ملتے ہیں ختم ہو جائیں گے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مریدوں کو بعد میں اتنا کچھ ملا کہ ان پیروں کے باپ دادا کے خیال میں بھی نہ آیا ہو گا۔ (ہم الآخرۃ ص۲۸)

حُبِّ عقلی اور حُبِّ طبعی کا فرق انسان دنیا کی "حُبِّ عقلی" کے ازالہ کا مکلف ہے نہ کہ "حُبِّ طبعی" کا چنانچہ جہاں ایک مقام پر کتاب وسنّت میں حب دنیا کی مذمت ہے تو دوسرے مقام پر یہ بھی ارشاد ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ اور یہ مشاہدہ ہے کہ حبِّ طبعی باوجود کوشش کے بھی زائل نہیں ہوتی۔ پس جب ان سب مقدمات کو ذہن میں جمع کر لیا جاوے

نہ سمجھ میں آجاوے گا کہ حُبِّ دنیا بیشک مذموم ہے مگر اس مذموم سے مراد وہ حب ہے جو طبعی نہ ہو کیونکہ حبِّ طبعی کا ازالہ وسعت سے خارج ہوتا ہے اور جو چیز وسعت سے خارج ہو انسان اس کا مکلف نہیں۔ لہٰذا حبِّ طبعی کے ازالہ کا انسان مکلف نہیں۔ باقی جس محبت کا ازالہ اختیاری ہے اس کے ازالہ کا انسان مکلف ہوگا اور اسی اختیاری محبت کا نام محبتِ عقلی ہے۔

(الافاضات حصہ ہفتم افوظ ۲۰۰)

خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے بغض نہیں۔ کسی کی ذات سے محبت نہیں بلکہ صفاتِ حمیدہ بنائے رضا ہیں اور صفاتِ ذمیمہ بنائے ناراضی و مذمت ہیں۔

(دنیا و آخرت ۱۶۳)

دنیائے مذموم کی مثال

دنیائے مذموم و ملعون کی مثال ایسی ہے جیسے کوڑے پر سبزہ جما ہُوا جس کو کوئی دیکھنے والا سمجھے کہ یہ ایک چمن ہے اور اس کے ظاہر رنگ و رُوپ کو دیکھ کر فریفتہ ہو جائے اور جب وہاں پہنچے تو پاخانہ سے بھر جائے۔ یہی حال دنیا کا ہے کہ ظاہر تو اس کا بہت بھلا ہوتا ہے مگر اندر نجاست بھری ہوئی ہے۔ یا خوبصورت سانپ کی سی مثال ہے جس کا ظاہر تو اچھا ہے، نقش و نگار سے آراستہ ہے مگر اندر زہر بھرا پڑا ہے۔

زہرِ ایں مارِ منقش قاتل است

باشد از دے دور ہر کو عاقل است

اگر بچے کے سامنے سانپ چھوڑ دو تو وہ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑ لیتا ہے۔ اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کے اندر زہر بھرا ہُوا ہے۔ مگر اس کا انجام کیا ہوگا؟ ہماری حالت بھی اسی بچہ کی سی ہے کہ ہم دنیا کی ظاہری آب و تاب اور نقش و نگار اور رنگ و رُوپ پر فریفتہ ہیں اور

اندر کی خبر نہیں۔ یہ بھی تجربہ ہے کہ سانپ جتنا خوبصورت ہوتا ہے اسی قدر زہریلا ہوتا ہے۔ اسی لیے حقیقت شناس اس کی طرف رغبت نہیں کرتے۔

(کمالات اشرفیہ ص ۱۴۹)

بعثت انبیاء کا اصل راز

انبیا علیہم السلام کی بعثت کا اصل راز یہی ہے کہ وہ دنیا کو قلب سے نکالیں گو ہاتھ میں بقدر ضرورت رہے۔ قلب تو بس حق تعالیٰ ہی کے رہنے کی جگہ ہے۔ صاحبو! قلب کو صاف رکھو نہ معلوم کس وقت نور حق اور رحمت حق قلب پر جلوہ گر ہو جائے۔ اس لیے ہر وقت اس کے مصداق بنے رہو۔ ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ان فضولیات کو چھوڑو۔ کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ مسلمانوں اور کافروں میں تو یہی فرق ہے کہ مسلمان عاقبت کی فکر میں لگے ہیں اور دنیا کو چھوڑے ہوئے ہیں اور کفار عاقبت کو چھوڑے ہوئے ہیں اور دنیا کی فکر میں لگے ہیں۔ ان کفار کی انہماک کی بالکل یہ حالت ہے۔ ؎

عاقبت ساز د ترا از دیں بری — ایں تن آرائی و ایں تن پروری

اور اسی مضمون کو فرماتے ہیں جس میں مسلمانوں اور کافروں کے مقصود کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ؎

انبیاء در کار دنیا جبری اند — کافراں در کار عقبیٰ جبری اند
انبیاء کار عقبیٰ اختیار — کافراں را کار دنیا اختیار

مسلمانو! تمہاری فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ تم خداوند جل جلالہٗ کے راضی کرنے کی فکر کرو۔ پھر تو دین کے ساتھ دنیا بھی تمہاری جوتیوں سے لگی پھرے گی

تم دین اختیار کرو۔ پھر دنیا تو تمہاری لونڈی غلام ہے۔ تم سے پہلے لوگ یہی کر کے دکھلا گئے۔ باوجود سلف کے نظائر کے تم ان واقعات کو نظر انداز کر رہے ہو۔ یہی وجہ ہے تم مصائب اور آلام کا شکار بنے ہوئے ہو کس طرح دل میں دل ڈال دوں اور کس طرح اطمینان دلاؤں۔ قسم سے زائد کوئی ذریعہ اطمینان کا اس وقت میرے پاس نہیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں واللہ ثم واللہ ثم اللہ اگر تم خدا کے دین کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ تو پھر تم سلف کی طرح تمام دنیا کے مالک بن جاؤ۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ آجکل مسلمانوں کی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ جو خود دین سے بے خبر ہیں۔ اسی لیے مسلمان تباہ حال ہیں۔ ایسوں کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

گر بہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

چھوڑو ان فضولیات کو مسلمانوں کا مذاق تو قرآن وحدیث کے مطابق یہ ہونا چاہیے جس کو فرماتے ہیں۔ ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(الافاضات الیومیہ، ملفوظ ۱۵)

یکم شوال المکرم ۱۳۵۰ھ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس چیز کا نمونہ تھے

یہ مسئلہ مسلمانوں کے نزدیک تو بالکل بدیہی ہے بلکہ حسّی ہے کہ اگر دین مقصود نہ ہوتا تو انبیا علیہم السلام کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ انبیا علیہم السلام نے دنیا

کمانے کے طریقے نہیں بتلائے۔ صرف احکام تبلاتے ہیں اور چونکہ عقلی مسئلہ ہے کہ
فعل کا اثر قول سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے میں پوچھتا ہوں کہ اگر دنیا مقصود تھی
تو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا نمونہ کیوں نہیں بنایا اس طرح سے
کہ آپ کا کوئی کارخانہ ہوتا اور بہت بڑا کارخانہ ہوتا۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
دین میں بے مثل نمونہ بنے دنیا میں بھی بنتے مگر احادیث میں دیکھ لیجیے کہ آپ کس چیز
کا نمونہ تھے۔ اگر حدیث صحیح نہیں جیسا ان میں سے بعض کا خیال ہے تو تواریخ تو
موجود ہیں۔ تواریخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دیکھیے کہ کیا تھے معلوم
ہو جائے گا کہ دنیوی اعتبار سے آپ کی کیا حالت تھی

تکبّر اور حسد انسانیت اور تمدّن کے منافی ہے

انسان کی طبیعت میں تمدن ہے یعنی مل جل کر رہنا اس
کی تمام ضروریات ایک دوسرے کی اعانت سے مہیّا ہوتی ہیں اسی کا نام تمدّن
ہے۔ بدون اس کے انسان کی زندگی نہیں ہو سکتی جب اس کو ضرورت ہے
تمدّن کی تو دوسرے سے ملنے کی بھی ضرورت ہے۔ دو باتوں کے لیے ایک اپنا کام
نکالنے کے لیے کیونکہ اس کا کام دوسرے پر موقوف ہے۔ دوسرے اس دوسرے
شخص کو مدد دینے کے لیے کیونکہ وہ بھی اس کا محتاج ہے اور یہ جب ہو سکتا ہے
کہ دوسرے کو نفع پہنچانے کا خیال بھی ہو اور یہ خیال حسد کی ضد ہے کیونکہ
حسد کے معنی ہیں دوسرے کے نعمت کی زوال کی تمنّا کرنا اور تمدّن میں ضرورت تھی
دوسرے کو فائدہ پہنچانے اور اس کے لیے حصول نعمت کی کوشش کرنے کی۔ تو
ثابت ہوا کہ حسد ضد ہے تمدن کی۔

اسی طرح اس کا کام بھی جب ہی نکل سکتا ہے کہ دوسرے کے سامنے
اپنی احتیاج لے جائے اور یہ مقتضی ہے اس بات کو کہ اس کے سامنے بڑا بن کر

بڑھایا جائے ورنہ وہ اتفاق کیوں کرے گا۔ یہ مضمون ہے تواضع کی جو ضد ہے کبر کی۔ تو ثابت ہوا کہ کبر تمدّن کی ضد ہے۔ یہیں سے عقلاً ثابت ہو گیا کہ حسد اور کبر تمدن کے منافی ہیں۔ یہ ان میں عقلی خرابیاں ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یہ شرعی گناہ بھی ہیں ..... تمدن کی بنا تمامتر تواضع اور انکسار پر ہے کیونکہ تمدن کی روح یہ ہے کہ انا مت ایسے ہو کسی کو کسی سے تکلیف نہ پہنچے اور یہ جب ہو سکتا ہے جب ہر شخص دوسرے کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے اور یہ بات جب حاصل ہو سکتی ہے کہ دوسرے کو یا دوسرے کے حق کو اپنے آپ یا اپنے حق سے بڑا سمجھے اور اپنے آپ کو یا اپنے حق کو اس سے یا اس کے حق سے کمتر سمجھے اسی کا نام تواضع ہے۔ پس تمدن کی بنا تواضع پر ہوئی اور آجکل کا یہ مذاق اور تعلیم ہے کہ آدمی کے لیے خودرائی بھی ضروری چیز ہے۔ یعنی اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا۔ ہر بات میں یہی کوشش کی جاتی ہے۔ افعال میں حرکات وسکنات میں، بول چال میں۔ غرض سر سے پیر تک ہمہ تن خودرائی بنے ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام کبر ہے اور یہ ضد ہے تواضع کی جس پر تمدّن کی بنا ہے۔

رزق کا مدار

رزق کا مدار عقل پر نہیں۔ ورنہ زیادہ عقل والے کم عقلوں سے زیادہ مالدار ہوتے، حالانکہ زیادہ عقل والے آپ کے سامنے موجود ہیں اور بہت پریشان ہیں۔ لیاقت سے رزق ملنا قارون کا عقیدہ ہے۔

(الامتحان صـ۹)

فلاح وبہبود کی حقیقت

فلاح کامیابی کا نام ہے نہ مالیابی کا اور یہ ضروری نہیں جو شخص مالیاب ہو وہ کامیاب بھی ہو۔

(سبیل النجاح صـ۳۳)

موجودہ ترقی کی حقیقت

جس کا نام لوگوں نے ترقی رکھا ہے۔ یہ فی الحقیقت قہر ہے جس کی صورت لطف کی ہے۔ (عمل الذرہ صـ۶)

نفع و نقصان کی کسوٹی

جس نفع میں حق تعالیٰ کی ناخوشی ہو وہ نفع ہی نہیں۔ دیکھو اگر کسی عاشق کے پاس سونا چاندی بھرا ہوا ہو مگر محبوب کی نظر میں نہ آتا ہو تو کیا عاشق اس کو نفع کی چیز سمجھے گا؟ نفع کی چیز وہی ہے جو محبوب کو بھا جاوے۔ ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت　　　زر و سیم یکساں نماید برت

اسی طرح مسلمان کے لیے نفع کی چیز وہی ہے جس سے خدا راضی ہو اور جس سے خدا راضی نہ ہو وہ ہرگز نفع کی چیز نہیں۔ اگر تمہارے پاس سلطنت بھی ہو مگر خدا راضی نہ ہُوا تو وہ کچھ بھی نہیں۔ تم خدا کو راضی رکھو، اس کے احکام کا اتباع کرو خواہ سلطنت ہو یا نہ ہو۔ (علم و عمل، تعمیم التعلیم صـ۲۰۶)

شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مُلّاپن ہی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود بھی مُلّاپن کا پھیلانا ہی ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: الذین مکّنّاھم الخ کہ اگر ان کو ہم دنیا میں سلطنت دیتے تو یہ خوب نماز پڑھتے اور خوب زکوٰۃ دیتے اور خوب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے۔ (کمالات اشرفیہ صـ۸۰)

جو چیز کافر اور مسلم میں مشترک ہو وہ کبھی مقصود نہیں ہو سکتی۔

(الافاضات ج۴ صـ۲۷۱ ملفوظ ۴۳۵)

سانپ کے کاٹے کو نیم کے پتے میٹھے معلوم ہوتے ہیں

حضرت امام غزالیؒ نے لکھا کہ اگر آخرت کا وجود نہ ہوتا یا تحصیلِ دنیا آخرت سے مانع نہ ہوتی تب بھی دنیا کی حقیقت ایسی ہے کہ اس کو معلوم کر کے عاقل ہرگز اس کی طرف رغبت نہ کرتا اور آخرت کے مقابلہ میں تو اس کا طلب کرنا محض حماقت اور جہالت ہے۔ شاید اس پر اہلِ دنیا کو یہ سوال ہو کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دُنیا خود قابلِ ترک ہے۔ ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ دُنیا سے بہت راحت ملتی ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی ایسی مثال ہے جیسے سانپ کے کاٹے کو نیم کے پتے میٹھے معلوم ہوتے ہیں مگر تندرست آدمی کو کڑوے معلوم ہوتے ہیں بس آپ کو دنیا اس لیے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی ایمانی حس درست نہیں۔ اگر ایمانی حس درست ہوتی جس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

صحتِ ایں حس بجوئید از طبیب　　　صحتِ آں حس بجوئید از حبیب

تو اس کے کہنے کی بھی ضرورت نہ رہے کہ آخرت ایسی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں دُنیا قابلِ ترک ہے بلکہ تم خود بخود دُنیا سے دل برداشتہ ہو جاؤ۔ اس کی حالت کو ان لوگوں سے پوچھیے جن کی عمر دراز ہوگئی ہے جنہوں نے دنیا کو اچھی طرح آزمایا ہے اور اس کے سرد و گرم کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ ایسا ایک تجربہ کار شاعر کہتا ہے ؎

ومن یحمد الدنیا العیش لیسرہ　　　فسوف لعمری عنقریب یلومہا

اذا ادبرت کانت علی المرء حسرۃ　　　وان اقبلت کانت کثیرا ھمومہا

کہ جو شخص کسی خوش کن عیش کی وجہ سے دنیا کی تعریف کر رہا ہے، میری جان کی قسم وہ عنقریب اس کی خود ہی برائی کرے گا۔ اس کی حالت یہ ہے کہ جب یہ چلی جاتی ہے تو آدمی کو حسرت و رنج دے کر جاتی ہے اور جب آتی ہے تو بہت سے افکار ساتھ لاتی ہے۔

نے غم دزد نے غم کالا

چنانچہ دنیا کا میزان الکل مال ہے کہ اس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے اس کی حالت یہ ہے کہ جب مال نہ تھا تو جنگل میں سو رہنا آسان تھا اور اب مال آنے کے بعد گھر میں سونا بھی مشکل ہے۔ چین سے نیند نہیں آتی۔ چنانچہ ایک گرو اور چیلے کی حکایت مشہور ہے کہ دونوں رات کو سفر کر رہے تھے۔ چیلے نے کہا کہ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ گرو نے تسلی کی۔ اس نے تھوڑی دور چل کر کہا کہ ڈر لگتا ہے۔ گرو نے کہا معلوم ہوتا ہے تیرے پاس کچھ رقم ہے۔ کہا ہاں ایک روپیہ ہے۔ کہا اس کو پھینک دے۔ چیلے نے روپیہ پھینک دیا۔ اس کے بعد کچھ دُور چل کر

گرو نے پوچھا کہ اب تو ڈر نہیں لگتا۔ کہا بالکل نہیں ۔ تو واقعی اس مال کی وجہ سے بہت سے خطرات و افکار میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور جو مفلس ہو اسے کیا خوف

لنگکے زیر لنگکے بالا نے غم دزد نے غم کالا

ایسے شخص کو تو اگر کوئی قید خانہ میں بھی بھیج دے تو گھر سے روٹی دینا پڑتی ہے مفلس کو جیل خانہ سے بھی ڈر نہیں لگتا کہ پکی پکائی ملے گی اور مالداروں کی حالت یہ ہے کہ بنیے کی قوم سب سے زیادہ مالدار ہے مگر سب سے زیادہ ڈرنے والی بھی یہی قوم ہے۔

انجام عیش

اب دنیا کے اور شعبوں کو دیکھو جن میں سے ایک نکاح ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ جو لوگ زیادہ نکاح کرتے ہیں یا ایک ہی بیوی سے زیادہ مشغول رہتے ہیں۔ اس عیش کا انجام یہ ہے کہ کسی کی نگاہ کمزور ہو جاتی ہے کسی کے ہاتھ میں رعشہ ہو جاتا ہے، کسی پر فالج پڑ جاتا ہے۔ پھر سب عیش منغص ہو جاتا ہے۔

دشمن مال یا جان لیتا ہے دوست ایمان بھی لے لیتا ہے

دنیا کا ایک شعبہ دوست اور اولاد ہیں جن سے انسان کو بہت تعلق ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں دوست دشمن سے زیادہ مضر ہوتا ہے۔ دشمن محض مال یا جان لیتا ہے اور دوست بسا اوقات ایمان بھی لے لیتا ہے اور ایمان سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ دوستوں کی وجہ سے انسان غیبت و شکایت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس سے ایمان کو نقصان پہنچتا ہے۔ پھر اگر دوستوں کے خلاف مذاق کام کیا اور وہ دشمن ہو گئے تو وہ دشمنوں سے زیادہ مضر پہنچاتے ہیں۔ اولاد کی یہ حالت ہے کہ جب تک باپ کے دست نگر ہیں، محتاج ہیں۔ اس وقت تک باپ کو ان سے محبت ہے۔ ان کو باپ سے ہے اور جب نکاح ہو گیا، ملازم ہو گئے۔ اب دیکھو باپ ماں کو ان سے کتنا تعلق ہے اور ان کو باپ ماں سے کتنا تعلق ہے۔ بعض دفعہ باہم

ایک دوسرے کی صورت سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

دُنیا کی رُوح راحت ہے

غرض دنیا کی محبت میں کچھ حلاوت نہیں اس کی حقیقت میں غور کرو تو یہ خود قابل نفرت ہے صحت دنیا میں بڑی نعمت ہے، مگر جس کی صحت اچھی ہو اور خدا اس کو بڑی عمر دے دے کہ سو سوا سو برس کا ہو جائے تو اب اس کی حالت دیکھو کہ بڑھاپے میں موت کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ پس دُنیا کی حالت بوڑھوں اور غمزدہ لوگوں سے پوچھو۔ یہ معنی ہیں لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کے۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ طالبانِ دنیا کو اپنے مطلوب کی بھی خبر نہیں۔ اس کا ایک تو یہی مطلب ہے کہ دنیادار کو دنیا کی حقیقت معلوم نہیں۔ اس کے انجام سے وہ بے خبر ہے۔ دوسرے دُنیادار اس معنی کر بھی دُنیا کو نہیں جانتے کہ وہ محض سازوسامان کو دنیا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کی رُوح راحت ہے۔ اور وہ ان لوگوں کو حاصل نہیں۔ کیونکہ یہ تکلّفات میں مقیّد ہیں۔ ان کی زندگی تکلّف اور تصنع کی وجہ سے بے لطف ہے۔ ان کو راحت نصیب نہیں۔ ملنا جلنا محض نفاق اور بناوٹ سے ہوتا ہے اور ملنے سے جو مقصود ہے یعنی راحت وہ ان کو حاصل نہیں۔ رسومِ شادی میں بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں مگر دل اندر سے رنجیدہ ہوتا ہے کہ بہت رقم لگ گئی۔ قرض بہت ہو گیا کہاں سے اترے گا۔

یاد رکھو راحت ہمیشہ بے تکلفی سے ہوتی ہے۔ ایک گاؤں والا میرے پاس آیا۔ میں نے کہا کھانا کھا لے۔ کہنے لگا میں تو گھر کھا چکا۔ وہ بھی تیرا ہی ہے۔ مجھے اس کی سادگی سے بہت ہی مسّرت ہوئی کہ لوگوں کے القاب وآداب سے بھی وہ مسّرت نہ ہوتی۔

آجکل کی تہذیب سراسر تعذیب ہے

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ دنیاداروں کے پاس بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجرہ میں مقید ہو جاتے ہیں۔ آج کل تہذیب کا یہ حال ہے۔ جو کہ سراسر تعذیب ہے۔

کہ میرے پاس کانپور میں ایک داروغہ آئے جبکہ میں مسجد کے اندر حدیث کا درس دے رہا تھا۔ وہ آدھ گھنٹے تک لب فرش کھڑے رہے کیونکہ وہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے۔ فرش پر بیٹھنے سے مجبور تھے آخر کار واپس ہو گئے۔ پھر ایک صاحب سے شکایت کی کہ میں آدھ گھنٹے تک کھڑا رہا مجھ سے ایک بات نہ کی نہ میرے پاس آئے۔ میں تو بوٹ جوتوں کی وجہ سے کہ ان کا کھولنا باندھنا وقت طلب ہے مجبور تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم بوٹ جوتوں میں قید تھے۔ وہ حدیث قرآن میں قید تھے۔ اب خود انصاف کرلو کہ کس کا عذر قوی ہے ۔ افسوس کہ یہ لوگ اس قدر تو مقید ہیں اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ کیا آزاد ایسے ہی ہوتے ہیں، جو سر سے پیر تک فیشن میں جکڑے ہوتے ہیں۔ بس ان کی آزادی کی حقیقت یہ ہے کہ دین سے اور خدا سے آزاد ہیں۔ آزاد حقیقت میں اہل اللہ ہیں کہ جہاں چاہیں بیٹھ جائیں، خواہ تخت ہو یا کرسی یا فرش ہو یا زمین اور ہر لباس میں رہ سکتے ہیں۔ خواہ قیمتی ہو یا گھٹیا، صاف ہو یا میلا، پھٹا ہو یا سالم کسی سے ان کو عار نہیں ؂

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

قیدِ آغوشِ محبوب

ہاں البتہ ان کو ایک قید ضرور ہے وہ یہ کہ محبوب کے آغوش میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ یعنی اس کی مرضی کے تابع ہیں۔ مخالفت نہیں کر سکتے، مگر یہ قید ایسی لذیذ ہے

اسیرت نخواہد رہائی ز بند شکارت نجوید خلاص از کمند

اس قید میں ان کو راحت ہے اس سے نکلنا ان کے واسطے موت ہے۔ عارف رومی فرماتے ہیں۔ ؂

از فراقِ تلخ می گوئی سخن ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

مقیدِ فیشن

پس آزاد یہ لوگ ہیں ورنہ دنیادار تو ایسے مقید ہیں کہ خدا کی پناہ۔ بھلا

اور تو اور میرٹھ کے ضلع میں بعض دیہات کے چمار عیسائی ہو گئے ہیں۔ ان کے فیشن کی یہ حالت ہے کہ دن بھر تو جُوتے بناتے اور سیتے ہیں اور شام کو پھٹا پرانا کوٹ پتلون اور ٹوپی پہن کر تفریح کے واسطے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پر نکلتے ہیں اور کھانا کھانے کی یہ صورت ہے کہ ایک تختہ کے اُوپر کھانا رکھ لیا جس کے نیچے اینٹیں رکھ لیں اور گھڑے الٹے کر کے ان پر بیٹھ گئے۔ اور ببول کے کانٹوں سے روٹی کھاتے ہیں۔ دُنیاداروں کی ریس میں چماروں کی آزادی سلب ہو گئی کہ اب وہ بے تکلف جس طرح گاؤں والے رہا کرتے تھے، نہیں رہ سکتے۔

مجھے انہیں لوگوں میں کا ایک کا قصہ یاد آیا کہ ایک عیسائی چمار کوٹ پتلون پہنے ہُوئے رات کو جا رہا تھا کہ راستہ میں بارش زور سے آگئی۔ سامنے نہر کی چوکی تھی جس میں ایک مسلمان چوکیدار جس کا نام ظہور علی تھا سو رہا تھا۔ یہ صاحب بہادر چوکی پر پہنچے اور آواز دی "او جھورلی او جھورلی کواڑ کھول صاحب باہر کھڑے بھگیں"۔ چوکیدار گھبرا کر اُٹھا کہ شاید نہر کا کوئی افسر آگیا ہے۔ اس نے کواڑ کھولے اور اس سے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں۔ کہا "ہو ہم ہیں نہیں"۔ ظہور علی نے جُوتا نکال کر دس پانچ رسید کیے کہ بدمعاش صاحب بہادر بنا پھرتا ہے۔ جا اپنا رستہ لے۔

عیش و راحت کا ایک گُر

غرض دُنیادار سراسر قید اور تکلیف میں ہیں۔ ان کو خاک راحت نہیں۔ واقع میں عیش و راحت اہل اللہ کو نصیب ہے جس کا ایک گُر ہے اور یہی گُر ان کی آزادی کا راز ہے اور وہ یہ کہ غم کی حقیقت یہ ہے کہ اُمید کے خلاف کوئی بات ہو۔ سو اہل اللہ نے اس جڑ ہی کو اڑا دیا۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اسی مضمون کو بیان فرمایا کہ بھائی کسی سے توقع مت رکھو۔ پھر خدام سے فرمایا کہ بتلاؤ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مربی ہیں، محسن ہیں۔ حضرت کا ہم پر وہ احسان ہے جس کا شکریہ ادا نہیں

ہو سکتا۔ فرمایا کہ میں تم کو دل سے کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی کوئی توقع نہ رکھو۔ بس خدا سے امید رکھو اور کسی سے مت رکھو۔ تو ایسا شخص جس کی رگ رگ میں توحید بسی ہوئی ہو۔ اس کو کسی سے کیا رنج ہو سکتا ہے؟ اس کو سعدیؒ فرماتے ہیں۔ ؎

گر گزندت رسد ز خلق مرنج　　　که راحت رسد ز خلق نه رنج

از خدا داں خلافِ دشمن و دوست　　　که دل ہر دو در تصرف اوست

مگر اس کا یہ اثر نہ لینا کہ تم خدا ہی سے روٹھ جاؤ کہ سب تکالیف وہی پہنچاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں درحقیقت وہ تمہاری ہی مصلحت ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ کی آنکھیں دکھتی ہیں تو ماں اس کی آنکھوں میں جست وغیرہ بھرتی ہے۔ بچہ اس پر بہت روتا ہے اور اس وقت ماں پر غصہ کرتا ہے۔ مگر سمجھدار ہو کر ماں کو دُعا دے گا۔ اسی طرح حق تعالیٰ جو تم کو رنج و تکلیف دیتے ہیں، حقیقت میں وہ تمہاری بھلائی کرتے ہیں، یہاں بھی اور آخرت میں بھی۔ کیونکہ اگر یہاں بلائیں نہ آئیں تو ہم کو خدا کی طرف توجہ نہ ہو۔ قاعدہ یہی ہے کہ انسان کو مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ اگر مصیبت نہ ہو تو انسان فرعونِ بے سامان ہو جائے۔ اور اس حالت میں اگر موت آگئی تو بجائے دُنیا کے تم آخرت میں نارِ جہنم کے ذریعہ سے پاک کیے جاؤ گے۔

ایک بشارت میں آپ کو بشارت سناتا ہوں کہ مسلمانوں کے حق میں عذاب جہنم تطہیر کے لیے ہے تعذیب کے لیے نہیں ہے اور اس کو تم بھی جانتے ہو کہ گھر کا چراغ چکٹ جائے تو اس کو آگ میں ڈال کر صاف کیا جاتا ہے۔ تو تم خدا کے گھر کے چراغ ہو مگر چکٹے ہوئے ہو اس لیے جہنم کی آگ سے تمہارا میل صاف کیا جائے گا اور اگر دنیا ہی میں میل صاف ہو گیا تو پھر آخرت میں صفائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ بس اللہ تعالیٰ دنیا میں مسلمان کو مصائب و تکالیف دے کر

اس کا میل صاف کرتے ہیں۔ اب بتلاؤ یہ تمہارے حق میں بھلائی ہے یا نہیں۔ یہ تو آخرت کی بھلائی اور دنیا کی بھلائی یہ ہے کہ مصائب اور تکالیف سے انسان کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اخلاق کی درستی سے بہت راحت ملتی ہے۔ کیونکہ بداخلاق سے سب کو وحشت ہوتی ہے۔ لوگ اس کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ نیز اس کے دل پر دنیا کی حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا دل لگانے کی چیز نہیں اور یہ بڑا علم ہے۔ اگر یہ علم حاصل نہ ہو تو آدمی ہمیشہ جہل میں مبتلا رہے اور جہل بڑا عیب ہے۔

(وعظ: المراقبہ)

دین کی ترقّی دنیا کی ترقّی پر موقوف نہیں

اس وقت کے ریفارمروں کی یہ رائے ہے کہ اگر دنیا کی اصلاح نہ کی جائے گی تو دین کی کیا اصلاح ہو سکتی ہے۔ افسوس ان مصلحین نے جتنی اصلاح کی کوشش کی اسی قدر مرض بڑھتا گیا۔ وہ حالت ہو گئی۔ ؎

هر چه کردند از علاج و از دوا   رنج افزون گشت و حاجت ناروا

یہ ایک کنیزک کا قصہ ہے۔ مولینا نے مثنوی میں اس کو نقل کیا ہے یعنی طبیبانِ ظاہری جوں جوں علاج کرتے گئے مرض میں افزونی ہوتی گئی۔ آخر جب طبیب روحانی آئے اور انہوں نے حالت دیکھی تو یہ کہا۔ ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند   آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

بے خبر بودند از حال دروں   استعیذ اللہ ممّا یفترون

یعنی جس قدر دوائیں کی ہیں سب نے تباہ کیا ہے اور حقیقتِ حال سے ان کو کچھ خبر بھی نہیں ملی اور یہ ہوا کہ۔ ؎

دید از زاریش کو زارِ دل ست   تن خوش است اما گرفتارِ دل ست

عاشقی پیداست از زاریٔ دل   نیست بیماری چو بیماریٔ دل

کہ مرض دل کا تھا اور علاج بدن کا ہو رہا تھا جس میں مرض کا بڑھنا لازمی تھا۔
یہی حالت اس وقت کے لیڈروں کی ہے کہ انہوں نے سب سے بڑا مرض روپیہ کے نہ ہونے کو سمجھا کہ روپیہ ہوتا تو یہ ہو جاتا، وہ ہو جاتا۔

صاحبو! جہاں روپیہ بہت سا ہے وہاں کیا نور برس رہا ہے۔ ذرا امرا کی حالت کو ملاحظہ کر لیجیے اگر روپیہ کا نہ ہونا دین کے ضعف کا سبب ہے تو امرا میں دین زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ ان کے پاس روپیہ زیادہ ہے۔ آجکل تو مشاہدہ کی بڑی پرستش ہوتی ہے۔ سو آپ مشاہدہ کر لیجیے کہ روپیہ والوں میں دین زیادہ ہے یا غریبوں میں۔ اور صورت اس کی یہ ہے کہ کیف ما اتفق چند غریبوں کو اور چند امیروں کو لے لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ زیادہ دین دار کون ہے۔

خود خدا تعالیٰ اس کے متعلق فیصلہ فرما رہے ہیں: کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى۔ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔

بس ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ دنیا کی ترقی دین کی ترقی کو مانع ہے جیسا کہ مشاہدہ اور مضمونِ آیت دونوں اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ لیکن ہم اپنے بھائیوں کی خاطر یہ کہتے ہیں کہ روپیہ فی نفسہٖ نہ مضر ہے اور نہ مفید ہے۔ اگر ہمارے بھائیوں کے پاس اس قسم کی کوئی دلیل ہوتی تو وہ ہرگز بھی رعایت نہ کرتے تو ہم اپنے اس دعوے سے کہ روپیہ مانع ترقی دین ہے دست بردار ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ روپیہ نافع ہے دین میں۔

پس معلوم ہوا کہ نافع فی الدین واقع میں کوئی دوسری چیز ہے اور وہ قلبِ سلیم ہے۔ یعنی اگر قلب سلیم ہے تو روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں مضر نہیں اور اگر قلب سلیم نہیں ہے تو روپیہ کا نہ ہونا تو کم مضر ہوتا ہے اور روپیہ کا ہونا زیادہ مضر ہوتا ہے۔ روپیہ اور قلب سلیم کی مثال بالکل تلوار اور ہاتھ کی سی ہے کہ تلوار کاٹتی ہے لیکن اسی وقت

جبکہ ہاتھ بھی ہو اور اس میں قوت بھی ہو۔ اور اگر ہاتھ نہیں یا ہاتھ تو ہے لیکن اس میں قوت نہیں تو نری تلوار کیا کام دے سکتی ہے بلکہ بعض اوقات خود اپنے ہی زخم لگ جاتا ہے۔ اسی طرح قلب سلیم نہ ہو تو نرا روپیہ کیا کام دے سکتا ہے!

اصل چیز قلب سلیم ہے۔ اگر ایسے شخص کے پاس مال ہے تو وہ بیشک حدیث نعم المال الصّالح عند الرجل الصالح (اچھا مال اچھے آدمی کے پاس خوب ہے) کا مصداق ہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ ؎

مال را گر بہر دیں باشی حمول   نعمَ مالٌ صالحٌ گفت آں رسولؐ

اور فرماتے ہیں۔ ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است   آب اندر زیرِ کشتی پشتی است

یعنی اگر کشتی کے اندر پانی بھر جائے تو اس کے ہلاک کا سبب ہوتا ہے اور اگر کشتی کے نیچے رہے تو اس کا معین ہوتا ہے۔ اسی طرح مال اگر قلب کے اندر گھس گیا تو وہ قلب کے لیے مہلک ہے اور اگر قلب سے باہر رہے تو وہ معین ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب صاحبِ قلب سلیم کے پاس روپیہ ہو۔ غرض روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہی ہوئے۔ لہٰذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ترقی دین، دنیا کی ترقی پر موقوف ہے۔

کسبِ دنیا اور حُبِّ دنیا قرآن ہی کو دیکھ لیجیے دین کے ساتھ کہیں دنیا کا مطلقاً کے ساتھ نام بھی نہیں لیا گیا جس جگہ ذکر ہے دین ہی کا بالذات امر فرمایا ہے۔ ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی ہو۔ باقی میں کسبِ حلال سے منع نہیں کرتا کسبُ الحلالِ فریضۃ حدیث ہے۔ پس کسبِ حلال تو فرض ہے ہاں حُبّ دنیا سے

منع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے حبُّ الدنیا راسُ کل خطیئۃٍ

کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

صاحبو! ایک تو ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا۔ کسب دنیا جائز اور بعض مواقع پر واجب اور فرض بھی ہے اور حب دنیا حرام ہے اور ان میں باہم تلازم نہیں۔ نہ کسب دنیا کے لیے حُبّ دنیا لازم اور نہ حُبّ دنیا کے لیے کسبِ دنیا لازم کیونکہ کسب دنیا اس وقت بھی ممکن ہے کہ معاش حاصل کرے۔ مگر اس کے ساتھ شغف نہ ہو۔ اسی طرح حُبّ دُنیا اس وقت بھی ہو سکتی ہے کہ کمائے بھی نہیں مگر اس کے ساتھ شغف ہو۔ مثلاً کوئی شخص دنیا نہ کماتا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حُبّ دُنیا حاصل ہے اور کسب دنیا حاصل نہیں کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی حُبّ دنیا ہے۔ اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی ہو اور حُبّ دنیا بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا ہے اور دین سے بھی غافل ہے۔ اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں نہ کسبِ دنیا نہ حُبّ دنیا۔ مثلاً کوئی شخص کسبِ دُنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں۔ غرض حُبّ دنیا و کسبِ دنیا متلازم نہیں۔ بعض محب ہیں، کاسب نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی کاسب ہو اور محب نہ ہو۔ سو ہم حُبِّ دُنیا سے منع کرتے ہیں۔ باقی کسبِ دنیا وہ تو خاص قیود کے ساتھ ضروری ہے۔

تجارت و زراعت فرضِ کفایہ ہے

آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرض کفایہ ہے۔ اسی طرح زراعت بھی فرضِ کفایہ ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر۔ اور ضروریاتِ معاش تحصیل فرض کفایہ ہے۔ اور فرض کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بقیہ لوگوں کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علما کسبِ دُنیا سے منع کرتے ہیں۔ بھلا فرض کفایہ سے کون منع کر سکتا ہے!

پس محبِ دُنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں۔ باقی کسبِ دُنیا جائز ہے۔

حدود کے ساتھ دولت مند ہونا

گو دُنیا کو میں مسلمانوں کے لیے پسند نہیں کرتا اور نہ اچھا سمجھتا ہوں لیکن کفار کے مقابلہ میں جی چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس اُن سے بھی زائد ہو اور مسلمانوں میں بھی ایسے (دولت مند) لوگ ہوں۔ اُن کے مقابلہ کی وجہ سے پسند کرتا ہوں، بشرطیکہ حدود میں رہیں۔

(الافاضات ع ۱ ص ۲۳۶ ملفوظ ع ۳۹۰)

دنیا میں دل کو کھپا دینا ہی زہر ہے

یہ وہ بلا ہے کہ اس سے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت یہی غالب نہ ہو جائے اور اللہ و رسول کے نام سے اس وقت بالکل بے تعلقی نہ ہو جائے۔ لہٰذا جہاں تک ہو اس کی کوشش کرو کہ دنیا میں دل لگا ہوا نہ ہو۔ دل کو خدا تعالیٰ ہی میں لگاؤ۔ ہاتھ سے کام کرو کچھ حرج نہیں۔ (دنیا و آخرت ص ۲۴۳)

ہر مسلمان کے لیے فکر کی چیز

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ موت کے وقت تو بہت سے خطرات قلب میں آ سکتے ہیں مگر مضر صرف وہی خطرات ہیں کہ جو اپنے قصد سے اختیار کیے ہوں اور جو بلا قصد اور بلا اختیار ہوں۔ وہ مضر نہیں، یہ خطرات میں تفصیل ہے۔ باقی سب سے زیادہ سخت جو چیز اس وقت خطرناک ہے حُبِّ دنیا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا میں جب انہماک ہوتا ہے اور اس کی محبت ہوتی ہے تو اس کے چھوٹنے کے وقت جو کہ موت کا وقت ہوتا ہے زیادہ اندیشہ ہے کہ چھڑانے والے سے عداوت نہ پیدا ہو جائے جو کفر ہے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ اس کو مغلوب کرتا رہے اس کے خلاف کا استحضار کرتا رہے۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ کوئی مضرت یا اندیشہ نہ ہو گا۔ اجی مسلمان اعتقاداً تو دنیا کو بُرا سمجھتا ہی ہے مگر اس اعتقاد کو استحضار کے درجہ تک پہنچا دینا

چاہیے۔ اور یہ بہت کم ہوتا ہے کہ موت کے وقت ایمان سلب ہوتا ہو جن کا سلب ہوتا ہے وہ پہلے ہی سے ہو چکتا ہے اس وقت ظہور ہو جاتا ہے۔ ہر مسلمان کو اس وقت کی فکر ہونا چاہیے۔ بالخصوص اپنے قلب کو محبت دنیا سے بالکل خالی رکھنا چاہیے
(الافاضات ج ۱ ص ۵۲ ملفوظ ۶۶)

لالچ سے متاثر ہونے کا علاج

ایک صاحب کے جواب میں فرمایا کہ ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ مسلمان خوف سے تو مغلوب نہیں ہوتے مگر طمع سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر کسی کامل کی صحبت میں کچھ روز مسلمان رہے تو یہ طمع کا مادہ بھی مغلوب ہو جائے گا۔ پھر اس سے بھی مغلوب نہ ہو گا۔
(الافاضات ج ۵ ص ۳۹ ملفوظ ۶۹۸)

دین اور دنیا میں منافات نہیں

دنیا کے ساتھ دین کو شروع کرنے کے متعلق بھی لوگ ایک بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ طاعات و تجارت میں منافات ہے۔ پھر دنیا کے ساتھ دین کیسے شروع کریں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ دکانداری نہ ہو تب طاعت ہو سکتی ہے۔ دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ حق تعالیٰ اس غلطی کو بھی رفع فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرما رہے ہیں کہ ان کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی۔ یوں نہیں فرمایا کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے۔ پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر اللہ تجارت و بیع سے چھڑاتا نہیں، البتہ غفلت سے روکتا ہے۔ یہ غلطی تو ان لوگوں کی ہے جو ہنوز دین کے طالب ہی نہیں ہوئے۔ اس غلطی کا سبب وہی دین اور دنیا میں تنافی کا اعتقاد ہے

عارفین کی نظر میں دُنیا کا وجود

میں ترقی سے منع نہیں کرتا بلکہ ترقی کو پسند کرتا ہوں لیکن اسی طرح جس طرح ایک نیک اور مسلمان کو ترقی حاصل کرنا چاہیے۔ ایسا نہیں کہ ترقی میں دین ہی کو بھول جائیں اور خدا کا خیال بھی نہ آئے۔

جو لوگ خدا کو جان لیتے ہیں وہ دُنیا سے زیادہ محبت تو کیا بالکل محبت نہیں رکھتے۔ دنیا کا وجود ان کی نظر میں کاہ سے زیادہ نہیں۔ وہ آپ کے بلند قصروں اور محلوں کو دیکھ کر آپ کو دارِ آخرت کی ترغیب دیتے ہیں اور جب آپ کو ملتفت نہیں پاتے تو وہ آپ پر ہنستے ہیں اور آپ کی حالت پر یہ کہتے ہوئے افسوس کرتے ہیں۔ ؎

دلا تا کے دریں کاخِ مجازی ۔۔۔ کنی مانندِ طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرور مرغ پرور ۔۔۔ کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا ز آشیاں بیگانہ گشتی ۔۔۔ چو دوناں چغدِ ایں ویرانہ گشتی

دنیا کو چھوڑو نہ خدا کو بھولو

پس اس سامان کو قبلہ و کعبہ مت بناؤ اور ان علماء کو جو خستہ حالت میں ہوں، میلے کچیلے ہوں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھو۔ وہی لوگ خاصانِ خدا اور کچھ لے جانے والے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کو چھوڑ دو اور تمام تعلقات کو ترک کر دو بلکہ غرض یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر منہمک نہ رہو کہ خدا کو بھی بھول جاؤ۔ بلکہ دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھو اور خاصانِ خدا کی عزت کرو۔

کامیابی صحابہ رض سے ارتباط میں ہے

ہم لوگوں میں طلب نہیں اگر طلب ہوتی تو اتباع میں تذلل بھی گوارا ہوتا۔ اگر تم صحابہ رض سے ارتباط حاصل کرو گے۔ ان کا واسطہ ڈھونڈو گے تو یقیناً کامیاب ہو گے کیونکہ

خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتلانے والے یہی ہیں۔ (دنیا و آخرت ص۵۹۵)

شریعت کو چھوڑنے کی وجہ

افسوس ہم نے شریعت کو چھوڑ کر دنیا کو محبوب بنایا ہے۔

بقولِ دشمن پیمان دوست بشکستی ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

وجہ یہ ہے کہ شریعت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ اس کا حسین چہرہ دیکھنے کے لیے آنکھ بنوائی اس لیے دُنیا کی برائیاں نہیں دکھائی دیتیں۔ اجی اندھا اس سے زیادہ کیا دیکھتا ہے کہ ڈیل نرم نرم ہو۔ بس یہ حسن ہے اس کے نزدیک اور چاہے چہرہ پر آدھ سیر قیمہ بھرنے کی ضرورت ہی ہو اور چاہے ایسا ہو جیسا کہ اُپلے میں کو ٹھونگیں مار گیا۔ آنکھیں درست کرائیں تو اصل حُسن کی پہچان ہو۔ اور آنکھ میں یہ دُھند اور جالا کاہے کا ہے غرضِ نفس کا اور اتباع ہوا کا ہے۔ شریعت نے تو حقیقی مصالح کی ذمہ داری لی ہے۔ خاص آپ کی موافقیتِ نفس کا تو ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ (الشریعۃ ص۳۱)

دُنیا کی ترقی کی حقیقت

صاحبو! آپ تو دُنیا کو برقعہ کے اُوپر سے دیکھ کر اس کے عاشق ہو گئے ہو اور اہل اللہ نے برقعہ اٹھا کر اس کو دیکھا ہے اس لیے وہ نفرت کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک تفسیر ہے اس آیت کی :-
لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ کہ دُنیا اور آخرت کی حقیقت میں تفکر کرو۔ دونوں کو برقعہ کھول کر دیکھو تو تم کو دنیا سے نفرت اور آخرت کی طلب ہو جائے گی۔ دنیا ظاہر میں محاسن سے مزین ہے مگر اندر گوہ موت اور سانپ بچھو بھرے ہوئے ہیں اور آخرت ظاہر میں مکارہ و مصائب سے گھری ہوئی ہے مگر اندر سے نہایت حسین دلفریب محبوبہ ہے جس کی ایک نگاہ کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم بھی کوئی چیز نہیں۔ ہم کو الزام دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ دنیا سے واقف نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واللہ ہم تم سے زیادہ دنیا سے واقف ہیں کیونکہ ہم کو

تو تفکر فی الدنیا کا امر ہے۔ ہم تو اس میں خوب غور و تامل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی حقیقت سے بھی واقف ہو گئے۔ تم خاک واقف ہو کہ محض برقعہ کے اُوپر سے زینت دیکھ کر عشق کا دم بھرنے لگے۔

پس ہم دنیا سے بے توجہی کرنے کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ دنیا کی حالت پر کامل توجہ کرو، جس سے حقیقت منکشف ہو۔ ناتمام توجہ مت کرو کہ ظاہر ہی تک رہ جاؤ چنانچہ اس آیت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے اور حق تعالیٰ نے اس میں سبب کفر یہی بتلایا ہے: يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

کہ کفار کو دنیا کی صرف ظاہری حالت کا علم ہے اس لیے وہ ایمان سے رُکے ہوئے ہیں۔ یعنی اگر حقیقت دنیا کا علم ہو جاتا تو یہ حالت نہ ہوتی تو یہاں بھی ظاہر دنیا کے علم کو مذموم کہا گیا ہے۔ حقیقت کے علم کو مذموم نہیں کہا گیا۔ اور حقیقت دنیا کا علم اہل دنیا کو حاصل نہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ علما ترقی سے منع کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے اور ہم پر بہتان ہے ہم ترقی سے کیونکر منع کر سکتے ہیں جبکہ قرآن میں حق تعالیٰ نے ہم کو ترقی کا حکم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے: فاستبقوا الخیرات۔ کہ خیر میں باہم سبقت کرو۔ اور یہی ترقی کا حاصل ہے۔ پس ترقی تو ہمارے نزدیک فرض ہے۔ اور اس سے معلوم ہُوا ہو گا کہ علما تم سے زیادہ ترقی کے حامی ہیں۔ کیونکہ تم نے آج تک اس کو فرض شرعی نہ کہا تھا نہ اس کی فرضیت کو قرآن سے ثابت کیا۔ بلکہ تم محض اقتصادی اور تمدّنی مصالح کی بنا پر اس کے حامی ہو۔ پس ترقی کے ضروری ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہ رہا۔ صرف اختلاف اس بات میں ہے کہ ہم ترقی کے لیے اتنی قید بڑھاتے ہیں کہ خیر میں ترقی ہونا چاہیے اور آپ یہ قید نہیں بڑھاتے۔ مگر اس قید کے ضروری ہونے سے آپ کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

اول تو یہ قید خود نص میں موجود ہے یعنی فاستبقوا الخیرات۔ دوسرے خیر کا مقابل شر ہے اور ترقی فی الشر کو کوئی عاقل مطلوب نہیں کہہ سکتا۔ اب اختلاف صرف اس میں رہا کہ جس ترقی کے آپ حامی ہیں وہ خیر ہے یا نہیں؟ آپ ترقیٔ ورم کے حامی ہیں خواہ دین سلامت رہے یا نہ رہے۔ اور ہم بدون سلامت دین کے ترقی ورم کو "ترقیٔ ورم" سمجھتے ہیں جس شخص کے بدن پر ورم ہو جائے ظاہر میں وہ بھی ترقی یافتہ ہے مگر حقیقت میں وہ تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ یہی حال بدون دین کے ترقیٔ ورم کا ہے۔ پس یوں نہ کہو کہ علماء ترقی سے مانع ہیں بلکہ یوں کہو کہ وہ خاص صورت کی ترقی کے مانع ہیں جو ترقیٔ ورم کے مشابہ ہے۔ ورنہ فی نفسہ مطلق ترقی کے تو وہ تم سے زیادہ حامی ہیں۔

(وعظ: ہم الآخرۃ)

حقیقت میں دنیاداروں میں کوئی بھی آرام سے نہیں

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علماء دنیا بھی سکھلاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تاریخ اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی دنیا دین کے ساتھ درست ہوتی ہے۔ یعنی جب ان کے دین میں ترقی ہوتی ہے تو دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے اور جب دین میں کوتاہی ہوتی ہے تو دنیا بھی خراب ہو جاتی ہے۔ تو جب ہم دین سکھلاتے ہیں، معاملات، معاشرت، اخلاق کو درست کرتے ہیں تو گویا ہم دنیا کی ترقی کی تدابیر بھی بتلاتے ہیں۔ البتہ ہماری تدابیر اور دوسروں کی تدابیر میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کی تدبیر میں پریشانی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی یہ حالت ہے کہ۔ ع

چو میرد مبتلا میرد، چو خیزد مبتلا خیزد

واللہ العظیم جو لوگ بظاہر نہایت آسائش میں معلوم ہوتے ہیں ان کی اندرونی حالت اگر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری پریشانیوں کا نشانہ یہی ہیں۔ ان لوگوں

کی حالت پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا:

میرے استاد علیہ الرحمۃ نے ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ کوئی شخص حضرت خضر کی ملاقات کے لیے دعا کیا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت خضر تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا چاہتے ہو اس نے کہا ایسی دعا کر دیجیے کہ دنیا میں مجھے کوئی غم نہ ہو۔ فرمایا یہ دعا تو کر نہیں سکتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تو دنیا میں جس شخص کو سب سے زیادہ بے غم دیکھے اسی کے موافق تیری حالت ہونے کی دعا کردوں تو ایسے شخص کو منتخب کرلے۔ وہ پھرتا پھرتا حیران ہو گیا اور کوئی امیر و رئیس بے غم نہ ملا۔ آخر ایک جوہری کو دیکھا جو صبح کو دکان پر آتا۔ خوبصورت خوبصورت لڑکے اس کے ساتھ ہوتے بہت سے نوکر چاکر بھی ہمراہ آتے۔ صبح سے شام تک خرید و فروخت کرتا اور غربا کو بہت کچھ خیرات کرتا۔ اس نے اس کی مجموعی حالت سے خیال کیا یہ ضرور بے غم ہوگا میں ایسا ہونے کی دعا کرالوں۔ پھر دل میں کہا کہ قبل دعا کرا لینے کے اس سے حال تو دریافت کرلینا چاہیے، شاید کوئی مخفی حالت ہو۔ چنانچہ اس سے تمام واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھائی مجھے خضر سے دعا کرانی ہے کہ میں تمہارے جیسا ہو جاؤں۔ بتلاؤ تو سہی تم کو تو کوئی غم نہیں ہے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ بھائی مجھ کو ایسا غم ہے کہ کسی دشمن کو بھی نہ ہو اور قصہ سنایا کہ ایک بار میری بیوی جو میری بڑی ہی محبوبہ تھی سخت بیمار ہوگئی تھی۔ میں رونے لگا اس نے کہا تم روتے کیوں ہو۔ میں مر جاؤں گی تم اور شادی کرلینا۔ میں نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ بولی ممکن ہے اب تو تیرا ایسا ہی خیال ہو مگر پھر نہیں رہ سکتا۔ بہت دیکھا یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ جب اس کو کسی طرح یقین نہ آیا۔ اس نے شدّت عشق میں اپنا عضو تناسل اس کے سامنے کاٹ ڈالا کہ اب تو یقین آگیا۔ اتفاق وہ مری نہیں اچھی ہوگئی اور میں بیکار ہو گیا۔ اب وہ کم بخت نوکروں سے سازش رکھتی ہے اور یہ سب بچّے دوسروں ہی سے

ہیں۔ اب میں دیکھتا ہوں اور گھلتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بھائی تُو تو بڑے ہی گندے غم میں مبتلا ہے۔ اللہ بچاوے۔ آخر حضرت خضرؑ کے پاس گیا اور سارا حال سنایا۔ پُوچھا کیا خیال ہے اس نے کہا بس دین کی دعا کر دیجئے۔

حقیقت میں دُنیاداروں میں کوئی بھی آرام سے نہیں۔ اندرونی حالت سب کی پریشان ہے اس واسطے کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ لاینتھی ارب الا الی ارب۔ ایک آرزو ختم نہیں ہوتی کہ دُوسری شروع ہو جاتی ہے اور تفویض و رضا بالقضا ہے نہیں۔ ہر کام میں یُوں چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور سب امیدوں کا پُورا ہونا دشوار۔ اس لیے نتیجہ اس کا پریشانی ہی پریشانی۔ گو ظاہر میں اموال و اولاد سب کچھ ہے مگر اس حالت میں وہ آلہ تعذیب ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں: فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ۔ کہ بظاہر اگرچہ ان کے پاس مال و اولاد بہت کچھ ہے لیکن وہ ان کے لیے عذاب ہے۔ اور راز اس کا یہی ہے کہ واقعات تو اختیار میں ہوتے نہیں اور ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے ہمیشہ مصیبت میں گزرتی ہے برخلاف اس شخص کے کہ جس کے پاس دین ہو کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور محبت میں یہ حالت ہوتی ہے۔

ع ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

دین کے ساتھ دنیا بھی مزے دار ہو گی

غرض دین کے ساتھ اگر دنیا ہو گی تو وہ دنیا بھی مزیدار ہو گی بلکہ نرا دین ہو اور دنیا نہ ہو تب بھی اس کی زندگی نہایت مزے دار ہو گی اس لیے کہ وعدہ ہے: مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ ان حضرات کو ہیچ ندارد میں بھی پورا لطف آتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقدوسؒ پر تین تین دن فاقہ کے گزر جاتے تھے اور جب بیوی

بہت پریشان ہوکر عرض کرتیں کہ اب تو تاب نہیں رہی۔ فرماتے کہ تھوڑا صبر اور کرو جنت میں ہمارے لیے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن بیوی بھی ایسی نیک بی تھیں کہ وہ نہایت خوشی سے اس پر صبر کرتیں۔ صاحبو! ان حالات پر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہیے اور اگر تعجب ہے تو ایسا ہی تعجب ہے جیسے کوئی عنین تعجب کرنے لگے کہ صحبت میں بھی لطف ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ذرا سا بھی ادراک ہوتا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت کا کیا عالم ہوتا ہے۔ محبت میں تو مطلقاً یہ عالم ہوتا ہے کہ۔ ؎

چو در چشم شاہد نیاید زر رت   زر و خاک یکساں نماید برت

دیکھو اگر محبوب کو ایک ہزار روپیہ دو اور وہ لات مار دے تو تمہارے دل میں بھی اس روپیہ کی قدر نہیں رہتی اور محبتِ مجازی میں جب یہ حالت ہے تو حقیقی کا کیا پوچھنا۔ اسی کو فرماتے ہیں۔ ؎

ترا عشق ہمچو خودی ز آب و گل   رباید ہمہ صبر و آرام دل

عجب داری از سالکانِ طریق   کہ باشند در بحرِ معنی غریق

دیکھیے اگر کوئی محبوب اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دے اور اس درمیان میں کھانے کا وقت آجائے اور محبوب کہے کہ اگر بھوک لگی ہو تو جا کر کھانا کھا لو۔ کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ عاشق اس وقت اُٹھنے اور کھانا کھانے کو گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ تو جب محبت کی یہ حالت ہے تو شیخ کے فاقہ پر کیا تعجب ہے۔ وہ حضرتِ حق محبوب حقیقی سے معیت رکھتے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں۔ ؎

گفت معشوقے بعاشق کاے فتا   تو بغربت دیدۂ بس شہرہا

پس کدامی شہر از آنہا خوشتر است   گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

آگے مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں | فوق گردوں است نے قعرِ زمیں
ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ | جنّت است آں گرچہ باشد قعرِ چاہ

تو اگر محبوب کنوئیں کے اندر ہو وہ بھی جنّت ہے۔ تو جب محبوب مجازی کی معیت کی یہ حالت ہوتی ہے تو محبوب حقیقی کی معیت اگر میسّر ہو جائے تو کیا حالت ہو گی غرض دنیادار آپ کو بے مزہ دُنیا سکھلاتے ہیں اور ہم مزے دار دنیا سکھلاتے ہیں اور وہ وہی دنیا ہے جو کہ دین کے ساتھ ہو کہ وہ نہایت لطیف اور مزیدار ہوتی ہے۔

(وعظ: طریقۃ النجاۃ)

ظاہر و باطن پر انہماکِ دُنیا کا اثر

انہماکِ دنیا اور افکارِ دُنیا اور تشویشاتِ دنیا سے انسان کا حسن ظاہری بھی فنا اور برباد ہو جاتا ہے۔ پھر جس کا اثر ظاہر پر یہ ہو وہ حسنِ باطن کو کیا کچھ برباد اور فنا نہ کرے گا۔ مگر بے حسی کی وجہ سے لوگ اس کو محسوس نہیں کرتے۔ (الافاضات ج۶ ص۳۵)

دنیا کی جتنی راحتیں اور لذّتیں ہیں کسی کے لیے بھی تو بقا نہیں۔ (دعوات ج۲ ص)

آخرت سے بے فکری کے ساتھ دنیا اور گندی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی بھی حلاوت اسی وقت نصیب ہوتی ہے جبکہ آخرت کی فکر ہو اور جو لوگ آخرت سے بے فکر ہیں بخدا ان کو دنیا کا بھی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ (دنیا و آخرت ص۱۴۱)

دُنیا کی راحت و عزّت بھی اسی سے حاصل ہوتی ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جائے۔ چنانچہ بحمد للہ ہر زمانہ میں جو لوگ آخرت کے طالب ہوتے ہیں اور اب بھی ہیں ان کو اہلِ دُنیا سے زیادہ راحت و عزّت حاصل ہے۔

(دُنیا و آخرت ص۲۰۷)

جب طلبِ آخرت کا دُنیا میں یہ نتیجہ ہے کہ طالب آخرت کو یہاں بھی راحت قلب اور عزّت حاصل ہو جاتی ہے تو خود آخرت میں پہنچ کر کیا حال ہو گا۔ (ہم الآخرۃ)

دنیا میں آسائش کی دو ہی صورتیں ہیں آسائش کی دو ہی صورتیں ہیں ؛ یا تو کوئی بالکل باغی ہو کر رہے تو سزائے بغاوت سے پہلے اس کو چین ہے اور یا بالکل مطیع ہو کر رہے تو اس کو ہمیشہ کے لیے چین ہے۔ یہاں بھی اور آخرت میں بھی۔ باقی مطیع اور نافرمان دونوں بن کر دنیا کی راحت اور عزت تو حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاں آخرت میں کچھ سزا بھگتنے کے بعد راحت ہو جائے گی۔

(سبیل النجاح صلا)

تمام بیماریوں کی جڑ قلب کا دنیا پر قرار ہو جانا اور آخرت کے لیے قلب کا بے چین نہ ہونا یہی جڑ ہے تمام بیماریوں کی۔ اس اطمینان کو دل سے نکالو جس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کو اپنے اُوپر لازم کر لو گو بہ تکلف سہی۔ خدا کی طاعت میں اثر خاص ہے کہ اس سے فکر پیدا ہو گی اور فکر پیدا ہونے سے تمام کام درست ہو جائیں گے۔ (کمالاتِ اشرفیہ صد۲)

طولِ امل اور فضول سے اجتناب طولِ امل اور فضول لایعنی خیالات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ صبح آئے تو شام کی فکر نہ کرو اور شام ہو تو صبح کی فکر نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اہلِ قبور سے شمار کرو۔ یعنی یہ سمجھ لو کہ گویا آج ہی کا تھوڑا سا وقت زندگی کا باقی ہے بس وہ کام کرو جو زندگی سے مایوس ہو جانے والا آدمی اخیر میں کیا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے کو ایک دن یا ایک گھڑی کا مہمان سمجھتا ہو۔ وہ غیر ضروری کاموں میں وقت کو ضائع نہیں کیا کرتا۔ (دنیا و آخرت "غریب الدنیا" ص۱۱۳)

جی لگنے کی جگہ دنیا ایک ایسی محدود القیام سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔ اول تو سرائے میں اگر قیام اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب

اختیاری نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہیے بلکہ اس سے توحش اور غیبوبی رہنا چاہیے مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے۔ اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو، کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور وہ گھر یہ نہیں۔

(دنیا و آخرت (متاع الدنیا صفحہ ۱۲۳)

پس بڑی بھاری غلطی ہماری یہ ثابت ہوئی کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے اسی لیے یہاں سے جدا ہونے کا رنج و غم ہوتا ہے۔ ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے، خوشی بڑھتی جاتی ہے۔

(دنیا و آخرت صفحہ ۱۲۷)

مُسلمان کا وطن

اے مسلمانو! تمہارا وطن آخرت ہے مگر تم نے اپنے لیے دنیا کو وطن بنا رکھا ہے اور اپنے لیے اور اپنے ہر عزیز کے لیے دنیا ہی دنیا چاہتے ہو۔ (متاع الدنیا)

دُنیا میں کچھ بھی اپنا نہیں

اپنا گھر کونسا ہے؟ جس میں سے کوئی تم کو نہ نکالے ہماری حالت یہ ہے کہ جب سرکاری حکم آتا ہے تو زبردستی ڈنڈا ڈولی کر کے ایک گڑھے میں پھینک دیے جاتے ہیں۔ کیوں صاحبو! یہی تھا تمہارا گھر!

حضورؐ فرماتے ہیں: یقول ابن آدم مالی مالی ...... الخ یعنی آدمی کہتا ہے کہ میرا مال ہے، میرا مال ہے۔ تیرا کیا ہے؟ مگر جو تو نے کھا لیا وہ تو فنا کر دیا اور جو پہنا وہ پرانا کر دیا اور جو صدقہ دیا وہ آگے بھیج دیا وہ بے شک تیرا ہے۔"

صاحبو! نہ مال اپنا ہے نہ بیوی اپنی ہے نہ بچے اپنے ہیں۔ ہم لوگ تو مزدور ہیں۔ چھکڑے کھینچ رہے ہیں جس میں بیوی بچے مال متاع لدا ہوا ہے جب منزل پر پہنچ جائے گا الگ کر دیے جائیں گے۔ صاحبو! مزدور اور خادم اور حمال مالک نہیں

ہوا کرتا پس ہم اصل حقیقت ہیں۔ جب خادم ہیں تو مخدوم کیسے بن جائیں گے۔ محل ہیں جب رعایا ہیں حاکم کیسے ہو سکتے ہیں۔ عبد ہیں مولی نہیں ہیں۔ چھوٹے ہیں بڑائی اس کا حق ہے۔ مقہور مغلوب ہیں وہ قاہر و غالب ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اور اسی کے لیے ہے بڑائی آسمانوں میں اور زمین میں۔

(دنیا و آخرت۔ الدنیا صفحہ ۸۷-۹۳)

عقل کا مقتضی یہ ہے کہ فنائے دنیا سے کبھی غفلت نہ ہو کیونکہ جب واقع میں اس کو بقا نہیں اور فنا اس کے ساتھ لگا ہوا ہے تو اس سے غفلت عقل کے نزدیک سخت غلطی ہے۔ مگر طبیعت غفلت کو مقتضی ہے۔ اس کا تو مضائقہ نہیں مگر اس کا حد سے بڑھ جانا یہ محل شکایت ہے۔ ہماری حالت ایسی ہے جیسے ایک چمار کی حکایت ہے کہ کسی نے اس کے ایک جوتا مارا تو وہ کہتا ہے اب کے تو مار۔ اس نے پھر مارا تو پھر بھی کہا اب کے تو مار۔ اسی طرح ہم بھی رات دن فنائے دنیا کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں۔ مگر اپنی فنا سے غافل ہیں۔ گویا بزبانِ حال یہ کہتے ہیں کہ اب کے تو موت آئے۔ اے صاحبو! مشاہدہ سے زیادہ کیا ہو گا جب مشاہدہ سے بھی ہماری غفلت کا پردہ نہ اٹھا تو کب اٹھے گا۔؟ (دنیا و آخرت صفحہ ۲۴۶)

موت سے غفلت

اے مسلمانو! جس چیز کے ملحد بھی منکر نہیں افسوس ہے کہ تم اس کے منکر ہو اور انکار عام ہے۔ خواہ انکار حالی ہو یا قالی یا عملی ہو۔ ملحد اگر اس کا بالکل بھی انکار کر دے تو جائے تعجب نہیں کیونکہ اس کے زعم میں انکار موت و ما بعد الموت پر کوئی مواخذہ نہیں۔ وہ اپنے اعتقاد میں اس کے انکار کو مضر نہیں سمجھتا۔ مگر تم تو مضر سمجھتے ہو۔ تمہارا کسی درجہ میں بھی اس کا منکر ہونا حیرت کی بات ہے اور یہ ابھی بیان ہو چکا کہ مقتضائے علم پر

عمل نہ کرنا بھی انکار کے مثل ہے اور یقیناً ہم لوگ علمِ موت کے مقتضا پر عمل نہیں کرتے۔

وعظ: غریب الدنیا

تھانہ بھون ۲۴ محرم الحرام ۱۳۴۱ھ)

فنائے دنیا کے عقیدہ کا اثر

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ دنیا کو فانی سمجھو عملاً بھی اور استحضاراً بھی اور اس کو ہر وقت یاد رکھو تاکہ درجۂ حال حاصل ہو جائے۔

اس اعتقاد میں جو شخص پختہ ہوگا اور رسوخ حاصل کر لے گا اس کو اعمال صالحہ کی زیادہ توفیق ہوگی۔ کیونکہ اصل مرض دنیا سے جی لگانا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ فنائے دنیا کو سوچتا رہے۔ پس ہر رات کو اتنا سوچ لیا کرو کہ ایک دن ہم کو جانا ہے، موت آنے والی ہے جب ہمیشہ اتنا نفس کو تنگ کرو گے تب نفس اعتدال پر آجائے گا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ضروری تعلقات کو ترک کر دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے جی نہ لگاؤ اس کا یہ اثر ہوگا کہ گو یہ چیزیں نفس سے چھوٹیں گی نہیں مگر ان کی ہوس نہ رہے گی اور یہی ہوس ہے جس کا علاج ضروری ہے۔ حضرات انبیا علیہم السلام نے اسی کا علاج بہت اہتمام سے کیا ہے۔ حدیث کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طولِ امل اور حرص و ہوس سے کس قدر روکا ہے اور اس کے ازالہ کی کس قدر تدابیر بتلائی ہیں۔

(الفانی)

ہر راحت و لذت فانی ہے

دنیا کی جتنی راحتیں اور لذتیں ہیں کسی کے لیے بھی تو بقاء نہیں۔ (دعوات ع۲)

عیشِ دنیا

اگر دنیا میں عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے ساتھ ہی پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا۔ (تعلیم البیان)

فنائے دنیا کا یقین

اعتقادِ بقائے آخرت اور یقینِ فنائے دنیا، دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت پیدا کریں۔ اور دنیا کی جن

غافل کر دینے والی اشیاء سے نفع اٹھایا جاتا ہے ان کو مقصود اصلی نہ قرار دیں اور اس معمولی فائدہ و آرام کو اپنا مطمحِ نظر اور مبلغ پرواز نہ بنائیں۔ (الدنیا والآخرۃ)

دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا فلاح کے خلاف ہے اور اس سے فلاح مبدل بہ خسران ہو جاتا ہے۔ (ترجیح الآخرۃ)

دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی ہونے کا جیسا اعتقاد ہے اس کا دھیان کرو تاکہ یہ اعتقاد حال بن جائے۔ (دنیا و آخرت ص ۲۱۳)

اعمال میں کوتاہی کا سبب حُبِّ دُنیا اور عدمِ اہتمامِ آخرت ہے۔ (کمالات ص ۳)

حقیقی نفع، نفعِ آخرت ہے مسلمانو! غور تو کرو کہ مخلوق کے ہاتھ میں برائے نام نفع و ضرر ہے جب ان سے اتنا خوف ہوتا ہے تو جس کے ہاتھ میں حقیقۃً نفع و ضرر ہے اس سے کتنا خوف ہونا چاہیے۔

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

جب ایک مخلوق کی ناراضی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جس کام سے وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس جاتے ہُوئے جی ڈرتا ہے تو مالک حقیقی اور قادرِ مطلق کی ناراضی کا کیا نتیجہ ہونا چاہیے۔ پھر کیا ممکن ہے کہ مسلمانوں کے دل میں کوئی کام کرتے وقت یہ خوف نہ ہو کہ اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن ہماری حالت ایسی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے دنیا ہی کے نفع و ضرر کو نفع و ضرر سمجھ رکھا ہے اور غفلت نے حقیقی نفع و ضرر پر پردہ ڈال دیا ہے۔ حالانکہ دنیا کا نفع کیا نفع ہے۔ ابھی ہے ابھی ندارد۔ اگر کوئی لکھ پتی اور بادشاہ بھی ہے اور ہر طرح کا اقتدار رکھتا ہے تب بھی یہ ممکن نہیں کہ اسے کبھی ناگوار بات پیش نہ آئے۔ کسی کا عیش بھی دنیا میں عیش خالص نہیں۔ پھر دنیا کا نفع کیا نفع ہے حقیقت میں نفعِ آخرت ہی نفع ہے جو خالص اور

دائمی ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ دنیا کا نفع جو بغیر دین کے ہو وہ کچھ بھی نہیں کیونکہ اس کو تمام منافع کی جو جڑ اور غایت ہے یعنی اطمینان قلب وہ ہرگز حاصل نہیں ہوتی۔ اور مطیع او طالب خدا کیسا ہی تکلیف میں ہو مگر اطمینان قلب اس کو ہر حال میں رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا اطمینان عیش میں بھی اس چیز پر نہیں تھا جس کو اہل دنیا کے نزدیک عیش سمجھا جاتا تھا بلکہ عطاء خداوندی پر اعتماد تھا۔ اس وجہ سے خوش تھا کہ خداوند تعالیٰ نے ایک چیز مجھ کو دی ہے اور عطاء خداوندی مصیبت کی حالت میں بھی بجنسہٖ موجود ہے۔ صرف اس کا متعلق بدل گیا ہے۔ مصیبت اور راحت دونوں اس کے نزدیک عطیۂ الٰہی ہیں۔ دونوں میں کچھ بھی فرق نہیں کرتا جیسا راحت میں خوش ہے اور اطمینانِ قلب رکھتا ہے ویسا ہی مصیبت میں خوش ہے، اطمینان رکھتا ہے وہ تو یہ سمجھتا ہے۔

ع ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

طاعت سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور بلا طاعت ہمیشہ پریشانی رہتی ہے خواہ لکھ پتی کیوں نہ ہو لیکن جب تک دیندار نہ ہو کبھی پریشانی سے خالی نہیں ہو سکتا۔

حُبّ دنیا کا علاج اور موت کی حقیقت

حُبّ دنیا کے علاج میں یہ مراقبہ نہایت مفید ہے کہ قبر میں اس طرح کفن گل گیا، اعضاء منتشر ہو گئے۔ موت سے لوگ گھبراتے ہیں مگر مومن کے لیے موت بڑی مسرّت کی چیز ہے۔ یہی وہ پُل ہے جس سے گزر کر محبوب تک رسائی ہوگی۔ باقی طبعی تکلیف ایسی ہے جیسے بچّہ کو آپریشن کرایا جاتا ہے۔ وہ اس پر روتا ہے، چلاتا ہے مگر مربّی خوش ہیں کہ یہ اب اچھا ہو جائے گا۔ (ملفوظات ج ۳ ص ۷۳)

علاجِ کبر اور اصلاحِ حال

ہماری اصل تو خاک ہے لہٰذا ہم کو خاک بن کر رہنا چاہیے مٹی ہو کر تکبر کرنا نہایت ہی نازیبا ہے۔ پھر آخر میں بھی ہم مٹی ہی میں ملنے والے ہیں۔ یہ جسم سب خاک خوردہ ہو جائے گا اور ایک دن ہم زمین کے اُوپر سے اس کے اندر پہنچ جائیں گے تو اس کے لیے ہم کو ایسے اعمال کرنے چاہئیں جو اس وقت کارآمد ہوں۔ اس مراقبہ کو اصلاحِ حال میں بہت ہی تاثیر ہے۔

(انفاسِ عیسٰی صہ ۹۴)

آخرت کے مقابلہ میں نفع دنیا ہیچ ہے

پریشانی کے معنی دل کا یکسو نہ ہونا ہے۔ یہ بات سوائے ذاکر و دیندار کے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس اگر یکسوئی ہو سکتی ہے تو صرف ذکراللہ سے ہو سکتی ہے۔ ذکراللہ میں بالخاصہ اثر ہے کہ اس سے قلب کو اطمینان ہوتا ہے۔

میں بہت موٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ دلیل کو بہت گنجائش ہے مگر بداہت کے سامنے دلیل کوئی چیز نہیں۔ چند افراد متمولین کے اور چند افراد اہل اللہ کے لے کر ان کے حالات ملائیے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اطمینان کس کو حاصل تھا۔ ایک طرف دو چار بادشاہوں کے حالات رکھیے اور ایک طرف چند اولیا اللہ کے خود آپ کا قلب بول اُٹھے گا کہ میرا کہنا کہاں تک صحیح ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسا تو ہوا ہے کہ سلطنت چھوڑ کر کسی نے فقیری اختیار کی ہے لیکن ایسی نظیر ایک بھی نہ ملے گی کہ فقیری چھوڑ کر سلطنت اختیار کی ہو۔

دُنیا کا نفع چاہے کیسا ہی بڑا معلوم ہوتا ہو لیکن جب آخرت کے نفع کے ساتھ مقابلہ کیا جائے بشرطیکہ نظر بھی صحیح ہو تو ہیچ ثابت ہو گا۔ اسی وجہ سے اس کو دیکھ کر بعض بادشاہوں نے سلطنتیں چھوڑ دی ہیں۔ ہم لوگوں کی صرف دنیا کے نفع تک نظر محدود ہے اور اسی طرف اٹھتی ہیں۔ اس وجہ سے اس کو منتہائے ترقی اور غایتِ عروج

سمجھ رکھا ہے اور جس کی نظر اس طرف اٹھ گئی وہ اُسی کا ہو گیا۔ تباؤ بھائی مسلمانو ایہ نفع نفع ہے یا وہ۔ اور دنیا کا نفع تو برائے نام ہی نفع ہے۔ اگر کسی کو تمام دُنیا بھی حاصل ہو جائے تب بھی کلفت سے خالی نہیں۔ ایک طرح سے چین ہے تو دس طرح سے بے چینی ہے۔ غرض یاد رکھو کہ دنیا کا نفع کوئی نفع نہیں ہے اور نہ نقصان کوئی نقصان ہے۔ ایک ہوا ہے کہ ٹھنڈی چل گئی تو طبیعتیں خوش ہو گئیں مگر اس کے پیچھے گرم ہوا بھی ہے یا گرم چل گئی تو طبیعتیں آزردہ ہو گئیں مگر اس کے پیچھے ٹھنڈی ہوا بھی آتی ہے۔ اسی پر کوئی شکر کرلے یا کفر۔

دورانِ بقا چو باد صحرا بگذشت — تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت

(ذم المکروہات ص ۱۵)

شوقِ آخرت

حضرت! ایمان پر خاتمہ ہو جائے چاہے ادنیٰ ہی درجہ کا ایمان سہی، بڑی دولت ہے۔ پھر خوف کے لہجہ میں فرمایا اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ بدون ان کے فضل کے کچھ نہیں بن سکتا۔

(۱۳ ر شوال ۱۳۵۰ھ)

حق تعالیٰ نے اصلاح کے لیے ایک مراقبہ کی تعلیم فرما دی ہے کہ عمر کے جلد جلد گزرنے اور ختم ہونے کو ہر وقت پیشِ نظر رکھے اور ہر وقت کو آخری وقت سمجھے۔

(دواء العیوب ص ۵)

اطاعت اور عمل صالحہ میں بالذات یہ خاصیت ہے کہ اس سے شوقِ آخرت اور حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے۔

(شوق اللقاء ص ۲۸)

اپنی حالت کو ہر وقت درست رکھو نہ معلوم کس وقت طلبی ہو جائے۔

(الابقا ص۳۔ ربیع الاول ۱۳۶۴ھ)

آخرت کا شوق عادۃً بدون دنیا کی نفرت کے نہیں ہو سکتا اور دنیا سے نفرت بدون ناگوار حوادث کے نہیں ہوتی۔ یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ایسے اسباب پیدا فرما دیتے ہیں کہ آدمی کو خود بخود دنیا سے نفرت ہو جاتی ہے۔

(الافاضات ج۳۔ ملفوظ ۱۳۶ ص۹۱)

جس کو مقصود حضرتِ حق ہوں اس کو اور فضول خرافات اور فضول جھگڑوں کی کہاں فرصت۔ یہ تو انہیں کا کام ہے جو آخرت سے بے فکر ہیں۔ دوسرے کی فکر تو وہ کرے جو اپنے سے فارغ ہو۔ (الافاضات ج۳ ملفوظ ۴۷۹ ص۲۷۰)

اعمالِ آخرت کے ثمرات

اعمالِ آخرت وہاں تو کام آتے ہی ہیں یہاں بھی کام آتے ہیں۔ اس لیے کہ اعمالِ آخرت سے حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ خدا کی خوشی کو معلوم کر کے اس شخص کا دل خوش ہوتا ہے۔ دنیا میں دیکھ لیجیے کہ صرف حاکم کی خوشی کے واسطے کیا کچھ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ وزیرِ اعظم مجھ سے خوش ہیں تو خیال کیجیے اس کو خوشی ہوگی یا نہیں۔ ایسے ہی اللہ والے بھی حق تعالیٰ کی خوشی معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں۔ دنیا میں بھی آرام ان کو ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا سے ان کو محبت ہے۔ کچھ بھی نہ ہو تو محبت کی لذّت ہی بڑی چیز ہے۔ پھر محبت بھی کس کی۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی جس سے بڑھ کر صاحبِ حسن و جمال کوئی نہیں ہو سکتا۔

ایک طوائف کی محبت میں تو یہ لطف آتا ہے کہ گھر بار تک لٹا دیتے ہیں جس سے بدنامی ہوتی ہے، ذلّت بھی ہوتی ہے۔ پھر خدا کی محبت میں کیوں لذت نہ ہو گی جس میں سب سے بڑی کامیابی کی بھی اُمید ہے۔

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود — گوئے گشتن بہر او لیٰ بود

محبت والے ہر حال میں خوش رہتے ہیں چاہے غم ہو یا خوشی ہو۔ آزمالیجیے کہ ایک وہ شخص ہے کہ جس کے دل میں خدا کی محبت ہے۔ بیوی مرگئی، بچے مرگئے سب کچھ ہوگیا مگر اس شخص کے بجز چند آنسو بہنے کے کچھ نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب خدا کی چیزیں ہیں جب تک اس نے چاہا ہمارے پاس رکھیں، جب چاہا چھین لیں۔ اللہ والے کا دل مصیبت میں بھی مطمئن رہتا ہے۔ یہ اپنی تسلّی تو کرتا ہی ہے دوسروں کی بھی تسلّی کرتا ہے۔ مگر جس شخص کے دل میں خدا کی محبّت نہیں، جہاں اس کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے خدا کی شکایت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبّت ہی سے اطمینانِ دنیا بھی نصیب ہوتا ہے

صاحبو! اگر آپ نے اپنی مرضی کے موافق ایک نہایت عمدہ مکان بنوایا ہو اور آپ کا نوکر یہ کہے کہ مجھے تو یہ چیزیں اس جگہ اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں آپ نے رکھی ہیں وہاں اچھی نہیں لگتیں۔ تو یہ نوکر آپ کے نزدیک سزا کے قابل ہے یا نہیں۔ ضرور آپ اس کے ایک طمانچہ ماریں گے کہ بدتمیز ہم نے مکان تیری خوشی کے لیے بنایا ہے یا اپنی، تُو اس میں رائے دینے والا کون ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہم خدا کی چیزوں میں بے خوف وخطر جو چاہے کہتے ہیں۔ اگر ہم ان کو خدا کی چیزیں سمجھتے تو کبھی شکایت دل میں نہ آتی۔ تو صاحبو! یہ خدا کی چیزیں ہیں۔ تم ان کو اپنی کیوں سمجھتے ہو۔ پھر خدا کو اختیار ہے جس چیز کو چاہے مکانِ دنیا میں رکھے جس کو چاہے مکانِ آخرت میں رکھے۔ تم کو راضی رہنا فرض ہے۔ ناراض ہونا بدتمیزی ہے رضاؤ محبت سے دنیا میں بھی راحت حاصل ہوتی ہے:

حضرت بہلول سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ فرمایا کہ کیا حال پوچھتے ہو اس

شخص کا جس کی خواہش کے مطابق دنیا کے تمام کام ہوتے ہوں۔ پوچھا حضرت یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ سارے کام ایک شخص کی خواہش کے موافق ہوتے ہوں۔ فرمایا کہ جس شخص نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو ہر کام اس کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہوا کہ دنیا بھی اگر درست ہے تو دین والے ہی کی ہے۔ دنیا یہ نہیں ہے کہ ہزاروں روپئے ہوں۔ موٹر ہو نوکر ہوں۔ دنیا یہ ہے کہ دل چین سے ہو۔ واللہ اگر دل چین سے ہے تو صرف اللہ والوں کا ہے۔ دنیا والوں سے جسے دیکھو ایک نہ ایک غم میں گرفتار ہے۔ کوئی بیماری میں چیخ رہا ہے۔ کسی کو اولاد سے بیحد محبت ہے۔ ایک بیگم کو اپنے بچوّں سے محبت تھی۔ وہ ان سب کو اپنے پاس ایک فرش پر لٹاتی تھیں اور رات کو بار بار اُٹھ کر دیکھتی تھیں کہ کوئی غائب تو نہیں ہو گیا۔ کیا یہ عذاب نہیں ؟ بعض لوگوں کو حق تعالیٰ مال کی محبت سے عذاب دیتے ہیں۔

مشہور ہے کہ ایک بخیل جب مسجد میں جایا کرتا تھا تو گھر کا چراغ گل کر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ بھول گیا تو مسجد سے لوٹ کر آیا۔ باندی نے پوچھا کہ خیر ہے کیوں لوٹ کر آئے ؟ کہا کہ میں چراغ گل کرنا بھول گیا تھا۔ اس نے کہا میں ایسی غافل نہیں تھی۔ میں نے تمہارے جلتے ہی چراغ گل کر دیا تھا، مگر مجھے تو اس کی فکر ہے کہ تم جو لوٹ کر آئے اس میں تمہارا جُوتا گھس گیا ہوگا۔ بخیل صاحب نے باندی کی بڑی تعریف کی کہ اسی طرح کفایت سے خرچ کیا کرتے ہیں اور میرے جُوتوں کی تو فکر نہ کر کیونکہ لوٹتے ہوئے میں نے بغل میں دبا لیے تھے۔ تو کیا یہ مال کی محبّت وبالِ جان نہیں ہے جبکہ انسان ہر وقت اسی ادھیڑ بُن میں لگا رہے۔ بہرحال دنیا کی راحت بھی اسی کو ہے جس کا دین اچھا ہے۔ حضرت بہلولؒ سے کسی نے کہا کہ روٹی گراں ہو گئی۔ کہا ہم کو کیا فکر۔ ہماری روٹی کا ذمہ انہوں نے لیا ہے اور ہم پر عبادت فرض کی ہے۔ ہم کو عبادت میں لگنا چاہیے۔ روٹی وہ آپ دیں گے۔

بہرحال اعمال کی اصلاح وہ چیز ہے جس میں آخرت کا تو بھلا ہے ہی، دنیا کی راحت بھی اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ خصوصاً اگر تندرستی بھی ہو اور بقدر ضرورت غنا اور فراغت بھی ہو تو پھر اس شخص سے زیادہ کوئی خوش قسمت نہیں ۔

خوشا روزگارے کہ دارد کسے   کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت یساری بود   کند کارے از مرد کارے بود

(وعظ: التنبہ)

طالبِ آخرت ہر حال میں کامیاب ہے

آپ کا کام کوشش ہے۔ اگر تم کوشش میں لگ جاؤ۔ پھر بھی کامیابی کا درجہ حاصل نہ ہو تب بھی ثواب ملے گا۔ بلکہ دونا ثواب ملے گا۔ ایک محنت کا، ایک ناکامی کی حسرت اور رنج کا۔ اور ناکامی پر ثواب ملنے پر حیرت نہ کیجیے۔ حدیث میں تصریح ہے:

"جو شخص قرآن میں اٹکتا ہو اور وہ اس پر دشوار معلوم ہوتا ہو، اس کو دو اجر ملیں گے"

یہ مضمون سالکین کے بہت کام کا ہے کہ دین کے راستہ میں اگر کوشش ناکام بھی ہو یا کمزور ہو جب بھی اجر ملے گا۔

صاحبو! اگر وصول الی کمال العمل نہ ہوا تو ثواب و قرب تو وصول الی المقصود ہو جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

گر مرادت را مذاق شکر است   بے مرادی نے مرادِ دلبر است

ارے مراد میں تو مزہ ہے ہی مگر نامرادی میں بھی ایک مزہ ہے۔ وہ یہ کہ محبوب نے تو دیکھ لیا کہ ہم نے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا۔ کیا یہ تھوڑی دولت ہے کہ تم ان کے خریداروں میں داخل ہو گئے۔ گو ناکام ہی خریدار سہی۔ وائے اس کے حال پر جو خریدار بھی نہ بنا۔ پس آخرت وہ شے ہے کہ اس کا طالب ناکام ہو کر بھی مستحق اجر ہے۔ مگر ایسی مد کوئی نہیں کہ کچھ بھی نہ کرو اور اجر مل جائے۔ افسوس ہے کہ ہم دنیا کے

لیے تو ہر طرح کی تدبیر و سعی کرتے ہیں جہاں ناکامی سراسر خسارہ ہے اور آخرت کے لیے سعی نہیں کرتے جہاں ناکامی بھی کامیابی ہے۔ (دنیا و آخرت صہ ۲۶۲)

عقیدۂ آخرت ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مسلمان اگر اسی بات پر آمادہ ہو جائیں کہ ہم کو آخرت میں سب کچھ مل جانے گا تب بھی ان کی ساری پریشانیاں دُور ہو جائیں اور تمام دنیا کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ (الافاضات ع۵ صہ ۴۰۶)

صحابہؓ کی تمام جد و جہد اور دوڑ دھوپ ملکِ کبیر کے واسطے تھی اسی کے لیے تھا جو کچھ تھا جس کی شان میں ارشاد ہے: وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَّمُلْكًا كَبِيرًا۔ اس ملکِ حقیر کے لیے کچھ نہ تھا اور صحابہؓ کی تو بڑی شان ہے۔ اولیاء سب اسی شان کے گزرے ہیں۔ (الافاضات ع۶ صہ ۲۵۵)

حضراتِ صحابہؓ میں نہ تکبّر تھا نہ شیخی تھی اور نہ وہ کسی مخلوق سے ڈرتے تھے اس لیے کہ وہ خدا تعالیٰ سے لو لگائے ہُوئے تھے اور ہر وقت وقتِ آخر کے منتظر تھے۔

(دنیا و آخرت صہ ـــ)

طلیحہ بن خویلد نے اپنے وزیر سے پوچھا تھا کہ ہمارے پاس سب سامان ہے، تلواریں ہیں جمعیت زیادہ ہے، پھر بھی یہ مسلمان ہم پر غالب آتے ہیں۔ ان میں ایسی کونسی چیز ہے جس کا یہ اثر ہے! وزیر سمجھدار تھا۔ عجیب جواب دیا کہ ہم میں ان میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ ان میں کا تو ہر شخص اپنے رفیق سے پہلے مر جانا چاہتا ہے اور دوسرے کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اور ہمارے یہاں ہر شخص خود تو زندہ رہنا چاہتا ہے اور دوسرے کو مُردہ بنانا چاہتا ہے۔ اُن کے نزدیک مقدم موت ہے اور ان کے نزدیک مقدم حیات ہے۔ بس یہ چیز ان لوگوں میں زیادہ ہے جو ہم میں نہیں یہی وجہ ہے کہ ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ (ملفوظات ع۱۷ صہ ۱۶۸)

سر سیّد احمد خاں کو خط حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ سر سیّد احمد خاں کو خط تحریر فرمایا۔ اس کا آخری حصّہ یہاں پر نقل کیا جا رہا ہے:

"خلاصہ تمام معروضات کا یہ ہے کہ اب آپ کا اخیر وقت ہے، بجز عقائد و اعمال کے کوئی اس سفرِ آخرت کا ساتھی نہیں۔ اپنے "چند روزہ رفقاء" کو رخصت کیجیے، خواہ ظاہراً بھی، خواہ صرف دل سے اور اس "دائمی رفیق" کو ساتھ لیجیے یعنی عقائد و اعمال کی اصلاح فرمائیے کیونکہ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔

نسیم جاگو کمر کو باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے"

(سیرت اشرف ص ۱۹۱)

فصل (۲)

طلبِ آخرت

آخرت کی نعمتیں قابلِ طلب ہیں

آخرت کی نعمتیں قابل طلب کے ہیں۔ ان کے حاصل کرنے کی تدبیر کرو۔ اور یقینی بات ہے کہ جس شخص کو آخرت مطلوب ہو گی تو اس کا اثر یہ ہو گا کہ وہ اپنے لیے بھی اور اپنے عزیز کے لیے بھی اللہ کے پاس رہنا زیادہ پسند کرے گا بہ نسبت یہاں رہنے کے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ دو شخص سفر میں ہیں اور سفر کی مشقتیں اور متاعب برداشت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو بادشاہِ وقت نے بلا بھیجا کہ تمہارے سفر کی میعاد ختم ہو گئی ہے۔ اب تم ہمارے پاس راحت کے لیے آجاؤ۔ دوسرے شخص کو ظاہر ہے اس کے جانے سے خوش ہونا چاہیے کہ اچھا ہُوا۔ اگرچہ جدائی کا رنج بھی ہو گا۔ مگر عقلاً وہ اس کو خلافِ مصلحت نہ سمجھے گا۔ بلکہ سمجھے گا کہ اچھا ہُوا اپنے ٹھکانے جا پہنچا اور خود بھی متمنّی ہو گا کہ وہ کون سا دن ہو گا کہ میرے سفر کی مدّت بھی ختم ہو گی اور میں بھی بادشاہ کی خدمت میں جا پہنچوں گا۔ چنانچہ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جناب حافظ صاحب شہید کے بارے میں تحفۃ العشاق میں ایک شعر لکھا ہے۔ ؎

جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر
مثلِ تلچھٹ رہ گیا میں خاک پر

یہاں یہ ہوتا ہے کہ اپنے مرنے کی تمنّا تو کیا ہوتی دوسرے کی موت پر حسرتیں

اور ارمان اور خلافِ مصلحت ہونے کے خیالات ہوتے ہیں۔ اور تمنّا موت کی بھی کس منہ سے کریں۔ تمنّا تو وہ کرے جس کے پاس نیک عمل ہوں۔ یہاں پر ایک شبہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تمنّا کرتے ہیں تو کیا ان کو اپنے نیک اعمال پر بھروسہ ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ان کو بھروسہ کبھی نہیں ہوتا۔ اپنے اعمال پر بھروسہ کسی کو بھی نہ چاہیے۔ ایک اور بات ہے کہ ہر شے میں حق تعالیٰ نے ایک خاصیت رکھی ہے۔ نیک عمل میں یہ خاصیت بھی ہے کہ خدا تعالیٰ سے حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے، رجا حاصل ہوتی ہے۔ (الباقی)

صرف ایک فکر کی ضرورت غیر اختیاری امور میں پریشانی پر ایک صاحب سے فرمایا: ارے چھوڑو اس فکر کو، تم نے یہ گھن کہاں کا لگایا، تم سے فکر کرنے کو کس نے کہا ہے۔ وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے تمہارے کیے سے کچھ نہ ہوگا۔ بس خدا پر نظر کر کے بے فکر رہو اور خوش رہو اور چین سے بیٹھو ؎

حریفانِ بلا مے پرستی کنید بنوشید و جوشید و مستی کنید

ہاں ایک فکر البتہ لذیذ ہے وہ جان کو لگاؤ یعنی فکرِ آخرت۔ اور واللہ میں قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں یہ فکر اگر پیدا ہو گئی تو ساری فکریں گم ہو جائیں گی۔ یہ عصائے موسیٰؑ ہے جو اژدہا بن کر سارے سانپوں کو نگل جائے گا اور جس کی جان کو دوسری فکریں لگی ہوئی ہیں۔ واللہ اس کو اس فکر کی ہوا بھی نہیں لگی ورنہ اس فکر کی تو مستی ایسی ہے جو دنیا بھر سے یکسو کر دیتی ہے ؎

خود قوی تر می شود خمرِ کہن
خاصۂ آں خمرے کہ باشد من لدن

(ارضاء الحق، حصہ دوم ص ۵۳-۵۲)

دشوار گزار راستہ میں عنایتِ حق کی دعا ہر وقت یہ خیال پیشِ نظر رکھے کہ میں

اس وقت سفر کر رہا ہوں۔ آخرت کی ایک دور دراز منزل میرے سامنے ہے جس کی شاہراہ بہت کٹھن ہے۔ اس میں بہت سے موانعات پیش آیا کرتے ہیں اور منزلیں کھوٹی ہو جایا کرتی ہیں۔ لہٰذا جس قدر امور معاون اور مقصود میں مددگار ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے اور جو امور مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں ان کو چھوڑنا چاہیے۔ لیکن یہ سب کچھ موقوف ہے خدا کی عنایت پر۔ جب تک مبداء کی نظر رہے گی اس وقت تمام مشکل سے مشکل کام سہل ہو جائیں گے اور سب دقتیں آسان ہو جائیں گی اور جہاں اس فیض سے محروم ہوئے تو پھر آسان سے آسان کام بھی دشوار اور ناقابلِ برداشت ہوں گے لہٰذا مناسب ہے کہ امدادِ خداوندی کی دعا ضرور کرے۔ یہی امداد وہ چیز ہے کہ سالکین کو اسی کی بہت فکر رہتی ہے۔ ان کی آنکھیں روشن ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بدون اس کی عنایت کے ہم اس شاہراہ پر نہیں چل سکتے۔

این ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیج ۔۔۔ بے عنایاتِ خدا ہیچیم و ہیچ

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق ۔۔۔ گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(الدنیا والآخرۃ ص۸۵)

طلبِ آخرت کی حقیقت فرائض کی پابندی اور محرمات سے اجتناب کا نام طلبِ آخرت ہے۔ مگر میں اس وقت ایسی حقیقت بتلانا چاہتا ہوں جو وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ پر بطریق مفہوم دال ہے۔ کیونکہ یہاں غفلت پر مذمت ہے پس غفلت کی ضد مطلوب ہوگی اور غفلت کی ضد ہے ذکر و فکر جس کا ترجمہ اردو میں دھیان اور دھن ہے۔ بس طلبِ آخرت کی حقیقت یہ ہوئی کہ آخرت کا دھیان رہے۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں اس میں تو کچھ وظیفے و لطائف کی بھی ضرورت نہیں بس اتنی ضرورت ہے کہ دل سے آخرت کی یاد ہو اور اس کی دھن لگی رہے۔ اگر دھیان اور دھن لگا رہے گا تو اول تو تم راستہ سے ہٹو گے نہیں اور اگر

ہٹو گے بھی تو جلد ہی متنبہ ہو کر راستہ پر لگ جاؤ گے۔ (دہم الآخرۃ)

طلبِ آخرت کی علامت

ارادہ آخرت کہتے ہی ہیں ایمان اور عمل صالح میں سعی کرنے کو۔ کیونکہ اس کے بغیر طلبِ آخرت متحقق ہی نہیں ہو سکتی، طلب کے لیے علامت بھی چاہیے۔ طلبِ آخرت کی علامت بھی ہے کہ ایمان اور عمل صالح اختیار کیا جائے۔ (دنیا و آخرت ص۵۹)

عاشقینِ الٰہی کے نالے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

مولانا رومیؒ کے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ چونکہ نالۂ عاشق کے سننے سے دوسروں کو بھی شوق پیدا ہوتا ہے اس لیے فرماتے ہیں کہ عشاق کا نالہ اور ان کی گفتگو سُن۔ نے سے مراد عشاق عارفین ہی ہیں۔ اس میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف رغبت کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ عشاقِ الٰہی کی صحبت اختیار کرو اور ان کا نالۂ جدائی سنو۔

(دنیا و آخرت ص۴۷)

اہلِ دنیا کی صحبت سے پرہیز

اہل محبت کی صحبت پرہیز کے ساتھ اختیار کی جائے اور پرہیز یہ ہے کہ اہلِ دنیا کی صحبت سے بچو اور اہل دنیا وہ ہیں جو غیر اللہ کا تذکرہ زیادہ کریں۔ (الجمعین بین النفعین ص۳۹)

طلبِ آخرت محبوبِ سرکار ہے

محبت الٰہی پیدا ہو جانے کے بعد ارادۂ آخرت اتنا سہل ہو جاتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کے لیے اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔ وہ ارادہ خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے مگر بوجہ اعانتِ غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بغیر اختیار کے پیدا ہو رہا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آخرت کی طلب محبوب سرکار ہے۔ اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے جس سے وہ بالکل سہل ہو جاتی ہے اور دُنیا

مردود بارگاہِ الٰہی ہے۔ اس میں ہمیشہ دقت اور تعب ہی رہتا ہے۔ اس کے لیے ہمیشہ اہتمام و انہماک از خود کرنا پڑتا ہے اور یہ طلب ہمیشہ بتکلف از سرِ نو پیدا کرنی پڑتی ہے۔

اور شرح اس سہولت و اعانت کی یہ ہے کہ طلبِ آخرت میں قدرے سعی کرنے سے جب نسبت مع اللہ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ایک کیف اور حال پیدا ہو جاتا ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ اس کے بعد کام کا نہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کام کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا۔ اور اس نسبت مع اللہ سے اور سب کام تو آسان ہو ہی جاتے ہیں جو سب سے بڑی خوفناک چیز ہے جس سے سب لوگ ڈرتے ہیں یعنی موت وہ بھی ان کے لیے ایسی خوشگوار ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ لوگ تمنا کرتے ہیں۔ (المراد صلے)

سفرِ آخرت غیر اختیاری ہے

حرکت کی دو قسمیں ہیں: ایک حرکت مکانی اور ایک حرکت زمانی۔ تو یہاں پر حرکت مکانی اور انتقالِ مکانی تو بیشک نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہراً ہم دیکھتے ہیں کہ آخرت میں پہنچنے کے واسطے اللہ پاک نے کوئی زینہ نہیں بنایا جس پر چڑھ کر ہم آخرت میں چلے جائیں۔ بلکہ یہاں پر حرکت زمانی متحقق ہے۔ یعنی اگرچہ ہم ساکن ہیں لیکن زمانہ حرکت کر رہا ہے۔ وہ حرکت کرتے کرتے ایک ایسی آخری ساعت پر پہنچ جائے گا کہ جس کے بعد ہم آخرت میں ہوں گے۔ نہ کسی زینہ کے واسطہ سے نہ کسی سیڑھی کے ذریعہ سے بلکہ حرکتِ زمانی کے ذریعہ سے جو کہ ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ کیونکہ ہم حرکت زمانہ کے بڑھانے اور گھٹانے پر قادر نہیں، چہ جائیکہ روکنے پر۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ آٹھ ہی کے گھنٹہ میں رہیں اور نو کے گھنٹے میں نہ جائیں تو چاہے سر سے پاؤں تک کا زور کیوں نہ لگالیں ناممکن ہے کہ آپ نو کے گھنٹہ میں داخل نہ ہوں۔ بلکہ آپ ضرور داخل ہوں گے اور اضطراراً داخل ہوں گے۔ حرکتِ زمانہ آپ کو مجبور کرتی ہے۔ اللہ میاں نے سیڑھی ہی ایسی عجیب بنائی ہے جو کہ اختیار سے بالکل باہر اور غیر محسوس ہے۔

ہماری مثال ایک رہرو مسافر کی سی ہے جو اپنے سفر کو قطع کر رہا ہے۔ اور یہی حرکتِ زمانی ہے جو بوجہ خارج از اختیار و کسب ہونے کے سبب تغافل بنتی ہے کہ ہمیں اپنی حالت کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس ساعت سے قبل ہماری کیا حالت تھی اور اب کیا ہے اور اس ساعت کے گزر جانے سے کس قدر حصہ ہماری اس دنیوی حیات کا ختم ہو گیا۔

اسی وجہ سے محققین نے کہا ہے کہ بچہ جس وقت پیدا ہو کر ایک ماہ کا ہوتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے کہ میرا بچہ ایک مہینہ کا ہو گیا لیکن درحقیقت وہ سمجھتی نہیں کہ اس کی عمر سے ایک مہینہ کم ہو گیا جس ساعت اس نے دنیا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس کی عمر ہر ہر ساعت محسوب ہونے لگتی ہے اور اسی قدر حصہ عمر کا گھٹنے لگتا ہے۔

(الدنیا والآخرۃ صہ ۹)

جس مسافت کو ہم طے کر رہے ہیں اس میں تنہا ہم ہی متحرک نہیں بلکہ اس سفر کا مبدا اور منتہا بھی متحرک ہیں۔ مبداء پیچھے کو ہٹ رہا ہے ہم سے دور ہو رہا ہے اور منتہا آگے کو بڑھ رہا ہے ہم سے نزدیک ہو رہا ہے۔ حدیث میں ہے": الا ان الدنیا مدبرۃ والاخرۃ مقبلۃ "کہ دنیا پیچھے کو ہٹ رہی ہے اور آخرت قریب ہو رہی ہے۔ یہ تو سفرِ اضطراری کی حالت ہے۔

اختیاری سفر کی رفتار

اور سیرِ اختیاری جس کو سلوک کہتے ہیں اس کی بھی یہی حالت ہے: جب بندہ "طلب" میں قدم رکھتا ہے۔ اسی وقت سے موانع پیچھے ہٹنے لگتے ہیں یعنی خود بخود مرتفع ہونے لگتے ہیں اور مقصود قریب ہونے لگتا ہے۔

(الرحیل صہ ۵)

حرکت الی الآخرۃ کے اقسام

اطمینان بالدنیا کا مطلب یہ ہے کہ حرکت الی الآخرۃ نہ ہو حرکت الی الآخرۃ ـــ جو مقابل ہے سکون کا ـــ تین قسم

کی ہوتی ہے۔

ایک حرکت اعتقادی کہ اعتقاد درست ہو۔ ایسا نہ ہو جیسا کفار کا۔ دوسرے حرکت عملی کہ اعمالِ آخرت کا اہتمام ہو۔

تیسرے حرکت حالی کہ آخرت کی دھن میں بے چین ہو اور اسی کی کاوش ہو۔

(کمالات اشرفیہ صـــ۶۲)

آخرت کا فکر شریعت نے جس طور پر انضباطِ اوقات کر دیا ہے اس میں نہ افراط کرو نہ تفریط۔ ضبطِ اوقات میں تجربہ کیا ہوگا کہ قلب میں فرحت زیادہ ہوتی ہے۔ جو لوگ برکاتِ شرعیہ کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کا تو کیا کہنا۔ وہ لوگ بھی جو صرف ضابطہ کی پابندی کرتے ہیں۔ اپنے ٹھیک وقت پر نماز سے فراغت کر لینے پر اپنے قلوب میں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ وقت کی قدر کرنا چاہیے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک برف بروش سے مجھ کو بہت عبرت ہوئی وہ کہتا جا رہا تھا کہ اے لوگو! مجھ پر رحم کرو۔ میرے پاس ایسا سرمایہ ہے کہ ہر لمحہ تھوڑا تھوڑا ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کی ہماری بھی حالت ہے کہ ہر لمحہ برف کی طرح تھوڑی تھوڑی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ اسے گھلنے سے پہلے جلدی بیچنے کی فکر کرو۔ کس کے ہاتھ؟ جس نے یہ فرمایا ہے ان اللہ اشتریٰ ..... الخ بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی" اور اس عمر کو ضائع مت کرو۔

عمرِ عزیز لائقِ سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

(الوقت۔ صـــ۳۲)

بقائے آخرت عقلی مسئلہ ہے

بقائے آخرت اعتقادی مسئلہ ہے اور اعتقادیات کا دل میں مضبوطی کے ساتھ جما رہنا ضروری ہے اور جو بات دل میں جمی ہوئی ہو اس سے اجنبیت نہ ہونا چاہیئے۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کوئی یہ کہے کہ تم مروگے اور خدا کے سامنے جاؤگے، قبر میں سوال جواب ہوگا، قیامت میں نامۂ اعمال سامنے ہوگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خواب دیکھ رہے ہوں۔ افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کا درجۂ حال میں دل میں جما ہوا ہونا چاہیے تھا وہ ایسی ہوگئی جیسے خواب ہو۔ (دنیا و آخرت ص۲۴)

حصولِ جنّت اختیاری ہے

نعمائے آخرت اور جنّت کی طرف جو طبیعت نہیں ابھرتی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اعمال میں اور مقصود میں جو علاقہ واقعی ہے وہ نہیں سمجھتے۔ یعنی ایسا علاقہ جیسا آگ کے جلانے اور کھانا پکنے میں۔ ایسا علاقہ جیسے پانی پینے میں اور پیاس کے بجھنے میں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص قریب قریب یہی سمجھتا ہے کہ جنّت میں داخل ہو جانا اختیاری نہیں۔ حتّٰی کہ اعمال صالحہ کو تو اختیاری سمجھتے ہیں مگر جنّت کو سمجھتے ہیں کہ اختیاری نہیں۔ ہرگز ہرگز ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اعمالِ صالحہ پر جنّت ضرور مل ہی جاوے گی۔ ایسا سمجھتے ہیں جنّت کو کہ اعمالِ صالحہ پر بس محض اتفاقاً ہی مرتب ہو جاتی ہے۔ جیسے کسی کو اتفاق سے سلطنت مل جائے۔ واقعی ٹٹول کر دیکھ لیجیے اپنے وجدان کو اکثر کا یہی عقیدہ ہے کہ جنّت کا حاصل کرنا کسی کے اختیار ہی میں نہیں۔

حضرت میں کہتا ہوں اگر جنّت اختیار میں نہیں تو حق تعالیٰ یہ ارشاد کیوں فرماتے ہیں سَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّۃٍ۔ دوڑو مغفرت اور جنّت کی طرف۔ تو کیا اللہ میاں اندھیری کوٹھڑی میں دوڑا کر سر پھڑواتے ہیں۔ پھر حکم بھی دوڑ کر چلنے کا فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ راستہ بالکل صاف ہے۔ جو شخص اعمال صالحہ کرے گا بشرطیکہ ایمان

بھی ہو۔ واللہ العظیم ثمّ واللہ العظیم ثمّ واللہ العظیم۔ وہ ضرور جنّت میں داخل ہوگا۔

تعجّب ہے۔ یہ شخص گویا تکذیب کرتا ہے نصوص کی۔ اور یہ خرابی کی ہے کہ جاہل واعظوں نے بس یہ حدیث بیان کردی کہ ایک شخص تھا جس نے ساری عمر عبادت میں گزاری اور جنّت کے کام کیے۔ لیکن اخیر میں دوزخی ہوگیا۔ حالانکہ اس جاہل واعظ نے حدیث کو سمجھا ہی نہیں۔ حدیث میں جو یہ آیا ہے اس کا سبب بھی کسی عمل اختیاری ہی کا صدور ہے۔ اسی واسطے تو میں کہتا ہوں کہ کتابیں مت دیکھو۔ اور اگر ایسا ہی شوق ہے تو میں اس کا طریقہ بتلاتا ہوں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ چند روز کسی محقق کے پاس رہ لو بس پھر دیکھنا مضر نہ ہوگا ورنہ سخت مضر ہوگا۔ مثلاً یہی حدیث دیکھی کہ ایک شخص عمر بھر جنّت کے عمل کرتا ہے لیکن آخر میں کوئی عمل اس سے ایسا سرزد ہوتا ہے کہ وہ دوزخ میں چلا جاتا ہے۔ بس اس حدیث کو دیکھ کر یہ مطلب سمجھ لیا کہ سارے عمل بیکار ہیں۔ اب وہ عقیدہ پختہ ہوگیا کہ جنّت اختیاری نہیں۔ ساری عمر تو کوشش کریں جنّت میں جانے کی اور لو ذرا سی بات میں دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔

اب یہاں دو غلطیاں ہیں۔ ایک تو یہ سمجھنا کہ ذرا سی بات میں دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔ دُوسری غلطی یہ کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے یہاں اتنا اندھیر ہے کہ اتنے سارے عمل ذرا سی بات میں حبط۔ ادنیٰ سی بات میں کیا کرایا ندارد۔ حالانکہ وعدہ یہ ہے کہ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ پھر کیا بات ہے وہ خیر کہاں گئی جو کی تھی۔ سو بات یہ ہے وہ خود فرماتے ہیں: فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُمُّہٗ ھَاوِیَةٌ۔ یعنی جس قسم کے اعمال زیادہ ہوں گے وہی غالب رہیں گے۔ اگر اعمالِ صالحہ زیادہ ہوں گے تو گناہ معاف ہوجائیں گے۔ گناہ معاف ہوکر جنّتی ہوجائیں گے۔ ہاں اگر گناہ

غالب ہوئے تو پھر دوزخ میں ان گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد بشرطِ ایمان جنت میں داخل ہوں گے۔ لیکن داخل ہوں گے ضرور۔ پھر اعمال صالحہ بے کار کہاں گئے؟ کیا کرایا........ سب کہاں مٹا؟ جنّت میں تو ان کی بدولت پہنچ گئے۔ بلکہ اگر گناہ بھی غالب ہوں گے تب بھی اکثر کے ساتھ تو معاملہ رحمت ہی کا ہوگا۔

اگر کوئی کہے کہ جب دوزخ میں بھیج دیے گئے تو خیر آیدہ کا اثر کہاں ظاہر ہُوا۔ بات یہ ہے کہ شر آیدہ کا اثر تو اس طرح ہُوا کہ پہلے دوزخ میں بھیج دیے گئے۔ پھر نکل کر جنّت گئے اب ظہور ہُوا خیر آیدہ کا یعنی گناہ کا اثر بھی ہُوا کہ پہلے دوزخ میں بھیجے گئے اور خیر کا بھی اثر ہُوا کہ اخیر میں نجات ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کوئی چیز بیکار نہیں بلکہ سبقت رحمتی علیٰ غضبی سے یہ تو ہُوا کہ گو گناہ غالب تھے اور اعمال صالحہ مغلوب۔ مگر پھر بھی رحمت کا غلبہ ہو گیا کہ آخیر ہی میں نجات ہوگئی۔ لیکن اس کا عکس کبھی نہیں ہوا کہ اول میں انعام راحت دے کر اخیر میں جہنمی کر دیا جاتا۔ تو ایک غلطی تو یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کو بے اثر سمجھ گئے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ صاحب ذرا سی بات ہوگئی تھی بس اسی میں جہنمی ہوگئے۔ مگر درحقیقت وہ بات ذرا سی نہیں ہوتی۔ وہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کسی نے گورنمنٹ کی خدمت پچاس برس تک کی۔ پھر اس نے بغاوت کی اور ایک بم کا گولہ وائسرائے پر پھینک مارا۔ وہ شخص گرفتار ہوگیا اور بعد تحقیقات کے اس کو پھانسی دے دی گئی۔ اب کوئی شخص کہے کہ دیکھیے صاحب یہ کیا اندھیر ہے۔ اس کی ساری عمر کی خدمتیں اور وفاداریاں ایک ذرا سی بات میں نظرانداز کر دی گئیں۔ بیچارے نے کیا ہی کیا تھا۔ ایک ذرا سا بم ہی تو چھوڑ دیا تھا۔ سبحان اللہ! آپ کے نزدیک گویا ذرا سی بات ہے بم چھوڑ دینا ایک ذمہ دار حاکم

پر۔ تو جیسے بم چھوڑنا بظاہر تو ذرا سا فعل ہے لیکن اتنا بڑا جرم ہے کہ ساری خدمات ملیا میٹ کر دینے کے لیے کافی ہے اور عمر بھر کی خدمات کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اسی طرح جو خدا سے بغاوت کرتا ہے اس کے تمام اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ اور ہو جانے چاہئیں۔ کیونکہ بغاوت جرم ہی ایسا ہے۔

غرض اس غلطی کے متعلق ایک تو یہ تحقیق ہے کہ جس کو چھوٹی بات سمجھا جاتا ہے۔ وہ دراصل بہت بڑی بات ہے ۔ دوسری تحقیق یہ ہے کہ وہ جو بڑی بات ہے آیا وہ اختیاری ہے یا بلا اختیار یعنی خود بخود ہو پڑی۔ وہ بات جس سے وہ جہنمی ہو گیا یا اس کو اپنے قصد سے، اپنے ارادہ سے، اپنے اہتمام سے کیا تھا۔ تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو بات بلا اختیار کے ہوتی ہے (واللہ ثم واللہ) اس سے مطلق ضرر نہیں ہوتا، چہ جائیکہ جہنمی ہونا خوب سمجھ لو کہ دوزخی اسی فعل سے ہوتا ہے جس کو اپنے قصد سے کرتا ہے اور اپنے اختیار سے کرتا ہے ورنہ ہرگز دوزخی نہیں ہوتا۔

پس پھر اب یہ کہاں سے لازم آیا کہ جس نے عمر بھر جنت کے عمل کیے تھے وہ بلا اختیار خالد فی النار ہو گیا۔ اور یہ کہاں لازم آیا کہ جس نے عمر بھر دوزخ کے عمل کیے تھے۔ دیکھو وہ بلا اختیار ہمیشہ کے لیے جنتی ہو گیا۔ خوب سمجھ لو کہ جنت میں جانا بھی اختیار سے ہوا اور جنت سے ہٹنا بھی اختیار ہی سے ہوا۔ وہ خود ہٹا جنت سے حضرت خدا تعالیٰ بہت ٹالتے ہیں۔ بہت طرح دیتے ہیں۔ مگر جو جان جان کر شرارت کرتا ہے۔ اسی کو دوزخ میں بھیجتے ہیں۔ فرماتے ہیں لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (ترجمہ: تاکہ جس کو برباد (گمراہ) ہونا ہے وہ نشان آئے پیچھے برباد ہو۔ اور جس کو زندہ (ہدایت یافتہ) ہونا ہے۔ وہ بھی نشان آئے پیچھے زندہ ہو)

پس معلوم ہوا کہ دوزخ میں بھی جانا اختیار میں ہے اور جنت میں بھی جانا

اختیار میں ہے۔ تو جب جنّت میں جانا اختیار میں ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ جنّت کا ذکر سُن کر طبیعت نہیں اُبھرتی اور کیوں وہاں پہنچنے کے اسباب جمع نہیں کیے جاتے۔

البتہ یہاں ایک طالب علمانہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ یہ تو ایمان کا جزو ہے کہ انسان رجا اور خوف کی حالت میں رہے۔ اتنی اُمید ہو جانا جنّت کی کہ دوزخ کا خوف ہی نہ رہے۔ یہ تو خود ایمان ہی کے خلاف ہے۔ سبحان اللہ! اچھا مسلمان بنایا۔ اچھی نصیحت کی کہ جنّت کو اپنے قبضہ کی بات سمجھو۔ تو گویا دعویٰ کرو جنّتی ہونے کا۔ حالانکہ عقائد کا مسئلہ ہے۔ الایمان بین الخوف والرجاء (ترجمہ: ایمان خوف اور رجا کے درمیان ہے" آہ! بس یہی تو مصیبت ہے۔

ع مولوی گشتی و آگہ نیستی

اسی وجہ سے تو میں کہا کرتا ہوں کہ بطور خود کتابیں نہ پڑھو کسی محقق سے جا کر پڑھنا ضروری ہے۔ یہ جو عقیدہ ہے الایمان بین الخوف والرجاء۔ تو کیا تم اس کے یہ معنی سمجھتے ہو کہ دوزخ جنّت اختیاری نہیں کیفما اتفق کوئی جنّت میں بھیج دیا جائے گا۔ کوئی دوزخ میں۔ اس طرح سے اُمید و بیم ہی کی حالت میں رہنا چاہیئے۔ صاحبو! اگر یہ عقیدہ ہے تو خدا کے لیے اپنا ایمان درست کرو۔ غضب ہے تم نے تو نصوص کی بھی تکذیب کر دی کہ جن چیزوں پر جن چیزوں کا وعدہ ہے۔ اسی میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ الایمان بین الخوف والرجاء کا حاصل یہ ہے کہ اسی کا خوف ہے کہ کہیں ایمان ہی نہ جاتا رہے۔ یہ نہیں کہ ایمان رہے اور پھر نجات نہ ہو۔ یہ مطلب ہے کہ اس سے ڈرتا رہے کہیں ایسا نہ ہو نعوذ باللہ کہ اختیار خود اپنے ایمان ہی کو نہ کھو بیٹھوں اور دوزخ میں نہ چلا جاؤں۔ یہ نہیں کہ میں کہیں بلا قصد کفر میں مبتلا نہ ہو جاؤں اور دوزخ میں نہ بھیج دیا جاؤں۔ حالانکہ خدا

کی عظمت پر نظر کرتے ہوئے تو یہ خوف بھی ہونا بعید نہ تھا مگر چونکہ وعدہ ہے کہ میں ایسا نہ کروں گا اس لیے اس سے بالکل بے فکر رہنا چاہیے ۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ عقیدہ رکھنا بھی واجب ہے کہ ان کا خود یہ وعدہ اور اس وعدہ کا ایفا سب اختیاری ہے نہ اس وعدہ میں وہ مجبور ہیں نہ وعدہ کرکے وہ مجبور ہیں یعنی انہیں یہ بھی اختیار ہے کہ اعمال بھی ہوں، ایمان بھی ہو پھر بھی دوزخ میں بھیج دیں اور یہ بھی اختیار ہے کہ کفر بھی ہو اور شرک بھی ہو پھر بھی جنّت میں بھیج دیں ۔ لیکن خوب سمجھ لو کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس پر ان کو قدرت تو ہے لیکن اس کے وقوع کا ہرگز ہرگز مطلق احتمال نہیں ۔ غرض حق تعالیٰ کے قادر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف کہیں کا کہیں بھیج دیں ۔ انہوں نے جو وعدہ کیا ہے [وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۔]

اسے ضرور پورا فرمائیں گے ۔ بہر حال اگر کوئی دوزخ میں جائے گا تو اپنے کسی عمل ہی سے جائے گا اور اگر جنّت میں جائے گا تو اپنے عمل ہی سے جائے گا ۔

(آثار الربیع ص۱۱ تا ۲۴)

دنیا سے دل لگا کر آخرت کو برباد مت کرو

اگر ایک شخص کسی کو دو مکان دکھلائے ایک خستہ و خراب، دوسرا نہایت عمدہ اور یہ کہہ دے کہ خراب تو اسی وقت تم کو مل سکتا ہے اور بعد ایک ماہ کے واپس لے لیا جائے گا اور دوسرا اس وقت نہیں مل سکتا ۔ بعد ایک ماہ کے ملے گا اور وہ واپس نہیں لیا جائے گا ۔ اور دونوں ساتھ مل نہیں سکتے ۔ تو بتلائیے اس صورت میں کیا کیا جائے گا ۔ ظاہر ہے کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی اس ویران کو اختیار نہ کرے گا ۔ اس فیصلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ عمدہ ہی گھر لینا چاہیے ۔ گو بعد مدت ملے ۔ صاحبو! اس شخص کو تو ترجیح ہی کر آپ بھی فیصلہ سنائیں گے کہ ویران گھر کو

ہرگز اختیار نہ کرے مگر جب یہی معاملہ آپ کے ساتھ ہُوا تو اپنے اس فیصلہ کو بھول گئے۔

صاحبو! حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے سامنے دو گھر پیش کر دیے ہیں۔ ایک دُنیا جو کہ اسی وقت مل سکتی ہے مگر بعد چندے چھین لی جانے لی اور خراب خستہ و فانی بھی ہے۔ دوسرا گھر آخرت ہے جو عمدہ ہے اور باقی رہنے والا ہے یہاں آپ نے آخرت کو کیوں اختیار نہیں کیا؟ گزشتہ مثال میں تو ایک ماہ کی بھی مہلت تھی اور یہاں تو کچھ بھی میعاد نہیں "شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود" زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ ایک منٹ کا بھی بھروسہ نہیں۔ طاعون کا حال معلوم ہے کس طرح دفعتہً مخلوق کا صفایا کر دیتا ہے کل کا مرنے والا آج کیا جانے کہ میں کب مروں گا۔ وہ تو آج بہت کچھ امیدیں اپنے دل میں کرتا ہوگا مگر اسے موت کی کچھ بھی خبر نہیں کہ سر پر آ چکی ہے۔ تو یہاں دنیا کی میعاد تو ایک مہینہ کیا ایک ہفتہ ایک دن بھی نہیں۔ ہر سیکنڈ میں خطرہ ہے کہ اسی وقت ختم ہو جائے۔ تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایسا جس کی اتنی کم میعاد اور فنا ہونے والا اور جس کی کوئی راحت بھی تکلیف سے خالی نہیں آپ نے اختیار کیا۔ اور آخرت کو جس کے ملنے کے لیے ایک سانس کی دیر ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہنے والا اور اس میں راحت ہی راحت ہے تکلیف کا نام بھی نہیں، آپ نے چھوڑ دی حالانکہ ایسی صورت اگر کوئی دوسرا شخص آپ سے پُوچھنے آئے تو آپ اس کو بھی رائے دیں گے کہ خراب خستہ اور فانی چیز ہرگز لینے کے قابل نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دنیا کو بالکل چھوڑ دیجیے۔ شکایت اور افسوس تو اس کا ہے کہ اس کو آخرت پر ترجیح دے رکھی ہے۔

(وعظ: المراد)

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

فرمایا کہ آخرت کے متعلق گناہوں پر دلیری کر کے کہا کرتے ہیں کہ اجی اللہ میاں غفور رحیم ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کیا اللہ میاں دنیا میں غفور رحیم نہیں ہیں؟ پھر دنیا میں کیوں خوف کی باتوں سے خوف

کیا کرتے ہو غفور رحیم سمجھ کر زہر کیوں نہیں کھا لیتے۔ بات یہ ہے کہ دُنیا کا ضرر تو مشاہد ہے۔ آخرت کے ضرر کی ابھی خبر نہیں۔ مرنے کے بعد حقیقت معلوم ہوگی۔

(حسن العزیز جلد ۱ ملفوظ ۳۴۵)

بڑی سخت غلطی

صاحبو! گناہ کی ظلمت تو ضرور پیدا ہوگی اور اس ظلمت کے ساتھ دخولِ جنت مشکل۔ پس یا تو خدا اِس بعد میں سچی توبہ کی توفیق دے اور یہ توبہ ایسی جرأت کرنے والے کو بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ ورنہ اس ظلمت کے دُور کرنے کے لیے عذاب جہنم موجود ہے۔ الا ان یرحم بفضلہ۔ جب اعتقادِ غفور رحیم سے دُنیا کا ضرر دفع نہیں ہوتا تو یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ اس اعتقاد سے آخرت کا ضرر مرتب نہ ہونا سمجھ لیا جائے۔

(الامداد صد ۵)

فصل (۳)

عالمِ آخرت

عالمِ آخرت کا اثبات مخلوقاتِ خداوندی بے کار و بے فائدہ نہیں۔ ان حوادث کی کوئی غرض و حکمت ضرور ہے۔ منجملہ ان حکمتوں کے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کوئی فعل حسبِ عادۃ اللہ اثر سے خالی نہیں رکھا گیا خواہ عتاب ہو یا ثواب۔ یہ نہیں کہ کوئی بندہ اس دار المحن میں کوئی فعل یا کوئی عمل کرے اور اس پر ثواب یا عتاب مرتب نہ ہو اور ہم بعض افعال و اعمال کو دیکھتے ہیں کہ ان پر دنیا میں کوئی ثواب و عتاب مرتب نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی نہ کوئی اور عالم ماسوا اس عالم کے ضرور ہے جس میں ان اعمال کے آثار مرتب ہوں گے۔ (الدنیا والآخرۃ)

عالمِ مثال و آخرت جس وقت انسان مرتا ہے پہلے اس عالمِ مثال ہی میں جاتا ہے وہاں ایک آسمان بھی ہے۔ مشابہ دنیا کے آسمان کے۔ اور ایک زمین بھی ہے مشابہ دنیا کی زمین کے۔ اور ایک جسم بھی ہے۔ مشابہ اس جسم کے۔ لیکن وہ بھی ہے جسم ہی۔ تو مرنے کے بعد تو روح کے لیے ایک جسمِ مثالی ہوگا۔ اور آخرت میں جو جسم ہوگا وہ یہی ہوگا جو دنیا میں ہے۔

غرض یہ ایمان ہے ہمارا کہ حشر روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی۔ یعنی یہی جسم جو ہم اب لیے بیٹھے ہیں اور جو گل سڑ کر خاک ہو جائے گا۔ اسی کو حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے پھر تازہ بنا کر محشور فرمائیں گے۔ لیکن وہاں اس جسم کی خاصیت بدل جائے گی۔ یعنی اب تو یہ خاصیت ہے کہ جو ہم کھاتے پیتے ہیں اس کا پیشاب پیخانہ بنتا ہے۔ بیماریاں

پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن مرکر فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہاں گویا ابدی اور خالد ہو جائے گا۔

غرض ایک تو جسم یہاں ہے اور ایک جسم ہے عالم مثال میں اور وہ مشابہ ہے اس جسم کے۔ یہ جسم بعینہٖ نہیں۔ تو عالم مثال میں بدن بھی مثالی ہے۔ وہاں کی جنت بھی مثالی ہے۔ وہاں کی دوزخ بھی مثالی ہے۔ پس اس عالم مثال ہی کا نام قبر ہے۔ اب سب اشکال رفع ہو گئے۔ یعنی قبر سے مراد یہ محسوس گڈھا نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کو بھیڑیا کھا گیا یا کوئی سمندر میں غرق ہو گیا تو اس صورت میں چونکہ وہ زمین میں دفن نہیں ہُوا۔ اس لیے اس کو چاہیے کہ قبر کا عذاب ہی نہ ہو لیکن اب اشکال ہی نہیں رہا کیونکہ وہ جو عالمِ مثال ہے وہیں اس کو عذابِ قبر بھی ہو جائے گا۔ اشکال تو جب ہوتا جب قبر سے مراد یہ گڈھا ہوتا جس میں لاش دفن کی جاتی ہے۔ حالانکہ اصطلاحِ شریعت میں قبر گڈھے کو کہتے ہی نہیں بلکہ عالمِ مثال کو کہتے ہیں۔ قبر اور وہاں پہنچنا کسی حال میں منتفی نہیں، خواہ مردہ دفن ہو یا نہ ہو۔

اور اس عالمِ مثال کے نہ جاننے ہی کی وجہ سے عوام یہ بھی کہتے ہیں کہ قبر ذرا بڑی رکھنی چاہیے تاکہ مُردہ کو بیٹھنے میں تکلیف نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اسی قبر کے اندر مُردہ کو بٹھایا جاتا ہوگا...... حضرت یہ جو وسیع قبر کی تجویز شریعت نے کی ہے یہ اس بنا پر تھوڑا ہی ہے کہ اس کے اندر مُردہ اس طرح بٹھایا جائے گا جیسے آپ اس وقت بیٹھے ہیں بلکہ یہ تو محض اکرام اور عزت ہے۔ مومن کی کہ اس کو مرکر بھی بیکار نہ سمجھا گیا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے مرتبہ کا لحاظ کیا اور ہر طرح اس کا اکرام کیا۔ یہ نہیں کہ وبال تھا ٹال دیا۔

وہ تو عالم عالمِ مثال ہے جہاں مرنے کے بعد انسان اول پہنچتا ہے اور وہ کچھ مشابہ اس عالم کے ہے اور کچھ مشابہ عالم آخرت کے ہے۔ وہیں فرشتے اس کو

بٹھلاتے ہیں۔ وہیں اس سے سوالات کرتے ہیں، وہیں کی زمین اس کو دباتی ہے۔ وہیں اس کو عذاب ثواب ہوتا ہے۔ وہ عالم یہی ہے جس کو حدیثوں میں قبر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور لو میں اب تمہیں اس کا پتہ بھی بتلائے دیتا ہوں جس سے تمہیں اس کی کچھ کچھ حقیقت سمجھ میں آجائیگی۔ وہ عالم کچھ کچھ خواب میں منکشف ہوتا ہے۔ لیکن ایک تو خواب ہوتا ہے سچا اور ایک ہوتا ہے محض خیال۔ تو جو خواب سچا ہوتا ہے، اس میں کچھ کچھ انکشاف اس عالم کا ہوتا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ خواب میں تو حقیقت اس عالم کی مغلوب ہوتی ہے کیونکہ اس میں آمیزش خیال کی بھی ہوتی ہے اور وہاں بالکل حقیقت ہی حقیقت ہوگی۔ ہاں وہ حقیقت اصلیہ بھی عالم آخرت کی حقیقت اصلیہ کے اعتبار سے تو بمنزلہ خواب ہی کے ہے۔ بلکہ خواب میں جو حقیقت عالم مثال منکشف ہوتی ہے۔ وہ بمقابلہ عالم مثال کی حقیقت اصلیہ کے اتنی ضعیف نہیں ہوتی ہے جتنی عالم مثال کی حقیقت اصلیہ بمقابلہ عالم آخرت کی حقیقتِ اصلیہ کے ضعیف ہے وہ اس سے بھی ضعیف تر ہے۔ (آثار المربع ص ۳۸)

مومن کے لیے دوزخ کی حیثیت

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ایسے رحیم وکریم ہیں کہ اگر کوئی مومن دوزخ میں بھی جائے گا تو وہ دوزخ بھی دوسری نوع کی ہوگی۔ کیونکہ دوزخ میں دو حیثیتیں ہیں۔ وہ دوزخ مسلمانوں کے لیے اور طرح کی ہوگی۔ کفار کے لیے اور طرح کی۔ یعنی کفار کے لیے تو وہ جیل خانہ ہے اور مسلمان کے لیے حمام ہے۔

اور بعضے ضعیف الایمان جو دوزخ میں جائیں گے بھی ان کا جانا تزکیہ وتطہیر کے لیے ہوگا۔ چنانچہ کفار کے وعید میں ارشاد ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "لا یزکیھم" اور وعید میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ مومن کے لیے دوزخ موجب تزکیہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ کفار دوزخ میں تعذیب کے لیے بھیجے جائیں گے اور مسلمان

تہذیب کے لیے۔ یعنی دوزخ میں مومن پاک صاف کرنے کے لیے بھیجا جائے گا جو اس کے لیے مثل حمام کے ہوگا۔ جب یہ ہے تو تم کیوں میلے کچیلے ہو کر جاتے ہو، پاک صاف ہو کر جاؤ۔ پھر حمام کی صورت بھی دیکھنے میں نہ آئے گی۔

دوزخ مومن کے لیے مطہّر ہے۔ گو بعض اوقات تطہیر تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔ دیکھیے بعض میل تو ایسا ہوتا ہے کہ ٹھنڈے پانی سے دُور ہو جاتا ہے اور بعض گرم پانی سے اور بعض بغیر صابن لگائے دور نہیں ہوتا اور بعض بدون بھٹی پر چڑھائے دور نہیں ہو سکتا۔ ٹھنڈے پانی سے مراد توبہ ہے گرم پانی سے مراد بیماری و حوادث ہیں۔ صابن سے مراد موت ہے بھٹی سے مراد دوزخ ہے۔ پس مومن کا دوزخ میں جانا میل کچیل داغ دھبہ سے پاک صاف ہونا ہے۔ یہاں کی آگ میں تطہیر کی خاصیت رکھی گئی ہے۔ دیکھو جیسے گوہ ناپاک ہے مگر جل کر راکھ ہو کر پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تم بھی خدا کی محبت و عشق میں جل کر فنا ہو جاؤ، سوختہ افروختہ ہو جاؤ۔ بس پاک صاف ہو کر پہنچو گے۔

(الافاضات ۵ ص ۳۲۹ ملفوظ ۵۵۲)

ارشاد فرمایا کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے، لاشے ہے جیسے ستارے آفتاب کے سامنے کچھ نہیں اور کانسٹیبل وائسرائے کے سامنے کچھ نہیں۔ دنیا کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ وہ آخرت کے ساتھ ذکر ہوتی ہے۔ (مظاہر الآمال)

دنیا و آخرت میں اتنی بھی نسبت نہیں جتنی ایک قطرہ اور سمندر میں نسبت ہے۔ فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا؟ (الحیٰوۃ)

اس عالم کو دوسرے عالم پر قیاس کرنا ہی سخت غلطی ہے۔ یہاں پر ہی دیکھ لیجیے کہ ایک اقلیم کو دوسری اقلیم سے زیادہ تفاوت نہیں ہوتا مگر دونوں کے خواص میں بڑا فرق ہوتا ہے اور وہ تو عالم ہی دوسرا ہے۔ وہاں کی زندگی اور ہے وہاں کی نعمتیں اور ہیں۔ وہاں کی چیزوں سے یہاں کی چیزوں سے کیا نسبت۔

غیب را ابرے و باوے دیگراست
آسمانے آفتابے دیگراست

(ملفوظات ع۴ ص۲۰۸)

فکرِ آخرت

آخرت تو ابدالآباد ہے اور مومن کے لیے ہر قسم کی راحت کا وعدہ ہے۔ اور جب مومن کی راحت آخرت کی توقع ہے۔ پھر دنیا سے دل لگانے کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا میں جب کسی چیز کی توقع ہوتی ہے تو اس کی تحصیل کے لیے آرام کو چھوڑ دیتے ہیں، مشقتیں اٹھاتے ہیں، سفر کرتے ہیں۔ اور جس چیز کا یقین دلایا گیا ہے تو یقین کے بعد اس کے لیے آرام کو کیوں نہ چھوڑنا چاہیے خصوصاً جبکہ دونوں میں ایک خاص تفاوت بھی ہے۔ (ذخیر الاثاث)

جیسے زمانِ آخرت میں یہ خاصیت ہے کہ اس وقت تحمل رویت پیدا ہو جائے گا۔ ایسے ہی مکانِ آخرت میں بھی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اس میں تحمل رویت پیدا ہو جاتا ہے۔ گو وہ حیاتِ دنیویہ ہی سے ملبس ہو۔ آخرت کے مکان و زمان دونوں کی خاصیت دنیا سے الگ ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص۳۴۳)

لذاتِ آخرت کا لذاتِ دنیا سے مقابلہ

جب ہم لوگ آخرت کی نعمتوں کو دیکھیں گے تو اس وقت یہاں کی لذات کو لذات کہنے سے شرمائیں گے بلکہ شاید ان لذات کو سامنے رکھنے سے قے آنے لگے۔

(انفاس عیسیٰ ص۳۷۲)

مومن کے برزخ کی حالت

احادیث اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی تنہائی ختم ہو جاتی ہے اور اور مسلمان کی روح عالم ارواح میں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوتی اور اپنے عزیزوں کی ملاقات سے مسرور ہوتی ہے۔ غرض وہاں خوشی ہی خوشی

رہے گی۔ اور ایسی خوشی ہوگی کہ دنیا میں اس کا خواب بھی نہیں دیکھا گیا۔

(انفاس عیسیٰ ص۳۷۳)

کشتنے کہ عشق دارد ایک حدیث شریف کی تشریح میں فرمایا کہ ہم بھی بڑے خوش قسمت ہیں کہ حضور نے ہم کو خطاب فرمایا۔ اگرچہ ہم نے ان کو دیکھا نہیں مگر آپ نے تو ہم کو دیکھا۔ ہم رائی نہیں تو رئی سہی۔ ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

خواہ اِدھر سے علاقہ ہو خواہ اُدھر سے ہو، علاقہ ہونا چاہیے۔ اور ایک موقعہ پر ہم کو رائی ہونے کی بھی توقع ہے کہ قبر میں حضورؐ کی زیارت ہوگی۔ حضرت مولینا محمد یعقوب صاحبؒ نے ایک نکتہ بیان فرمایا کہ اگر ایسا واقع ہو تو حکمت اس کی یہ ہے کہ مقتضائے محبت تو یہ تھا کہ حضورؐ ہمارے جنازہ کی نماز پڑھاتے۔ ہم کو دفن کرتے لیکن مصلحتِ خداوندی سے آپ کی عمر اتنی طویل نہ ہوئی، وفات فرما گئے۔ لیکن خیر اگر وہ نہ ہوا تو یہ تو ہوا کہ قبر ہی میں قرب میسّر ہو گیا اور اس پر یہ شعر پڑھا: ؎

کشتنے کہ عشق دارد نگذاردت بدینساں
بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

واقعی یہ شعر اس سے زیادہ اور کہیں چسپاں نہیں ہو سکتا۔ (اجر الصیام ص۳۳)

انتقال کے وقت دُنیا بمقابلہ آخرت کے بالکل تنگ ہے جب یہاں سے جاؤ گے تو شکر ادا کرو گے اور دنیا میں ہرگز نہ آنا چاہو گے جب خدا کے پاس پہنچنے کا وقت قریب آتا ہے اور اس عالم کی چیزوں کا انکشاف ہوتا ہے اس وقت اگر مومن کو کوئی حیات افزا چیز دے کر کہا جائے کہ لو اسے کھالو تاکہ مدت دراز تک زندہ رہو تو وہ لات مار دے گا اور چاہے گا کہ فوراً مر

جاؤں۔ (کمالات اشرفیہ، صہ ۱۵۴)

مرنے والا جی اُٹھتا ہے

جس کو تم سمجھتے ہو مر گیا وہ واقع میں جی گیا۔ بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ جب مومن مرے گا تو معلوم ہو گا کہ یہی واقع میں جیل خانہ میں مقید تھا عالم تو یہ ہے۔ وہ مرتا نہیں بلکہ جی جاتا ہے۔ اگر تم اس عالم کو دیکھ لو تو تم اس کے جانے پر کبھی نہ روؤ بلکہ اپنے یہاں رہنے پر رویا کرو۔ البتہ وہاں جانے کی قابلیت پیدا کر لو۔ (الباقی)

موت سے گھبراتے ہو تو حیات کو سوچو

اگر موت کے سوچنے سے کسی کا دل گھبرائے تو حیات کو سوچو کہ اس حیات سے اچھی ایک دوسری حیات ہے جو خیر بھی ہے۔ البقی بھی، الذہبی، اشہٰی بھی۔

(کمالات صہ ۶۲)

سراپا حیات

اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آخرت سراپا حیات ہے۔ وہاں کی در و دیوار میں بھی زندگی ہوگی دیواریں گائیں گی، نعمات پیدا ہوں گے۔ درخت گائیں گے جنّت کا بولنا خود حدیث میں آیا ہے اور وہ بظاہر حقیقت پر محمول ہے یہی صوفیہ کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک دوزخ بھی ذی حیات ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ھل من مزید پکارے گی۔

(کمالات اشرفیہ صہ ۱۴۷)

اِنَّہٗ بِکُلِّ شَيْئٍ مُحِیْط کی لذّت

فرمایا کہ جنّت میں سب کچھ ہوگا اور سیری بھی ہوگی۔ سیری نہ ہونا غلط ہے۔ وہاں تو وہ کیفیت ہوگی جس کو یاد کر کے اب یہ کہنا زیبا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

یوں نہیں کہا کہ "دستِ جانانِ خود گیرم" کیونکہ "جانانِ من گیرد" میں اور بھی لطف ہے آپ کو بشارت ہے کہ جنّت میں آپ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوگا۔ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ۔ کی لذّت عشّاق کو اب بھی ہے اور وہاں اور بھی اتم ہو گی۔ مزہ ہے جیسے ہے وہ آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔ (اشرف رمضان صفحہ ۱۰)

جنّت میں طبعی اور عشقی خوشی

عشّاق کو جنّت کی اصل تمنا اور آرزو زیادہ تر اسی لیے ہوتی ہے کہ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ زیارت ہوگی۔ تو جنّت بھی آپ ہی کی ذات بابرکات سے مقصود ہوگئی اور جنّت تو جنت آپؐ کی تو یہ شان ہے کہ دُنیا میں بھی جس حصّۂ زمین میں آپؐ ہوں وہ مقصود ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ حق تعالیٰ کی قسم تک میں وہ مقصود ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ کہ میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اس حال میں کہ آپؐ اس میں مقیم ہیں۔ یعنی آپ کی اقامت کی وجہ سے یہ شہر اس درجہ مکرّم ہوگیا کہ خدا تعالیٰ اس کی قسم کھاتے ہیں۔ پس اس بنا پر جب جنّت میں جائیں گے تو ایک خوشی تو ہوگی راحت ملنے کی اور غم کے زائل ہونے کی کہ اللہ کا شکر ہے۔ دُنیا کے مصائب سے نجات ہوگئی۔ یہ خوشی تو طبعی ہوگی اور دوسری خوشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہوگی اور یہ خوشی عشقی ہوگی۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ شمس تبریز کو یاد کر کے تبریز کے حق میں کہتے ہیں:

اُبرُکی یا ناقتی طاب الامور۔ ان تبریزاً مناجات الصدور

اِسرَحی یا ناقتی حول الریاض۔ ان تبریز النا نعم المفاض

ساربانان بار بکشا ز اشتراں ۔۔۔ شہر تبریز است و کوئے دلبراں

یہ اشعار زبانِ حال سے جنّت میں جانے کے وقت پڑھنے کے قابل ہوں گے۔

(راس الربعین صفحہ ۲۹)

فصل (۴۰)

عیادت و موت

مرضُ الموت میں عیادت کا طریقہ

چند امور ایسے بیان کرتا ہوں جن کا مرنے کے وقت خیال رکھنا چاہیے۔ ہماری حالت پر افسوس ہے کہ لوگوں کو مرنا بھی نہیں آتا۔ صحابہؓ سب لکھے پڑھے نہ تھے، لیکن سمجھدار تھے۔ یہ کیا مبارک شریعت ہے جس میں مرنے کے بھی قاعدے تبلائے گئے ہیں۔

جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے واسطے جانا مسنون ہے۔ کوئی ایسی بات نہ کہے جس سے مریض کو کسی قسم کی یاس ہو بلکہ اُمید افزا بات کہے۔

اکثر عورتیں مریض کے پاس بیٹھ کر ایسے نا امیدی کے کلمات کہتی ہیں جس سے مریض کی دل شکنی ہوتی ہے۔ مثلاً خدا ہی کرے گا جو یہ بخار جائے گا وغیرہ۔ شارع علیہ السلام نے تو جانوروں پر بھی رحم فرمایا اور حکم دیا کہ ایک جانور کے سامنے دوسرا نہ ذبح کیا جائے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔

بھلا اتنا تو خیال کرنا چاہیے کہ اس کا دل نہ دُکھے جب ایسی نااُمیدی کے کلمے اس کے سامنے کہے جائیں گے تو مریض کو ضرور اپنی جان کا اندیشہ ہو جائے گا، بلکہ ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جس سے اس کو معلوم ہو کہ اب مرض بہت ہی خفیف ہے اور میں جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ مسلمان کی دلداری بڑی عبادت ہے، ہر امر میں اس کا لحاظ چاہیے۔

جب کسی مریض سے مایوسی ہو جائے اور خود بھی اس کو توقع زیست نہ رہے تو آخری وقت میں ان باتوں کا خیال رہے :

(۱) اس کے سامنے دنیا کی بات نہ کہی جائے ۔

(۲) کوئی بات ایسی نہ کہی جائے جس سے توجہ الی الحق میں فرق آئے جیسا کہ رواج ہے کہ ایک طرف بی بی کھڑی کہہ رہی ہے کہ مجھے کس پر چھوڑ چلے ۔ کبھی بچّوں کو اس کے سامنے لایا جاتا ہے ۔ تھوڑا سا وقت جو کلمہ کلام میں صرف کرتا وہ پیار و محبّت میں صرف ہو جاتا ہے ۔

(۳) اس بات کا اہتمام چاہیئے کہ خاتمہ تو کلمۂ خیر پر ہو جائے ۔

(۴) خود کسی بچّے وغیرہ کو سامنے مت لاؤ ۔ اگر وہ دیکھنا چاہے تو فوراً دکھا دو تاکہ اس کے خیال سے بھی جلد نجات ہو ۔

(۵) اس کے سامنے اللہ کا نام لو ، کلمہ پڑھو ، توبہ استغفار پکار پکار کر کرو ، لیکن اس سے کہنے کے لیے مت کہو ۔

(۶) اس مضمون کو اُردو میں بھی کہو کہ اے اللہ میرے گناہ معاف فرما تاکہ وہ بھی سُن کر کہنے لگے ۔

(۷) قرآن مجید ، خاص کر یٰسین شریف قریب پڑھی جائے ۔ آج کل اس سورۃ سے جاہلوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے ۔ بعضے بُرا مان جاتے ہیں اور نعوذ باللہ نامبارک سمجھتے ہیں ۔ یہ سورہ اس وقت کے واسطے اس لیے مقرر فرمائی گئی ہے کہ اس میں بعث و نشر کا ذکر ہے قیامت کے حالات ہیں اور آخر میں یہ مبارک الفاظ بھی

سُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۔

نہایت مناسب ہیں تاکہ اس کے عقیدے درست ہو جائیں ۔

(۸) جنّت کا ذکر کرے اور دوزخ کا ذکر ایسے مریض کے سامنے نہ کیا جائے ! ایمان

کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں: خوف و امید۔ خوف اس غرض سے کہ گناہوں کو چھوڑ دے اور اعمال صالحہ کی طرف متوجہ رہے۔ مرتے وقت اعمال کا موقعہ نہیں۔ ڈرانے سے پھر کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بجز اس کے کہ نا امید ہو کر بے ایمان مرے۔ سبحان اللہ! یہ شریعت کیسی معقول ہے۔ اگر غور کیا جائے سب حکمتیں سمجھ میں آجائیں۔

(۹) قریب مرنے کے منہ قبلہ کی طرف کر دیں۔

(۱۰) اگر مردہ کے منہ سے کوئی کلمہ کفر کا نکلا ہو یا کلمہ سے انکار کیا ہو تب بھی غیبت نہ کریں۔ کیونکہ وہ معاف ہے۔ جب بیماری میں معذور تھا تو اب تو بدرجۂ اولیٰ معذور ہونا چاہیے اور قلب کی ہم کو خبر نہیں ۔ حضرت مرشدی حاجی صاحب بیان فرماتے تھے کہ لوہاری ہیں ایک بزرگ تھے جب وہ مرنے لگے تو لوگوں نے کہا کہ حضرت کلمہ پڑھیئے۔ آپ نے منہ پھیر لیا۔ پھر کہا گیا۔ پھر آپ نے منہ پھیر لیا۔ لوگوں کو نہایت حیرت ہوئی۔ دل میں کہنے لگے اب کیا امید ہے کہ جب ایسا شیخ کامل کافر ہو کر مرے۔ میاں جی نور محمد صاحبؒ تشریف لائے پوچھا خان صاحبؒ کیسے ہو؟ کہنے لگے الحمدللہ۔ اور کہا حضرت لوگوں کو فرما دیجیے کہ مجھ کو دق نہ کریں، یہ مجھ کو مسمّٰی سے اسم کی طرف لاتے ہیں ؎

دست بوسی چوں رسد از دستِ شاہ
پائے بوسی اندر آں دم شد گناہ

جب مشاہدۂ حق ہو گیا پھر اسم کی کیا ضرورت۔ ایسے مقام پر تو یہ تنزل ہے۔

(۱۱) اگر موت میں سختی ہو تو اس سے بھی بدگمانی نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب کسی بندہ کا درجہ بڑھانا منظور ہوتا ہے اور اس کے گناہ بہت ہوتے ہیں تو سکرات کی تکلیف میں مبتلا کیا جاتا ہے جس سے اس کے

گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ ساری خرابیاں جہالت کی ہیں۔ اگر علماء کی صحبت اختیار کریں تو ضروری باتیں معلوم ہو جائیں۔

(اشرف المواعظ جلد اول ص ۲۶، ۲۷، ۲۸)

موت کے بعد نیک عمل کی اہمیت

جب انسان مرجاتا ہے تو ذرہ ذرہ نیکی کو ترستا ہے اور سوچتا ہے کہ کاش اس وقت کوئی ایسی سبیل ہو کہ کوئی شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ کہہ کر بخش دے کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی احتیاج ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ؎

اے کہ برما میروی دامن کشاں
از سر اخلاص الحمدے بخواں

کہ اگر اور کچھ نہیں تو ایک دفعہ الحمد ہی پڑھتے جاؤ۔ آج جس الحمد کو ہم ہزار بار خود پڑھ سکتے ہیں۔ بعد مرگ اس کو ایک مرتبہ دوسرے کی زبان سے پڑھنے کے لیے ترسیں گے۔ (تجارت آخرت)

میت کے معاملہ کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بموتی)

یہ معاملے تین قسم کے ہیں۔ ایک قبل الموت (یعنی حالت مرض میں) دوسرے وقت الموت (یعنی موت کے بہت قریب) تیسرے بعد الموت (یعنی موت کے بعد جب تک اس کے متعلق کوئی تذکرہ یا کوئی کارروائی جاری رہے) اور ان تینوں قسموں میں مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں جو اختصاراً کے ساتھ ذکر کی جاتی ہیں۔

"حالتِ مرض"

حالت مرض میں بھی حتی الامکان نماز کی پابندی ضروری ہے

اس میں ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بوجہ غایت ترحم

مریض کو نماز کے وقت کی اطلاع نہیں کرتے اور نماز پڑھنے کے لئے اس سے نہیں کہتے کہ اس کو تکلیف ہوگی۔ بعضے مریض تو خود بھی جاہل یا کاہل ہوتے ہیں گو پہلے سے نماز کے پابند ہوں مگر مرض میں (یا وسوسہ سے کہ کپڑے خراب ہیں، بدن ناپاک ہے یا صاف نہیں ہے۔ یا یہ کہ وضو و غسل نہیں کیا جاتا۔ اور تیمم کو دل نہیں گوارا کرتا اور اس سے طبیعت صاف نہیں ہوتی (و مثل ذالک) نماز قضا کر دیتے ہیں۔ یہ تو جہل ہے۔ یا کم ہمتی سے کہ کون اہتمام کرے تیمم کا رُخ سیدھا کہنے کا کہ اس میں تکلیف ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ تحمل سے زائد نہیں۔ مگر کسی قدر آرام تو فوت ہوتا ہے اور دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اچھے ہو کر سب پوری کر لیں گے۔ اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں اور یہ کاہلی ہے۔

اور علاج اس کا یہ ہے کہ اس کو سمجھایا جاوے کہ شریعت نے ہر حال میں آسانی کی رعایت کی ہے۔ بدن یا پارچہ کا صاف ہونا تو کچھ فرض نہیں۔ اگر میلے ہیں ہونے دو۔ اسی طرح نماز پڑھو اور اگر ناپاک ہے تو اُن کے پاک کرنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ تو پاک کرنا کیا دشوار ہے۔ آخر تھوڑی بہت مشقت سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں۔ چنانچہ مرض میں دوا پینا کیا مشقت نہیں؟ بعض اوقات کروٹ بدلنا مشقت ہے مگر مصلحت بدنی کے لئے اس کو گوارا کرتے ہیں۔ مگر نماز کے لئے بھی کہ مصلحت روحانی ہے جس کی رعایت بدن سے بھی اہم اور اقدم ہے کسی قدر مشقت گوارا کر لی جاوے تو کیوں گرانی ہے۔ اور اگر پاک ہونے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ تو بدون پاک کیے ہوئے نماز پڑھ لو کہ شرع کی اجازت ہے۔ صرح الفقہاء بہ اور وضو اور غسل اگر نہیں ہو سکتا تو تیمم کی اجازت ہے اور اگر وضو ہو سکتا ہو اور غسل نہ ہو سکتا ہو تو وضو کر لو اور بجائے غسل کے تیمم کر لو اور طبیعت کا صاف ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں اور اگر نماز نہ پڑھی تو اس سے طبیعت کون سی صاف ہو گئی ؟ اگر آدمی کو حس

ہو تو معلوم ہو کہ اس سے اور بھی گندی اور میلی ہو جاتی ہے۔ یہ جہل کا علاج ہے۔
اور نا پاک کپڑے اور بدن کے پاک کرنے کے متعلق جو ابھی مضمون لکھا گیا ہے
وہ علاج ہے کاہلی کا بھی کہ کم و بیش مشقت تو ہر کام میں ہوتی ہے۔ مثلاً ناگوار دوا پیتے
ہی ہیں بلکہ ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات غذا کھانے میں بھی بعض مشقتیں لاحق
ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مرچ لگ گئی، منہ جل گیا۔ لقمہ گلے میں اٹک گیا یا شوربے وغیرہ کا
بلکہ بعض اوقات پانی کا پھندا پڑ گیا۔ کیسی بری حالت ہو جاتی ہے بعض اوقات
پان کھانے میں چونا زیادہ ہوا یا تیز ہوا، اور منہ اور زبان کے ٹکڑے اڑ گئے مگر ان
عارضی مشقتوں کے سبب کوئی بھی کھانا پانی نہیں چھوڑتا اگر اسی مریض کو کہا جاوے کہ
تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر اگر فلاں شخص سے جا کر ملو جو کہ یہاں سے ایک فرلانگ
پر ہے تو تم کو دس روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ مل جاویں تو اس وقت یہ ساری
مشقتیں راحت معلوم ہونے لگیں۔ تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں کا اجر اتنی قدر بھی نہیں
رکھتا خصوصاً جبکہ دنیوی کاموں سے بہت زیادہ ان دینی کاموں میں سہولت رکھی
گئی ہے۔ چنانچہ جب کھڑے نہ ہو سکیں بیٹھ کر پڑھیں۔ اگر بیٹھ کر نہ پڑھ سکیں تو
لیٹے لیٹے پڑھیں اور رکوع سجدہ سر کے اشارے سے کریں۔ اور ایسا شاذ و نادر ہے
کہ اس قدر ضعف ہو جاوے کہ سر سے بھی اشارہ نہ کر سکیں لیکن اگر اتفاق سے
ایسی نوبت آ جاوے تو پھر شریعت کی سہولت دیکھئے کہ نماز کا مؤخر کر دینا اور بعد
میں قضا کر لینا اس حالت میں جائز فرما دیا پس ان سہولتوں کے بعد کسی کے پاس
کیا عذر ہے اور یہ خیال کہ اچھے ہو کر قضا پڑھ لیں گے نہایت ہی جرأت کا خیال ہے۔
کیا ان کے پاس کوئی سند پروانہ اس معاہدہ کا ہے کہ یہ اس مرض سے ضرور اچھے کر
دیئے جاویں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ان کا اخیر ہی مرض ہو۔ مرض میں بوجہ اس کے کہ
مرض پیام موت ہے۔ آدمی کو زیادہ تنبیہ اور تہیۂ آخرت کی طرف زیادہ توجہ چاہیے

ع شاید ہمیں نفس نفسِ واپسیں بود

یہ تو ان مریضوں کا ذکر تھا جن کو خود بھی جہل یا کسل سے نمازوں کا اہتمام نہیں ہوتا۔ بعض مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو پُورا اہتمام ہے لیکن مرض کے غلبہ سے ان کو پُورے طور سے اوقات وغیرہ کی اطلاع نہیں ہوتی یا نماز کے وقت کچھ نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے یا غایت ضعف سے آنکھیں بند ہو کر غفلت سی ہو جاتی ہے لیکن اگر ان کو نماز کے لیے آگاہ کیا جاوے تو ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ مگر اوپر کے لوگ اس وجہ سے کہ ان کو اس مریض کی راحت جسمانیہ کے ساتھ تو اعتناء ہے لیکن دین کی کچھ مبالات نہیں۔ اس مریض کو اطلاع ہی نہیں کرتے۔ یا اگر اس کو کسی طرح اطلاع بھی ہو گئی تو اس کی امداد نہیں کرتے مثلاً اس کے لیے پانی یا تیمّم کے لیے کلوخ نہیں لاتے اس کی چارپائی قبلہ کی طرف نہیں بدلتے۔ اس کو پاک کپڑے نہیں بدلوا دیتے اس تساہل میں یا تو مریض پھر غافل ہو گیا۔ یا اس پر بھی کسل غالب آ گیا اور ایسے اس کی نماز برباد ہُوئی۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اپنے جس عزیز کی تھوڑی سی معمولی تکلیف گوارا نہیں اس کے دوزخ میں جلنے کی تکلیف کیسے گوارا کر لیتے ہیں اور اگر غایتِ بے رحمی سے اس کی یہ تکلیف گوارا کر لیں تو اپنی کیسے گوارا کر لیں۔ اس لئے کہ یہ تعاون فی الدین واجب ہے۔ اور یہ امر بالمعروف بالید کی ایک فرد ہے جو کہ محلِ قدرت اور توقعِ قبول میں فرض ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ جب اس کو اوقاتِ نماز کا ہوش نہیں ہے تو بے ہوشی میں نماز معاف ہُوئی تو اس کا دفعیہ یہ ہے کہ اس بے ہوشی میں نماز معاف نہیں ہوتی وہ وہ بے ہوشی ہے کہ جس میں آگاہ کرنے سے آگاہ نہ ہو پھر اس میں بھی مطلقاً معافی نہیں بلکہ یہ تفصیل ہے کہ اگر چھ نمازیں متصل بے ہوشی میں گذر جائے تب تو بالکل معاف ہے یعنی نہ ادا نہ قضا اور اگر اس سے کم بے ہوشی ہوئی ہے۔ مثلاً چار نمازیں یا پانچ نمازیں اس حال میں گذر گئیں تو اس وقت

تو ادا کا مکلف نہیں۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد ان کی قضاء واجب ہو گی۔ اور اگر قضاءً واجب ہو گی۔ اور اگر قضاء میں سستی کی تو فدیہ کی وصیت مرتے وقت واجب ہو گی اور اگر وصیت میں بھی غفلت ہوئی تو وارث کو ثواب ہو گا۔ اگر یہ فدیہ ادا کر دیا لیکن اس صورت میں اپنے حصے میں سے ادا کرے مشترکہ ترکہ سے ادا نہ کرے۔

وضو اور قیام کی قدرت ہوتے ہوئے تیمم سے اور بیٹھ کر نماز نہیں ہوتی

بعضے مریض یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ باوجودیکہ وضو سے کوئی ضرر نہیں پھر تیمم کر لیتے ہیں بعض دفعہ اوپر کے لوگ وضو سے روکتے ہیں کہ میاں تیمم کر لو شرع میں آسانی ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ باوجود قدرت علی القیام بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بعض دفعہ نماز ہی میں باوجود قدرت ضبط کے غایت کم ہمتی سے کراہتے ہیں۔ آہ آہ خوب صاف لفظوں سے کہتے ہیں اور اس کی پرواہی نہیں کرتے کہ ہماری نماز رہے گی یا جائے گی۔ سو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مطلق مرض سے تیمم یا قعود کی اجازت نہیں اس میں ابوابِ فقہ کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح قدرتِ ضبط ہوتے ہوئے آہ یا ہائے وغیرہ کرنے سے نماز جاتی رہتی ہے۔ نماز بڑی احتیاط کی چیز ہے اس کو بے کار نہ سمجھیئے۔

بعضے ان ظاہری بے احتیاطیوں کے مقابل ایک دقیق بے احتیاطی کرتے ہیں۔ جو ظاہراً ان کے زعم میں بڑا تقویٰ ہے وہ یہ کہ خواہ ان پر کچھ ہی مصیبت گذر جاوے خواہ کیسا ہی مرض بڑھ جاوے اور خواہ مرہی جاویں مگر تیمم جانتے ہی نہیں مریں گے۔ کہیں گے، مگر وضو ہی کریں گے۔ سو حقیقت میں اس غلو کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے جو واقع میں ناقص ہے اس لیے ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔ اصل میں شیطان کی مطرودیت[1] کا مبنیٰ اس کا یہی خیال ہے کہ یہ حکم حق تعالیٰ کا نامناسب ہونے

---

[1] اللہ کے دربار سے دور کیا جانا ۱۲

کے سبب قابل عمل نہیں یہ معصیت تو اس کے عقیدے کے ہوئے۔ اور اگر اس کو کوئی ضرر شدید پہنچا.... تو اہلاکِ نفس سے معصیتِ عملی ہو گی خوب فرمایا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا
ولیکن میفزائے بر مصطفٰےؐ

ولیس من البر الصیام فی السفر......

اور دوسری حدیثیں بھی اس کی صاف ادلہ ہیں۔ یہ کوتاہیاں تو نماز کے متعلق تھیں

حالت مرض میں بھی مریض کا ستر بغیر ضرورت کے دیکھنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ مریض کا ستر چھپانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اگر زانو کھل گیا تو کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ اگر ران کھل گئی تو کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر بضرورتِ تداوی کسی موقع کے کھولنے اور دیکھنے کی حاجت ہوئی تو اس کی احتیاط نہیں کہ بقاعدۂ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ اتنا ہی بدن کھلے جس کے کھلنے کی ضرورت ہے۔ یا صرف انہیں لوگوں کے سامنے کھلے جن کا تعلق اس تداوی سے ہے۔ وہ بھی دیکھتے ہیں اور دوسرے حاضرین اور عیادت کرنے والے بھی بے تکلّف دیکھیں گے۔ بلکہ اس کی ہمدردی سمجھیں گے۔

غرض نہ دوسروں کو دیکھنا جائز اور نہ مقدار ضرورت سے زیادہ دیکھنا جائز یہاں تک کہ اگر عورت کے جننے کے وقت کا فر دائی جاوے تو موقع تولد کا دیکھنا تو اس کو اگر حاجت ہو درست ہے لیکن بوجہ اس کے کہ کافر عورت نامحرم مرد کے حکم میں ہے۔ اس کے روبرو عورت کو سر کھولنا حرام ہوگا۔ کیونکہ اس کا کھولنا بلا ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر عورت کے ہاتھ میں فصد لی جاوے تو فصّاد کو تو موقع فصد کا دیکھنا جائز ہے۔ مگر دوسرے حاضرین کو وہاں سے ٹل جانا یا آنکھ بند کر لینا یا منہ پھیر لینا واجب ہے۔ اوروں کو اجازت نہیں کہ اس کے ہاتھ کا وہ حصّہ کھلا ہوا دیکھیں۔ اسی

طرح ختنہ میں اگر بچہ سیانا ہو جس کا کھلا ہوا بدن دیکھنا جائز نہیں تو ختان کو تو بقدر ضرورت دیکھنا درست ہے۔ دوسروں کو درست نہیں۔ اسی طرح اگر کسی عضو مستور میں دُنبل وغیرہ میں شگاف دیا جائے تو جراح یا ڈاکٹر کے سوا یا ایسے شخص کے سوا جس کے دیکھنے میں کوئی مصلحت معالجہ کی ہو دوسروں کو اس موقع کے دیکھنے کی اجازت نہیں یہ جزئیات استطراداً ذکر کر دیئے گئے اصل مقصود بیان کرنا مریض کے ستر کا ہے کہ اس میں بے پروائی برتی جاتی ہے۔

ناپاک اور حرام دوا سے پرہیز کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی دوا کے متعلق یہ کی جاتی ہے کہ دوا کے حلال و حرام طاہر و نجس ہونے کی کچھ پروا نہیں کی جاتی خصوص امراء کے یہاں کہ برانڈی تک سے پرہیز نہیں خواہ تناول یا استعمال کے ساتھ ہی دم نکل جاوے مگر کچھ انقباض ہی نہیں ہوتا مسلمانوں کے حال پر تعجب ہے کہ جس چیز کو طبیعت قابل نفرت بتلادے مثلاً پیشاب پینا اس سے تو نفرت ہو اور جس چیز کو شریعت قابل نفرت بتلادے۔ مثلاً شراب پینا اس سے نفرت نہ ہو تو گویا اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ یہ شخص اپنے کو نفس کا بندہ سمجھتا ہے خدا کا بندہ نہیں سمجھتا۔ تو کیا مسلمان ہونے کے یہی معنی ہیں؟ ع

ببیں کہ از کہ گسستی و با کہ پیوستی

ایک وسوسہ کا ازالہ

اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ دوا کے لئے تو شرع میں بھی اجازت ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا دعویٰ علی الاطلاق محض غلط ہے۔ اصل مذہب میں تو کسی حالت میں بھی دوا کے لئے ایسی چیز کی اجازت نہیں۔ ہاں مضطر بالمخمصہ یا مغصوص باللقمہ کے لئے ایسی چیز سے ابقاء حیوٰۃ مشروع ہے اور تداوی کا اس پر قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ مقیس علیہ میں نفع عادۃً متیقن ہے اور مقیس میں غیر متیقن۔ چنانچہ اطباء خود فن ہی کو ظنی کہتے ہیں اس لئے نفس معالجہ

ہی واجب نہیں بخلاف اساغۂ مغصوص کے کہ واجب ہے۔ اس دوا میں ایسی چیز
کی اصلاً اجازت نہیں خواہ مرض کیسا ہی مہلک ہو اور نفع کیسا ہی مجرب سمجھا جاوے۔
البتہ بعض متاخرین نے ضرورتِ شدیدہ اور تجربۂ نفع کی قید کے ساتھ اجازت
دے دی۔ مگر جو بے احتیاطی کرتے ہیں وہ ان قیدوں کا کب لحاظ کرتے ہیں بلکہ وہ تو
محض احتمالِ نفع ہی پر سرعت براء یعنی تعجیل صحت ہی کے لئے بلکہ بعض اوقات
بدون مرض کے محض تقویتِ طبیعت ہی کے لئے یا مرض کے غیر خطرناک ہونے پر بھی
بے تکلف ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں پس وہ اس فتویٰ سے کیسے تمسک کر سکتے ہیں؟
یہ تو جواز و عدم جواز میں گفتگو تھی۔ باقی جو لوگ قلبِ سلیم طبع طاہر رکھتے ہیں۔ وہ تو اختلافی
اجازت سے بھی منتفع ہونا پسند نہیں کرتے جس طرح بعض لطیف المزاج لوگ بعض اشیاء
مکروہ طبعی کو حلق سے اتار نہیں سکتے اور اگر دھوکہ سے اتر جاوے تو معدہ اس کو قبول نہیں
کرتا۔ اسی طرح جن کا مزاج لطافتِ دینی رکھتا ہے ان کی اُن اشیاء مکروہ شرعی کے تناول
یا امساک فی المعدہ کے ساتھ یہی کیفیت ہے اور ادویہ محرمہ کچھ برانڈی ہی وغیرہ کے
ساتھ خاص نہیں۔ بہت سی ادویہ طب یونانی میں بھی ایسی ہی حرام و نجس ہیں جیسے جند
بیدستر، دما یہ شتر اعرابی اور لبوب کبیر میں قضیب گاؤ۔

میں نے اپنے ایک طبیب دوست سے استدعا کی ہے کہ ایسے ادویہ کی ایک
فہرست شائع کر دے۔ اور خاص کر ایسی چیزوں کا استعمال ایسی جگہ کرانا تو ظلم عظیم
ہی ہے جہاں مریض خود محتاط اور ایسی اشیاء سے نفور ہو۔ مگر اس کی بے خبری میں یا
اس کو دھوکہ دے کر کھلا پلا دیا جاوے۔ کبھی تو اس کو اگر خبر ہو گئی تو بیحد کلفت ہوتی
ہے اور اس کلفت سے اس کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس طرح سے اس کو جسمانی
ضرر بھی لاحق ہوتا ہے اور اگر خبر بھی نہ ہوئی تو اس خیر خواہ نے پرائی دُنیا کی درستی کے
لیے اپنا دین برباد کیا جس کا برباد کرنا خود اپنی دنیا کی درستی کے لئے بھی مذموم و مبغوض

عنداللہ ہے۔ اور یہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہوا کہ حظِ آخرت تو فوت ہوا ہی کوئی حظِ دنیا بھی نصیب نہ ہوا۔ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بنا

دعا غلاموں کی طرح کرنی چاہیئے نہ کہ شکایت کرنے والوں کی طرح

ایک کوتاہی دوسرے قسم کے معاملہ یعنی دعا ختم یا صدقہ و نذر میں ہوتی ہے کہ ان میں حدود شرعیہ کو ملحوظ و محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ مثلاً دُعا بصیغہ شکایت ہوتی ہے۔ اللہ میاں سے کہا جاتا ہے۔ اے اللہ کیا ہوگا۔ بس میں تو بالکل ہی تباہ ہو جاؤں گا۔ یا تباہ ہو جاؤں گی۔ یہ بچے کس پر ڈالوں گی۔ بس جی میرا تو کہیں ٹھکانہ ہی نہ رہے گا۔ اے اللہ ایسا تو نہ کیجیو۔ گویا شکایت الگ کی جاتی ہے۔ اور رائے الگ دی جاتی ہے۔

استغفر اللہ، کیا حق تعالیٰ کا یہی ادب ہے۔ یہی عظمت ہے۔ دُعا کرو غلاموں کی طرح اجازت ہے بلکہ محبوب ہے آگے رضا بالقضا واجب ہے۔ ع

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

ختم پڑھا جاتا ہے بعض جگہ تو غیر مشروع الفاظ سے مثلاً یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ اور بعض جگہ اس سے غامض خرابی مضمر ہوتی ہے کہ الفاظ تو مشروع مگر اس کا ثواب بزرگوں کو اس عقیدہ سے بخشا جاتا ہے کہ وہ خوش ہو کر کچھ سہارا لگا دیں گے۔ یا بجائے امداد کے دُعا ہی کا اعتقاد ہوا مگر اس طرح سے کہ وہ دُعا ان کی رد ہو ہی نہیں سکتی۔ جس کے متعلق احقر نے بقدر ضرورت القاسم کی جلد (۳) نمبر ایک کے پرچہ میں صفحہ ۱۴ پر کچھ مفصل بھی لکھ دیا ہے۔

صدقہ کے متعلق کوتاہیاں

صدقہ میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے نام کا کھانا پکوا کر تقسیم کرتے

بالعلانیہ ہیں اور مثل ختم مذکور عنقریب کے اس میں بھی اعتقادِ امداد اور رضا فی ان بزرگ کے متعلق رکھتے ہیں جس کی نسبت

ابھی لکھا گیا ہے بعض لوگ کچھ غلّہ یا بکرا وغیرہ شب بھر مریض کے پاس رکھ کر اور بعض لوگ اس کا ہاتھ لگوا کر خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس تلبّس سے یا اس لمس سے مریض کی تمام بلائیں گویا اس صدقہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کے دینے کے ساتھ وہ بھی چلی جاتی ہیں۔ سو یہ اعتقاد محض خلاف شرع ہے۔

صدقہ دینا جو ایک فعل ہے اس کا اثر حدیث میں آیا ہے کہ بلا دفع ہو جاتی ہے۔ اس فعل کے قبل خود جرم صدقہ میں لپٹ کر مریض سے دُور ہو جانے کا اعتقاد یہ مزاحمت ہے منصوص کی کہ منصوص تو اس کا اندفاع ہے اس فعل سے اور معتقد عوام کا اس کا ایک گونہ اندفاع ہے قبل اس فعل کے، اور مزاحمت نص کی دلیل ضعیف سے بھی جائز نہیں نہ کہ بلا دلیل بعض لوگ مریض کی طرف سے بکرا ذبح کرتے ہیں اور خصوصیت ذبح کو دافع بلا میں موثر سمجھتے ہیں جس کی حقیقت افتراء ہے جس کا ادراک مشاہدہ یا رائے سے تو نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت ہے نقل کی، اور نقل مفقود ہے۔ اس لیے یہ اعتقاد تقوّل علی اللّٰہ ہونے کے سبب ناجائز ہے۔ اور اگر کوئی عقیقہ پر قیاس کرے تو وہ خود غیر مدرک بالقیاس ہے۔ اور حکم غیر قیاسی مقتصر رہتا ہے مورد نص پر اس میں قیاس جائز نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ میں صدقہ کو مقصود سمجھتا ہوں تو اس کی تکذیب کے لیے یہ امتحان کافی ہے کہ اگر اس سے کہا جاوے کہ تم اس بکرے کو خریدنے کے عوض اسی قیمت میں گوشت خرید کر وہ یقیناً اس بکرے کے گوشت سے زیادہ آوے گا، مساکین کو تصدق کر دو تو ہرگز اس عمل کا التزام کرنے والے اس پر راضی نہ ہوں گے اور یہ سمجھیں گے کہ اس میں وہ اثر نہ ہو گا۔ سو اگر محض تصدق ہی مقصود ہے تب تو بدیں وجہ ہے کہ یہاں تصدق زیادہ گوشت کا ہُوا۔ اس میں زیادہ اثر سمجھنا چاہیے تھا۔ مگر جب اس پر بھی ایسا نہیں سمجھتا تو پھر اس میں بجز فعل ذبح کے کیا چیز کم

ہے جس کی کمی سے اثر کم ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ عوام الناس اس طریق میں ذبح کو ہی مقصود سمجھتے ہیں پس دعویٰ قصد تصدق کا غلط ٹھہرا بعض لوگ ذبح کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ گوشت خریدتے ہیں لیکن بجائے آدمیوں کے چیلوں کو کھلاتے ہیں سو اس میں دو بدعت ہیں۔ گوشت کے خصوص کا موثر سمجھنا۔ پھر چیلوں کے کھانے کی خصوصیت میں اثر جاننا ایسی تخصیصات پر ابھی گفتگو آتی ہے بعض لوگوں نے صدقہ کے لئے خاص خاص چیزیں تجویز کر رکھی ہیں جیسے ماش اور تیل اور پیسے جن میں امر مشترک سیاہ رنگ کی چیز معلوم ہوتی ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ بلا کو ایک کالی چیز سمجھ کر اس کے جلب للسلب کے لئے بھی کالی چیزوں کو تجویز کیا۔ سو اول تو بلا کوئی جسم نہیں جو سواد کے ساتھ موصوف ہو اور اگر کوئی توجیہ اس کی صورت مثالیہ کے اعتبار سے اس کی کر بھی لی جاوے تب بھی خود یہ ایک خلاف شرع دعویٰ ہے کہ اس کا دافع بھی تصدّق بالاسود ہی ہوگا۔ نص میں مطلق تصدق کو دافع بتلایا ہے۔ خواہ بالاسود ہو یا بالابیض ہو۔ پھر تصدق کا محل سب سے اچھا مسلمان مساکین ہیں۔ بعضے بھنگیوں کو اور بعضے چیلوں کو اس کا مصرف متعین قرار دیتے ہیں۔ خود اس مصرف کے مساوی ہونے یا راجح ہونے کا دعویٰ مزاحمت ہے نص کی نہ کہ متعین ہونا۔ اس میں تو نص کا بالکل ابطال ہی ہے۔

وصیّت کے متعلق کوتاہی ایک کوتاہی وصیت کے متعلق ہے وہ یہ کہ بعض اوقات مریض اپنے بعد کے لیے خلاف شرع وصیت کرتا ہے اور کوئی اس کو تنبیہہ بھی نہیں کرتا تاکہ اس کی اصلاح دی جاوے اور بعض اوقات دوسرے لوگ مریض کو ایسی وصیتوں کی رائے اور ترغیب دیتے ہیں۔ مثلاً ثلث سے زیادہ کی وصیّت یا کسی وارث جائز کے محروم کرنے کی وصیّت یا کسی معصیت کی وصیت کہ میرے مرنے کے متعلق فلاں کام بدعت کا یا تفاخر کا کیجیو۔ مثلاً تیجہ، دسواں وغیرہ کیجیو یا

قبر میں عہد نامہ وغیرہ رکھیو یا ایسا ایسا کھانا کیجیو یا میرا عرس کیا کیجیو (ومثل ذالک) اسی طرح ان کاموں کے لئے کچھ وقف کر جانا اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر مریض اس میں غلطی کرے تو دوسروں کو اصلاح کر دینا چاہیئے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کرے تو وہ وصیت لازم نہیں ہوتی بلکہ بعض پر تو عمل جائز نہیں ہوتا جیسے وصیّت بالمعاصی۔ ان احکام میں فقہاء وعلماء سے وقت پر تحقیق کر کے عمل کرنا چاہیے۔ یہ چند کوتاہیاں ہیں حالت مرض میں جو اس وقت خیال میں آئیں۔ تتبّع یا تأمّل سے اور بھی کوتاہیاں نکلیں گی جن کے بلئے مذکورہ کوتاہیوں کے ضمن میں جو اصول شرعیہ بیان کئے گئے ہیں یا تو وہی یا بعض کوتاہیوں کے لئے علماء سے رجوع کرنا کافی ہوگا۔ اب دوسری حالت کے متعلق کچھ ضروری امور عرض کرتا ہوں۔

"حالت وقت الموت"

حالت نزع میں رونے پیٹنے کی بجائے اس کو کلمہ کی تلقین اور اس کے خاتمہ بالخیر کی دعا کرنی چاہیئے

اس وقت کی کوتاہیوں میں عورتیں زیادہ مبتلا ہیں۔ مثلاً اس وقت بجائے اس کے کہ کچھ کلمہ پڑھیں حق تعالیٰ سے میّت کی سہولت نزع وختم بالخیر کی دعا کریں۔ رونا پیٹنا پھیلاتی ہیں کلمات جزع وفزع کے کہتی ہیں کہ اگر مریض کو کچھ ہوش ہوا تو وہ پریشان ہوتا ہے اور اس پریشانی سے دو خرابیاں ہیں کبھی تو ناامیدی و ہراس سے دل شکستہ ہوتا ہے۔ اگر اس وقت تک ناامیدی نہ ہوئی ہو اور مریض کی دل شکنی اور اقناط خود مذموم ہے۔ حدیث میں نص ہے کہ مریض کو امید دلایا کرو۔ اس سے وقت تو نہیں ٹلتا لیکن اس کا دل خوش ہو جاتا ہے تو یہ حرکت اس حکم کے کس قدر خلاف ہے اور کبھی اس سے وہ خلق کی طرف مشغول ہوتا ہے حالانکہ وہ وقت خالص توجہ الی اللہ کا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر وہ خود بھی اِس عالم کی طرف بلاضرورت شرعیہ (مثل وصیت وغیرہ) متوجہ ہوتا تو اس

کی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف منعطف و منصرف کیا جاتا۔ نہ کہ خود ہی اس ظلمت کدہ کی طرف اس کو متوجہ کرنے کا سبب بن جاویں۔ اور اگر ان کلمات میں کچھ الفاظ اس میت کے غلو فی المدح کی ہوئی کہ تو ایسا تھا اور ایسا تھا تو ایک ضرر میت کا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ایہ ہے کہ فرشتہ اس کو دھکیلتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہی تھا۔

غرض اس نامعقول حرکت سے پریشانی در پریشانی ہوتی ہے اور مثلاً بعضی عورتیں اس وقت اس کی بی بی کو سامنے لاکر کھڑا کرتی ہیں۔ یا کبھی بی بی صاحبہ خود ہی تشریف لاکر کھڑی ہوتی ہیں۔ اور پوچھا جاتا ہے کہ اس کو یا مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں اور اس غریب کو جواب پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات اس کے بچوں کو سامنے لاتی ہیں کہ ان کا کون ہوگا، یا یہ کہ ان کو پیار تو کر لو، اُن کے سر پر ہاتھ تو رکھ دے جس سے وہ غریب تو پریشان ہوتا ہی ہے اور توجہ علی المخلوق کا ضرر الگ پہنچتا ہے لیکن بچے کس قدر دل شکستہ اور نااُمید ہو جاتے ہیں۔ یہ حماقت شعار اتنا نہیں سمجھتیں کہ اس وقت کا تو مقتضا یہ تھا کہ اگر خود بھی بچوں کو یاد کرتا تو اس کو کہا جاتا کہ تم حق تعالیٰ کی طرف خیال رکھو۔ البتہ اگر بہت ہی یاد کرے تو سرسری طور پر سامنے کر دیں تاکہ اس کا دل ان میں اٹکا نہ رہے۔ لیکن اگر خود یاد نہ کرے تو ہرگز اس کو یاد نہ دلادے اور یہ بھی مقتضا تھا کہ بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور اگر وہ گھبراتے تو اپنے آنسو پونچھ کر ان کو دلاسا دیا جاتا کہ تم کیوں گھبراتے ہو اس سے زیادہ ہم تمہارے شفیق اور خدمت کرنے والے موجود ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تطییبِ قلبِ مسلم اور تسلیہ محزون عبادۃِ عُظمیٰ ہے۔ اسی طرح بیوی کی تسلّی کرتے کہ بھائی لاعلاج کا علاج ہمارے قبضہ سے باہر ہے۔ اور اس کا علاج تمہاری پریشانی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ باقی تمہاری راحت رسانی اور دلجوئی کے لئے ہم حاضر ہیں۔ تم اس قدر پریشان نہ ہو۔

غرض اس میں ایک تو یہ پریشانی ہے۔ دوسرے وُہی مخلوق کی طرف اس کو

متوجہ کرنا جس کا اُوپر ذکر ہُوا ہے۔ اسی طرح بعض مرد بھی جو زنانہ مزاج کے ہیں وہ بھی یہی ناشائستہ حرکت کرتے ہیں۔ اسی واسطے سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ قرب موت کے وقت میت کے پاس عاقل دیندار لوگ ہوں۔ اگر گھر کی عورتیں ایسی ہوں تو ان کے رہنے کا مضائقہ نہیں ورنہ مردوں میں جو ایسے لوگ ہوں ان کو پاس رہنا چاہیئے۔ اور وہ ان سب امور کی احتیاط اور انتظام رکھیں۔

بعضے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بدفالی کے خیال سے یا قلت مبالات بالدّین کی وجہ سے نہ اس وقت یٰسین پڑھیں اور نہ پڑھنا گوارا کریں۔ یا اس طرف التفات نہ کریں۔ اور نہ کلمہ کا اہتمام کریں۔ نہ اس کو متوجہ کریں جب کہ اس کو ہوش ہو اور نہ خود اس میں مشغول ہوں، جبکہ اس کو ہوش نہ ہو بلکہ دنیا کے فضول قصّوں میں خصوص ان بکھیڑوں میں جن کی ضرورت بعد میں ہوگی ابھی سے مشغول ہو جاتے ہیں بعض جگہ تو کوئی اس کے پاس بھی نہیں رہتا اور وہ تنہا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ سب اِدھر اُدھر مال و متاع پر قبضہ کرنے کی فکر میں بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور بعض جگہ اس لئے اس کے پاس نہیں پھٹکتے کہ اس کی بیماری لگ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اول تو بعض محققین کے نزدیک نفسِ تعدیہ ہی غلط ہے۔ دوسرے بعض قول پر کہیں ہُوا بھی تو بِلا اذنِ خالق نہیں ہوتا اور نہ اذن دائم ہوتا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اکثر جگہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر کتنی سنگدلی کی بات ہے کہ اپنے کو تو ضررِ محتمَل سے بھی بچایا۔ اور اپنے ایک بھائی مسلمان (یعنی اس مریض کو) ضررِ متیقن میں مبتلا کیا۔ کیونکہ اس طرح تنہا رہ جانے سے اس کی بعض ضروریات میں فروگذاشت ہونے سے اس کو تکلیف بھی ہوگی اور اس کی دل شکنی بھی ہوگی۔ اور ان کے اعتزال سے یہ معلوم کرکے کہ میں مرض متعدی مہلک میں گرفتار ہوں، مایوس بھی ہو جاوے گا۔ تو کتنی خلفیں اس پر جمع ہوئیں اور ان محتاط صاحب کی ایک وہمی احتیاط ہوئی تو ایسی احتیاط خاک

ڈالنے کے قابل ہے۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ جو طبقہ ادعاء ہمدردی کے نعرے لگاتا ہے وہی اس لغو احتیاط میں زیادہ حصہ لیتا ہے۔

یہ تو ان کی شکایت تھی جو کہ مریض کے لیے خواہ پاس رہ کر یا اس کو تنہا چھوڑ کر اس کے متوجہ الی اللہ کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔

بعض لوگ ان کے مقابلہ میں دوسری طرف غلو کرتے ہیں یعنی بزعم خود اس کو متوجہ الی اللہ کرنے میں اس قدر متشددانہ برتاؤ کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں کہ وہ ذرا غافل ہوا اور اس پر تقاضا شروع ہوا کہ کلمہ پڑھنا استغفار پڑھنا اور اگر اس کو ہوش نہ ہو تو برابر اس کے سر رہتے ہیں۔ جب تک کہ وہ ان کا حکم نہ مانے۔ اور اگر ہوش آگیا اور اس نے پڑھ بھی لیا تو اس پر کفایت نہیں کرتے، پھر پڑھواتے ہیں چاہتے کہ آموختہ کی طرح پڑھتا ہی رہے۔ دم نہ لے۔ اللہ بچاوے۔ اس جاہلانہ زہدِ خشک سے۔

اس بات میں علماء کا ارشاد یہ ہے کہ اگر وہ ہوش میں ہو تو اس کو بسہولت کلمہ و استغفار کی طرف متوجہ کریں۔ اور جب وہ ایک بار پڑھ لے تو بس کرے۔ پھر چھوڑ دیں پھر جب تک وہ کوئی دنیا کا کلام نہ کرے۔ دوبارہ پڑھنے کو نہ کہیں وہ مرض میں اور نزع میں پریشان ہوتا ہے۔ اگر اس کے قلب میں تنگی پیدا ہو کر کلمہ و استغفار سے (نعوذ باللہ) کراہت و ناگواری ہوئی یا خدانخواستہ منہ سے انکار نکل گیا تو کس درجہ امر منکر ہے گو اس وقت کا ایسا فعل بھی قواعد شرع سے قابلِ اعتراض نہیں کیوں کہ وہ وقت پورے شعور اور پورے اختیار کا نہیں ہے لیکن تاہم عام دیکھنے سننے والوں کی نظر میں اس میت کی کتنی رسوائی ہے جس کا سبب یہ زاہدِ خشک بنا ہے۔ اور اگر وہ بالکل بیہوش ہے تو اس کو کچھ پڑھنے وڑھنے کے لئے نہ کہیں۔ اس کے قریب پکار پکار کر سورۂ یٰسین شریف اور کلمہ کلام وغیرہ پڑھتے رہیں تاکہ اگر قدرے ادراک ہو یا ہو جاوے تو قلب سے تو ادھر متوجہ رہے اور اسی توجہ میں خاتمہ ہو۔

بعضے آدمی اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ اخیر وقت تک اس سے باتیں کرانا چاہتے ہیں۔ اور بڑھ کر اس لئے کہا کہ ان زاہدانِ خشک نے تو اس سے کلمہ پڑھوانا چاہا تھا جو کہ دین کا کام ہے۔ انہوں نے دنیا کی باتیں کرانا چاہا۔ یعنی جہاں وہ ذرا بے ہوش ہُوا اس کو پکارتے ہیں کہ میاں فلانے ذرا آنکھ تو کھولو۔ مجھ کو تو دیکھو میں کون ہوں، تم کیسے ہو کچھ کھوگے کسی بات کو دل چاہتا ہے؟ اور اسی طرح خرافات لغویات میں اس کو دق کرتے ہیں۔ ان عقل کے پُتلوں سے کوئی پوچھے کہ یہ ان باتوں کا وقت ہے۔ اگر اس کا مرض مرضِ موت نہیں ہے اور اچھا ہو جاوے گا تو اچھا ہونے کے بعد جتنی چاہے باتیں کر لیجیو۔ اس وقت اس کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ مرض میں ایسا تعب ہوتا ہے کہ بات کرنا تو بڑی بات ہے بات سننا بلکہ کسی طرف دیکھنا، خیال کرنا گراں گذرتا ہے اور یہ بزرگ اس سے مجلس آرائی کی توقع رکھتے ہیں اور اگر اس کا مرض مرضِ موت ہے تو ایسی باتیں کرنا اور بھی بُرا ہے کیونکہ قطع نظر تکلیف سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اب اس کو دنیا میں بہت تھوڑا وقت ملے گا سو اس کو تو اچھے مصرف میں صرف کرنا چاہئے۔

البتہ اگر کوئی ایسی بات ہو جو شرعاً ضروری ہے مثلاً کسی امانت کو پوچھا جاوے کہ تم نے کہاں رکھ دی ہے یا قرضہ اور لین دین کے بارہ میں پوچھا جاوے جس کا حال بدون اس کے دوسرے ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتا یا کافی نہیں ہو سکتا یا اور اسی قسم کا کوئی حق واجب ہو اس کے متعلق پوچھ پاچھ کرنے کا مضائقہ نہیں بلکہ ضروری ہے بشرطیکہ اس کو زیادہ تنگی اور تکلیف نہ ہو جو تحمل سے زائد ہو سو ایسی بات درحقیقت دنیا کی بات نہیں ادائے واجب ہے جو طاعت کی فردِ اعظم ہے اور چونکہ صورتاً دنیا ہی کی بات ہے اس لئے بہتر ہے کہ ایسی بات کا جواب لینے کے بعد پھر تہلیل و استغفار وغیرہ پڑھوا دیں۔ بشرائط مذکور سابقاً بعض لوگ

قریب مرگ کو رو بقبلہ کرنے کا مسئلہ سن کر یہ کرتے ہیں کہ اس کا تمام بدن اور منھ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر وہ نزعِ روح میں بدن یا گردن کو حرکت دے جو حرکتِ اضطراریہ ہوتی ہے تو پھر مروڑ تروڑ کر رخ بدل دیتے ہیں۔

سو خوب سمجھ لینا چاہئے اس مسئلے کا یہ مطلب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب اس پر شاق نہ ہو یا وہ بالکل بے حس وحرکت ہو جاوے اس وقت رُو بقبلہ کردیں نہ یہ کہ اس سے کشاکشی کر کے اس کو تکلیف پہنچا دیں (در مختار)

نامحرم مرد کو مرنے کے بعد بھی دیکھنا جائز نہیں

ایک بے احتیاطی یہ ہوتی ہے کہ اس وقت اکثر نامحرم عورتیں بھی اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ گویا پردہ ضروری نہیں رہتا۔ سو اگر اس کو اتنا ہوش ہے کہ وہ دیکھتا سمجھتا ہے تب تو اس کے سامنے آنا ایسا ہے جیسا تندرست کے سامنے آنا۔ مرض سے احکام معاف نہیں ہو گئے اور اگر اس کو اتنا ہوش نہیں ہے تو بہت سے بہت اس نے نہ دیکھا۔ مگر ان عورتوں نے اس نامحرم مرد کو بلا ضرورت دیکھا جس کی ممانعت حدیث افعمیاوان انتما الستما تبصرانہ (کیا تم دونوں بھی اندھی ہو کیا تم دونوں اسے نہیں دیکھ رہی)؟ مصرح ہے اور اگر کہا جاوے کہ اس وقت تو کسی مفسدہ کا احتمال نہیں ہے سو جواب یہ ہے کہ اول تو حکم عام ہے مفسدہ کی قید نہیں ہے۔ دوسرے ہم نے مفسدہ بھی دیکھا۔ بعض عورتیں اس وقت دیکھ کر عاشق ہو گئی ہیں اور عمر بھر خیالات نجس میں مبتلا رہی ہیں گو ان کے ایقاع کی گنجائش نہیں رہی۔ تو العینان تزنیان (آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں) اور القلب یزنی تو صادق آ گیا۔

اگر عورت مرتے وقت شوہر کو مہر معاف کر دے تو اس کا اعتبار نہیں ہوتا

ایک کوتاہی جو نہایت عام ہے کہ جب کوئی عورت

مرنے لگتی ہے کہتے ہیں کہ شوہر کو معاف کردے اور وہ معاف کردیتی ہے اور شوہر اس معافی کو کافی سمجھ کر اپنے کو دین مہر سے سبکدوش سمجھتا ہے اور اگر کوئی وارث مانگے بھی تو نہیں دیتا اور نہ اس کا دینا ضروری سمجھتا ہے۔

سو خوب سمجھ لیا جاوے کہ اس وقت کی معافی وصیت ہے اور وصیت وارث کے حق میں نافذ نہیں ہوتی جب تک کہ سب ورثہ بلوغ بشرط بلوغ اس کو منظور کریں اور اگر بعض جائز رکھیں بعض نہ رکھیں تو صرف جائز رکھنے والوں کے حصہ کے قدر نافذ ہوگی۔ باقی باطل ہوگی۔ اور نابالغ تو اگر جائز بھی رکھیں تو صحیح نہیں پس اس صورت میں جو وارث نابالغ ہیں ان کے حصہ کا مہر اور اسی طرح جو بالغ وارث جائز نہ رکھیں ان کے حصے کا مہر بھی واجب الادا ہوگا۔ اور وہ معافی ان کے حق میں محض باطل ہے۔ مثلاً اس عورت کے وارث علاوہ شوہر کے تین بھائی ہیں۔ ایک نابالغ اور دو بالغ جن میں سے ایک نے اس معافی کو منظور کیا اور دوسرے نے نامنظور کیا اور مہر چھ سو روپے تھا تو اس صورت میں یہ حکم ہوگا کہ تین سو تو حصۂ شوہری میں معاف ہوگئے اور سو روپے بالغ منظور کرنے والے کے حصے میں آکر معاف ہوگئے۔ آگے دو سو روپے رہے سو تو نامنظور کرنے والے کا حق اس شوہر کے ذمہ ہے اور سو اس نابالغ کا حق اس کے ذمہ ہے یہ دو سو روپے ادا کرنا ہوں گے۔ یہ مختصر تذکرہ ہوا حالتِ موت کے وقت کی بعض کوتاہیوں کا اب حالت بعد الموت کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

حالت بعد الموت

اس میں اس قدر امور غیر مشروعہ شائع ہیں جن کا احصا مشکل ہے ان میں سے اکثر کو میں نے اصلاح الرسوم فصل چہارم میں مفصل و مدلل لکھا ہے یہاں صرف ان

کی فہرست لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں :

(۱) دفن میں اعزّا وغیرہ کے انتظار میں دیر کرنا

(۲) قبر پر اناج لے جانا۔

(۳) جانماز اور اُوپر کی چادر ترکہ میں خریدنا۔

(۴) میّت کے کپڑے بلا تقسیم ورثا کے مساکین کو دے دینا۔

(۵) تیجہ دسواں وغیرہ کرنا۔

(۶) برادری کو یا مساکین کو تفاخراً کھانا دینا۔

(۷) کئی بار عورتوں کا جمع ہونا جس میں ایک اجتماع انقضاءِ عدّت کے دن ہوتا ہے۔

(۸) بلا ضرورت دُور دُور سے مدّتوں تک مہمانوں کا آنا اور میّت والوں پر بار ڈالنا۔

(۹) خاص قواعد کے ساتھ میّت کے گھر اوّل روز کسی عزیز کے یہاں سے کھانا آنا۔

(۱۰) حُفّاظ وغیرہ کو کچھ دے کر قرآن پڑھوانا۔

(۱۱) مدّت تک سوگ کرنا یہ تو عام اموات کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے اور بعض معاملہ خاص بزرگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جس کو رسالہ مذکور کے باب مذکور کی فصل دوم و سوم میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے :

(۱۲) عرس و فاتحہ مروّجہ کے منکرات اور

(۱۳) شب برات کا حلوہ اور عاشورہ کا کھچڑا اور شربت کہ ان کی بحث بھی بہت مبسوط لکھ دی ہے۔ اگر شوق ہو اس میں ملاحظہ فرما لیا جاوے۔ اب بعض وہ معاملات اس تیسری حالت کے متعلق مختصراً لکھتا ہوں جو اس میں نہیں

لکھے گئے۔

میّت اگر وصیّت نہ کرے تو اس کی نماز و روزہ کا فدیہ ترکہ مشترکہ سے نہ دیں

پس ان میں سے ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تقویٰ کے جوش میں اگر ترکہ مشترکہ میں بلا وصیتِ میّت نماز روزہ کا فدیہ دلواتے ہیں۔ سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ وصیّت کرے تو ثلث میں سے دینا حق ورثاء پر مقدم ہے اور اگر وہ وصیّت نہ کرے تو جس کو دینا ہو خاص اپنے حصّے ترکہ یا اپنے پہلے مال سے دے۔

حیلہ اسقاط مروّجہ کی تردید

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بجائے فدیہ کے ایک حیلہ اختراع کیا ہے کہ ایک قرآن مجید لاتے ہیں اور تمام عمر کی نماز و روزہ بلکہ کہیں کہیں کے معاصی کا حساب لگا کر اس قرآن کی اتنی بڑی قیمت تجویز کر کے کسی مسکین کو دے دیتے ہیں اور اس کا نام اسقاط رکھا ہے۔ چونکہ وہ رسم کسی قاعدہ فقہیّہ پر منطبق نہیں اس لئے محض باطل ہے

مُردہ دفن کر کے اذان دینے کا ثبوت نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ مُردہ دفن کر کے قبر پر اذان کہتے ہیں۔ چونکہ شریعت میں کہیں وارد نہیں اس لیے واجب الترک ہے۔

اگر کہیں کوئی نماز جنازہ جاننے والا نہ ہو تو کیا کرے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض دیہات میں جہاں کوئی نماز پڑھنے والا میسر نہیں۔ میّت کو بدون نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک خطبہ میں جبکہ بہت دیہاتی جمع تھے اس کی تدبیر بتلا دی تھی کہ اگر ایک آدمی بھی وضو کر کے جنازہ سامنے رکھ کر کھڑا ہو کر صرف چار بار اللہ اکبر کہہ دے تو نماز فرض جنازہ کی ادا ہو جاوے گی کیونکہ رکن اس نماز کا یہی چار تکبیریں ہیں۔ باقی دعائیں وغیرہ

سُنّت ہیں۔ سو جہاں ایسا موقع ہو اتنا ہی کر لیں۔ ترکِ فرض کی معصیت سے تو محفوظ رہیں گے۔

قبر میں رکھ کر میّت کے بدن کو رُو بقبلہ اچھی طرح کروٹ دے دینا چاہئے

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ مردہ کو قبر میں رکھ کر صرف منہ تو قبلہ کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ باقی سارے بدن کو کروٹ نہیں دیتے۔ سو کتبِ فقہ میں مصرح ہے کہ تمام بدن کو اچھی طرح کروٹ دے دینا چاہیے۔

میّت کا منہ کھول کر قبر کو دکھانے کی کوئی اصل نہیں

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ قبر میں رکھنے کے بعد اس کا منہ کھول کر قبر کو دکھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ سو شریعت میں اس کی کچھ اصل نہیں۔

قبر میں عہد نامہ یا شجرہ وغیرہ نہ رکھنا چاہئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قبر میں عہد نامہ یا شجرہ وغیرہ رکھتے ہیں اور میّت کے گلنے سڑنے سے اس کی بے ادبی ہوتی ہے سو اس کو بھی ترک کرنا چاہیے۔ البتہ جس چیز کا ادب شریعت میں اس درجہ کا نہیں۔ اس کا قبر میں رکھ دینا درست ہے جیسے کسی بزرگ کا کپڑا وغیرہ۔

قبر پختہ کرنا ممنوع ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے قبر پختہ بناتے ہیں جس کی نصاً حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

لڑکیوں کو میراث نہ دینا ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ لڑکیوں کو میراث نہیں دیتے جو بنصِ قرآن حرام اور ظلم ہے۔

بیوہ کو تمام منقولات کا مالک سمجھنا بھی ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے بیوہ عورتیں اپنے کو تمام

منقولات کا مالک سمجھتی ہیں۔ یہ بھی ظلم ہے۔ جو چیز شوہر نے اس کو ہبہ کردی ہو وہ بیشک اس کی ہے۔ ورنہ اور سب ترکہ مشترکہ ہے حسب فرائض سب کو دینا چاہئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو چیز جس وارث کے قبضہ میں آجاتی ہے وہ اس کو چھپا ڈالتا ہے مگر یاد رہے کہ قیامت کو سب اگلنا پڑے گا۔

اگر دلہن میکے میں یا سسرال میں مرجاوے تو اس کا مال سب ورثہ کو ملے گا

ایک کوتاہی سہی کا شعبہ یہ ہے کہ اگر دلہن اپنے میکے میں مرجاوے تو اس کے تمام سامان پر وہ لوگ قبضہ کر لیتے ہیں اور اگر سسرال میں مرجاوے تو وہ قابض ہوجاتے ہیں ہم نے کہیں تقسیم شرعی ہوتے سنا ہی نہیں اس میں بھی اوپر کی وعید کو یاد رکھنا چاہئے۔

میّت پر کسی قسم کا قرض اگر دلیل سے ثابت ہو تو انکار نہ کرنا چاہئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بجز قرضۂ تمسک کے دست گرداں قرض جو میّت کے ذمہ ہو اور دلیل شرعی سے ثابت ہو اس کو کوئی شاذونادر ہی ترکہ سے ادا کرتا ہے۔ صاف انکار کردیتے ہیں۔ جیسا کہ میّت کا جو ایسا ہی قرضہ اوروں کے ذمہ ہے اور لوگ اس کو بھی مکر جاتے ہیں۔ دونوں امر صریح ظلم ہیں خصوصاً میّت پر اگر قرضہ ہو تو ورثہ کو یہ سمجھنا چاہئے کہ بروئے حدیث اس کی روح جنت میں جانے سے معلق رہے گی جب تک قرض نہ ادا ہو تو کیا اپنے عزیز کے لئے اتنا بڑا حرمان گوارا ہوگا؟

اگر میّت کا کوئی وارث بطن مادر میں ہو تو اس کے تولد تک میراث تقسیم نہیں ہوگی

ایک کوتاہی یہ ہے کہ کبھی میت کے وارثوں میں وہ بچہ بھی ہوتا ہے جو ابھی بطن مادر میں ہے۔ ہم کو یاد نہیں کہ کبھی مستفتی نے سوال میں کبھی اس کو ظاہر کیا ہو۔ اور ہم جواب دینے والے لوگوں کی بھی کوتاہی ہے۔

اس کا احتمال ہی نہیں ہوتا اور رسائل سے اس کی تحقیق ہی نہیں کرتے۔ مذہب کا ضروری مسئلہ ہے۔ بہت زیادہ قابلِ اعتناء کے ہے۔ بدون اس کے تولد کے تقسیم ترکہ کی صورت معلق رہے گی۔ بعد تولد کے صحیح سوال قائم ہو گا۔

کفن میں میت کی لنگی باندھ دینا بدعت ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جا بعض میں میت کی لنگی باندھی جاتی ہے جو بالکل بدعت ہے بعض اُردو خوانوں کو ازار یا اس کا ترجمہ لنگی دیکھ کر دھوکہ ہوا ہے سو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بھی پورا چادر ہوتا ہے۔ چونکہ لنگی کے حصہ کا وہ چادر مشروع ہوا ہے اس لئے اس کا نام یہی ہو گیا۔

شوہر اپنی مُردہ بیوی کا مُنہ دیکھ سکتا ہے اور اس کے جنازہ کا پایہ بھی پکڑ سکتا ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ شوہر کو اس کی مُردہ بیوی کا منہ نہیں دیکھنے دیتے نہ اس کے جنازہ کا پایہ پکڑنے دیتے ہیں یہ محض لغو ہے۔ میت کو ہاتھ لگانا تو بلا ضرورت جائز نہیں لیکن منہ دیکھنا درست ہے اور پایہ پکڑنا مستحب ہے بلکہ اگر کوئی محرم قبر میں اتارنے والا نہ ہو تو اور اجنبیوں سے شوہر احق ہے اور عورت کے لئے تو مُردہ شوہر کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا بھی درست ہے۔

کثرتِ آدمی کے لئے جنازہ کو دیر کرنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ نماز جمعہ کے انتظار میں جنازہ کو رکھے رکھتے ہیں کہ زیادہ نمازی نماز پڑھیں گے۔ سو یہ بالکل جائز نہیں جس قدر جلد ممکن ہو نماز اور دفن سے فراغت کرنا واجب ہے۔

اگر میت نے کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص جگہ دفن کرنے کی وصیت کی تو شرعاً ایسی وصیتیں لازم نہیں ہوتیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اموات کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص مقام

پر دفن ہونے کی وصیت کر جاتے ہیں تو اَحیاء اس کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ بعض اوقات بعضے واجباتِ شرعیہ بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیے کہ ایسی وصیتیں شرعاً لازم نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی امر خلاف شرع لازم آوے تو اس پر عمل جائز بھی نہیں

الحمد للہ قسم سوم سے بھی فراغت ہوئی اس وقت ذہن میں یہی امور ظاہر ہوئے جو انشاء اللہ تعالیٰ قریب قریب کافی ہیں باقی اگر کوئی اور بات قابلِ تحقیق خیال میں آوے تو علماء سے رجوع کر لیا جاوے۔ جیسا حالت قبل موت کے بیان کے ختم پر بھی عرض کیا ہے۔ (اصلاحِ انقلاب، امت)

ایک تعزیت نامہ

یہ تعزیت نامہ حضرت نے اپنے ایک ہم وطن عزیز کی وفات پر ان کے صاحبزادہ ظفر احمد صاحب انجنیئر کو لکھا تھا جو اس وقت لندن میں انجنیئری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چونکہ یہ حد درجہ سبق آموز اور مفید ہے لہٰذا لنفع عام کے لیے نقل کیا جا رہا ہے۔

"عزیزم سلمہٗ! السلام علیکم۔ کئی روز ہوئے میں مدرسہ کو آ رہا تھا۔ راستہ میں حافظ اعجاز کا چھوٹا بچہ مل گیا۔ میں نے چھیڑ کے طور پر اس کو کچھ کہہ دیا، وہ بولا اللہ کرے بڑے ابا مر جاویں۔ اس وقت میں نے غور کیا کہ اس کلمہ کا مجھ پر کیا اثر ہوا۔ سو الحمد للہ یہ محسوس ہوا کہ جیسے کوئی مسافر گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر کسی ضرورت سے سفر میں ہو یہاں اس کو ہر طرح کی کلفت کا ہر وقت سامنا ہو اور کوئی شخص اس کو کہے خدا کرے تو اپنے گھر پہنچ جاوے۔

یہ کہنے والا خواہ کسی نیت سے کہے لیکن اس سننے والے پر اس کا کیا اثر ہوگا ظاہر ہے کہ خوش ہوگا کہ اس نے مجھ کو بہت اچھی دعا دی اور اگر اس نے بد دعا کے قصد سے کہا ہوگا تو اس خوشی کے ساتھ اس کو تعجب بھی ہوگا کہ عجیب بے وقوف ہے

کہ دعا کو بد دعا سمجھ رہا ہے۔ بس بحمد للہ تعالیٰ وہی اثر اس وقت مجھ پر ہُوا اور میں
ہنس ساکہ اس نے تو اپنے نزدیک انتہا درجہ کی بد دعا تجویز کی ہوگی۔ مگر وہ واقع میں دعا
ہے تو یہ اثر مجھ پر ہُوا۔ یہ نتیجہ کس چیز کا تھا صرف بزرگوں کی صحبت سے جو عقل و دین عطا
ہُوا تھا صرف اسی کا اثر تھا ورنہ طبعاً تو ایسی دعا سب ہی کو ناگوار اور گراں گزرتی ہے۔
اور اللہ تعالیٰ نے دولتِ عقل و دین اسی لیے عطا فرمائی ہے کہ ایسے مواقع میں ان دونوں
کو طبیعت پر غالب رکھے۔ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ آں عزیز کو اللہ تعالیٰ نے دین بھی
دیا ہے اور عقل بھی دی ہے اور اہل اللہ کی صحبت بھی میسر آئی ہے جس سے ان دونوں حالتوں
میں کافی قوّت اور اضافہ ہو گیا تو اگر کوئی ایسا موقع ہو تو ضرور دین اور عقل کو طبیعت پر
غالب رکھو گے۔

اب ایسے موقع کی اطلاع دیتا ہوں۔ آں عزیز کے والد ماجد جو طویل مدت سے
علیل تھے اور جن کی علالت کی اطلاع گھر سے آں عزیز کو ملتی رہی۔ اس دار المشقت
مسافر خانہ بلکہ پُر خار دشت کو چھوڑ کر اپنے آرام گاہ وطنِ اصلی آخرت کو روانہ ہو گئے جس سے
طبعاً آں عزیز متاثر ہوں گے اور یہ تاثر نہ عقلاً مذموم ہے نہ شرعاً۔ بلکہ علامت ہے محبت و تراحم
کی جو کہ ہر مسلمان کے لیے ہر مسلمان پر حق ہے خصوص جس سے زیادہ تعلقات ہوں خصوص سرپرست
اور مربّی کے لیے مگر ساتھ ہی یہ بھی مطلوب ہے کہ عقل و دین کو طبیعت پر غالب رکھ کر راضی
برضا اور مفوّض بالقضا ہوں، نہ جزع فزع کریں نہ حدود سے متجاوز ہوں۔ دل پر قابو حاصل
کر کے مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب سے مدد پہنچا دیں۔ خواہ عبادات بدنیہ، نوافل و تلاوتِ قرآن
سے خواہ صدقہ مالیہ سے جس قدر اور جس طریق سے سہل ہو۔ ممکن ہے کہ واقعہ قلب پر زیادہ اثر
نہ کرے مگر ان کی فکرِ نجات طبیعت کو مشوش کرے۔ سو اس کے متعلق یہ بھی واقعہ ہے کہ مرحوم
اگرچہ اعمال میں آزاد تھے لیکن عقائد و جذبات و ملکات اور سب کو نفع رسانی خصوصاً اہلِ
دین کی عظمت و احترام کی رعایت اور ترحم و ہمدردی وغیرہ وغیرہ یہ ایسے امور ان میں تھے
جو حق تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنے والے ہیں۔ پھر بیماری کی تکالیف بھی بروئے حدیث

گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں، اور اس سب سے قطع نظر ثواب بخشنے سے وہی نفع ہو سکتا ہے جو اعمال سے ہوتا سو یہ زندوں کے ہاتھ میں ہے۔

غرض صبرِ جمیل سے کام لیں اور صبر ہی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ محض اس واقعہ سے متاثر ہو کر اپنا نظامِ عمل نہ بدلیں کہ اپنا نقصان کرنے سے ان کو یا کسی کو نفع نہیں پہنچ سکتا تو ایسے فعلِ عبث سے کیا فائدہ۔ بس اپنا کام پورا کر کے وہاں سے آویں جیسا پہلے سے تجویز کر رکھا ہے۔ اب دعا پر ختم کرتا ہوں۔ دعا گو، اشرف علی

از تھانہ بھون ۶ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۱ھ"

○

محبت و عبدیت

فصل (۱)

طریقِ محبّت (راہِ سلوک)

عمل کی تعریف اور وسعت

عمل کہتے ہیں فعل اختیاری کو اس لیے اعمالِ باطنہ بھی عمل میں داخل ہیں۔ چنانچہ ایمان کو نصوص میں عمل کہا گیا ہے جس طرح نماز روزہ کا شریعت میں حکم ہے۔ اسی طرح محبّت اور شکر وغیرہ کا بھی امر ہے۔

(المرابط صـ ۱۵)

حُبّ حق بڑھانے کی ضرورت

میں یہ نہیں کہتا کہ حُبّ حق آپ کے اندر بالکل نہیں۔ آپ میں حبّ حق ہے مگر بہت کمزور ہے۔ اس وقت آپ کی ایسی مثال ہے جیسے چراغ میں تیل بھی ہے بتی بھی ہے سارا مصالحہ موجود ہے مگر اس کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔ ذرا ابھار دو گے تو روشنی ہو جائے گی۔ آپ کے پاس کمی نہیں کسی چیز کی۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے کسی اور سے لینے کی ضرورت نہیں۔

(الحیوٰة صـ ۲۹)

میری تمنّا

اور میں یہ (بھی) نہیں کہتا کہ تم دنیا سے قطع تعلق کر کے جنید و شبلی بن جاؤ۔ میں تو اس کا متمنّی ہوں کہ تم مسلمان بن جاؤ۔ افسوس تو اسی کا ہے کہ آج کل اکثر مسلمانوں کا ایمان ہی کمزور ہے کہ نہ خدا و رسول کی محبت کی فکر ہے نہ آخرت کا خوف ہے۔ ایک مہینہ کی جیل سے جتنی وحشت ہے عذاب جہنّم کا اتنا بھی خوف نہیں۔

(الفصل صـ ۵)

محبت سارے عالم پر ظاہر ہو جائے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کو خدا تعالیٰ سے بہت محبت ہے" کسی مخلوق کی محبت خدا تعالیٰ کی محبت کے مشابہ بھی نہ ہونی چاہیے۔ برابر ہونا تو درکنار، محبت خدا کا رنگ ایسا غالب ہونا چاہیے کہ سارے عالم پر ظاہر ہو جائے کہ ان کو سوائے حق تعالیٰ کے کسی کی کچھ محبت نہیں۔ (الوصل والفصل ص۳۲)

تمام دنیا سے کہہ دو

تمام عالم سے کہہ دو کہ ہم نے ایک ذات سے علاقہ جوڑ لیا ہے۔ جو اس سے ملے وہ ہمارا دوست ہے جو اس سے الگ ہے وہ ہم سے الگ ہے۔ صرف اس کی رضا کا طالب ہونا چاہیے چاہے تمام عالم ناراض ہو جائے۔ (تواصی بالحق ع۱ ص۲۹)

محبت کا ایک بڑا حق

خدا سے تعلق رکھنے والوں کو یگانہ اور آشنا سمجھو اور جو اس سے بے تعلق ہو اس کو بیگانہ اور ناآشنا سمجھو خدا کے دوستوں کو اپنا دوست اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھو۔ صاحبو! محبت کا یہ بہت بڑا حق ہے اس کو ادا کرو۔ آج کل اس میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔ بس آپ کی تو یہ شان ہونی چاہیے۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

(غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح ص۲۱-۲۲)

اے مسلمانو!

اے مسلمانو! خدا کے ساتھ وہ حالت تو ہونی چاہیے جو ایک محبوب مجازی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر دم عاشق اسی کی دھن میں رہتا ہے گو دنیا کے سارے دھندے بھی کرتا ہے مگر اس کا خیال کبھی دل سے نہیں اترتا۔ بس یہ حال ہوتا ہے۔ ؎

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

تو کم از کم طالبِ خدا کا یہ حال تو ہونا چاہیے جو ایک مرداکسبی کے عاشق کا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی وقت دل سے نہیں اترتی ؎

عشق مولٰے کے کم از لیلےٰ بود

گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

کیا خدا کی محبت ایک مخلوق کی محبت سے بھی کم ہو گئی۔ اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کی ایسی دھن نہ ہو۔ واللہ جو سچا طالب ہو گا اس کے دل کو ہر وقت خدا تعالیٰ کی دھن لگی ہو گی۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِم الخ ”کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔“

(سبیل النجاح ص۴۵،۴۶)

عاشق ملامت کی پروا نہیں کیا کرتا

فرمایا، خدا کی محبت کا دعویٰ اور آبرو یا جان کا خیال ایسی تو خرابی ہے جس نے غارت کر رکھا ہے۔ معلوم ہے کہ فلاں رسم بری ہے، مگر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہے تو شرع کی بات مگر ہم چشموں میں ہیٹی ہو گی۔ جناب کیسے ہم چشم اور کیسی ہیٹی۔ کہیں عاشق کو ملامت کا اثر ہو سکتا ہے بلکہ اس کو تو ملامت میں مزا آتا ہے اور ملامت سے خوف ہونا تو دلیل اس بات کی ہے کہ عشق کی ہوا بھی نہیں لگی۔ عشق میں تو سب مصلحت اور انجام بینی رکھی رہ جاتی ہے اور آدمی آبرو مال اور جان سب معشوق کے قدموں میں رکھ دیتا ہے اور اگر وہ ان سب کو قبول کر لے تو یہ احسان مند ہوتا ہے مصلحت اور پالیسی کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں دو مختلف طرف کے تعلق کو نباہنا پڑتا ہے کہ اس کو بھی راضی رکھنا ہے اور اس کو بھی۔ لہٰذا کچھ اِدھر کی بات ہو کچھ اُدھر کی۔ بس ایک کو لو اور سب کو ترک کر دو۔ اور اس کے سامنے کسی کی پروا نہ کرو۔ معمولی

محبت سارے عالم پر ظاہر ہو جائے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ سے بہت محبت ہے۔ کسی مخلوق کی محبت خدا تعالیٰ کی محبت کے مشابہ بھی نہ ہونی چاہیے۔ برابر ہونا تو درکنار، محبتِ خدا کا رنگ ایسا غالب ہونا چاہیے کہ سارے عالم پر ظاہر ہو جائے کہ ان کو سوائے حق تعالیٰ کے کسی کی کچھ محبت نہیں۔ (الوصل والفصل ص۳۲)

تمام دنیا سے کہہ دو

تمام عالم سے کہہ دو کہ ہم نے ایک ذات سے علاقہ جوڑ لیا ہے۔ جو اس سے ملے وہ ہمارا دوست ہے جو اس سے الگ ہے وہ ہم سے الگ ہے۔ صرف اس کی رضا کا طالب ہونا چاہیے چاہے تمام عالم ناراض ہو جائے۔ (تواصی بالحق ع۱ ص۲۹)

محبت کا ایک بڑا حق

خدا سے تعلق رکھنے والوں کو یگانہ اور آشنا سمجھو اور جو اس سے بے تعلق ہو اس کو بے گانہ اور ناآشنا سمجھو۔ خدا کے دوستوں کو اپنا دوست اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھو۔ صاحبو! محبت کا یہ بہت بڑا حق ہے اس کو ادا کرو۔ آج کل اس میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔ بس آپ کی تو یہ شان ہونی چاہیے۔

ہزار خویش کہ بے گانہ از خدا باشد
فدائے یک تنِ بے گانہ کآشنا باشد

(غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح ص۲۲-۲۱)

اے مسلمانو!

اے مسلمانو! خدا کے ساتھ وہ حالت تو ہونی چاہیے جو ایک محبوب مجازی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر دم عاشق اسی کی دھن میں رہتا ہے گو دنیا کے سارے دھندے بھی کرتا ہے مگر اس کا خیال کبھی دل سے نہیں اترتا۔ بس یہ حال ہوتا ہے۔ ؎

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

تو کم از کم طالب خدا کا یہ حال تو ہونا چاہیے جو ایک مرد اکبسی کے عاشق کا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی وقت دل سے نہیں اترتی۔ ؎

عشق مولےٰ کے کم از لیلےٰ بود
گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

کیا خدا کی محبت ایک مخلوق کی محبت سے بھی کم ہو گئی۔ اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کی ایسی دھن نہ ہو۔ واللہ جو سچا طالب ہوگا اس کے دل کو ہر وقت خدا تعالیٰ کی دھن لگی ہو گی۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ارشاد ہے رجالٌ لا تلھیھم الخ "کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔"

(سبیل النجاح ص ۴۵، ۴۶)

عاشق ملامت کی پروا نہیں کیا کرتا

فرمایا، خدا کی محبت کا دعویٰ اور آبرو یا جان کا خیال ایہی تو خرابی ہے جس نے غارت کر رکھا ہے۔ معلوم ہے کہ فلاں رسم بری ہے، مگر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہے تو شرع کی بات مگر ہم چشموں میں ہیٹی ہو گی۔ جناب کیسے ہم چشم اور کیسی ہیٹی۔ کہیں عاشق کو ملامت کا اثر ہو سکتا ہے بلکہ اس کو تو ملامت میں مزا آتا ہے اور ملامت سے خوف ہونا تو دلیل اس بات کی ہے کہ عشق کی ہوا بھی نہیں لگی۔ عشق میں تو سب مصلحت اور انجام بینی رکھی رہ جاتی ہے اور آدمی آبرو مال اور جان سب معشوق کے قدموں میں رکھ دیتا ہے اور اگر وہ ان سب کو قبول کر لے تو یہ احسان مند ہوتا ہے مصلحت اور پالیسی کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں دو مختلف طرف کے تعلق کو نباہنا پڑتا ہے کہ اس کو بھی راضی رکھنا ہے اور اس کو بھی۔ لہٰذا کچھ اِدھر کی بات ہو کچھ اُدھر کی۔ بس ایک کو لو اور سب کو ترک کر دو۔ اور اس کے سامنے کسی کی پروا نہ کرو۔ معمولی

عشقوں میں یہی ہوتا ہے اور خدا کا نام لینے والوں کے نزدیک تو دنیا و مافیہا بھی کچھ نہیں۔ کیسا ننگ اور کیسا نام؟ اذا اللہ سب ہوا ہو جاتے ہیں۔ نخوت و ناموس کو تو یہ محبت پھونک دینے والی ہے۔ ان کا تو نام ہی نہیں رہتا قیامت تک یہ مصلحت اندیشی عشق میں نہیں ہو سکتی کہ بیٹھی ہو گی۔ عاشق کی نظر تو ایک ہی پر پڑتی ہے۔ دوسرا کوئی نظر میں ہوتا ہی نہیں جس کے سامنے بیٹھی ہو گی۔

(علم و عمل "آخر الاعمال" ص۳۶)

تعلق مع اللہ کا نور پیدا کرو

صاحبو! اگر کسی عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا محبوب فلاں کام سے ناراض ہوتا ہے تو کیا اس کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ابھی تو محبوب کی ملاقات میں دیر ہے۔ لاؤ اس کام کو کر لوں۔ صاحبو! عاشق سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی محبت ہرگز محبوب کے خلافِ رضا کام کرنے کی اجازت نہ دے گی۔ گو ملاقات میں کتنی ہی دیر ہو بلکہ گو ملاقات بھی ہونے والی نہ ہو۔ پھر افسوس ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہم اس کے خلاف برتاؤ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پوری محبت ہی نہیں تو اس صورت میں شکایت اور زیادہ ہو گئی کہ ایک ادنیٰ حسین صورت سے ہم کو کیا تعلق ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ سے ہم کو اس درجہ کی محبت نہ ہو جو کہ جلال و جمال و کمال و نوال میں سب سے زیادہ کامل ہیں اور جو کچھ دوسروں میں ہے سب کچھ اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن — صبر چوں داری ز رب ذوالمنن

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں — صبر چوں داری ز نعم الماہدون

اور گو نفس محبت تو ہے مگر دوسروں کی محبت نے اسے مغلوب کر رکھا ہے اس لیے ناراضی حق کی گرانی کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔

جب آدمی کو سانپ ڈس لیتا ہے تو اس کو نیم کے پتّے تلخ نہیں معلوم ہوتے۔ اسی طرح ہم کو دُنیا کے سانپ نے ڈس رکھا ہے اس لیے ناراضی خداوندی کی تلخی ہم کو محسوس نہیں ہوتی۔ دل میں تعلق مع اللہ کا نور پیدا کرو۔ اس وقت سمجھو گے کہ ناراضیٔ حق کی تلخی کیسی ہوتی ہے۔ پھر خود بخود یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی اصلی مضرت خدا کی ناراضی ہے اس کے سامنے دنیا کے منافع اور مضرتوں کی کچھ حقیقت نہیں۔

(علم وعمل، تعمیم التعلیم، ص ۱۹۳-۴)

اہلیہ سے محبّت

فرمایا کہ ایک صاحب کا خط آیا ہے اس میں لکھا ہے کہ مجھ کو اپنی اہلیہ سے بیحد محبت ہے۔ اس قدر محبت مذموم تو نہیں میں نے لکھ دیا کہ اس سے زیادہ بھی مذموم نہیں مگر ایک شرط ہے۔ میں نے اس شرط کے متعلق بھی ان سے دریافت کیا ہے کہ اگر کسی موقعہ پر اس کی رعایت کرنے میں دین کا ضرر ہو تو اس وقت آپ کس کو ترجیح دیں گے۔ دین کو یا اہلیہ کو اس پر فرمایا کہ نہ معلوم بیچاری بیوی ہی کو کیوں تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ اگر بیوی کے متعلق یہ شبہہ ہے کہ وہ غیر اللہ ہے تو یہ خود بھی تو عین اللہ نہیں غیر اللہ ہی ہیں۔ جو محبت اہلیہ سے ہے اگر وہی محبت اپنی ذات سے ہو تو وہاں پر بھی تو یہی شبہہ ہونا چاہیے مگر اس کا کبھی سوال نہیں کیا۔ خیر جو سوال کیا یہ بھی غنیمت ہے۔ اس سے دین کی فکر کا تو پتہ چلا اور فکر دین وہ چیز ہے کہ یہ جب ہوتی ہے تو مصلح کا بھی جی چاہتا ہے کہ یہ بھی بتادو، یہ بھی سکھادو۔ .... اور اگر طلب اور فکر نہیں تو پھر مرد اور پڑے گڈھے میں۔

(۲۲ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ)

جاہلانہ خیال، ترکِ تعلق اہل وعیال

جو لوگ محبّت الٰہی کو دشوار یا محال سمجھے ہوئے ہیں یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ انہوں نے محبّت الٰہی کی حقیقت یہ سمجھی ہے کہ تعلقاتِ دُنیویہ کو کلیتہً ترک کر دیا جائے

بیوی بچّوں کو چھوڑ کر ایک حجرہ سنبھال لیا جائے۔ یہ خیال جاہلانہ ہے کیونکہ انبیا علیہم السلام سے زیادہ کسی کو اللہ تعالیٰ سے محبت نہ تھی اور انبیا علیہم السلام اکثر صاحب ازواج و ذرّیہ تھے اور کسی نے بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرا نہیں سنبھالا بلکہ سب ان کے حقوق کو اہلِ دنیا سے زیادہ ادا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

۱ ـ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ۝

۲ ـ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۝

اور حدیث میں ہے تم میں کامل الایمان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ خلق و لطف سے پیش آئے۔" پس خوب سمجھ لیجیے کہ بیوی بچّوں کو چھوڑ کر حجرہ سنبھالنا محبت الٰہی نہیں بلکہ معصیت حق ہے۔ محبتِ الٰہیہ ان کے چھوڑنے کا امر نہیں کرتی بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی دلداری اور دلجوئی کا امر کرتی ہے۔

(الفصل والانفصال ص۸)

بغیر محبّت زندگی بے مزہ ہے

صاحبو! محبّت عجیب چیز ہے مگر افسوس اس کی تحصیل کی طرف توجہ نہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے محبت کو ایمان کا لازم گردانا ہے۔ فرماتے ہیں والذین آمنوا اشد حبًا للّٰہ "کہ اہلِ ایمان کو خدا سے شدید محبت ہوتی ہے"۔ خدا کا یہ فرمانا غلط نہیں۔ اگر آپ میں محبت کم ہے تو ضرور ایمان میں کمی ہے۔ اور علاوہ ایمان کی کمی کے بغیر محبت کے زندگی کا بھی تو مزہ نہیں۔ ؎

بے دوست زندگانی لطفے چناں ندارد
لطفے چناں ندارد بے دوست زندگانی

اے صاحبو! جن کی بیوہاں یا جن کے خاوند مرجاتے ہیں ان کی زندگی کس قدر بے لطف ہو جاتی ہے کیونکہ انہیں محبت کا چسکہ پڑ گیا ہے۔ اب بغیر اس کے شگفتگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ افسوس کہ آپ کو خدا کی محبت کے بغیر کس طرح چین آتا ہے۔!

(الامتحان صـ۲۹-۲۸)

رعب اور وحشت میں فرق

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ محبت زیادہ سبب ہوتی ہے۔ رعب کا کہ کہیں یہ ناراض نہ ہو جائے۔ اگر محبت نہ ہو اور خوفِ محض ہو تو وہ رعب نہیں ہوتا بلکہ وحشت ہوتی ہے۔ رعب محبوب ہی کا زیادہ ہوتا ہے۔

(الافاضات ۳ صـ۱۷۳ ملفوظ ۲۸۴)

عقلی محبت میں دوام اور ثبات ہے

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ زیادہ تر عقلی محبت ہی کی ضرورت ہے۔ اس میں دوام ہے، ثبات ہے، اختیاری ہے عجیب چیز ہے عقلی محبت۔ اور عقلی اور طبعی محبت دونوں بھی جمع ہو سکتی ہیں مگر غلبہ عقلی ہی کو ہونا چاہیے۔ محبت طبعیہ کے غلبہ میں حدود محفوظ نہیں رہتے۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا تھا کہ طبیعت کو عقل پر غالب نہ آنے دے اور عقل کو شریعت پر غالب نہ آنے دے۔ فرمایا کہ بالکل صحیح ہے۔ ساری دنیا کے عقلاء حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے تو ڈوب ہی رہے ہیں۔ اس بے خبری میں انہوں نے عقل کو دین پر غالب کر دیا۔ البتہ عقل کو طبیعت پر غالب رکھنا ضروری ہے۔ بس ہمیشہ رہنے کی چیز تو عقل و ایمان ہی ہیں۔ باقی سب میں آمد و رفت رہتی ہے۔

(الافاضات ۱ صـ۲۸۲ ملفوظ ۴۶۵)

محبت عقلی

محبت عقلی استدلال سے ہوتی ہے اور استدلال سے جوش نہیں

ہوا کرتا۔ اور طبعی محبت بغیر دیکھے اور بغیر آواز سُنے بھی ہوسکتی ہے اور وہ ہے مناسبت اور مناسبت ہی مدار محبت طبعیہ ہے۔ سو حق تعالیٰ کے سوا بندہ کو کسی سے بھی مناسبت نہیں۔ پس محبت طبعی بھی خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ہوسکتی۔ بلکہ محققین نے دعویٰ کیا ہے کہ غیر خدا سے محبّت ہو ہی نہیں سکتی اور جس کو غیر سے بظاہر محبت ہے وہ بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی سے محبت ہے۔ باقی اس پر جو مواخذہ ہے وہ بوجہ نیّت کے ہے کیونکہ یہ تو نیت غیر ہی کی کررہا ہے اور مواخذہ جب ہوتا ہے نیّت پر ہی ہوتا ہے۔

محبّت کے جتنے اسباب ہیں یعنی حسن و جمال عطا و نوال یا فضل و کمال۔ یہ صفات حقیقت میں حق تعالیٰ کی ہیں۔ دوسروں میں صفاتِ الٰہیہ کا عکس ہے۔ تو اس عکس کا عاشق ہونا ایسا ہے جیسے دیوار پر دُھوپ پڑ رہی ہو اور کوئی دیوار کی روشنی پر عاشق ہو جائے۔ تو ظاہر میں گو یہ نورِ دیوار کا عاشق ہے مگر حقیقت میں آفتاب کا عشق ہے۔ یہ شخص دیوار پر اسی وقت تک عاشق ہے جب تک اس کو یہ خبر نہیں کہ یہ نور آفتاب کا ہے اور جب اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ تو آفتاب کی صفت ہے اس وقت کہے گا۔ ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور اس وقت اپنی حماقت پر افسوس کرے گا کہ میں اب تک کیوں آفتاب سے غافل رہا اور دوسروں میں اُس کا عکس دیکھ کر کیوں الجھا رہا۔ اسی طرح جن کی نظر حق تعالیٰ کے کمالات پر پہنچ گئی ہے اور وہ سمجھ گئے ہیں کہ اسباب محبت حقیقت میں حق تعالیٰ ہی میں ہیں اور دوسروں میں محض عکس ہے۔ وہ سب کو چھوڑ کر خدا کے ہو گئے ہیں اور جو لوگ عکس کے اُوپر فریفتہ ہیں ان کی نسبت یوں فرماتے

ہیں۔ ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار　　عشق را با حی و با قیوم دار

عشق ہائے کز پے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

واقعی غیر حق کے ساتھ عشق پائدار نہیں ہے۔ کیونکہ جو لوگ غیر کے عاشق ہیں

...... وہ اسی وقت تک عاشق ہیں جب تک صفاتِ حق کا جلوہ ان میں ہو رہا ہے اسی کو رنگ فرمایا گیا ہے۔ اور اگر وہ اپنے عکس کو سلب کر لیں تو پھر ان کا عشق بھی جاتا رہے گا۔ ؎

عاشقی با مردگاں پائندہ نیست　　زانکہ مُردہ سوئے ما آئندہ نیست

بہرحال اہلِ تحقیق کا یہ قول ہے کہ محبت خدا کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتی اور حق تعالیٰ سے محبت عقلی تو ہوتی ہی ہے طبعی بھی ہو سکتی ہے۔

خدا کی محبت و رضا رسول کی محبت و رضا کو مستلزم ہے

خدا کو راضی کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا خدا کو راضی کرنا ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے نصیب

اسی درجہ میں ارشاد ہے: وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی کسی نے لعل سے پوچھا تھا کہ "تجھے آفتاب سے زیادہ محبت ہے یا اپنے سے"۔ اس نے کہا کہ اس سوال سے مجھے معاف کرو۔ اگر میں کہتا ہوں کہ اپنے سے محبت ہے تو وہ آفتاب ہی کی محبت ہے کیونکہ میرے اندر جو خوبی موجب محبت ہے وہ اسی وجہ سے ہے اور اگر کہتا ہوں

کہ آفتاب سے محبت ہے تو اپنی ہی محبت ہے۔ کیونکہ اس سے اسی لیے محبت ہے کہ اس نے میری ذات کو ایسا بنا دیا ہے۔ اس بارے میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

بس حیثیتِ وصول و ایصال میں حق تعالیٰ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی تعلق ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت و رضا آپ کی محبت و رضا کو مستلزم ہے کیونکہ آپ سے تو اسی لیے محبت ہے کہ آپ مظہرِ کمالاتِ الٰہیہ ہیں۔ اور یہی وہ بات ہے جو حضرت رابعہ بصریہؒ سے بوجہ غلبۂ عشق کے مخفی رہی اور ان کی نظر یہاں تک نہ پہنچی گو ان کا درجۂ عشاقؔ میں بہت عالی اور ان کے عشق کی شان عجیب تھی۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپؒ ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لیے ہوئے نہایت جوش و غضب میں بھری ہوئی جا رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا کہاں جا رہی ہو؟

کہا "میں آج جنّت و دوزخ کا فیصلہ کرنے جا رہی ہوں۔ اس آگ سے جنت کو پھونکوں گی اور پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کروں گی۔ کیونکہ ساری مخلوق جنّت و دوزخ کے طمع و خوف سے عبادت کر رہی ہے۔ میرے محبوب کو (خالصاً و مخلصاً) کوئی یاد نہیں کرتا۔"

اس واقعہ سے ان کے عشق کا حال معلوم ہو گیا ہو گا کہ کس درجہ کا ہے۔ حضرت رابعہؒ کے کمالِ عشق میں کچھ شبہ نہیں مگر یہ مسئلہ ان سے مخفی رہا کہ رسول میں ایک حیثیت ایسی بھی ہے جس کے اعتبار سے وہ غیر حق نہیں ہیں اور اس درجہ میں خدا کی محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت خدا تعالیٰ کی محبّت ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو ندامت سے آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں کہ خدا کی محبت نے دل میں اتنی جگہ کی ہے کہ آپ کی محبت کی بھی جگہ نہ چھوڑی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی کہ غم نہ کرو اللہ تعالیٰ کی محبت ہماری ہی محبت ہے" الحمد للہ بزرگوں کی برکت سے جس بات کی طرف حضرت رابعہ کا ذہن نہ گیا۔ وہ ہم جیسوں کو سہولت سے معلوم ہوگئی اور یہ خدا کی عطا ہے جس کو چاہے دے۔

طبعی محبّت اور عقلی محبّت

بات یہ ہے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں: ایک عقلی اور ایک طبعی اور مطلوب محبّت عقلیہ ہے اور حضرت رابعہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عقلیہ حاصل تھی کیونکہ وہ احکام شرعیہ کی متبع تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں فنا تھیں اور محبت عقلیہ اسی کا نام ہے کہ محبوب کے احکام کی اطاعت کرے اور اپنی خواہش وارادہ کو اس کے احکام کے سامنے فنا کردے اور اس کے حکم پر کسی چیز کو ترجیح نہ دے مگر طبعی محبت یعنی میلان و انجذاب ۔ و وابستگی ان کو حق تعالیٰ سے زیادہ تھی اور قاعدہ ہے کہ محبت طبعیہ خاص درجہ میں ایک ہی سے ہو سکتی ہے۔ دوسے ایک درجہ کی نہیں ہو سکتی اور یہ امر غیر اختیاری ہے کیونکہ اس کا مدار مناسبت طبع پر ہے جو بندہ کے اختیار میں نہیں اسی لیے محبت طبعیہ مامور بہا نہیں بلکہ مامور بہا اور مطلوب محبت عقلیہ ہے۔ جو امر اختیاری ہے۔ رہی طبعی محبت تو وہ بعض کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہوتی ہے اور بعض کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہوتی ہے۔

مطلوب محبّت عقلیہ ہے

مطلوب محبت عقلیہ ہے نہ کہ طبعیہ۔ کیونکہ امور طبعیہ سب غیر اختیاری ہیں اور اللہ فرماتے ہیں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اور راز اس کا وہی ہے جو اوپر اجمالاً مذکور ہو چکا کہ محبت طبعیہ کا مدار مناسبتِ باطنی پر ہے اور مناسبت باطنی کسی کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہے اور کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے اور بعض کو کسی سے بھی مناسبت نہیں۔ وہ محض خشک لکڑی ہیں، جیسے نجدی مگر ان کو بھی ناقص نہ سمجھو

کیونکہ ذوق ومناسبت کا نہ ہونا کچھ قصور نہیں۔ ذوق شرطِ مقبولیت نہیں، ہاں نعمت ضرور ہے کیونکہ اس سے عمل میں سہولت ہوجاتی ہے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے حسنِ ظاہری نعمت تو ہے مگر شرط قبول نہیں۔ گنجے بدصورت کو بھی قربِ حق ہوسکتا ہے اسی طرح ذوق ومناسبت ایک حسن باطنی ہے۔ اگر کسی کو حاصل ہوجائے تو نعمت ہے لیکن اگر کسی کو حاصل نہ ہو تو کوئی نقص نہیں کیونکہ قرب ورضائے حق کا مدار محبت عقلیہ پر ہے یعنی اطاعتِ احکام پر، ذوق پر اس کا مدار نہیں۔ اگر کسی شخص کو ذوقِ باطن بالکل نہ ہو۔ لیکن احکام کو پوری طرح بجالاتا ہو وہ ناقص نہ ہوگا بلکہ کامل ہوگا۔ اب یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جن میں جوش وخروش نہیں ہوتا اور وہ اس کے نہ ہونے سے مغموم ہوتے ہیں اور غضب یہ کہ بعض مشائخ غیر محقق بھی ایسے لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ تم کو طریق سے مناسبت نہیں تمہاری قسمت میں طریق باطن نہیں ہے۔ یہ شیخ قابلِ عزل ہے۔ میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ ہر مومن کو طریق باطن حاصل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ طریق باطن ذوق شوق کا نام نہیں ہے بلکہ مداومتِ ذکر واطاعتِ احکام اور ملکاتِ باطنہ مثل توکل ورضا وشکر وغیرہ کا نام ہے اور ان ملکات میں ہر ایک کے دو درجے ہیں۔ ایک طبعی، ایک عقلی۔ اور درجۂ عقلی اختیاری کسبی ہے۔ یہ ہر ایک کو حاصل ہوسکتا ہے۔

ہر مسلمان کو خدا اور رسولؐ سے محبت طبعیہ بھی ہے دوسرا جواب اس سے ترقی کرکے یہ ہے کہ میں یہی تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی مومن ایسا بھی ہے جس کو اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت طبعیہ نہ ہو بلکہ ہر مسلمان کو اللہ ورسول سے طبعی محبت بھی ہے اور عقلی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں ملکاتِ عقلیہ کو فطری اور طبعی بھی بنایا ہے مگر بعض میں طبیعت کو عقل پر غلبہ ہے اور بعض میں عقل کو طبیعت پر غلبہ ہے لیکن طبعیہ سے خالی کوئی نہیں۔

شوق و انس اہل ظاہر کے نزدیک تو محبت جوش وخروش کا ہی نام ہے۔ اگر جوش نہ ہو تو ان کے نزدیک محبت ہی نہیں مگر صوفیہ نے کہا ہے کہ محبت کے دو لون ہیں ایک شوق کا رنگ ہے۔ اس میں جوش وخروش ہوتا ہے ایک انس کا ہے اس میں سکون ہوتا ہے جوش وخروش نہیں ہوتا جیسے ایک محبت چھوٹے بچہ سے ہوتی ہے اور ایک بڑے لڑکے سے دونوں کا لون مختلف۔

اہلِ وجد کا حال کسی قوال یا باجہ پر موقوف نہیں۔ ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند بر آوازِ دولاب مستی کنند

ان کے لیے چکّی کی آواز بھی سماع کا کام دیتی ہے۔

(الحدود والقیود ص۳۶)

اصل مقصود وصول الی اللہ .... یاد رکھو اصل مقصود اپنا وصول الی اللہ ہے دوسروں کا ایصال بالذات مطلوب نہیں بلکہ یہ ایصال بھی اسی لیے مطلوب ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم کو وصول تام ہو جائے حق تعالیٰ راضی ہو جائیں۔ ورنہ ایصالِ خلق بالذات مطلوب نہیں خصوص جبکہ مخلِّ وصول ہونے لگے پس اصلی کوشش اپنے وصول کے لیے کرنا چاہیے۔ البتہ اگر بدون کاوش اور بدون گھیر گھار کے کوئی طالب آجائے اور اس کی طلب متحقق ہو جائے تو اس کی خدمت کر دینے کا بھی مضائقہ نہیں بلکہ طاعت ہے۔ باقی یہ کیا واہیات ہے کہ ساری کوشش سلسلہ بڑھانے ہی کے لیے کی جاتی ہے اور اپنے وصول کی فکر نہیں کی جاتی۔ (الوصل والفصل ص۲)

نامبارک عقل اور مبارک بے عقلی نری عقل سے کیا کام بن سکتا ہے جب تک کہ تائید غیبی نہ ہو۔ بڑے بڑے فلاسفہ

یوں ان منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے ویسے ہی ٹکریں مار کر اور ٹھوکریں کھا کر مر گئے۔ اور بہت سے بھولے بھالے لوگ منزل تک پہنچ گئے۔ تو جو بے عقلی محبوب تک رسائی کا سبب ہو وہ مبارک ہے اس لیے کہ وہ موصل الی اللہ بن گئی اور وہ عقل نامبارک ہے جو محبوب کے راستہ سے دُور لے جائے اور محبوب سے مفارقت پیدا کر دے۔ ایسی ہی عقل کو فرماتے ہیں۔ ؎

آزمودم عقل دُور اندیش را   بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

یعنی جب عقل سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنا دیا۔ یہ مطلب نہیں کہ عقل سے کام نہیں لیا۔ یہ تو اعلیٰ درجہ کی عقل ہے کہ اپنے مقصود کو ہاتھ سے نہ چھوڑا بلکہ مقصود یہ ہے کہ عقل کے اتباع میں غلو کو پسند نہیں کیا۔ ہر چیز کو اس حد پر رکھا جہاں تک عقل کا کام ہے وہاں تک اس سے کام لیتے ہیں اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس سے کام لینے کی نسبت کہا جاتا ہے۔ ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(الافاضات ع۴ صنا ملفوظ ع۱۶)

بے کار عقل

فرمایا کہ ایسی عقل کس کام کی جو محبوب کی طرف رہبری نہ کر سکے۔

(الافاضات ع۶ ص۷۲)

علّتِ تامہ دخولِ جنّت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال سے جنّت میں نہ جائے گا۔ بلکہ سب رحمت سے جائیں گے اس پر حضرت عائشہ رضؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ بھی؟ واقعی بڑا ضروری سوال تھا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت عائشہ رضؓ کو کہ ایسے ایسے سوالات کر کے ہمارے لیے راستہ صاف کر دیا۔ تو حضورؐ نے جواب

میں ارشاد فرمایا "ولا انا" کہ ہاں میں بھی عمل سے جنّت میں نہ جاؤں گا بلکہ محض فضل و رحمت سے جاؤں گا اور یہ جواب بڑی علامت ہے حضور کے سچا ہونے کی کہ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیا کیا فضائل ہیں، کیسے کیسے کمالات ہیں مگر اس پر بھی صاف صاف فرماتے ہیں "ولا انا"۔ جھوٹا مدعی ہرگز یہ جواب نہیں دے سکتا۔

وعظ: آثار المحوبہ فی اسرار التوبہ

تھانہ بھون: یکم جمادی الاوّل ۱۳۵۰ھ)

علّت تامہ دخولِ جنّت کی رحمتِ تامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہی ہیں کہ ہم جنّت میں جائیں اس لیے عمل کا حکم دیتے ہیں اور پھر اس عمل کی توفیق بھی عطا فرماتے ہیں تو محض ان کی رحمت ہی سبب ہے دخولِ جنّت کا۔ ورنہ ہمارے اعمال تو جو کچھ بھی ہیں، سب انہیں کے عطا کیے ہوئے ہیں۔ (آثار المحوبہ فی اسرار التوبہ ص۲۰)

وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہم سے لگاؤ کس کو ہے، لہٰذا کام میں لگا رہنا چاہیے۔ اگرچہ ساری عمر بھی کامیابی نہ ہو۔ (الافاضات ۷ ص۱۴۱)

ہائے وہ بندہ کیسے زندگی بسر کرتا ہے جس کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں۔ واللہ مرجانے کی بات ہے۔ (اوجِ قنوج ص۲۸)

حق تعالیٰ کو بھی طالبین سے محبت ہے

عادۃ اللہ یہی ہے کہ جب کوئی ان کی طلب کرتا ہے تو وہ بھی ان کی طلب کرتے ہیں یعنی وہ بھی اس کے حال پر متوجہ ہو جاتے ہیں۔ احادیث میں مصرح ہے مَنْ تَقَرَّبَ (الحدیث) پس سالک کو طلب میں سرگرم ہونے کے ساتھ یہ بھی تصوّر کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کو بھی میری ساتھ تعلق ہے۔ وہ بھی مجھ کو چاہتے ہیں۔ یہ مراقبہ مفید ہوگا اس سے محبت بڑھے گی، ورنہ افسردہ ہو جائے گا۔

محبوب کو تم سے تعلق ضرور ہے اگر ان کو تعلق نہ ہوتا تو تم کو طلب ہی نصیب

نہ ہوتی، مگر فرق اتنا ہے کہ عاشق عشق میں ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہے اور محبوب کا تعلق مخفی ہے مگر ہے تعلق دونوں طرف ۔ یہ انہیں کی محبت کا اثر ہے کہ تم بدون دیکھے ہوئے ان کے طالب ہو۔ تم نے توان کو دیکھا بھی نہیں ۔ انھوں نے ہی تم کو اپنی طلب اور محبت میں لگایا ہے ۔ یہ بڑی دلیل ہے ان کی محبت کی ۔ پس یہ تصور کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے ۔ ؎

آتشِ عشق است کہ اندر نے فتاد　　جوششِ عشق است کہ اندر مے فتاد

نے جہاں را پر نکردے از شکر　　گر نبودے نالۂ نے را اثر

حق تعالیٰ کی محبت اور تعلق کے آثار تمہارے اندر جو ہیں گو وہ خود مخفی ہیں مگر طالب کے ساتھ جو معاملات ہوتے ہیں جن کو طالب خوب جانتے ہیں وہ معاملات اور آثار بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بھی ان سے تعلق ہے اور اسی لیے تو ان کی شان الظاھرُ اور الباطن ہے ۔ یعنی ذات سے باطن ہیں اور آثار سے ظاہر ہیں ۔ مولانا فرماتے ہیں ۔ ؎

عشقِ من پیدا و معشوقم نہاں
یار بیرون فتنۂ او در جہاں

(غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح صنـ۲۰)

معصیت اور محبت ایک صاحب نے عرض کیا کہ کیا معصیت کے ساتھ دعویٰ محبت صحیح ہو سکتا ہے ؟ فرمایا کہ قلب کا میلان تو ہر مسلمان میں حق تعالیٰ کی طرف ضرور ہے اور طبعی ہے ۔ اس لیے مطلق محبت کا دعویٰ صحیح بھی ہے ۔ کبھی خواہش کی رغبت سے ، کبھی مصلحت سے ، کسی حالت کے غلبہ سے نافرمانی بھی ہو جاتی ہے ۔ البتہ حبِّ کامل کے ساتھ معصیت جمع نہیں ہوتی اور اگر غلبہ ہو طاعت کو اور نادراً کبھی معصیت بھی ہو جائے تو وہ کمالِ محبت کے

بھی منافی نہیں۔ (الافاضات ج ۳ ص ۱۶۲ ملفوظ ۲۸۱)

خدا اور رسولؐ کی محبت

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے کے جرم میں سزا دی۔ پھر وہ ایک دن حاضر کیا گیا۔ پھر آپ نے حکم سزا کا دیا۔ ایک شخص نے مجمع میں کہا کہ اے اللہ اس پر لعنت کر۔ کس قدر کثرت سے اس کو اس مقدمہ میں لایا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر لعنت مت کرو۔ واللہ میرے علم میں یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ روایت کیا اس کو بخاری نے۔

اس حدیث سے چند امور ثابت ہوئے:

(۱) بشارت مذنبین کو کہ ان سے اللہ و رسول کی محبت کی نفی نہیں کی گئی۔

(۲) تنبیہ مذنبین کو کہ نری محبت سزا سے بچنے میں کام نہ آئی تو کوئی اس ناز میں نہ رہے کہ بس خالی محبت بدون اطاعت کے سزائے جہنم سے بچا لے گی۔ البتہ بعد لعید من الرحمۃ سے بچا سکتی ہے جیسا کہ نہی عن اللعنۃ سے معلوم ہوا۔ پس جو سزا آخرت کی اس ملعونیت پر مرتب ہے یعنی خلود اس سے یہ محبت بچا لے گی۔ بعد سزا کے مغفرت ہو جاوے گی۔

(۳) فضیلت محبت کی جیسا کہ ظاہر ہے۔

(۴) تفاوت مراتب محبت کا کہ باوجود ایک عصیاں کے اثبات محبت کا حکم فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ متابعت کامل نہ ہونے سے گو کمالِ محبت کا حکم نہ ہوگا مگر نفسِ متابعت سے کہ ادنیٰ درجہ اس کا کفر سے نکلنا ہے کوئی درجہ محبت کا ثابت کہا جائے گا۔

(۵) مومن خواہ کتنا ہی گنہگار ہو مگر اس پر لعنت نہ کرنا چاہیے۔ اس سے

عظمت ثابت ہوتی ہے۔ اللہ ورسول کی محبت کی کہ اس کا ایک شمّہ بھی گو مقرون بالمعاصی ہو، مانع عن اللعنتہ ہے تو اس کا کامل اور خالص درجہ کیا کچھ موثر ہوگا۔ ؎

جرعۂ خاک آمیز چوں مجنوں کند   صاف گر باشد ندانم چوں کند

محبّت کا ایک انوکھا رنگ

صاحبو! اصل یہ ہے کہ جیسی صحابۂ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی ہم کو ایسی محبت ہی نہیں بعض صحابہؓ کی محبّت کا یہ لون تھا کہ تمام عمر گذر گئی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکے کیونکہ محبّت کا اختلاف استعدادِ محبت سے، ایک یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب غایت درجہ کی محبت ہوجاتی ہے تو محبوب کو دیکھنے کی تاب نہیں رہتی، خوب کہا ہے۔ ؎

یوں کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو آجاتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

غرض بعض صحابہؓ کو اس رنگ کی بھی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کسی صحابی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ شریف دریافت کیا تو کہا کہ یہ تو اس سے پوچھو جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھ بھر کر دیکھا ہو۔ یہاں تو عمر گزر گئی کبھی آنکھوں کو تاب نہ ہوتی کہ نگاہ بھر کر اس پر جمال کو دیکھ سکیں۔ بیان کروں تو کیا کروں۔ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بے چین تھے۔ حتیٰ کہ وہ حضورؐ کی گزشتہ

تکلیف کو یاد کر کے بے چین ہو جاتے تھے۔

(سنت ابراہیم صہ ۳۲)

کدو کا ذکر تھا حضرت والا نے فرمایا کہ صحابہؓ کے عشق کی کیا عجب حالت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو کھاتے ہوئے دیکھا مجھ کو اس سے محبت ہو گئی۔ غیر طبعی کا طبعی بن جانا بدون کسی قوی موثر کے ممکن نہیں۔

(ملفوظات)

طریق حصولِ محبت

محبت کا اثر تو یہ ہے کہ اطاعت میں سہولت پیدا ہو اور جبکہ ہم نے بالکل شریعت کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی جو شریعت کے بالکل خلاف۔ معاشرت وہ پسند ہوئی جس کو شریعت سے بالکل بھی لگاؤ نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا و رسول سے ہے خلاصہ یہ کہ کامل محبت کے دو اثر ہیں۔ ایک[1] دوامِ ذکر دوسرے[2] سہولتِ اطاعت اور یہی علامت کامل ایمان کی ہے۔ اگر ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں تو ہم کو اپنی حالت پر افسوس کرنا چاہیے۔ صاحبو! یہ تو بفضلہ تعالیٰ بلا غبار ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی محبت کامل کا دعویٰ بدون ذکر دائم اور سہولت اطاعت کے غلط ہے۔ اب یہ بات باقی رہی کہ آیا خدائے تعالیٰ اس محبت کاملہ کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ سو اس کو بھی سمجھ لو کہ درحقیقت خدا تعالیٰ ہی مستحق محبت ہیں۔ اور یہ ایسی ظاہر بات ہے کہ شریعت کے علاوہ عقل بھی اس کا فتویٰ دیتی ہے۔ اس لیے کہ محبت کے تین سبب ہوا کرتے ہیں:

یا تو یہ کہ کوئی شخص ہم پر احسان کرتا ہو اور اس کے احسان کی وجہ سے ہم کو اس سے محبت ہو۔ یا یہ کہ وہ خود نہایت حسین و جمیل ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف میلانِ خاطر ہو۔ یا یہ کہ اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو اور وہ کمال باعثِ محبت ہو۔

اب غور کیجیے کہ ان تینوں وجوہِ محبت میں سے کوئی وجہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ میں نہ پائی جاتی ہو۔ منعم وہ اتنے بڑے کہ کوئی ان کی برابر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ سب اس کی مخلوق و مملوک و محتاج ہیں۔

جمال ان کا اس حد تک ہے کہ کسی کو حاصل ہونا ممکن ہی نہیں۔ بڑے بڑے حسین و جمیل ان ہی کے حسن و جمال کے فیض سے حسین و جمیل بنے بیٹھے ہیں۔ ع

چہ باشد خود آں نگار کہ بندد ایں نگارہا

علیٰ ہذا صاحب کمال اتنے بڑے کہ علم کامل ان ہی کا ہے۔ نیز ہر صفت کمال علیٰ وجہ الکمال ان ہی میں پائی جاتی ہے۔ تو انعام و نوال حسن و جمال اور فضل و کمال ہر طرح سے عقلاً و نقلاً انہی میں ہے۔ پس وہی مستحق محبت ہیں۔

پس اپنے قلوب کو ٹٹولو کہ خدا تعالیٰ سے محبت کاملہ ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اس کی تحصیل کی تدبیر کرو۔ اور تدبیر بھی میں بتلاتا ہوں۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیجیو کہ محبت امر غیر اختیاری ہے اس کا پیدا کرنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ پھر اس کی تدبیر کیا؟ کیونکہ یہ گمان غلط ہے۔ محبت گو خود غیر اختیاری ہو مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ جن پر ترتب محبت کا عادۃً ضروری ہے اور ایسے امور میں خدا تعالیٰ نے ہر امر کی تدبیر بتلائی ہے۔ سو وہ تدبیر یہ ہے کہ تم چند باتوں کا التزام کر لو۔

ایک[1] تو یہ کہ تھوڑی دیر خلوت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔ اگرچہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو۔ لیکن اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔

دوسرے[2] یہ کیا کرو کہ کسی وقت تنہائی میں بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچا کرو اور پھر اپنے برتاؤ میں غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کیا معاملہ کر رہے ہیں اور ہمارے اس معاملہ کے باوجود بھی خدا تعالیٰ ہم سے کس طرح

پیش آرہے ہیں۔

تیسرے[۳] یہ کرو کہ جو لوگ محبانِ خدا ہیں ان سے علاقہ پیدا کرلو۔ اگر ان کے پاس آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت ہی جاری رکھو۔ لیکن اس خیال کا جاری رکھنا ضروری ہے کہ اہل اللہ کے پاس اپنے دنیا کے جھگڑے نہ لے جاؤ۔ نہ دنیا پوری ہونے کی نیّت سے ان سے ملو بلکہ خدا کا راستہ ان سے دریافت کرو۔ اپنے باطنی امراض کا علاج کراؤ اور ان سے دُعا کراؤ۔

چوتھے[۴] یہ کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام کی پوری پوری اطاعت کرو۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے۔

پانچویں[۵] یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ اپنی محبت عطا فرمائیں۔ یہ پانچ جز کا نسخہ ہے اس کو استعمال کرکے دیکھیے۔ انشاء اللہ بہت تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ سے محبت کامل ہو جائے گی۔ اور آپ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کے پورے مصداق ہو جائیں گے۔ (وعظ: المحبتہ)

اپنے اسلام پر ناز نہ کرے

فرمایا کہ کوئی اپنے عمل پر ناز نہ کرے اور نہ یہ سمجھے کہ چونکہ ہم بڑے عاقل ہیں اس لیے اسلام و ایمان سے مشرف ہیں، حضرت بڑے بڑے عاقل گمراہ ہیں اور بعضے جاہل راہ یاب ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ ہم اپنے اعمال کو اسی وقت تک کچھ سمجھ سکتے ہیں جب تک اپنے اُوپر نظر ہو اور جب حق تعالیٰ کی عظمت پر نظر ہو گی تو ہر شخص اقرار کریگا کہ میں نے حق تعالیٰ کا کچھ بھی حق ادا نہیں کیا۔ ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش	عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش	کس نتواند کہ بجا آورد

ہمارے اعمال کیا چیز ہیں؟ محض علامات میں سے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ظنی طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو نوازنا منظور ہے اور دوسرے کو نکالنا منظور ہے۔ باقی یہ اعمال موثر بہ تاثیرِ حقیقی ہرگز نہیں۔ (مظاہر الاقوال)

ہمارے اندر تکبّر اسی وقت تک ہے جب تک کہ خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں نہیں آتی اور اگر عظمتِ حق دل میں آجائے تو پھر یہ حال ہوگا۔ ؎

چو سلطانِ عزّت علم بر کشد جہاں سر بجیب عدم در کشد

پھر یہ سارے دعوے نیست و نابود ہو جائیں گے۔

(العبد الرّبانی ص ۲۳)

○

فصل (۲)

معرفت و محبّت الٰہیہ

محبّت میں عارفین کی حالت

اللہ تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے "جو تصویریں ذہن میں گزرتی ہیں وہ سب فنا ہونے والی ہیں۔ خدا تعالیٰ اس سے بہت برتر ہیں۔" ہم تو کیا سب سے بڑھ کر علم عارفین کا ہے۔ وہ بھی گو اول اول بہت دوڑتے ہیں اور جس قدر معرفت بڑھتی جاتی ہے ان کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے جس کی مثال ایسی ہے جیسے استسقاء کی بیماری والا کہ جس قدر پانی پیتا جاتا ہے پیاس بڑھتی جاتی ہے۔ اور اگرچہ اعتقاداً یہ جانتے ہیں کہ ذات منکشف نہیں ہو سکتی مگر شدتِ اشتیاق میں کچھ یاد نہیں رہتا اور برابر طلب میں لگے رہتے ہیں لیکن جب تھک تھکا کے ہر طرف سے لوٹتے ہیں تو پھر آخر یہی کہتے ہیں۔ ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں
کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(ارواح القیام صـ۵)

محبّت الٰہیہ

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از د خیزد
کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری ست
جمالِ شخص نہ چشم است و زلف و عارض و خال
ہزار نکتہ درایں کار و بار دلداری ست

مطلب یہ کہ جو جمال مدار ہے عشق کا وہ ایک کیفیت خاصہ ہے محبوب میں جو وجداناً مدرک ہوتی ہے یہ خط و خال وغیرہ مدار اس کا نہیں ہے۔ اسی کو دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

شاہد آں نیست کہ مو و میانے دارد　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اور اس میں ایک تحقیق عظیم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ بعض اہل ظواہر نے محبت الٰہیہ بمعنی میلان قلب و رجحان طبع کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس محبت کا سبب صرف حسن صورت ہوتا ہے اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے اس کا جواب اس طرح ہو گیا کہ ہم اس سبب کا انحصار حسن صورت میں تسلیم نہیں کرتے بلکہ سبب اصلی ایک جمال و کمال خاص ہے۔ جو علیٰ وجہ الکمال حضرت حق میں موجود ہے۔ بسط اس کا احیاء العلوم کی کتاب المحبۃ میں موجود ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔

(التکشف ص ۲۳۷)

تفویض

لوگ خدا و رسول کی مخالفت کریں تو اس پر رضا جائز ہی نہیں نہ اس پر سکوت کرنا تفویض کی فرد ہے بلکہ وہاں تو تادیب ہی عین تفویض ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہاں جب غلبۂ تفویض ہوگا تو اول اول حالت یہی ہوگی مگر تمکین کے بعد ہر حالت کے حقوق کو صحیح انداز سے ادا کرے گا، جیسے حضرت صدیق کی حالت تھی کہ باوجود کامل صاحب تفویض ہونے کے سلطنت کا انتظام کرتے تھے اور ایسا انتظام کیا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ تمکین کامل کا نتیجہ تھا۔

اور یہ منافی تفویض اس لیے نہیں کہ یہ سب منجانب اللہ مامور بہ یا ماذون فیہ ہیں تو امتثالاً للامر ان کو اختیار کرنا عین تفویض ہے۔

الا لہ الخلق والامر۔ جس کا حاصل یہ کہ تکوین اور تشریع دونوں قسم کے

تصرفات اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں وہی خالق ہیں وہی حاکم ہیں۔

حسن و کمال کا تقاضا عارفین کو حق تعالیٰ سے محض ان کے کمالات کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔ اگر ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہماری توجہ اور طلب کے بعد بھی حق تعالیٰ توجہ نہ کریں گے تب بھی وہ محبت و طلب سے نہیں رکتے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے کمال کا مقتضیٰ ہی یہ ہے کہ ان کو ہر حال میں چاہا جائے اور یاد کیا جائے۔ ؎

ملنے کا نہ ملنے کا وہ مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہیئے کہ تگ و دو لگی رہے

(النفحات صـ۳۰)

اب بھی اللہ کے عاشق ایسے موجود ہیں کہ ان کو دیکھا تک نہیں اور پھر ایسا عشق! اور تعجب ہی کیا ہے؟ مقناطیس لوہے کو پہچانتا نہیں مگر اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ ذات ہی ایسی ہے کہ کسی میں ذرا قابلیت ہو۔ وہ بالاضطرار ادھر کھنچتا ہے۔ (الافاضات ج۵ صـ۱۴۴)

مذاقِ عشق عاشق کو جو عارف بھی ہو کسی وقت یہ وسوسہ نہیں ہوتا کہ محبوب کو چھوڑ دے اس کی طلب ہر وقت ترقی پر رہتی ہے خواہ قبض ہو یا بسط، انعام ہو یا دشنام۔ اس کا مذاق یہی ہوتا ہے۔ اگر اس کو یقین بھی ہو جائے کہ جہنم میں جاؤں گا جب بھی عمل سے باز نہیں آتا برابر طلب میں بڑھتا رہتا ہے۔

(الحدود والقیود صـ۴۲)

اُن کی نظر میں پسندیدہ چیز وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہم سے لگاؤ کس کو ہے لہٰذا کام میں لگا رہنا چاہیے۔ اگر چہ ساری عمر بھی کامیابی نہ ہو۔ (الافاضات ج۷ صـ۴۱)

وصالِ تام ممکن نہیں

قلب مخفی ہے اور لطیفہ قلب اس سے زیادہ مخفی اگر کوئی ظاہر کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ عاشق چاہتا ہے کہ قلب نکال کر معشوق کے سامنے رکھ دے کہ وہ دیکھ لے کیونکہ محبت اس دل ہی میں ہوتی ہے اسی لیے تو عاشق چاہتا ہے کہ معشوق سے سینہ بسینہ ملے۔ یعنی اصل میں تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے دل کو اس کے دل سے ملا دے۔ مگر یہ گوشت پوست حاجب ہو جاتے ہیں۔ دل سے نہیں ملتا اس لیے سینہ ہی کے ملنے پر قناعت کرتا ہے۔ مگر دل کے نہ مل سکنے سے جس پر وصالِ تام موقوف تھا ہمیشہ حسرت ہی رہتی ہے۔ ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

غرض اس دل کو ملانا چاہتا ہے، دکھلانا چاہتا ہے، مگر قدرت سے باہر تو ایسا مخفی ہے اور اس حسرت اور وصلِ تام نہ ہو سکنے پر ایک نکتہ تصوف کا بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب مخلوق سے وصلِ تام ممکن نہیں تو خدا سے کہاں ہو سکتا ہے۔ اسی کو حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

در بزم عیش یک دو قدح درکش و برو
یعنی طمع مدار وصالِ دوام را

اور میں یہ بھی کہتا ہوں:

ع یعنی طمع مدار وصالِ تمام را

لیکن یہ حسرت اسی عالم میں ہے۔ اگرچہ وصالِ تام تو وہاں بھی نہ ہوگا لیکن سکون ہو جائے گا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہاں شوق کو متناہی کر دیا جائے گا گو مطلوب یعنی ذاتِ حق لامتناہی ہی رہے گی۔ اور چونکہ دنیا میں شوق بھی غیر متناہی ہے اس لیے سکون نہیں ہوتا۔ جتنا ملتا ہے اور شوق بڑھتا ہے۔ یہ فرق ہے نشاطِ دنیا

اور آخرت میں۔ بس دنیا میں بقدر شوق بھی وصال میسّر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے سالکین کو مشاہدہ یا معائنہ تام کا خیال کرنا محض ہوس ہے۔

مشاہدہ: توجہ الی الصفات ایسی ہو کہ اور چیز کی طرف توجہ بالکل نہ ہے

معائنہ: توجہ الی الذات ایسی ہو کہ ماسوا ذات کے کسی کی بالکل خبر نہ ہے۔

(الحدود والقیود)

حق تعالیٰ کی محبّت اضطراری نہیں

بھلا باپ ماں تو محبت و شفقت میں کسی درجہ میں مجبور بھی ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کی محبّت تو تمہارے ساتھ محض اختیاری ہے۔ اضطراری نہیں۔ پھر حیرت ہے کہ ہم کو اس کی قدر نہیں۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حق تعالیٰ کے تعلق کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسے طرز سے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی عاشق معشوق کی محبت میں بے قرار و بے تاب ہوا کرتا ہے۔ یہ سخت جہالت ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ اضطرار سے پاک ہیں۔ ان کو کسی کے ساتھ عشق کا تعلق نہیں جس سے بھی ان کو محبت ہے محض اختیاری ہے

اسی طرح بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ایسی کرتے ہیں جس سے آپؐ محض ایک معشوق معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی شانِ جاہ و جلال اور نبوّت و رسالت کی عظمت اس سے بالکل ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ بہت بے ادبی ہے۔ بھلا اگر کوئی شخص اپنے باپ کا خدوخال کھینچ دے اور اسے محض ایک معشوق بنا دے تو کیا باپ اس سے خوش ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ ایک بادشاہ کے ہیبت و شوکت و جاہ و جلال و شمشیر زنی و عقل و دانائی وغیرہ کا تذکرہ کر کے اخیر میں اتنا اور بھی کہہ دے کہ وہ حسین بھی ایسا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسن و جمال میں بھی بے نظیر تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو

سیرت کے ساتھ صورت بھی ایسی عطا فرمائی تھی کہ زمانہ کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ ؎

لواحی زلیخا لو رأین جبینہ
لآثرن بالقطع القلوب علی الید

مگر آپ کی تعریف میں اسی پر اکتفا کر لینا غلطی ہے۔ چاہیے کہ اول آپ کے اصلی کمالات ظاہر کیے جائیں پھر اس کی ساتھ حسن و جمال کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ بہر حال حق تعالیٰ کی محبت اختیاری ہے اضطراری نہیں اور اختیاری محبت زیادہ قابل قدر ہے۔ گو شرافت کا مقتضی تو یہ ہے کہ اگر کوئی اضطراراً بھی یا اپنی ضرورت سے یا بے خبری میں کسی کو نفع پہنچادے اس کا بھی احسان مانا جائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کا قرآن سن کر ان کی مدح فرمائی کہ اس نے مجھ کو ایک آیت یاد دلادی جو میں بھول گیا تھا۔ حالانکہ ان صحابی رضی نے اس نیت سے قرأت نہ کی تھی بلکہ وہ ویسے ہی نماز میں قرأت کر رہے تھے مگر حضور ؐ نے اس بے ارادہ احسان کا بھی شکریہ ادا کیا۔ اور حق تعالیٰ کی محبت تو اختیاری ہے۔ وہ تم کو بے خبری میں نفع نہیں پہنچاتے بلکہ ارادہ سے نفع پہنچاتے ہیں۔ پھر اس کے معاوضہ میں خدا تعالیٰ کو اپنی کسی غرض کا پورا کرنا مقصود نہیں کیونکہ وہ اغراض و حاجات سے پاک ہیں اس کا تو ضرور ہی احسان ماننا چاہیے۔

جان بخشی و جان دادن اور جب ان کی طرف سے ایسی جان بخشی کا برتاؤ ہے تو ہم کو بھی حق تعالیٰ کے ساتھ جان دادن کا یہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ ؎

ہمچو اسماعیل پیشش سر بنہ — شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ
نیز دیکھو شرط التذکر صت — (دہم الآخرۃ)

بخوشی اطاعت کا طریقہ

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرے۔ وہ بیشک بڑی کامیابی کو پہنچا۔ "یطع" میں اشارہ ہے کہ جو شخص خوشی سے کہنا مانے اس لیے کہ یہ طوع سے مشتق ہے اور خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک وقت مقرر کرکے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں ہیں چند روز کے بعد آپ کو مشاہدہ ہوگا کہ ہم سرتاسر عنایات اور نعمتوں میں غرق ہیں۔ اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہوگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ "یطیع" کا تعلق آپ سے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ محبت کا طریق بھی یہی ہے کہ حضورؐ نے جو ہمارے لیے مشقتیں اٹھائیں اور اپنی اُمّت پر شفقت فرمائی اس کو سوچا کرو۔ جب محبت پیدا ہوگی اطاعت خوشی سے ہوگی۔

(تسہیل الاصلاح ص ۱۶)

اللہ کے سامنے کسی کی پرواہ مت کرو

مصلحت اور پالیسی کی ضرورت وہیں ہوتی ہے جہاں دو مختلف طرف کے تعلق کو نباہنا پڑتا ہے کہ اس کو بھی راضی رکھنا ہے اور اس کو بھی۔ لہٰذا کچھ ادھر کی بات کہو اور کچھ ادھر کی۔ بس ایک کو لو اور سب کو ترک کردو اور اس کے سامنے کسی کی پرواہ مت کرو۔ معمولی عشقوں میں یہی ہوتا ہے اور خدا کا نام لینے والوں کے نزدیک تو دنیا و مافیہا بھی کچھ نہیں۔ کیسا ننگ اور کیسا نام! واللہ سب ہوا ہو جاتے ہیں۔ نخوت و ناموس کو تو یہ محبت پھونک دینے والی ہے۔ ان کا تو نام ہی نہیں رہتا۔ قیامت تک یہ مصلحت اندیشی عشق میں نہیں ہوسکتی کہ ہیلٹی ہوگی۔

عاشق کی نظر تو ایک ہی پر پڑتی ہے۔ دوسرا کوئی نظر میں ہوتا ہی نہیں جس کے سامنے ہیٹی ہو گی۔ (علم و عمل۔ آخر الاعمال ص۳۶)

نامرادی، عشق کی حقیقت

حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ بھائی جو بامراد ہونا چاہے وہ کسی اور بزرگ کے یہاں جائے اور جو نامرادی چاہے وہ ہمارے پاس چلا آئے۔ پھر چپکے سے فرمایا کہ جانتے ہو نامرادی کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں عشق۔ کیونکہ عاشق بوجہ طلب اور اشتیاق کے غلبہ کے ہر جگہ اپنے آپ کو ناکام اور بے مراد ہی سمجھتا ہے۔ وہ کسی حالت پر اور مقام پر قناعت نہیں کرتا۔ ہر وقت آگے بڑھنے کی طلب رہتی ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چشتیہ میں بعد تمکین کے بھی سوز و گداز رہتا ہے۔ (دین و دنیا: الکمال فی الدین ص۲۸۰)

معیارِ دیدارِ حسن

خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت محبت کا کوئی معیار ہی نہیں۔ فرمایا کیا معیار ہو سکتا ہے۔ عرض کیا ایسا ہی حسن ہے نہ اس کا کوئی معیار۔ فرمایا یہ بھی ایسی ہی چیز ہے اس کا بھی معیار مشکل ہے۔ ہاں جمال کا معیار تو ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ جمال تو تناسب اعضا کو کہتے ہیں جس کا ضابطہ ہے مگر حسن اور محبت کا کوئی معیار نہیں۔ عرض کیا کہ ایک مولوی صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر حسین چیز کو دیکھو تو اس میں کون سی مضرت ہے۔ ایک چیز خوبصورت ہے مثلاً لوٹا ہے جو خوبصورت اور حسین بنا ہوا ہے اس کے دیکھنے میں کیا مضرت اور کونسا گناہ ہے۔ ایسا ہی حسین آدمی کو دیکھنا۔ میں نے اس کا جواب دیا جو حضرت ہی کی فیضانِ صحبت کی برکت سے ذہن میں آیا وہ یہ کہ لوٹا جو خوبصورت ہے اس کے دیکھنے پر اس لیے گناہ نہیں کہ اس سے آگے کسی ناجائز تمتع کی ہوس نہیں ہوتی کیونکہ یہ محل شہوت نہیں ہو سکتا جو سبب بنے۔ مضرت اور گناہ کا مگر دوسری چیز

جس سے آگے چل کر تمتع ناجائز حاصل ہو سکتا ہو۔ اس وجہ سے کہ وہ محلِ شہوت ہے اس کے دیکھنے سے گناہ ہوگا۔ اس لیے ایسی چیز کی لوٹے سے مثال دینا صحیح نہیں ہو سکتی۔ حضرت والا نے سن کر فرمایا کہ بالکل ٹھیک جواب ہے۔ ماشاء اللہ۔

(الافاضات، ۱۱ شوال المکرم ۱۳۵۰ھ)

عشق مجازی

فرمایا کہ عشق مجازی عذاب ہے۔ عذاب سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ پھر فرمایا کہ یہ اکثر کم ہمتی سے بڑھ جاتا ہے۔ چونکہ اس کے خیال میں اور برتاؤ میں لذّت آتی ہے اس لیے اس کو دفع نہیں کرتا۔ پھر بڑھ جاتا ہے۔ عرض کیا گیا کہ ملتے جلتے رہنے سے تو معمولی بات ہو جاتی ہے۔ عشق مجازی میں اس سے بجائے کمی کے ترقی کیوں ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ ملنے میں تسلّی سی رہتی ہے معمولی نہیں ہو جاتا۔ مفارقت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بڑھ گیا، کم نہیں ہُوا۔ عرض کیا گیا کہ ایسا شخص اگر حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہو گیا تو اوروں سے بھی بڑھ جاتا ہوگا۔ فرمایا کہ بہت سے طرق ہیں، یہ بھی ایک طریق ہے۔ اس محبت کو اگر حق تعالیٰ کی طرف متصرف کر دے تو اس خاص کیفیت میں اوروں سے بڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ نفسِ حُب میں اوروں سے بڑھا ہُوا ہو۔ یہ محض ایک لون ہے محبّت کا۔ ممکن ہے کہ دوسرا لون اس سے اتم ہو۔ یہ اکثر ضعیف القلب لوگوں کو ہو جاتا ہے۔

(حسن العزیز جلد ۲ ملفوظ ۵۳۳)

مردُودیّت کی علامت

فرمایا کہ عشقِ صورت بھی ایک عذاب ہے عذاب۔ خصوص عشق امارد۔ بڑا سخت مرض ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب کسی کو مردُود کرنا ہوتا ہے تو اس کو عشق امارد میں مبتلا کیا جاتا ہے پس یہ عشق صورت گویا علامت ہے مردُودیت کی۔ تصوّف کا مسئلہ ہے کہ امردوں سے اختلاط نہ کرے اور عورتوں سے نرم باتیں نہ کرے۔ حق تعالیٰ کا

بھی ارشاد ہے لَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ اس سے تائید ظاہر ہے۔ پھر فرمایا کہ عشق مجازی ظاہر میں بھی تو ایک نہایت مصیبت اور کلفت کی چیز ہے۔ برخلاف عشق حقیقی کے کہ اس میں سراسر راحت و اطمینان ہے اور اس میں بھی جو کچھ ظاہری کلفت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بھی ایک نور ہوتا ہے پریشانی مطلق نہیں ہوتی

(حسن العزیز جلد ۲، ملفوظ ۵۵۰)

عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہیے

بعضے ایک اور جہالت میں گرفتار ہیں، کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں ہمیں جنت و دوزخ سے کوئی سروکار نہیں اس لیے ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے عمل تو وہ کرے جو جنّت کو لینا چاہے۔ ہمیں اس سے مطلب ہی نہیں ہم تو ذات کے عاشق ہیں خوب سمجھ لیجئے کہ ذات کے عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہیے جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے۔ ذات کی طلب میں تو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ کے قرب کے لیے اور زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔

(وعظ: خیر المال للرجال ص۱۱)

۸ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ کی محبت میں نہایت مضبوط ہونا چاہیے اور خدا تعالیٰ کی برابر کسی کی محبت اس کے دل میں نہ ہونی چاہیے۔ اب اپنی حالت کو دیکھیے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو اشدّیت محبت کس درجہ کی ہے اور اس میں کلام ہی نہیں کہ آپ کو اشدیت محبت حاصل ہے اور یہ بالکل نئی بات ہے ورنہ سب واعظین یہی کہتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں تو گویا میں نے آپ کو یہ نئی بشارت دی ہے یعنی اگر کوئی شخص فاسق، فاجر، گنہگار، شرابی بھی ہے تو اس

میں بھی اشدیت محبت کی ہے۔ لیکن باوجود اس اشتراک کے پھر بھی مراتب اس
کے مختلف ہیں کیونکہ ہر اشدیت برابر نہیں ہوتی اور اشتراک اشدیت اگرچہ اس وقت
محسوس نہیں ہوتا لیکن امتحان کے موقع پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی
مسلمان کے سامنے کوئی شخص خدا تعالیٰ کی شان میں یا اس کے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے تو اگرچہ وہ مسلمان نہایت درجہ کا ضعیف الایمان
ہو لیکن اس گستاخی کو سن کر اس قدر بے چین ہو جاتا ہے کہ ماں کی گالی سننے کے
بعد بھی اتنا بے چین نہیں ہوتا اور اس درجہ کی بے چینی بدون اشدیت محبت کے
نہیں ہو سکتی۔ پس معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے اشد محبت ہے۔ اگر
ضعیف محبت ہوتی تو اس قدر بے چین نہ ہوتا۔ گو بے چینی کسی نہ کسی مرتبہ میں اس
وقت بھی ہوتی۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کا ایک پیسہ گم ہو جائے تو
اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور اگر کسی کا ایک روپیہ گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا
ہے اور کسی کی گنی گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور دس گنی گم ہو جائیں تو
اس کا بھی قلق ہوتا ہے۔ لیکن پیسہ کے گم ہونے کا قلق ضعیف ہوتا ہے اور روپیہ
کے گم ہونے کا قلق شدید، اور گنی کے گم ہونے کا قلق اشد ہوتا ہے اور دس گنی کا
اشد سے بھی اشد ہوتا ہے۔ غرض کوئی فاسق بھی شدت محبت سے خالی نہیں
ہے۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں فسق کی اجازت دیتا ہوں مگر جو بات واقعی
ہے اس کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم تو خود اسلام کے ساتھ
تمسخر کیا کرتے ہیں اور ہنسا کرتے ہیں اور ہم کو ذرا بھی بے چینی نہیں ہوتی تو ایمان
کے لیے شدت محبت لازم کہاں ہوئی تو میں کہوں گا کہ خدا کی قسم اگر کسی شخص کی
یہ حالت ہے تو وہ ہرگز مسلمان نہیں۔ اگرچہ وہ اپنی زبان سے اپنے کو مسلمان
کہے اور اگرچہ وہ کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہو۔ اور اس وقت ایسے بہت سے

لوگ ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کو ذرا بھی پروا اس بات کی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ دیکھو اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرنے لگے تو وہ کتنا بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے تو کیا یہ توہین عدالت کی توہین کی برابر بھی نہیں ہر عقل شناس جانتا ہے کہ عدالت کی توہین سلطنت کی توہین ہے۔ اسی طرح اسلام کے کسی حکم کی توہین شارع علیہ السلام اور ربانی اسلام یعنی خدا تعالیٰ کی توہین ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ کی توہین کرنے کے بعد بھی ایمان نہیں گیا تو گویا ایمان سریش اور گوند ہوا کہ وہ ایسا چپکا ہے کہ کسی طرح چھوٹتا ہی نہیں۔

صاحبو! اسلام ایسا سستا اور اتنا بے غیرت نہیں کہ اس کو کوئی شخص دھکے بھی دے اور وہ نہ ٹلے۔ آج اکثر مسلمان روزے کو نماز کو فاقے اور اٹھک بیٹھک کہتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ حالانکہ کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔ آخر ضابطہ اور حدود بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں؟ یہ اچھا اسلام ہے کہ تمسخر اور اہانت کرنے سے بھی نہیں جاتا!

بہر حال یہ مسئلہ بلا غبار ثابت رہا کہ جو مسلمان ہوگا اس کو خدا تعالیٰ سے شدتِ محبت ضرور ہوگی لیکن اس میں درجات متفاوت ہوں گے۔ اب آپ اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھیے کہ آپ میں کس درجہ کی محبت ہے۔ سو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے کیونکہ اس کے کچھ آثار ہوتے ہیں کہ وہ آثار جس مرتبہ میں پائے جائیں محبت بھی اسی مرتبہ میں ہوگی اور یہ گویا محبت کے پرکھنے کی کسوٹی ہے کہ جس طرح چاندی کا کھوٹا کھرا ہونا کسوٹی سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح محبت کا کم اور زیادہ ہونا ان آثار سے معلوم ہوگا اور یہی کسوٹی ہے جس کو حافظ علیہ الرحمۃ نے بیان فرمایا ہے۔

خوش بود کہ محک تجربہ آید بمیاں   تا سیہ روئے شود ہر کہ در و غش باشد

حقیقت یہی ہے کہ بدون امتحان کے پتہ نہیں چل سکتا۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہم نے اپنے کو جانچا یا نہیں۔ اگر نہیں جانچا تو اب جانچنا چاہیے اور اپنے افعال و اقوال کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ وہ شدت محبت کے آثار ہیں یا نہیں۔ اور اگر آثار یوں سمجھ میں نہ آئیں تو آثار دنیا کے نظائر پر قیاس کر کے دیکھیے یعنی اگر دنیا میں کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے کیا آثار ہوتے ہیں۔ سو آثار اس کے یہ ہوتے ہیں کہ اول تو ہر وقت کی یاد کہ کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا جس میں محبوب کی یاد سے دل پر نہ ہو۔ دوسرے نہایت خوشی سے اطاعت کرنا اور اس میں ذرا بھی کلفت نہ ہونا مثلاً اگر وہ گھر بھر بھی مانگ لے تو اس میں کچھ بھی دریغ نہیں ہوتا پس جب یہ دو چیزیں آثار محبت سے ہیں تو انہیں کو پیش نظر رکھ کر اپنے کو جانچ لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ چوبیس گھنٹے میں کتنی دیر آپ خدا کو یاد کرتے ہیں خاص کر جبکہ ہر وقت اس کی نعمتوں میں بالکل سرتاپا غرق بھی رہتے ہو جن سے ہر وقت یاد آجانا طبعاً بھی ضروری ہے۔

صاحبو! یہ باتیں بھولنے کی نہیں ہیں کہ خدا تعالیٰ کے دیے ہوئے مکانوں میں رہتے ہو اس کا دیا ہوا کھانا کھاتے ہو۔ اس کی دی ہوئی اولاد سے متمتع ہوتے ہو لیکن اس کو یاد نہیں کرتے۔ دیکھو اگر کوئی دوست تم کو دو آم بھیج دے تو ان کو کھاتے وقت دل میں اس کا تصور ضرور ہی رہتا ہے۔ ذرا انصاف سے بتائیے خدا تعالیٰ کا دیا ہوا کھانا دونوں وقت تمہارے سامنے آتا ہے لیکن تم نے کسی وقت بھی کھاتے وقت خدا تعالیٰ کو یاد کیا ہے؟ ہزار کھانا کھا جائیں گے لیکن کسی لقمہ پر بھی یہ خیال نہیں ہوگا کہ یہ خدا کی دی ہوئی نعمت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بوجہ عقیدہ درست ہونے کے کسی کے پوچھنے پر ہم کہہ دیں کہ یہ خدا تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے۔ کیوں صاحبو! پھر کیا اسی منہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ

سے شدت محبت کا درجہ مطلوب ہے اور ہم کامل ایماندار ہیں۔ دیکھ لیجیے کہ اس کی علامتیں کس حد تک ہم میں پائی جاتی ہیں اور اگر کوئی کہے کہ ہم میں محبت کے خواص مشترک تو پائے جاتے ہیں جو ادنیٰ مسلمانوں میں بھی مشترک ہیں۔ مثلاً یہی کہ اس کی شان میں گستاخی سن کر بے چین ہو جانا تو میں کہوں گا کہ آپ کو ان مشترک خواص پر قناعت ہے؟

صاحبو! ذرا غور کر کے دیکھو کہ تمہارے پاس سوائے دولت ایمان کے اور دھرا کیا ہے۔ پھر اگر اس کے بھی ادنیٰ درجہ پر قناعت کر لو تو غضب ہے! اور اگر کسی کو دولت دنیا پر ناز ہو اور اس لیے دولت ایمان کے کمال کا طالب نہ ہو تو یاد رکھو کہ یہ دولت بہت جلد تم سے چھوٹ جانے والی ہے۔ (آثار المحبۃ)

محبّت کے تقاضے

مجھے حاجی صاحب رح کی ایک بات یاد آئی کہ بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنّا آپ کے سامنے ظاہر کی تو فرمایا کہ میاں تمہارا بڑا حوصلہ ہے جو حضور کے دیکھنے کی تمنا ہے ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ گنبد خضراء ہی کی طرف نظر کر لیں۔ یہ نیازمندی کا غلبہ ہے اور عاشق کو نیازمند ہی ہونا چاہیے۔ اسی کو ایک عاشق اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود
کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

ہماری نگاہ اور محبوب کے چہرہ پر پڑے بڑی حیرت ہے۔ کہاں ہماری ناپاک نگاہ وہ پاک چہرہ، اسی کو بوعلی قلندر فرماتے ہیں۔ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

اپنی آنکھ اور کان سے بھی غیرت آتی ہے۔ آخر یہ کیا بات ہے۔ وہی نیاز مندی جب نیاز کا غلبہ ہوتا ہے تو محبوب کو دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

(وعظ: الصلات والصلوٰۃ)

(تھانہ بھون ۲ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ)

محبت سے خلوص بہت جلد حاصل ہوتا ہے

عشق و محبت وہ چیز ہے جو محبوب کے سوا ہر چیز کو جلا پھونک کر رکھ دیتی ہے اور عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی فعل و قول غیر کے لیے نہیں ہوتا وہ جو کچھ کرتا ہے محبوب کے لیے کرتا ہے: اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ۔

اس طریق عشق سے اخلاص بہت جلد حاصل ہوتا ہے۔ پھر محبت کے بعد عادتاً کچھ خطرہ نہیں رہتا کیونکہ جب بندہ کو خدا سے محبت ہوتی ہے تو ان کو بھی اس سے محبت ہوتی ہے بلکہ وہ اپنا عشق اسی کو دیتے ہیں جس سے پہلے ان کو محبت ہوتی ہے۔ مگر عاشق کے عشق کی اور شان ہوتی ہے۔ یہ تو دنیا میں غل مچا دیتا ہے اور محبوب کی محبت کی دوسری شان ہے۔ (الحدود والقیود ص۳۴)

رویتِ حق

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ وہ رویتِ حق جس سے تشنگی کم ہو وہ جنت میں ہی ہوگی اور یہاں تو یہ کیفیت ہے جیسا کسی نے کہا ہے ؎

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق   گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

اور یہ عشق ہے ہی ایسی چیز کہ اس کے ہوتے ہوئے عاشق کو کہاں راحت اور کہاں چین۔ ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

(الافاضات ج۵ ص۱۱۹ ملفوظ ۱۹۶)

محب کی نظر

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اگر کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کی ہر ادا محبوب معلوم ہوتی ہے۔ محب کی نظر میں محبوب کی شان بچے جیسی ہوتی ہے کہ وہ نوچے کھسوٹے سب ادا پیاری معلوم ہوتی ہیں اور اگر یہی حرکات کوئی بڑا کرے ناگوار ہوں گی۔ میں خود اپنا حال بیان کرتا ہوں۔ ایک شخص ایک بات کرتا ہے ناگوار معلوم ہوتی ہے دوسرا وہی بات کرتا ہے اچھی تو کیا مگر ہاں ناگواری نہیں ہوتی۔ بجز محبت کے اس کا کوئی ضابطہ نہیں حدود نہیں، واللہ العظیم محبت وہ چیز ہے کہ عتاب اور غصہ پر بھی پیار معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصہ پر پیار آتا ہے

محبت کے معاملات کی اور ہی شان ہوتی ہے اور اس پر قانون سے کوئی ملامت ہی نہیں ہو سکتی۔ گو خشک علماء نے اہل محبت پر بہت کچھ طعن و تشنیع کیے ہیں مگر ان کے ایسا کرنے کا سبب محبت کی حقیقت سے بے خبری ہے۔ ان کو اس کوچہ کی ہوا ہی نہیں لگی۔

ملفوظ: الافاضات الیومیہ
یکم شوال المکرم ۱۳۵۰ھ

سچی اور جھوٹی محبت کے آثار

جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں نماز پڑھو تو آپ کہتے ہیں صاحب میں تو نہیں پڑھتا، جب زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں تو کہتے ہیں میں نہیں دیتا، جب روزہ کے لیے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں میں نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب خلاف شرع لباس سے، شرک سے، بدعت سے منع کیا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ نہیں صاحب میں تو نہیں مانتا اور کہنے کو اللہ کے عاشق ہیں۔ زبان پر ہے ہائے اللہ، ہائے اللہ! یہ اچھے عاشق ہیں

صاحب! میں کہتا ہوں کہ جیسے مخلوق کی محبت تھی کہ محبوب کو دیکھتے ہی رہ نہ سکا بدون ہاتھ پاؤں چومے، بدون لپٹے، بدون قدموں پر گرے، بدون تلوے چاٹے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائیے، گر پڑیے۔ تعریف کرنے سے کیسے رہا گیا؟ اگر محبت ہوتی تو تعظیم کے کلمات بھی کیوں نہ زبان سے نکلتے، جھک بھی کیوں نہ جاتا، سجدہ میں بھی کیوں نہ گر پڑتا، اسی کا نام تو نماز ہے۔ تو نماز تو پڑھتے نہیں اور اللہ کے عاشق ہیں، اچھے عاشق ہیں۔ کوئی شعر سناتا تھا، گانا بجانا سنتا تھا اس پر کودنے لگے۔ بس عاشق ہیں۔ اگر یہی ہے تو پھر سانپ بھی اولیاء اللہ ہیں۔ کیوں کہ جب بین کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی مست ہو جاتے ہیں۔ آدمی کیا بہت سے جانور بھی گانے بجانے پر عاشق ہیں۔ بھلا یہ کوئی محبت ہے۔ محبت تو وہ چیز ہے کہ خدا کی قسم نہ گانے کی ضرورت نہ بجانے کی اور بے چین ہیں۔ ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند
برآوازِ دولاب مستی کنند

بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں وہاں تو ہر وقت یہ حالت ہے: ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

ان کی تو یہ حالت ہے کہ ان سے ذرہ برابر نافرمانی نہیں ہوتی۔ حضرت عشق و محبت تو یہ ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں یعنی صرف عمل نہیں بلکہ سخت سے سخت محنت کا کام کرتے ہیں۔ (طریق القلندر ص ۵۳)

جذبۂ عشق اور ذوق حضوری

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند

لفظِ دیوانہ سے اس امانت کے برداشت کرنے کی لِم کی طرف اشارہ ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان میں محبت اور عشق کا مادّہ رکھا ہے اور سوائے اس کے اور مخلوقات میں یہ مادہ اس درجہ کا نہیں۔ یہ امر دوسرا ہے کہ ہر شے کو اپنے خالق کے ساتھ تعلق ہے۔ لیکن وہ تعلق دوسری قسم کا ہے۔ پس چونکہ زمین و آسمان و جبال میں ایسا مادہ محبت کا نہ تھا اس لیے جب ان پر امانتِ الٰہی پیش کی گئی تو بوجہ عدمِ محبت کے اس خطاب میں ان کو لذّت نہ آئی اور اپنی نااہلیت کا اظہار کیا اور حضرتِ انسان میں چونکہ دیوانگی اور عشق رکھا تھا اس لیے اس نے آگے بڑھ کر فوراً عرض کیا کہ حضرت اس بار کو میں لیتا ہوں۔ مجھے دے دیجیے۔ یہ سمجھا کہ اور کچھ نہیں تو اس بہانہ سے بات ہی کرنے کا موقع ملا کرے گا۔ بقول کسی شاعر کے۔ ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد　　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(الغضب، ص ۹)

حدیث گریہ حضرت ابی بن کعب رضؓ

حضرت استاد (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) اس حدیث کا درس دے رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضؓ صحابی سے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا مجھ کو حکم ہوا ہے کہ تم کو سورۂ بیّنہ "لم یکن الذین کفروا" سناؤں۔ صحابی نے سوال کیا "آللہ سمّانی" کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر ارشاد فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ اس پر صحابی رضؓ رونے لگے۔ تو وہ طالب علم کہتا ہے کہ یہ تو ہنسنے کی بات تھی نہ کہ رونے کی۔ مولانا نے فرمایا "جا بھدّے"۔ واقعی ایسے عدیم الذوق کو کوئی کیا سمجھائے۔ مولانا شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کے شیخ کی مجلس میں ایک منکر آیا دیکھا کہ سب اہلِ مجلس رو رہے ہیں۔ کہنے لگا یہ سب محروم ہیں جبھی تو رو رہے ہیں۔ اس

پر شاہ صاحب کو جوش آیا اور ایک رسالہ بنام ہفت گریہ لکھا۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک رونا محرومی کا ہے اور ایک رونا خوشی کا ہے کیونکہ کبھی غایت فرح سے بھی آنسو بہنے لگتے ہیں اور ایک بکا (رونا) دونوں سے عالی ہے جس کا نام گرم بازاری عشق ہے پھر اس پر حضرت عارفؒ کا یہ قطعہ لکھا۔ عارف کے کلام میں مسائل سلوک بہت کثرت سے ہیں۔ ؎

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا صد نالہ ہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

غرض ایک رونا جوششِ عشق کا بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ صحابی اس بات کو سن کر رونے لگے کہ حق تعالیٰ نے ان کا نام لے کر فرمایا ہے کہ ان کو فلاں سورت سناؤ جس پر ایک بھدّے نے کہا کہ یہ تو ہنسنے کی بات تھی — ارے تم کیا جانو کہ اس سے عاشق کے کلیجہ پر کیسا تیر چل گیا! عارفین کے دل پر جو گزرتی ہے۔ اس کو کوئی کیا جانے ہے وہ تو ان کو روتا ہوا دیکھ کر یہی سمجھتا ہے کہ ہائے بیچارے محروم ہیں خصوصاً چشتیہ کو دیکھ کر، کیونکہ یہ تو ہمیشہ افروختن و سوختن ہی میں رہتے ہیں۔ یہ عین وصل میں بھی روتے ہیں۔ (الاستمرار التوبہ صہ ۳۹)

کام بننے کی ترکیب فرمایا کہ اگر چاہتے ہو کہ کچھ کام بنے اپنے کو مٹاؤ، پستی اختیار کرو، گریہ اور زاری، دعا، التجاء، الحاح وبکا اپنا شغل بناؤ، دیکھو پھر کیا ہوتا ہے۔

کام تو موقوف زاریٔ دل است
بے تضرع کامیابی مشکل است (الافاضات ۶ صہ ۴۲)

حقیقی عذاب | عاشق کے نزدیک ظاہری تکالیف کا نام عذاب ہے ہی نہیں وہ صرف فراق اور ناراضیٔ محبوب کو عذاب سمجھتا ہے:

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیرِ کنعان گفت
فراقِ یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیثِ ہولِ قیامت کہ گفت واعظ شہر
کنائیتیست کہ از روزگارِ ہجراں گفت

اور راز اس میں یہ ہے کہ رضا و تفویض و محبت و معیت کی لذّت میں وہ آلام و تکالیف ایسے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ان کا اثر معتدبہ محسوس نہیں ہوتا۔

(تعمیم التعلیم)

خدا کے مخلص بندوں کی حالت | جو خدا کے مخلص بندے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ ان پر کچھ بھی گزر جائے مگر ان کو حق کے مقابلہ میں سب ہیچ معلوم ہوتا ہے: ؎

کشند از برائے دلے بارہا
خورند از برائے گلے خارہا

اور پھر چاہے طلب اور جستجو میں عمر بھی ختم ہو جائے مگر گھبراتے اکتاتے نہیں کیونکہ ان کی طلب طلبِ صادق ہوتی ہے اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ محبوب اور مطلوب کون ہے۔

(اکمال الصوم ص۱۷)

محبّین کا طریقہ | باوجود اعمالِ صالحہ کے بھی ڈرنا چاہیے۔ طاعت کر کے ڈرنا ان لوگوں کا طریقہ ہے جو خدا سے محبت رکھتے ہیں

(شوق اللقاء ص۱۸)

مراد اور نامرادی میں مزہ | ارے مراد میں تو مزہ ہے ہی مگر نامرادی میں بھی ایک

مزہ ہے وہ یہ کہ محبوب نے تو دیکھ لیا کہ ہم نے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا۔ کیا یہ تھوڑی دولت ہے کہ تم ان کے خریداروں میں داخل ہو گئے گونا کام ہی خریدار سہی۔

(دنیا و آخرت صفحہ ۲۶۴)

عشق و محبت کی خاصیت

عشق بھی عجیب چیز ہے کیا کچھ نہیں کرا دیتا۔ اس میں آدمی آبرو، مال جان سب کچھ دے بیٹھتا ہے۔ کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ ہم میں اسی کی کمی ہے۔ ورنہ جس کے اندر یہ حالت پیدا ہو جائے اس پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

(الافاضات ج ۳ صفحہ ۱۶۷ ملفوظ ۲۶۰)

خوشا رسوائی کوئے ملامت

اطاعت حق کرنے والے کو لوگ طعن و ملامت کریں تو کچھ پروانہ کرنی چاہیے پختگی کا ذریعہ ہے۔

ع خوشا رسوائی کوئے ملامت

ضد ہی کی بدولت جد پیدا ہوتی ہے۔ (حسن العزیز ج ۲ ملفوظ ۸۸)

طلب حق کی مطلوبہ حالت

محبت میں اعلیٰ درجہ کی حالت یہ ہے کہ عقلاء زمانہ بیوقوف کہا کریں اور دیوانہ سمجھا کریں۔ یہ تو بڑے فخر کی بات ہے ایسی دیوانگی تو مطلوب ہے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد   مرعسس را دید و در خانہ نشد

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم   مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

اور حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی   بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں   شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

بلکہ اگر وہ جنون کم ہو جائے تو غم ہوتا ہے اور جب وہ پھر عود کرتا تو خوش ہو کر فرماتے ہیں۔

بازدیوانہ شدم من اے طبیب　　بازسودائی شدم من اے حبیب
باز آمد آبِ من درجوئے من　　باز آمد یارمن درکوئے من

خوش ہوتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ دیوانگی پھر آگئی اور عقل کو یوں خطاب کرتے ہیں۔ ؎

آزمودم عقلِ دوراندیش را　　بعدازیں دیوانہ سازم خویش را

تو حالتِ مطلوبہ یہ ہوئی کہ طلب میں ایسی حالت ہو جائے کہ لوگ دیوانہ سمجھنے لگیں۔ حدیث میں تو آتا ہے حصن حصین میں ہے اذکروا اللہ حتی یقولوا انہ لمجنون۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اتنی یاد کرو کہ لوگ پاگل کہنے لگیں۔

(طریق القلندر ص ۳۸-۳۹)

محبت کے ذریعہ حقوق کامل طور پر ادا ہوتے ہیں

یہ عشق ہی وہ چیز ہے جس سے محبوب کے حقوق بتمامہ اور بکمالہ ادا ہوتے ہیں۔ میں اسی لیے کہا کرتا ہوں کہ حق جل علیٰ شانہٗ کے ساتھ محبت پیدا کرنے کی کوشش کرو اور اس کا سہل ذریعہ اہلِ محبت کی صحبت ہے۔ جب اس صحبت کے حقوق ادا کیے جائیں۔

(الافاضات ج ۶ ص ۲۱)

فصل (۳۱)

احوال و اقوالِ اہلِ محبّت

عشق و محبّت کی خاصیّت یاد رکھو دو چیزیں دل سے نہیں نکل سکتیں، ایک مرغوب اور ایک مرہوب۔ ہمارے استاد فرماتے تھے کہ شوقِ علم تپ دق ہے یا تو ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے تو پھر دل سے نکلتا نہیں۔ تو یہ شوقِ علم جنم روگ ہے۔ بلکہ محبت و رغبت کسی شے کی ہو جنم روگ ہی ہے۔ جب کسی سے ایک بار محبت ہو جاتی ہے پھر وہ مرتے دم تک نہیں نکلتی مگر محبت ہونا چاہیے۔ پھر اگر محبوب سے وصال بھی نہ ہو تو اس کے ذکر میں وہ لذت آتی ہے کہ یاد ہی کافی ہو جاتی ہے۔ پھر یہ یاد دل میں ایسی پیوستہ ہو جاتی ہے کہ اگر اس سے روکا جائے تو وہ باز نہیں آتا۔ مجنوں کا قصہ ہے کہ اس کا باپ اس کو مکہ معظمہ لے گیا اور کہا کہ بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دعا کر کہ خدا تیرے دل سے لیلیٰ کا خیال نکال دے، تو وہ کہتا ہے۔ ؎

یارب لا تسلبنی حبّہا ابدا ویرحم اللہ عبداً قال آمینا
الٰہی تبت من کل المعاصی ولکن من حب لیلیٰ لا اتوب

جب عشقِ مجازی میں یہ کیفیت ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی محبت میں کیا حال ہونا چاہیئے۔ حقیقت میں عارفین کو حق تعالیٰ سے محض ان کے کمالات کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔ اگر ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہماری توجہ و طلب کے بعد بھی حق تعالیٰ

توجہ نہ کریں گے یا وصال سے مشرف نہ فرمائیں گے۔ تب بھی وہ محبت وطلب سے نہیں رکتے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے کمال کا مقتضی ہی یہ ہے کہ اُن کو ہر حال میں چاہا جائے اور یاد کیا جائے۔ ؎

ملنے کا نہ ملنے کا وہ مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہیے کہ تگ ودو لگی رہے

(النفحات صفحہ ۳۱-۳۰)

اللہ تعالیٰ سے تعلق حاصل کرو، ہر وقت ان سے لو لگائے رکھو، کسی وقت غافل نہ ہو، کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً تمہاری طرف متوجہ ہوتے رہتے ہیں تو ایسے وقت میں تمہارا غافل رہنا ستم ہوگا۔ ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(النفحات صفحہ ۳۸)

خشیت الٰہی

میرے ایک دوست نے ایک شخص کی حکایت بیان کی جو مارہرہ کا رہنے والا تھا اور بازیوں کا جامع اور ساری بدمعاشیوں کا مجموعہ تھا۔ جتنے بُرے کام تھے سب اس کے اندر موجود تھے۔ مگر ایک دن دفعتاً اس کی زبان سے یہ نکلا کہ ہائے میرا کیا انجام ہوگا؟ اس کے بعد زبان تو بند ہوگئی اور آنکھوں سے دریا کا دہانہ کھل گیا۔ ؎

یارب چہ چشمۂ ایست محبت کہ من ازاں
یک قطرہ آب خوردم ودریا گریستم

غرض روتے روتے اس کا بُرا حال ہوگیا نہ کھانے کا رہا نہ پینے کا۔ تین روز تک برابر روتا رہا اور تین دن کے بعد مرگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوف الٰہی نے اس کے جگر

کے ٹکڑے کر دیئے اور دل پھاڑ دیا تھا اس لیے واقعی وہ شہید اکبر ہوا۔ محبت کا تیر بھی عجیب ہے کہ جب کسی کے لگتا ہے تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کہاں سے آیا، کدھر سے آیا۔ مگر دل و جگر سے پار ہو جاتا ہے۔ ؎

درونِ سینہ ام زخم بے نشاں زدہ
بحیر تم کہ عجب تیر بے کماں زدہ

(الحج صہ۶)

محبّت کے کرشمے

حضرت لقمان علیہ السّلام کی حکایت ہے۔ ان کی نبوت میں علماء کا اختلاف ہے۔ مگر ولایت متفق علیہ ہے۔ یہ ایک کسی رئیس کے باغ میں ملازم ہو گئے۔ ایک روز وہ رئیس اپنے باغ میں سیر کو گیا۔ حضرت لقمان سے کہا کہ ایک ککڑی توڑ لاؤ۔ یہ توڑ لائے۔ رئیس نے تراش کر ایک ٹکڑا ان کو دیا انھوں نے کھا لیا جب آقا نے منہ میں رکھا تمام مُنہ کڑوا ہو گیا۔ آقا نے کہا کہ بندۂ خدا اس قدر تلخ چیز کو جو مثل زہر کے معلوم ہوئی تُو کھا گیا اور تیوری سے بھی محسوس نہ ہو سکا کہ یہ تلخ ہے۔ حضرت لقمان نے جواب دیا کہ جس آقا کے ہاتھ سے ہزارہا قسم کی نعمتیں قسم قسم کے ذائقوں کی کھائیں۔ اگر آج اس کے ہاتھ سے ایک تلخ چیز کھالی تو کیا اس پر مُنہ بناتا اس کو منہ پر لاتا۔ اسی طرح خدا کے ساتھ جو مسلمان کا تعلق ہے اس کی یہی شان ہونا چاہیے۔ اور صاحب اللہ کی تو بڑی شان ہے۔ ایک عورت سے کسی کو تعشّق ہو جائے اس میں گوارا ناگوارا سب کچھ سہتا ہے اور زبان پر حرفِ شکایت تک نہیں لاتا۔ جان، مال، جاہ سب ہی کچھ فدا کر دیتا ہے یہ سب محبت کے کرشمے ہیں۔ اسی لیے کہا کرتا ہوں خصوص جدید تعلیم یافتوں کو جن کو دوسری اصطلاح میں نئی روشنی والے کہا جاتا ہے کہ تمہارے تمام اعتراضات اور شبہات کا پہاڑ محض محبتِ حق کے نہ ہونے کی وجہ سے تمہارے سامنے ہے۔

محبت پیدا کرو، تمام شبہات اور اعتراضات خود بخود ایک دم کافور ہو جائیں گے۔
رہا محبت کے پیدا کرنے کا طریق سو وہ اہلِ محبت کی صحبت ہے۔ بدون اس کے کام بننا مشکل ہے

قیل و قال کے راستہ کی مثال

اور گو ان شبہات کے ازالہ کا دوسرا طریق بھی ہے یعنی تحقیق قالی مگر اس میں اور محبت میں جو تفاوت ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک جنگل میں بہت ہی کچھ جھاڑ جھنکاڑ کھڑے ہیں۔ ایک شخص ان کو صاف کر کے زراعت کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کے صاف کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ درانتی لے کر جائے اور ایک ایک درخت خاردار کو کاٹے اس پر جو مشکلات کا سامنا ہوگا۔ ظاہر ہے اور پھر بھی کامیابی یقینی نہیں ممکن ہے۔ اس صاف کرنے ہی میں اتنا وقت لگ جائے کہ زراعت کی فصل ہی ختم ہو جائے۔ یہ حالت تو قال و قیل کی ہے۔

محبت کے راستہ کی مثال

اور ایک یہ صورت ہے کہ دیا سلائی لے جا کر ہوا کے رخ کھڑے ہو کر اس کو گھس کر جھاڑ کو دکھلائے اور گھر آ کر سو رہے۔ صبح کو دیکھیے گا کہ جنگل صاف ہے بلکہ وہی جلا ہوا کھاد کا کام دے گا۔ یہ حالت آتشِ محبت کی ہے۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ ان شبہات اور اعتراضات سے جو قلب لبریز ہے اس میں حضرتِ حق کی محبت کی آگ پیدا کر لو۔ وہ دیا سلائی اہلِ محبت کے پاس ہے۔ اس کے مل جانے کے بعد تم کو محض گھس کر لگا دینا ہوگا۔ پھر اس کے سامنے کسی خس و خاشاک کا ٹھہرنا مشکل ہوگا۔

سماع میں موت کی تمنا

فرمایا کہ بعض اہلِ عشق نے خاص حالت کے ساتھ تمنا موت کی ہے یعنی یہ تمنا کی کہ ہم کو حالت سماع میں موت آئے کیونکہ سماع میں محبت و عشق کو خاص ہیجان ہوتا ہے۔ گویا اس وقت

محبت کی تلوار بہت تیز ہو جاتی ہے تو سماع کا مارا ہُوا شہیدِ شمشیرِ محبت ہے۔ اس وقت موت نہایت لذّت کے ساتھ آتی ہے، جیسے جہاد میں تلوار کی ضرب سے موت میں لذّت آتی ہے۔ بس دونوں میں ایسا فرق ہے جیسے کسی نے شربت فالسہ پی لیا اور کسی نے شربت انار پی لیا۔ چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی کو تمنا تھی کہ مجھ کو سماع میں موت آئے یعنی سماع مباح میں۔ کیونکہ یہ حضرات غیر مشروع طریق سے سماع نہ سنتے تھے۔ چنانچہ شیخ کی یہ تمنّا پوری ہُوئی اور ایک دفعہ سماع میں تین روز تک اس شعر پر وجد رہا۔ ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　　ہر زماں از غیب جان دیگر است

قوال بھی تین روز تک بار بار اسی کو پڑھتے رہے۔ کیونکہ یہ بات آدابِ سماع میں سے ہے کہ جس شعر پر کسی کو وجد ہو اسی کو مکرر پڑھتے رہیں جب تک کہ وجد کو سکون نہ ہو، ورنہ صاحبِ وجد کو قبض شدید ہو جاتا ہے جس سے بعض دفعہ موت کی نوبت آجاتی ہے اور اسی وجہ سے یہ بھی آداب میں سے ہے کہ جب صاحبِ وجد کھڑا ہو تو سب کھڑے ہو جائیں تاکہ موافقت سے اس کو بسط ہو اور مخالفت سے قبض نہ ہو۔ غرض تین دن تک شیخ کو اس شعر پر وجد رہا ـــ تین دن کے بعد وصال ہو گیا۔

مگر سماع میں موت آنا مطلقاً دلیل شہادت نہیں اور اگر کسی کو سماع محرّم میں موت آجائے تو یہ جوازِ سماعِ مذکور کی دلیل نہ ہو گی، کیونکہ کسی شے کے ساتھ موت کا مقترن ہو جانا اس کی فضیلت کی یا جواز کی دلیل نہیں کیونکہ بعض دفعہ موت کا اقتران ایسی حالت کے ساتھ ہُوا ہے جو بالاتفاق حرام تھی۔

نیز بعض دفعہ موت کا اقتران سماع سے صرف ظاہری ہوتا ہے اور حقیقت میں سببِ موت بسط نہیں ہوتا بلکہ ضعفِ قلب وغیرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض

قوالوں کے گانے پر ایسے اور لوگوں کی جان نکل گئی ہے جن کو بسط و قبض کی ہوا بھی نہیں لگی۔

بعض اہلِ محبت نے سماع میں موت آنے کی تمنّا اس لیے کی ہے کہ اس وقت محبت کو ہیجان ہوتا ہے اور موت لذّت کے ساتھ آتی ہے جیسے جہاد میں لیکن جو حضرات محقق اور مقتدا ہیں۔ وہ ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں اس لیے وہ اس کی تمنّا نہیں کرتے بلکہ تفویض سے کام لیتے ہیں اور خود کوئی صورت تجویز نہیں کرتے۔ بجز اللہ کی راہ میں قتل ہونے کے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمنّا کی ہے اسی لیے اللہ کی راہ میں شہید ہونے کی تمنّا شرعاً مطلوب و محمود ہے ورنہ ایمان میں رخنہ واقع ہوگا۔ (ارضاء الحق حصہ دوم ص ۹)

عاشق طلب میں ہر حال میں سرگرم رہتا ہے

شاہ ابوالمعالیؒ نے اپنے ایک مرید سے جو سفر حج کو جا رہا تھا، فرمایا کہ روضۂ اقدس پر میرا سلام عرض کر دینا۔ اس نے سلام عرض کیا تو جواب آیا کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہنا۔ مرید بڑا گھبرایا کہ شیخ سے یہ الفاظ کیونکر عرض کروں۔ واپسی پر شیخ نے خود پوچھا کہ ہمارا سلام عرض کیا تھا۔ کہا جی ہاں کیا تھا۔ حضورؐ نے بھی آپ کو سلام فرمایا ہے۔ کہا وہی کہو جو حضورؐ نے فرمایا تھا۔ بات کیوں بدلتے ہو۔ اس نے کہا جب آپ کو علم ہے تو آپ مجھ سے ہی کیوں پوچھتے ہیں۔ فرمایا کہ وہ بات تم تھوڑا ہی کہو گے۔ تم تو قاصد ہوا اور قاصد سفیر محض ہوتا ہے۔ اور محبوب کا پیام سننے میں اور مزہ ہے کہ جلتے ہیں وہ مزہ نہیں چنانچہ اس نے حضورؐ ہی کے الفاظ میں پیام کو ادا کیا۔ شیخ پر وجد طاری ہو گیا اور کہا۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
زبان تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

غرض عاشق کو جو عارف بھی ہو کسی وقت یہ وسوسہ نہیں ہوتا کہ محبوب کو چھوڑ دے۔ اس کی طلب ہر وقت ترقی پر رہتی ہے خواہ قبض ہو یا بسط ہو، انعام ہو یا دشنام ہو۔ سعدی فرماتے ہیں۔

گدایان از پادشاہی نفور | بامیدش اور گدائی صبور
دما دم شراب الم در کشند | و گر تلخ بینند دم در کشند
نہ گویم کہ بر آب قادر نیند | کہ بر ساحل آب مستسقیند

(الحدود والقیود صہ ۴۲)

محبّ کی نظر میں محبوب کی ہر چیز دلکش اور بے بہا ہوتی ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ چند کھجوریں حضور ﷺ نے ان کو دم کردی تھیں جس کو انہوں نے ایک توشہ میں رکھ لیا تھا اور ان میں ایسی برکت ہوئی کہ ہمیشہ ان میں سے کھاتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت میں وہ ان کے پاس سے کھوئی گئیں جس کا ان کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ ان کا شعر بھی اس بارہ میں مشہور ہے۔

للناس ھمٌّ ولی فی الیوم ھمّان
فقدُ الجراب وقتل الشیخ عثمان

کہ لوگوں کو ایک ہی غم ہے اور مجھے آج دو غم ہیں۔ توشہ دان کے کھوئے جانے کا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو اس برکتِ نبوی کے فوت ہو جانے کا غم تھا جو ان چھواروں میں تھی۔ عشاق کی یہی حالت ہوتی ہے کہ محبوب کی ذرا ذرا سی چیز پر جان دیتے ہیں۔

نیز محبت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ عاشق دوسروں کی زبان سے بھی اس کا نام سننا اور تذکرہ سننا چاہتا ہے۔ ابو نواس کہتا ہے۔

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر
ولا تسقنی سرا متی امکن الجھر

اس کو شراب سے محبت تھی تو کہتا ہے شراب پلاتا جا اور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے شراب ہے کیونکہ محبوب کا نام سننے سے بھی لذت آتی ہے اگر سننے میں لطف نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی سے کیوں فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھو، میں سننا چاہتا ہوں اور وہ صحابی فرماتے ہیں اعلیک اقراء وعلیک انزل یعنی آپ کو سننے کی کیا ضرورت ہے آپ پر تو قرآن نازل ہوا ہے، مگر آپ فرماتے ہیں کہ نہیں سننے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ خود پڑھنے میں توجہ منقسم ہوتی ہے اپنی قرأت کی طرف۔ اور سننے میں ہمہ تن ادھر ہی توجہ ہوتی ہے، عشاق غور کر کے دیکھ لیں کہ جیسا خود اپنی زبان سے ان کو محبوب کا تذکرہ پسند ہے۔ اسی طرح دوسرے کی زبان سے بھی تذکرہ سننے کو جی چاہتا ہے۔ اور ایسا جی چاہتا ہے کہ اس کے ضمن میں اگر دوسرے کا تذکرہ ٹھونس دیا جائے تو سخت ناگوار ہوتا ہے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ مولانا مظفر حسین صاحب سے ایک رئیس نے کہا کہ حضرت حدیث میں آتا ہے: لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (متفق علیہ) "یعنی کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہوگا (مسلمان نہ ہوگا) جب تک کہ اپنے والد اور اولاد اور سب آدمیوں سے زیادہ میری ساتھ محبت نہ ہو" اور میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے تو کیا میں مومن نہیں۔ مولینا نے اس وقت کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری باتوں میں لگ گئے اور باتوں باتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا اور آپ کے کمالات بیان کرنا شروع کیے۔ وہ رئیس نہایت شوق سے حضورؐ

کا تذکرہ سنتے رہے جب مولٰینا نے دیکھا کہ اُن کو بہت لطف آرہا ہے تو درمیان ہی میں حضورؐ کا تذکرہ چھوڑ کر فرمانے لگے کہ اچھا اس کو تو رہنے دیجیے۔ اب آپ کے والد صاحب کے کمالات بیان کرتا ہوں۔ اس میں بھی بڑے بڑے کمالات تھے۔ بس وہ رئیس یہ سُن کر بے چین ہوگئے اور کہا حضرت آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں یہ والد صاحب کا قصہ کہاں سے ٹھونس دیا۔ توبہ توبہ کیا ان کے کمالات بھی کوئی چیز ہیں جو حضورؐ کے کمالات کے ساتھ بیان کیے جائیں۔ مولانا اس سے میرا دل بہت دُکھا اس کو چھوڑیے اور حضورؐ ہی کا تذکرہ کیجیے۔ مولانا نے فرمایا کیوں صاحب اگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے والد کے ساتھ محبت ہے تو حضورؐ کے تذکرہ میں ان کا تذکرہ ناگوار کیوں ہوا اور اس سے دل کیوں دُکھا۔ بس شکر کیجیے کہ آپ کو حضورؐ ہی کے ساتھ زیادہ محبّت ہے جس کا احساس مقابلہ کے وقت ہوتا ہے اب تو ان رئیس کی آنکھیں کھل گئیں اور مولانا کو بہت دعائیں دیں۔ واقعی عارفین قیل وقال سے جواب نہیں دیا کرتے۔ وہ عملی جواب دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلّی ہوجاتی ہے۔ اگر مولانا دلائل سے ان رئیس کا اطمینان کرنا چاہتے تو وہ اطمینان نہ ہوتا جو اس عملی جواب سے ہُوا۔ سو بحمد للہ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حق تعالیٰ سے محبت نہ ہو۔ محبت سب کو ہے اور جان و مال اور اہل وعیال سے بھی زیادہ ہے۔ کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں مگر وجودِ محرک کے وقت تحریک ہوتی ہے۔ (وعظ: الصلات فی الصلوٰۃ)

تھانہ بھون ۲ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

ایک بدو کی حکایت

ایک بدو کے لڑکے کو بعض حاجیوں نے ہندوستان ساتھ لانا چاہا اور اس کے سامنے ہندوستان کی سرسبزی اور ارزانی کا خوب تذکرہ کیا۔ وہ سب اوصاف سن کر کہنے لگا کہ ہندوستان

میں کعبہ بھی ہے؟ کہا نہیں۔ تو وہ صاف کہتا ہے کہ پھر ہندوستان میں کچھ بھی نہیں۔ جب وہاں کعبہ نہیں۔ ہائے خوب کہا ؎

ومن مذہبی حب الدیار لاھلھا　　وللناس فیما یعشقون مذاھب

مولانا نے مثنوی میں ایک عاشق و معشوق کی گفتگو نقل فرمائی ہے۔ اس بڈھے لڑکے کا جواب بالکل اسی جواب کے موافق ہے جو مولانا نے عاشق کی طرف سے بیان فرمایا ہے۔ ؎

گفت معشوقے بعاشق کاے فتا　　تو بہ غربت دیدۂ بس شہرہا

پس کدامی شہر ازانہا خوشتر است　　گفت آں شہرے کہ در وے دلبر است

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں　　فوق گردوں است نے قعر زمیں

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

(مظاہر الآمال ص ۳۴۲)

اعمالِ آخرت پر دنیا میں روحانی سکون

میں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے خود سنا ہے۔ بھائی جنت کا مزہ برحق حوض کوثر کا مزہ برحق، مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں نہیں اور سجدہ میں جاتے ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیار کر لیا۔ سبحان اللہ جس شخص کو اعمال کی یہ لذت نصیب ہو اس کے لیے دنیا ہی میں جنت کیوں نہ ہو گی۔ واللہ اعمال آخرت کا ثمرہ نقد بھی ملتا ہے اور جن کو اس ثمرہ کا پتہ چل گیا ہے وہ ہفت اقلیم کی سلطنت پر بھی نگاہ نہیں اٹھاتے وہ ثمرہ یہی خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اس سے امید کا وابستہ ہو جانا ہے۔ اعمال صالحہ کا ایک ثمرہ اخروی فلاح تو ہے ہی۔ اور ایک دوسرا ثمرۂ عاجلہ ہدایت بھی ہے۔ ہدایت پر ہونا بڑی نعمت اور بڑی دولت ہے۔ یہ ثمرہ دنیا میں ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ کافر کو یہ بات نصیب نہیں۔

مزید برآں یہ بات سونے پر سہاگہ ہے کہ اعمال صالحہ "باقیات صالحہ" بھی ہیں کہ آخرت میں ان کا اجر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ (منظاہر الآمال صلا ۳۳-۳۱)

مذاق عشق امام سعدیؒ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ان کو ایک رات غیب سے آواز آئی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور ایسے زور سے آواز آئی کہ ایک مرید نے بھی سن لیا۔ مگر وہ بزرگ بدستور اپنا عمل پورا کرنے چلے۔ اگلے دن پھر لوٹا لے کر تہجدؒ کو اٹھے۔ مرید نے کہا ایسی بھی کیا بے عزتی ہے۔ جب وہ کچھ نہیں پوچھتے تو اس محنت سے کیا نفع؟ شیخ نے جواب دیا کہ بیٹا یہ تو صحیح کہ وہ نہیں پوچھتے مگر تم یہ تو بتلاؤ کہ اور کہاں جاؤں۔ کیا اور کوئی دروازہ ہے جسے خدا کے دروازہ کو چھوڑ کر اختیار کرلوں۔ اور جب اور کوئی دروازہ نہیں تو پھر چاہے وہ ماریں یا چھوڑیں میں تو انہیں کو لپٹا رہوں گا

اس پر دوبارہ آواز آئی۔ ~~

قبول است گرچہ ہنر نیستت که جز ما پناہِ دگر نیستت

اس میں بھی ایک چرکہ لگا دیا کہ گو کسی قابل تو نہیں ہو مگر رحم کر کے قبول کیے لیتے ہیں۔ حضرت عاشق کا مذاق یہی ہوتا ہے۔ اگر اس کو یقین بھی ہو جائے کہ جہنم میں جاؤں گا جب بھی عمل سے باز نہیں آتا برابر طلب میں بڑھتا رہتا ہے۔

(الحدود والقیود صلا ۴۲)

مفتی الٰہی بخش کا ایک عجیب واقعہ مفتی الٰہی بخش ایک مرتبہ بیماری میں اللہ اللہ کر رہے تھے کہ ان کے بھائی آ گئے کہ وہ بھی بڑے بزرگ تھے۔ انہوں نے فرمایا بھائی جی آہ آہ کرو کیونکہ اللہ اللہ مظہر الوہیت ہے اور آہ آہ مظہر عبدیت ہے اور اس وقت وہ عبدیت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے آہ آہ شروع کی اور بہت جلد صحت ہو گئی کیونکہ

مقصود پورا ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی کلیہ نہیں ہر حالت کا جدا مقتضا ہے جس کے لیے ضرورت ہے تحقیق کی یا کسی محقق کی تقلید کی۔ اللہ تعالیٰ کو عجز و نیاز اور تضرع و زاری بہت پسند ہے اور یہ بات آہ ہی میں ہے۔ اللہ اللہ کرنے میں نہیں ۔

تا نگرید کودکِ حلوا فروش | بحر بخشایش نمی آید بجوش

اور فرماتے ہیں ۔

اے خوشا چشمے کہ او گریانِ اوست | اے خوشا آں دل کہ او بریانِ اوست

در پسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست | مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست

ہر شکایت صبر کے منافی نہیں

اسی لیے ایک بار حضرت عمرؓ سے بیماری میں جب کسی نے پوچھا کہ کیسی طبیعت ہے۔ فرمایا اچھی نہیں۔ سائل نے کہا کیا آپ شکایت کرتے ہیں۔ فرمایا تو کیا میں خدا کے سامنے اپنی بہادری ظاہر کروں کہ وہ تو بیمار کریں اور میں کہوں نہیں میں تو اچھا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ شکایت منافی صبر وہ ہے جو خود مقصود ہو اور جو کسی حکمت سے ہو وہ عبدیت ہے۔ ان مقامات کو عارفین سمجھتے ہیں کہ اس وقت کیا مطلوب ہے اور دوسرے وقت کیا مطلوب۔

تشریع اور تکوین کا ایک عجیب فرق

تکلیف تشریعی سے مقصود عمل ہے اور تکلیف تکوینی سے صبر مقصود ہے اور امور تکوینیہ میں فوق طاقت کا وقوع ہو سکتا ہے اور بوجہ زیادت اجر کے فوق طاقت وقوع خلاف رحمت نہیں۔ اور صبر کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شکایت نہ کرے اور اس میں بھی اتنی توسیع ہے کہ حقیقی شکایت نہ کرے کہ صورت شکایت ہو جائے تو وہ معاف ہے، جیسے یعقوب علیہ السلام کا قول ہے انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ۔ اسی طرح آنسو بہنا، آہ آہ منہ سے نکلنا بھی خلاف صبر نہیں۔

ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے۔ بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی آسان ہو جاتا ہے کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے تو دل میں خدا سے شکایت پیدا نہیں ہوتی بعض لوگوں کو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے۔ وہ بیماری میں آہ آہ کرنے کو خلاف صبر سمجھتے ہیں اس لیے اللہ اللہ کرتے ہیں تاکہ قوت قلب ظاہر ہو مگر یہ معرفت کے خلاف ہے۔

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ جس کا حاصل یہ کہ (تشریعاً) مدار تکلیف صرف اختیار ہے۔ انسان صرف اختیاریات کا مکلف ہے۔ تو بیماری وغیرہ میں صورت شکایت کا حرج نہیں بس شکایت حقیقی نہ ہونی چاہیے اور یہ امر اختیاری ہے اور تکوینیات میں انسان اسی کا مکلف ہے۔ اس کے سوا کسی عمل وغیرہ کا مکلف نہیں پس تکوینیات میں فوق الطاقت وقوع جائز ہے اور تشریعات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں تکوینیات کے بارہ میں آگے دعا کی تعلیم ہے کہ فوق الطاقت مصائب سے بچنے کی بھی دعا مانگا کرو چنانچہ ربنا ولا تحمل علینا اصراً کے بعد جو کہ تشریعات کے بارے میں ہے۔ اس کا بھی اضافہ فرمایا گیا: ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ

(الفصل والانفصال ص۳۰)

اہل محبت کا جداگانہ مذاق مصائب اور تکالیف میں انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ حق تعالیٰ جو معاملہ بھی اپنے بندوں کے ساتھ فرماتے ہیں وہ حکمت اور رحمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اور اہل محبت کا تو اس باب میں مذاق ہی جدا ہوتا ہے جو اس سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے یعنی ان کو محبوب کی ہر چیز محبوب معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

(الافاضات ج۲ ص۱۷۹)

حضرت عبید اللہ احرار کی خدمت میں مولانا جامی کی حاضری

مولانا جامی ایک مرتبہ حضرت خواجہ عبید اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب انہوں نے وہاں امیرانہ ٹھاٹھ دیکھا تو بہت جھنجھلائے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ پاس اتنی دنیا بھری ہوئی ہے۔ آپ نے اسی وقت یہ مصرع پڑھا:

ع نہ مرداست آنکہ دنیا دوست دارد

یہ کہہ کر چل دیئے اور ایک مسجد میں آکر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور ایک شخص ان کے سر ہو گیا کہ میرے پیسے دلواؤ جو تمہارے ذمہ ہیں۔ مولانا جامی بڑے پریشان ہوئے کہ یہاں اس کو کہاں سے پیسے دوں؟ اس نے کہا پھر نیکیاں دلواؤ۔ یہ اسی کشمکش میں تھے کہ ایک طرف سے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی سواری بڑی شان سے آتی ہوئی نظر پڑی۔ خواجہ صاحب نے مولانا جامی کو پریشان دیکھ کر سواری روکی اور قرض خواہ کو دھمکایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو، جاؤ جو کچھ تمہارا مطالبہ ہو ہمارے خزانہ سے وصول کر لو جو ہم نے یہاں پہلے سے جمع کر رکھا ہے اور یہ کہہ کر مولانا کو اپنی ساتھ سوار کر لیا۔ یہ دیکھ کر آنکھ کھل گئی۔ اب تو تنبہ ہوا کہ خواجہ صاحب بڑے درجہ کے درویش ہیں، اور میں نے سخت غلطی کی جو ان پر اعتراض کیا۔ یہ اسی سوچ میں تھے کہ اتنے میں خواجہ صاحب نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے۔ یہ دوڑ کر قدموں میں گر پڑے اور خطا معاف کرائی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا وہ اپنا مصرع تو سناؤ، جو آتے ہی سنایا تھا۔ مولانا جامی نے شرمندہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت وہ تو میری حماقت تھی۔ فرمایا ایک بار تم نے اپنی خواہش سے حماقت کی تھی، اب ہماری خوشی کے لیے وہ حماقت کر لو۔ چنانچہ آپ نے پڑھا ۔

ع نہ مرداست آنکہ دنیا دوست دارد

خواجہ صاحب نے فرمایا مضمون صحیح ہے لیکن ناتمام ہے اس میں اتنا اور ملا لو کہ:

ع
اگر دارد برائے دوست دارد

غرض مال کی محبت کا طبعی درجہ خلافِ زہد نہیں اور نہ مال کا جمع کرنا مطلقاً خلافِ زہد ہے۔ البتہ اس کو ذریعہ معاصی بنانا خلافِ زہد اور اگر یہ نہ ہو تو پھر کچھ حرج نہیں بلکہ بعضوں کے لیے مالدار ہونا ہی مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کو مال سے قرب ہوگا اور کس کو افلاس سے۔ اس لیے کسی کو مال دیتے ہیں اور کسی کو مفلس رکھتے ہیں۔ اور یہ جو بعض صوفیہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مال کی محبت مطلقاً نہ تھی تو ان میں محبت دوسری محبت سے مغلوب ہو جاتی ہے جو بوجہ مغلوبیت کے کالعدم معلوم ہوتی ہے مگر وہ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مقصود بالغیر ہوتی ہے اور کبھی اس کے بعض آثار محسوس بھی ہوتے ہیں۔

(الفصل والانفصال ص۳۶)

سلطان محمود کی بُت شکنی کی حکایت

محمود بادشاہ نے جب ہندوستان کو فتح کیا اور سومنات کا مندر توڑا تو تمام بُت توڑ ڈالے۔ جو بُت سب سے بڑا تھا اس کو بھی توڑنا چاہا۔ پجاریوں نے بہت الحاح وزاری کی اور کہا کہ اس کے برابر ہم سے سونا لے لیا جائے اور اس کو نہ توڑا جائے۔ محمود نے ارکان سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا کہ ہم کو فتح ہو ہی چکی۔ اب ایک بُت کے چھوڑ دینے سے ہمارا کیا جاتا ہے۔ اس قدر مال ملتا ہے لشکرِ اسلام کے کام آئے گا، چھوڑ دینا اچھا ہے۔ مجلس میں سپہ سالار مسعود غازی تھے۔ فرمایا یہ بُت فروشی ہے۔ اب تک بادشاہ بت شکن مشہور تھا۔ اب بُت فروش کہلائے گا۔ محمود کے دل کو یہ بات لگ گئی۔ مگر گونہ تردد باقی تھا۔ دوپہر کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر ہے اور ایک فرشتہ ان کو دوزخ کی طرف یہ کہہ کر کھینچتا ہے کہ یہ بُت فروش ہے۔ دوسرے فرشتہ نے کہا کہ نہیں یہ بُت شکن ہے

اس کو جنّت میں لے جاؤ۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ فوراً حکم دیا بُت توڑ ڈالا جائے اس کو جو توڑا تمام پیٹ میں جواہرات بھرے ہوئے نکلے۔ حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بُت فروشی سے بھی بچا اور جس مال کی طمع میں بُت فروشی اختیار کرنا تھا اس سے زیادہ مال بھی مل گیا۔ یہ جنّت اور دوزخ کی طرف کھینچا جانا اس تردد کی صورت دکھائی گئی جو محمود کے قلب میں تھا۔ خیال کرنے کی بات کہ بُت کو چھوڑ دینا حقیقت میں بُت فروشی نہ تھا لیکن صورۃً بُت فروشوں کی مشابہت تھی جس کا یہ نتیجہ ہُوا۔

ایک پرندہ کی حکایت

ایک پرندہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ایک مادہ سے کہا کہ اگر تو میرے ساتھ مل جائے تو میں تجھ کو ملک سلیمان دے دوں گا۔ یہ بات حضرت سلیمان نے سن لی، کیونکہ وہ منطق الطیر کے عالم تھے، فوراً اس پرندہ کو بلایا اور فرمایا نالائق یہ کیا گستاخی تھی آپ میرا ملک دینے والے کون ہوتے ہیں۔ اس نے کہا اے نبی اللہ میں عاشق ہوں اور لسانِ عشق معذور ہوتی ہے۔ اس پر حضرت سلیمان نے اس کا قصور معاف کیا۔ اسی طرح یہ عشاق بھی وہاں معذور شمار ہوں گے۔ مگر ہر شخص کی زبان زبانِ عشق نہیں تم ناز سے کام نہ لو اور عاشق کی نقل نہ کرو۔ وہ تو اپنے کو مٹا کر فنا کر کے ناز کر رہا ہے اس کو حق ہے تم کو یہ حق نہیں ہے کیونکہ تم اپنے کو باقی رکھ کر ناز کرتے ہو۔

پیشِ یوسف نازشِ و خوبی مکن — جز نیاز و آہِ یعقوبی مکن

زشت باشد روئے نازیبا و ناز — عیب باشد چشمِ نابینا و باز

(الفصل والانفصال ص ۳۰)

حضرت حاجی صاحب کا مقام

فرمایا کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اگر میں عند اللہ مومن ہوں اور ساری دنیا مجھ کو مردود سمجھے میرا کچھ ضرر نہیں۔ اور اگر عند اللہ مردود ہوں اور ساری دنیا قطب غوث

اور ابدال سمجھے تو کچھ نفع نہیں۔

(الافاضات ج ۶ ص ۱۵)

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی زندگی

یہاں (خانقاہ میں) حضرت حاجی صاحب تشریف رکھتے تھے تو حافظ عبد القادر جو حضرت کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی رات کو یہیں سہ دری میں حضرت کی چارپائی کے نیچے لیٹتے تھے۔ حضرت کی چارپائی بہت مکلف تھی، نواڑ سے بنی ہوئی، رنگین پائے، پیچ بند کسے ہوئے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ نوابوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن حال یہ تھا۔ مجھ سے خود حافظ عبد القادر کہتے تھے۔ کہ عشاء کے بعد حضرت اول ہی چارپائی پر آکر لیٹ جاتے بس اس وقت تو سب نے دیکھ لیا کہ حضرت عشاء کے بعد سو رہے ہیں لیکن جب سب نمازی چلے جاتے تو مؤذن سے دروازہ بند کرا لیتے اور مسجد میں مصلیٰ بچھا کر ذکر میں مشغول ہو جاتے۔ حافظ صاحب کہتے تھے کہ رات بھر میں شاید تھوڑی ہی دیر آرام فرماتے کیونکہ جب آنکھ کھلی حضرت کو مسجد میں بیٹھے ہوئے ذکر میں مشغول ہی دیکھا اور کوئی دن ناغہ نہ جاتا تھا کہ روتے نہ ہوں اور بڑے درد سے بار بار یہ شعر نہ پڑھتے ہوں۔ ؎

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن   گر بدم من سرّ من پیدا مکن

تو حضرت جس کو منزل پر پہنچنا ہو گا وہ رات ہو یا دن جب وقت ملے گا چل پڑے گا۔

(الافاضات ج ۷ ص ۲۹۹ ملفوظ نمبر ۲۳)

عشق ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے

تمام ان چیزوں کو جو بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہیں عشق آسان کر دیتا ہے۔ قلب میں اس کے آجانے کے بعد سب قیل و قال، چون و چرا ھباءً منثورا ہو جاتے ہیں: ؎

عشق آمد عقلِ او آوارہ شد   صبح آمد شمع او بےچارہ شد

(الافاضات ص ۸)

ایک واقعہ

جس وقت راجہ داہر سے مقابلہ کا اہتمام ہو رہا تھا اس وقت محمد بن قاسم کو معلوم ہوا کہ راجہ داہر نے اپنی بہن سے شادی کی ہے۔ یہ سن کر بے فکر ہو گئے اور یہ کہا کہ اب اس کے مقابلہ میں ہم لوگ ضرور انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہوں گے اس لیے کہ وہ کافر ہی نہیں ملحد بھی ہے وہ شہوت سے مغلوب ہے کفر کے ساتھ تو شجاعت جمع ہو سکتی ہے مگر شہوت کے ساتھ شجاعت نہیں ہو سکتی۔

(الافاضات ج ۵، ملفوظ ۱۹۳)

ایک نوجوان کی حکایت

راجہ گوالیار کے یہاں فوجی لوگ داڑھی منڈائیں یا نہ منڈائیں، اس کے متعلق کوئی قانون نہ تھا۔ ایک شخص مسلمان نوجوان فوجی داڑھی منڈایا کرتا تھا۔ سب برا بھلا کہتے کہ تو داڑھی منڈاتا ہے۔ وہ جواب میں کہتا کہ میاں گناہ کرتا ہوں اللہ میاں معاف کر دے گا۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ راجہ کی طرف سے حکم ہوا کہ فوج میں رہنے والا کوئی شخص داڑھی نہیں رکھ سکتا۔ جس قدر اس شخص کو تبلیغ کرنے والے تھے۔ ایک دم سب نے داڑھی منڈا ڈالی اور اس شخص سے کہا کہ لو میاں مبارک ہو تیرا ہی چاہا ہو گیا۔ کہا کہ کیا ہوا۔ کہا کہ اب تو راجہ کا حکم ہو گیا کہ کوئی فوجی داڑھی نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے بھائی ہم سب کو منڈانی پڑیں۔ اس پر یہ شخص جواب دیتا ہے کہ میاں اب تک تو جو داڑھی منڈائی اور خدا کی نافرمانی کی تو نفس کے کہنے سے مگر اب خدا کے ایک نافرمان کا حکم ہے تو اب منڈانا بے حمیتی ہے کہا کہ فوج سے برخاست کر دیے جاؤ گے۔ کہا کہ اللہ رازق ہے وہ کہیں اور سبیل فرما دیں گے۔ یہ ہے قوت ایمانیہ اور یہ ہے جوشِ اسلامی اور غیرتِ اسلامی اور حمیت اسلامی۔ مگر مسلمانوں نے خود ہی کمزوری اختیار کر لی اس کے یہ نتائج ہیں جو ظاہر ہو رہے ہیں۔

(الافاضات ج ۵ ص ۱۳۸ ملفوظ ۲۳۱)

داڑھی خلافِ فطرت ہے؟

کلکتہ میں ایک ملحد نے مولانا شہید دہلوی ؒ سے کہا تھا کہ غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی رکھنا خلافِ فطرت ہے۔ کیونکہ اگر فطرت کے مطابق ہوتی تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت بھی ہوتی۔ مولانا شہید علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ اگر فطرت ہونے کی یہی وجہ ہے تو دانت بھی خلافِ فطرت ہیں ان کو بھی توڑ ڈالو۔ کیونکہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت دانت بھی نہیں تھے۔

(وعظ: طریق النجاۃ)

حکایت

طلیحہ بن خویلد نے اپنے وزیر سے پوچھا تھا کہ ہمارے پاس سب سامان ہے، تلواریں ہیں، جمعیت زیادہ ہے۔ پھر بھی یہ مسلمان ہم پر غالب آتے ہیں۔ ان میں ایسی کون سی چیز ہے جس کا یہ اثر ہے۔ وزیر سمجھدار تھا عجیب جواب دیا کہ ہم میں ان میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ ان میں کا تو ہر شخص اپنے رفیق سے پہلے مرجانا چاہتا ہے اور دوسرے کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اور ہمارے یہاں ہر شخص خود تو زندہ رہنا چاہتا ہے اور دوسرے کو مُردہ بنانا چاہتا ہے۔ اُن کے نزدیک مقدم موت ہے اور ان کے نزدیک مقدم حیات ہے۔ بس یہ چیز ان لوگوں میں زیادہ ہے جو ہم میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ (الافاضات ع۲ ص۱۶۹، ملفوظ ع۲۵۰)

استقامت کی عظمت

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو سُولی پر لٹکا ہُوا دیکھا تھا۔ ساتھ والوں سے پُوچھا کہ اس کو سُولی کیوں دی گئی۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ بڑا چور تھا۔ ایک بار اس نے چوری کی تو دایاں ہاتھ کاٹا گیا۔ پھر باز نہ آیا اور دوبارہ چوری کی تو بایاں پیر کاٹا گیا پھر باز نہ آیا تو قید کردیا گیا۔ اس نے قید خانہ میں بھی چوری کی تو سولی کا حکم دیا۔ یہ سُن کر حضرت جنیدؒ نے دوڑ کر اس کے قدم چُوم لیے۔ اہلِ ظاہر نے اعتراض کیا کہ آپ

ایک ایسے پکّے چور کے قدم چُومتے ہیں۔ فرمایا میں نے چور کے قدم نہیں چُومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم چُومے ہیں کہ وہ جیسا بھی کچھ تھا اپنی طلب کا پکّا تھا۔ اس کا محبوب گو کیسا ہی بُرا سہی مگر اس نے اس کے پیچھے جان دے دی۔ اس کا یہ حال تھا۔ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا تن رسد بجانان یا جان زتن برآید

میں اس کے استقلال کی قدر کرتا ہوں۔ اے لوگو! اگر ہم کو حق پر ثابت قدم رہنے پر ایسا استقلال حاصل ہو جائے تو ہمارا کام بن جائے۔

(دین و دنیا بتفصیل الدین ص۱۰۳، ۱۰۴)